دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مارچ 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول

جلد 45 • شمارہ 03 • مارچ 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جاسوسی ڈائجسٹ میں
انگارے
ایک نیا شاہکار سلسلہ
آپ کے محبوب مصنف کے قلم سے
زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں
اپنے دامن میں سمیٹے
ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی
جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر
خود کو مجبور پائیں گے
اس دلچسپ داستان
کے مصنف کا صحیح نام
بھیجنے والے قارئین کے نام اگلے شمارے میں شائع کیے
جائیں گے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے
دس کامیاب قارئین کو مئی 15 کا شمارہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مفت ارسال کیا جائے گا

عزیزانِ من... السلامُ علیکم!

سینیٹ کے انتخابات کی گہما گہمی اور سودے بازی کے ہنگامے میں نیا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ ملک میں سیاست کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہی ہوتا رہے گا۔ جب تک گنے چنے مقتدر خاندانوں کے لوگ اقتدار پر قابض ہیں... وہ اپنوں کے سوا کسی کی کوئی بات نہیں سنیں گے، اس نقار خانے میں ان طوطیوں کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ اختلاف، سب میٹھی میٹھی باتیں کر کے قوم کو ایم کھلاتے اور سلاتے رہتے ہیں۔ عمل کے نام پر کسی سے کوئی بھول چوک بھی نہیں ہوتی... اور ان سب خرابیوں کی جڑ ہے کرپشن۔ زیادہ نہیں، چند عشروں کی بات ہے کہ رشوت کو ایک قابلِ نفرت برائی سمجھا جاتا تھا۔ لینے والا چوری چھپے، شرمندگی کے ساتھ لیتا تھا۔ اس نفرت انگیز حرکت کو چھپاتا تھا۔ اب یہ ایک فخریہ خوبی ہے۔ لوگ سینہ تان کر کہتے ہیں کہ تنخواہ بیس ہزار ہے، اوپر سے ڈیڑھ، دو لاکھ بن جاتے ہیں۔ اُن دنوں قانون کا بھی احترام تھا... دیکھتے ہی دیکھتے یہ معاشرت عنقا ہو گئی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جرم کی ماورائے قانون قیمت ادا کر کے پارسائی کی سند مل سکتی ہے۔ گلیوں، بکڑوں، سڑکوں اور چوراہوں پر سفید پوش اہل کار بلاخوف و خطر تک مکا کرتے ہیں، دوسری ٹولیاں تلاشی کے بہانے شہریوں کو لوٹتی ہیں۔ مانا کہ سب ایسے نہیں ہیں لیکن کافی ایسے ہیں اور وہی اس معاشرتی بگاڑ کی بنیاد ہیں۔ نیچے سے سو پچاس میں شروع ہونے والی یہ خرابی اوپر پہنچتے پہنچتے کروڑوں اور اربوں میں پھل پھول رہی ہے۔ روز نت نئی کہانیاں سامنے آتی رہتی ہیں لیکن ہوتا کچھ نہیں۔ ایک الزام لگاتا ہے، دوسرا جوابی الزامات کا پلندا کھول دیتا ہے اور یکا یک دونوں پُرامن بقائے باہمی کے اصول کے تحت خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی بیخ کنی کب اور کون کرے گا... یہ سوال آج ہر دردمند پاکستانی کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ ان کو بھی جو ہمیں سندیسے بھیجتے ہیں اور اس محفل کو سجاتے ہیں۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں...

لاہور سے زویا اعجاز کی کنٹری ”چار فروری کو شام چار بجے جاسوسی سے ملاقات ممکن ہوئی۔ سرد برفیلے موسم میں سفید مخمل جیسے برف پوش کہساروں کی جھلک نے سردی کے تاثر کو مزید بڑھا دیا۔ دائیں جانب انکل سیانے انکھیلیاں کرتے نظر آ رہے تھے جس کی وجہ بائیں جانب جلوہ افروز نسیم وڈے شاہ جی کی پڑوسن تھیں۔ علی سفیان آفاقی کی پُرالم وفات نے صحافت کا ایک مکمل عہد خاک نشین کر دیا۔ پروردگار انہیں غریق رحمت فرمائے۔ آج کل قوم عالمی کپ کے بخار میں مبتلا ہے۔ ہمیں بھی یہ مرض پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ انیلی ہمارے بارے میں ناکام اندازے لگانے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ ڈیئر! آپ اپنی ننھی منی سمجھ دانی پر کیوں بے جا زور ڈالتی ہیں؟ ہماری گفتگو اور رموز آپ کی محدود سوچ نگری میں کہاں سمائے گی بھلا؟ بلقیس خان کا حال کسی نوآموز بلیئر جیسا تھا جو اپنے ڈیبیو پر ہی کرس گیل اور شاہد آفریدی جیسے جارحانہ اسٹروکس لگائے مگر وہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی اسٹروک قابلِ داد نہ تھا۔ سید عبادت کاظمی!! یہ دنیا بیچل کی۔ اور اس کے غیر تحریری دستور کے مطابق بے جان چیزوں کی قدر و قیمت جانداروں سے کہیں زیادہ ہے۔ ادارے کی طرف سے ڈیبیو کیپ پہنائے جانے پر محمد مرتضیٰ احتشام کو مبارکباد۔ کے چودھری طاہر بھی اپنی ابتدائی جارحانہ بائنگ کے بعد نہ جانے کون سے ڈریسنگ روم میں پوشیدہ ہیں۔ تمام اراکینِ محفل سے التماس ہے کہ تبصرہ نگار مرزا انجم جرال کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کریں۔ کہانیوں کا آغاز حسبِ معمول منظر امام سے کیا۔ نسیم انجم نے ہماری قومی اور سیاسی صورتِ حال کا ظریفانہ پوسٹ مارٹم کیا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط اب تک کے ناول کی بہترین انٹری تھی۔ بیگم صاحب اور لئیق شاہ کے ماضی سے اسرار کی دھند ہٹنے سے کہانی دلچسپ ترین موڑ پر ہے۔ چودھری الف خان کا عادلانہ کردار بہت جاندار اور شاندار تھا۔ جواری اب تک آوٹ آف فارم تھی۔ لیکن فرید کا نادر شاہ کے کیمپ میں گھس کر نقب لگانے کا فیصلہ شاید اسے جلد ہی فارم میں لے آئے۔ نورین کی موت ناقابلِ یقین لگی۔ مایا جال کی آخری قسط پہلا تاثر قائم رکھنے میں ناکام رہی۔ کاشف زبیر کی آخری جواب قومی سلامتی کے درپے عالمی غنڈوں کی ناکامی کا خوش کن احوال تھی۔ مریم کے خان کی پانچواں سوار حسبِ سابق بے مثال۔ مغربی خواتین کو آزادی اور حقوقِ نسواں کے صلے میں مشکلات ملتی ہیں، رشتوں اور تحفظ میں وہ دیوالیا ہوتی ہیں۔ عکس فاطمہ کی گہری سازش کے کرداروں کے اسمائے شریف نے بہت الجھائے رکھا، اور کہانی کا مزہ گہنا گیا۔ مستقبل بعید کا آئینہ تشنہ کام بھی بہت اچھی لگی۔ قرائن بتاتے ہیں کہ عنقریب ہم مشینوں سے گھر کر اپنے مقام و مرتبے اور ہستی و وجود سے یکسر فراموش ہو چکے ہوں گے۔ آسیبِ کرکٹ میں افاقہ اور پاکستان کی جیت کی دعا کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی تھرتھراہٹ ”رم جھم برستی بارش میں جاسوسی کو خریدا۔ سردی کی مناسبت سے سرورق بھی سرد سا لگ رہا تھا۔ برف باری سے ڈھکا گھر اور حسینہ زبردست لگ رہے تھے۔ ہمایوں سعید بھی غالباً سردی کی وجہ سے خاموش کھڑے تھے۔ بہت عرصے بعد صبا گل کی آمد اچھی لگی، عرفان راجہ ہماری کمی محسوس کرنے کا شکریہ۔ ہمایوں صاحب کا جلا کٹا تبصرہ پڑھ کے مزہ آیا۔ ماہا ایمان، تفسیر عباس بابر جلدی انٹری دیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، کہانی میں ٹوئسٹ آیا ہے۔ میڈم زہرہ کی کہانی اچھی لگ رہی ہے۔ جواری میں نورین کی موت... کہانی کا مزہ خراب ہو جائے گا۔ پہلا رنگ کاشف زبیر نے زبردست لکھا۔ دوسرا رنگ، محبت میں پاگل پن نے حماد کو برباد کر دیا۔ مریم کے خان، آئی تے چھا گئی۔ پانچواں سوار اچھی کہانی تھی۔“

ماریہ جہانگیر مرالی کا کبیروالا سے تفکر ”ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد آخرکار پانچ فروری کو جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ محفلِ یاراں میں پہنچی اور اپنا مکتوب پاکر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ عرصۂ دراز سے حصۂ محفل بننے کی خواہش دل میں پل رہی تھی مگر یہ خواہش حسرت بننے سے پہلے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ زویا اعجاز اور احسان سحر کے تبصرے شاندار تھے۔ باقی تبصرے بھی جاندار تھے۔ کہانیوں میں آوارہ گرد اس مرتبہ کافی پُرامن رہی۔ آخرکار بیگم صاحبہ کی پُراسرار زندگی سے پردہ سرک رہا ہے۔ جواری میں بھی کافی تیزی نظر آئی ہے۔ نورین کی موت کا افسوس ہوا۔ سرورق کی پہلی کہانی آخری جواب پسند آئی۔ دوسری چال ایک منفرد تحریر تھی۔ واقعی انسان اگر حیوانی روپ میں آجائے تو درندوں سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں دھوکا، نسیم انجم اور کوپ نگر اچھی تھیں۔ تعلیمی مصروفیات کے باعث فی الحال اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ آخر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ جو قارئین کہانیوں کو غیر فطری کہتے ہیں، انہیں کہانی اور حقیقت کا فرق سمجھنا چاہیے۔ بے شک کہانیاں، حقیقت سے ہی ماخوذ ہوتی ہیں لیکن اگر کہانی میں سب کچھ ہی حقیقی رنگ میں پیش کیا جائے، تو کہانی میں لطف ہی نہ رہے۔“ (بجا فرمایا!)

کبیروالا سے مہر محمد شفقت مرالی کی ستائش ”گزشتہ 20 برس سے جاسوسی ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں۔ میں اس وقت سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں جب شکاری اور مداری کے سلسلے شائع ہوا کرتے تھے۔ جاسوسی کے بھی سلسلے بہترین ہیں۔ آج کل کے دور میں ایسے منفرد جرائد کمیاب ہیں۔ خاص طور پر احمد اقبال کی تحاریر مجھے بے حد پسند ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو کچھ ایسے پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ اب جواری بھی ایک بہترین تصنیف ہے۔ میں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر خط لکھ رہا ہوں۔ لہٰذا نظرانداز کرنے سے گریز کیجیے گا۔ جاسوسی کے علاوہ میں سسپنس اور سرگزشت کا بھی مستقل قاری ہوں دورِ حاضر میں نسلِ نو کی ذہنی پختگی کو جِلا بخشنے میں بلاشبہ یہ جرائد انتہائی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔“ (شکریہ!)

کراچی سے پریزے خان کی پروازِ تخیل ”ٹائٹل ڈاکر جی کے فن کا شاہکار، برف پوش وادی، شال اوڑھی لڑکی اسکیٹنگ کرتا مرد اور مفلر لپیٹے ہیرو... اگر اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہو کے میں نے اسے یہ درجہ دے ہی دیا ہے تو اس میں حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اہلِ کراچی تو ٹائٹل کو دیکھ کر صرف دل ہی تھام کر رہ سکتے ہیں یعنی سردی آنے کی بات کرتے ہو، دل جلانے کی بات کرتے ہو اس لیے مزید اپنا دل جلانے کے بجائے محفل میں آجاتے ہیں یہاں ویسے تو یقیناً کچھ لوگ میرے نام سے واقف ہوں گے اور جو نہیں ہیں تو رہنے دیں۔ واقف ہو کے ان کا کون سا بھلا ہو جانا ہے۔ احسان سحر جامع تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ طاہرہ گلزار بھی میری پسندیدہ تبصرہ نگار ہیں، تو ظاہر ہے کہ ان کا تبصرہ بھی مجھے اچھا لگا۔ ایم کے احساس کے جذبات اچھے لگے۔ ویسے احساس جی! سرورق کی حسینہ کو بھلا آپ کی بے بسی کا علم کیوں کر ہوا؟ مرتضیٰ جی آپ آگئے۔ آپ کا پہلا تبصرہ بہترین تھا۔ آپ کو تو پہلے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔ تفسیر عباس جی غیر حاضر ہیں اور ان کے بغیر محفل کے رنگ پھیکے ہیں۔ پلیز ذرا وقت نکال لیجیے۔ ایک تبصرہ لکھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ سب سے پہلے ابتدائی صفحات کی بات کروں گی۔ امجد رئیس کا ہر ناول لاجواب ہوتا ہے۔ مایا جال پڑھتے ہوئے میرے اعصاب تنے اور سانسیں تھمی ہوئی تھیں۔ دھماکے کے بعد جینی کی خیریت تو پتا چل گئی، مارک کا پتا نہیں ملا اس پر مستزاد آخر صفحے پر جب جاری کی پخ دیکھی، اُف...... نہ پوچھیں۔ مگر خیر، ہم بھی بلا کا ضبط رکھتے ہیں۔ آخر گزار ہی لیا نا ایک مہینا۔ مارک اور جینی کی مشرقی طرز کی لو اسٹوری، کہانی کی جان تھی۔ میرا تو دل ہی جیت لیا۔ جواری، احمد اقبال کی یہ سیریز جب تک جاری رہے گی، مجھے نہیں لگتا ان کی تحریروں میں یکسانیت، بوریت اور طوالت کے علاوہ بھی کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ ان کا اگلا ناول شاید سفاری کے نام سے ہو یا پھر کھلاڑی کے نام سے کہ اب تو کہانی کے نام سے پوری کہانی از خود ذہن میں آجاتی ہے کیونکہ کچھ نیا پن تو ہوتا نہیں۔ احمد اقبال بہت اچھے رائٹر ہیں مگر اب ان کی تحاریر میں تنوع کی شدید کمی ہوتی جارہی ہے۔ تنویر ریاض کی تحریر نے شروع سے لے کر آخر تک الجھائے رکھا اور کچھ پھر بھی کچھ نہ آیا۔ فریش ہونے کے لیے صوفیہ شکیل کو پڑھنا شروع کیا تو رہی سہی کچھ بھی رخصت ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ تو شکر ہے آخری سطروں میں کہانی کے پوشیدہ اسرار تک رسائی ہو گئی اور اپنے وقت کے ضائع ہونے کا افسوس جاتا رہا۔ مفرور نے رنجیدہ و افسردہ کر دیا۔ کوئی کوئی آخری دم تک حالات کی ٹھوکروں میں ہی رہتا ہے۔ خونی لاٹری، پتا نہیں لوگ ایسی حماقتیں کرتے کیوں ہیں۔ رولینڈ نے لاٹری جیت کر ڈھنڈورا پیٹا اور نتیجہ بھگتنا پڑا۔ کیپٹن کی دیانت داری بہت پسند آئی۔“

ساہیوال سے محسن علی طاب کی خاکساری ”ٹائٹل مناسب تھا۔ خطوط میں بلقیس خان، محمد ہمایوں، صبا گل اور معراج محبوب عباسی چھائے ہوئے تھے۔ اگر آپ خطوط کے ساتھ تبصرہ نگار کا نمبر بھی شائع کریں تو قارئین ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں گے (اور اس کے جو نتائج سامنے آئیں گے، اس سے ہم بخوبی آگاہ ہیں، اس لیے معذرت) اس دفعہ تمام رسالے پر آوارہ گرد چھائی ہوئی تھی۔ کہانی کا اتار چڑھاؤ قابلِ داد تھا۔ احمد اقبال جواری کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہے۔ احمد اقبال صاحب مبارک باد۔ آخری جواب کاشف زبیر کی اچھی کاوش تھی۔ ہمارے ملک میں 70 غیر ملکی ایجنسیوں کے ایجنٹ سرگرم ہیں۔ ان کا خواب بھی پورا نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ (ہونے کو اب باقی کیا رہ گیا ہے بھائی؟) دوسری چال، عبدالرب بھٹی صاحب آج کل بھیڑیا انسان بن گیا ہے اور انسان بھیڑیا بن گیا ہے۔ آپ نے کیا، پوری دنیا نے آرمی پبلک اسکول والی درندگی دیکھی ہے۔ شکارپور کا سانحہ بھی کم نہیں ہے۔ یہ درندے ان جانوروں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ میرا ایک مشورہ ہے جناب انگریزی کہانیاں کم کریں اور جس طرح یہ کہانیاں ہیں جن پر تبصرہ کیا ہے، زیادہ شامل کریں۔“

پاکپتن شریف سے جناح پیرزادہ کی دل گرفتگی ”سردیوں کی اس اداس کر دینے والی رات جب میرا گاؤں محوِ خواب ہے، میں فروری 2015ء کا جاسوسی ڈائجسٹ ہاتھ میں لیے دل گرفتہ ہوں یادیں ہیں کہ امڈی چلی آرہی ہیں۔ جاسوسی سے رشتہ بہت پرانا ہے مگر نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ اب اجنبی ہو چلا ہے۔ شاہد حسین صاحب کے بعد اب علی سفیان آفاقی کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں سلسلہ وار، میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے۔“ (ہمیں آپ کے خیالات کا احترام ہے لیکن جب چراغ بجھتے جارہے ہوں اور ہر طرف اندھیرا ہو تو کیا کیا جائے۔ دستیاب

میں سے بہترین کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے)

بشیر احمد بھٹی بہاولپور سے لکھتے ہیں "جناب علی سفیان آفاقی کی رحلت کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ مرحوم بڑے خوب صورت انداز میں فلمی دنیا کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ فلمی دنیا کا ماضی ایک خوب صورت اور اچھوتا دور تھا۔ مایا جال کا پہلا حصہ پڑھا۔ فروری کے شمارے میں یہ کہانی ختم ہوئی۔ ہر ماہ جاسوسی میں انگریزی ناول ضرور شائع کیا کریں۔"

محمد انعام کی لودھراں سے پہلی کوشش "تین فروری کو جاسوسی ہاتھ میں آیا تو سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی جس میں شہزی دشمنوں کو جُل دے کر بچ نکلا۔ دشمنوں کے جانے کے بعد بیگم صاحب نے اپنے ماضی کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد پہلا رنگ پڑھا جو بہت اچھا تھا۔ پھر دوسری چال ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے لکھا ہوا سرورق پڑھا تو ٹائم گزرنے کا پتا نہ چلا۔ اس کہانی میں مارخور کا ذکر تھا جو پاکستان کا قومی جانور ہے لیکن اس کا کردار کہانی میں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مختصر کہانیوں میں خونی لاٹری پڑھی جو کہ بہت پسند آئی کیپٹن نے بڑی ہوشیاری سے قاتل کا پتا لگایا۔ چینی نکتہ چینی میں زویا اعجاز کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ قاسم رحمان کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ باقی سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ انکل جی جاسوسی کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہا ہوں اس لیے امید ہے کہ اس محفل میں نذرانہ خلوص کی جگہ مل جائے گی۔" (یقیناً یہ آپ ہی کے لیے ہے)

سرگودھا سے اسد عباس کی رائے "8 فروری کو جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ سرورق موسم کے لحاظ سے کچھ لیٹ تھا، تاہم اچھا لگا۔ دوستوں کی محفل میں حاضری دی۔ احسان سحر ابتدائی تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ مبارک باد۔ زویا اعجاز زیادہ تر دوسروں کے تبصروں کا پوسٹ مارٹم کرتی نظر آئیں۔ مظہر سلیم صاحب اپنے روایتی انداز میں تبصرہ کرتے نظر آئے۔ مالاکنڈ سے صبا گل نے شاید رسالہ پڑھے بغیر ہی تبصرہ لکھ دیا تھا۔ بہرحال محترمہ سے گزارش ہے کہ اگر کہانیوں پر تبصرہ لکھنا ہو تو اس کے لیے رسالہ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ دیگر تبصروں میں ہمایوں سعید اور طاہرہ گلزار صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی آخری جواب سے انصاف کیا، موضوع تو پرانا تھا۔ تاہم کہانی گزارہ کر ہی گئی۔ مایا جال، پچھلی قسط کی نسبت اس بار بور رہی۔ کچھ کردار کہانی میں بلاضرورت ہی ٹھونسے گئے تھے۔ پانچواں سوار، لانچ میں ڈوبی ہوئی ایک عبرت آموز کہانی تھی۔ آسکر کا انجام بھیانک ہوا۔ تاہم جینی پھر بھی فائدے میں رہی۔ مختصر کہانیوں میں، مفرور اور کوپ کلر پسند آئیں۔"

بدھ موڑ، بگرام سے کاشف عبید کاوش کی کوشش "جاسوسی اس بار 9 تاریخ کو ملا۔ سرورق اس بار ذرا بھی جاسوسی کا ترجمان نہیں تھا۔ خیر فہرست میں پہنچے۔ بس فہرست سو سو تھی۔ زویا اعجاز کے قلم میں واقعی جادوگری ہے۔ مظہر سلیم، رحیم یار خان سے خوشبو بکھیر رہے تھے۔ محمد صفدر معاویہ صاحب شہرِ قائد سے پہلا خط لکھ رہے تھے۔ اسی شہر سے انیکی بھی دل کی خوش خبری سنا گئیں۔ بلقیس خان کے مطابق خط کے ساتھ حاضری تھی۔ عرفان راجہ راولپنڈی سے جبکہ ماریہ جہانگیر کبیروالہ سے تین سال پرانا تعلق یاد دلا رہی تھیں۔ ارے اتنے سالوں کہاں گم رہیں آپ؟ سرورق کی پہلی کہانی آخری جواب کاشف زبیر صاحب نے بہت اچھی لکھی۔ دوسری کہانی عبدالرب بھٹی نے بھی اچھی کہانی لکھی۔ جواری کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جناب پلیز یہ جلدی سے ختم کریں۔" (آپ کی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے، پلیز دوبارہ کوشش کیجیے)

جام پور سے عثمان ارشد کی سرشاری "سب سے پہلے آپ کی پہچان اور یادداشت کی داد دیتا ہوں۔ خوب پہچانا ہم سمجھے تھے کہ آپ ہم سے خفا ہیں اور اس لیے خط شائع نہیں کریں گے۔ مگر ہم غلط تھے اس لیے معافی چاہتا ہوں۔ جناب علی سفیان آفاقی کے انتقال کا دکھ ہے اور ان کی بخشش کے لیے دعاگو ہیں۔ باقی خطوط میں احسان سحر کی بات سے رضامند ہوں۔ واقعی زویا اعجاز کمل کر تبصرہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ باقی سب ٹھیک تھے۔ آپ سے ایک اور شکایت تھی کہ ہمارے ہاں اسٹال پر جاسوسی بڑی دیر سے آتا ہے، اس دفعہ بھی جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ ہمیں پھر زیادہ کہانیاں پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ گزارش ہے کہ اس معاملے پر غور کریں۔ کہانیوں میں تو سب سے پہلے سرورق کی کہانیوں پر گئے۔ آخری جواب، خواب کی طرح تھی۔ اس میں زیادہ مزہ نہ آیا۔ دوسری چال خوب تھی۔ حماد پر ہمیں پہلے ہی سے یقین تھا کہ یہی ہے وہ جس کی تلاش میں ہیں ہم۔ اس کے بعد نسیم انجم پر آئے۔ ہائے جمشید تمہیں تیری قسمت پر رونا آتا ہے۔ کوپ کلر میں پیٹر بے چارے نے جان کا نذرانہ دیا۔ خونی لاٹری بھی خوب تھی۔ ابھی مایا جال پر پڑے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ اگلے جاسوسی ملنے تک ہم اس کو ختم کر چکے ہوں گے۔ ایک اور بات جو کرنی تھی، وہ یہ کہ مغرب کی کہانیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمیں اپنی کہانیوں پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ جب سے جاسوسی کے گرویدہ بنے ہیں سلیم انور کو مغرب میں ہی پایا ہے۔ اس خط کے ساتھ میں نے ایک کترن بھی ارسال کی ہے جو خط کے پیچھے ہے اس رسالے میں جگہ دیں۔" (کترنیں علیحدہ صفحے پر تحریر کر کے ارسال کیا کریں، شکریہ)

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی حیرانی "ماہ فروری کا جاسوسی 3 تاریخ کو کراچی میں ملا۔ سرورق کو بہت خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو احسان سحر کو غیر معمولی تبصرہ کرتے پایا۔ لاہور سے زویا اعجاز نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ لالہ مظہر سلیم نے بھی خوب صورت اور دھیمے الفاظ میں تبصرہ مرتب فرمایا، ویلڈن۔ انیکی کو مبارک ہو تبصرہ بھی اچھا ہے۔ ہمایوں سعید بھائی بھی خوب طنز و مزاح کر گئے۔ ماریہ جہانگیر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لگتا ہے طاہرہ گلزار باجی نے سارا غصہ نکال دیا ہے۔ صبا گل! آپ کو کہانی پر اعتراض ہے تو ٹھیک لیکن اس طرح بکواس لکھنا عجیب سا لگا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ سب سے پہلے مایا جال سے کہانیوں کی ابتدا کی۔ جیک اینڈ گروپ نے اچھا جال بچھایا لیکن مارک اور جینی نے آخر میں سب کو مات دے دی۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی ساری قسط بیگم صاحب کے بچے دلوں میں گزر گئی۔ جمال دستی کی کوپ کلر میں پیٹر نے اپنی جان دے کر واقعی کئی لوگوں کو بچا لیا، کیا خوب پھنسایا میک ملن کو۔ تختہ کام بھی بس گزارہ کر گئی۔ عکسِ فاطمہ کی گہری سازش روہنگ اور جھانگ... جس

طرح حقائق اور واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے قاتل تک جا پہنچے، قابلِ تحسین ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی میں کاشف زبیر آخری جواب لے کر آئے۔ پاکستان دشمنی کی آڑ میں پیش کی گئی تحریر نے ثابت کر دیا کہ کوئی بھی دشمن کہیں سے بھی تعلق رکھتا ہو، ان کا حال سمیرا اور ریان جیسا ہی ہوگا۔ سرورق کا آخری رنگ عبدالرب بھٹی کے قلم سے لکھا گیا۔ حماد نے جس طرح انتقام لیا، وہ بہت بھیانک تھا، پڑھ کر ہی جھرجھری سی آگئی۔"

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی دل آزاری "5 فروری کو جاسوسی ملا۔ ٹائٹل مکمل جاسوسانہ انداز لیے ہوئے تھا۔ صنفِ نازک کی مسکراہٹ نے تو دل ہی موہ لیا۔ انکل آج کل صنفِ مخالف پر بڑے مہربان ہیں۔ دو تین صنفِ مخالف ضرور ٹائٹل کی زینت بنتے ہیں۔ اپنی محفل میں پہنچے تو افسوس ناک خبر نے استقبال کیا۔ علی سفیان آفاقی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے اور 16 جنوری کو میری بڑی بہن ہمیں چھوڑ گئیں اور داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان کی کمی کوئی بھی پوری نہیں کر سکتا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا کرے) انکل کی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ احسان سحر کا تبصرہ جان دار تھا۔ عرفان راجا یاد رکھنے کا شکریہ۔ زویا اعجاز کا تبصرہ بھی خوب صورت تھا۔ الیلیٰ کا تبصرہ اچھا لگا۔ محمد ہمایوں سعید! یہ آپ نے مجھے کس سے ملا دیا۔ میری زندگی میں نہ جانے کب سکون آئے گا اللہ ہی جانے یا بشریٰ افضل خاموشی سے دنیا ہی چھوڑ جائے گی بہن کی طرح۔ (اللہ نہ کرے) سب ساتھی میرے لیے دعا کریں۔ جاسوسی میرا بہترین دوست ہے، ہر بات میں شیئر کر کے ریلیکس ہو جاتی ہوں۔ (ہمارے لیے آپ کے الفاظ باعثِ افتخار ہیں) نسیم انجم خوب صورت کہانی تھی۔ منظر امام نے اپنی بات خوب صورت پیرائے میں لوگوں تک پہنچا دی۔ کوپ کلر میں پیٹر نے اپنی جان دے کر اس کی لاعلمی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تشنہ کام خلائی کہانی تھی، دماغ نے کمپیوٹر کو مات دے دی۔"

طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے "جاسوسی ملتے ہی سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور علی سفیان آفاقی کی رحلت کی خبر پڑھی۔ آفاقی صاحب بہت نفیس، شائستہ اور ملک و قوم سے محبت کرنے والے انسان تھے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ کہانیوں کی فہرست میں پہنچے جہاں عبدالرب بھٹی، کاشف زبیر، مریم کے خان، احمد اقبال، منظر امام اور جمال دستی کے نام تھے تو دل سے مدیرِ اعلیٰ اور ادارے والوں کی اس کاوش کے لیے خلوص کے ساتھ دعا نکلی۔ چلتے ہیں اب چینی تکتہ چینی کے دوستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے۔ پہلے نمبر پر میرا کیوٹ سا بھائی احسان سحر مبارکاں، مبارکاں۔ بھائی جاسوسی کو ہاتھ میں لے کر تو پتھر دل بندہ بھی مسکرانے لگتا ہے۔ مسز زویا اعجاز کا خط کافی دلچسپ اور شاندار لگا، ویلڈن زویا جی یہ اور بات کہ میرا ذکر نہیں کیا۔ منظم سلیم جی! آپ تو اب بھی خود کو بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے الفاظ لے کے اپنے نام سے دوسروں کو متاثر کرنا اتنی اچھی بات بھی نہیں ہے۔ ہائے محمد صفدر معاویہ بھائی اب آپ کراچی چلے گئے ہو؟ الیلیٰ جی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہرا بھرا اور نیک بندہ میرا اپنا ہے۔ اللہ اس ڈھیر کو ہمیشہ شاد رکھے اور دشمن کو جلائے رکھے، آمین۔ الیلیٰ جی! شادی مبارک ہو۔ بلقیس خان ڈیئر اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کو صحتِ کاملہ عطا کرے، بہن کے سر کا صدقہ دیں، ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ ایم کے احساس بھائی! اتنا مختصر خط۔ صبا گل جی آتے ہی الفاظ کے اتنے دھماکے، پلیز کاشف زبیر کی کہانی پر آپ کا تبصرہ دل کو دکھی کر گیا۔ کاشف زبیر ایکشن کے بادشاہ ہیں۔ جمال دستی کی مختصر کوپ کلر اچھی تحریر تھی۔ مجرم اپنی نادانی کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ مجرم آخر مجرم ہوتے ہیں۔ قانون سے بچ نہیں سکتے۔ صوفیہ شکیل کی تشنہ کام بس خلائی مخلوق کی کوئی انگلش مووی لگی۔"

اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کی آمدِ بہار "اس دفعہ جاسوسی ہمیں پانچ تاریخ تک دستیاب ہو چکا تھا۔ سرورق موسم کی مناسبت سے بہت دلکش لگا۔ چینی تکتہ چینی میں وارد ہوئے تو علی سفیان آفاقی صاحب کی وفات کا سن کر ادبی و صحافتی دنیا کے عظیم نقصان کا ادراک ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کریں۔ آمین۔ ابتدائی تبصرہ احسان سحر کا خوب رہا۔ زویا اعجاز کافی مربوط تبصرہ لیے حاضر ہوئیں۔ اگلا تبصرہ برادر منظم سلیم کا تھا جو شاید جلدی میں تھے اس لیے اختصاریے پر ہی اکتفا کیا۔ الیلیٰ آپ نے شیکسپیئر اور نیوٹن کے حالاتِ زندگی جاسوسی کی تاریخ میں ایک کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ بیب گرنے سے براہِ راست متاثر نیوٹن ہی ہوا تھا۔ عبادت کاظمی پڑوسن سے آگے جہاں اور بھی ہیں اس لیے میں کسی نئی داستاں کی تلاش میں ہوں۔ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے والی بات۔ ہمایوں سعید صاحب میں نے تو خطرہ ٹال ہی لیا مگر بہت سارے لوگ ہنوز خطرات کی زد میں ہی نظر آ رہے ہیں۔ ماریہ جہانگیر، رزاق شاہد کوہلر، مرتضیٰ احتشام اور تمام نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید۔ محترمہ صبا گل صاحبہ، میں آپ کے خلوص کا انتہائی مشکور ہوں۔ آپ کی ستائش میری حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ میں مزید لکھتا رہوں۔ اور بھی جن دوستوں کو میرا تبصرہ پسند آیا، ان سب کا شکر گزار ہوں۔ بلقیس خان اللہ پاک آپ کی بہن کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائیں۔ حالاتِ غیر حاضرہ پر آپ کی خاصی گرفت ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے آج کل کی مشہور فلمی ٹرم Pre Sequal کو شروع کر دیا مگر اس میں کافی دلچسپی کا سامان ہے۔ خاص طور پر کمیل اور لئیق شاہ کا ماضی۔ دیکھتے ہیں لئیق شاہ اور کمیل دادا کے مابین کون سی ڈوئیل کھیلی جاتی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ کاشف زبیر نے بہت عمدہ لکھا۔ پچھلے ماہ شاہی اور تیمور کے بور سے ایڈونچر کی شکایات کا خوب ازالہ کیا۔ دوسرا رنگ بھی قدرے بہتر تھا مگر زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔ ابتدائی صفحات کی سوغات امجد رئیس کی مایا جال کا دوسرا حصہ مزہ دے گیا۔ تھرل، ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانی۔ رشین مافیا، سی آئی اے اور جینی اور مارک جیسے عام شہریوں کو ان سے برسرِپیکار دیکھ کر صحیح معنوں میں لطف دوبالا ہو گیا۔ منظر امام کی نسیم انجم ہماری ذہنی اور معاشی صورتِ حال کی کیا خوب صورت عکاسی کی۔ مزاح کے پیرائے میں ایک تلخ سچائی۔ مریم کے خان کی پانچواں سوار بھی ایک عمدہ کاوش تھی۔ اس طرح کی کہانیاں ہی جاسوسی کے معیار کی حامل ہیں۔ جمال دستی کی کوپ کلر مختصر مگر بہترین کہانی تھی۔ جبکہ صوفیہ شکیل صاحبہ کی سائنس فکشن کہانی تشنہ کام زیادہ جاندار نہیں لگی اور جواری کی طرف طبیعت مائل نہیں ہو سکی۔"

اسلام آباد سے ماریہ خان کے وسوسے و اندیشے "ہر بار تبصرہ لکھتے وقت اندیشے دل کو ہلائے رکھتے ہیں کہ نہ جانے خط منزلِ مقصود تک پہنچا بھی

ہے یا نہیں، فروری کے شمارے کے ساتوں صفحات کو گہری نظر سے کھنگالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یا تو ہمارے خط کو اس قابل نہیں سمجھا گیا یا پھر وہ تاریک راہوں میں گم ہو گیا۔ (یہ زیادہ مناسب ہے) فروری کا جاسوسی چھ کو دستیاب ہوا۔ سرورق حسب سابق اچھا لگا اور خوش آئند بات یہ کہ سرورق کے رنگ کمال کے ہو گئے۔ (اچھا! شکریہ) اداریے میں معروف قلم ساز اور صحافی علی سفیان آفاقی کی رحلت کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا، مرحوم کی تحریریں ہم ترجیحی بنیادوں پر پڑھتے تھے، اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ خطوط میں ابتدائی تبصرہ احسان سحر کا تھا۔ زویا اعجاز کے قلم کی جادوگری کے حوالے سے کچھ کہنے کے لیے لفظ بہت چھوٹے محسوس ہوتے ہیں۔ مظہر سلیم نے اپنے تبصرے میں سانحہ پشاور کے حوالے سے خوب لکھا۔ ہمایوں سعید! خوش فہمیاں پالنا اچھی بات ہے مگر انگور کھٹے ہیں، والی بات تو آپ نے سنی ہو گی۔ باقی دوستوں کا شکریہ جنہوں نے ہمارے تبصرے کو پسند کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مایا جال پڑھی، پل پل رنگ بدلتی، جینی اور مارک کے جذبوں کی عکاس اس داستان کو امجد رئیس نے بہتر انداز میں منطقی انجام تک پہنچایا، جواری کی موجودہ قسط، سابقہ اقساط کی نسبت تیز رفتار رہی۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر نے پرانے موضوع پر آخری جواب کے عنوان سے نئے انداز میں تحریر رقم کی جو پسند آئی۔ سرورق کا دوسرا رنگ انسان اور حیوان میں مشترک درندگی کا ہلا دینے والا پُر انتقام کھیل دوسری چال سپر ہٹ رہا۔ آوارہ گرد میں بالآخر بیگم صاحبہ اور ممتاز خان کے ماضی سے پردہ ہٹ گیا، بہت ہی پُرتجسس اور دلچسپ قسط تھی۔“

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی فرمائش ”جاسوسی 13 کو ملا۔ جناب علی سفیان آفاقی کی وفات کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے۔ ہم محفل میں ہی نہ تھے حتیٰ کہ بلیک لسٹ میں بھی جگہ نہ ملی۔ احسان سحر مسکراہٹ پر لیکچر دیتے نظر آئے۔ یار آج کل کی زندگی میں مسکراہٹ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بڑا تحفہ ہے۔ وہ الگ بات ہے۔ جواری میں نورین کی موت اور روبی کے اور سلیم کے مابین نزدیکیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ آخری جواب میں کاشف زبیر نے خوب لکھا۔ دوسری چال بھی اچھی تحریر تھی۔ غلام قادر نے جنوری میں ایک اچھی تحریر لکھی تھی، مجھے امید ہے کہ وہ آتے رہا کریں گے۔ (ہاں، اگر ان کی سستی نے اجازت دی) محمود احمود مودی، نجمہ مودی، غلام قادر، کاشف زبیر، احمد اقبال، نواب انکل یہ لوگ آخری اور ابتدائی کہانیوں کے حقیقی ہیرو قلم کار ہیں۔ پلیز ان سب کو جاسوسی میں حاضر رکھا کریں۔“

لیہ سے صنوبر گل خان ایڈووکیٹ کی باتیں ”جاسوسی سے میرا ایک طویل اور خاموش رشتہ ہے جسے آج پہلی بار زبان و الفاظ میسر آئے ہیں۔ یہ رسالہ نہیں سات رنگ کی دنیا ہے جس کے ہر رنگ کے ساتھ ہزار رنگ ہیں۔ دیس دیس کی تہذیب و چلن کو عیاں کرتا ہوا صحیح، غلط کو ذہنوں پر متعین کرتا ہوا ایک ایسا تربیتی ادارہ جو فکر کی دعوت دیتا ہے، انسان کے اندر باہر کے سربستہ رازوں کو منکشف کرتا ہے۔ پستی سے بلند کرداری کی طرف گامزن کرنے والا بہترین استاد، ضمیر کو جھنجوڑ کر جاگنے اور جاگتے رہنے پر مجبور کرتا ہوا ایک عظیم رہبر ہے۔ کردار سازی میں انسان کو بہترین ادب کی اشد ضرورت ہے اور وہ ضرورت یہ رسالہ بااحسن وخوبی پوری کر رہا ہے۔ آپ کو شاید یہ عجیب لگے کہ میں انسان کی قدر اس وقت زیادہ کرتی ہوں جب مجھے معلوم ہو جائے کہ اسے ادب سے لگاؤ ہے، میری نگاہ میں اس کی بہت عزت بن جاتی ہے جو جاسوسی کا قاری ہو۔ میں نے اس رسالے سے بہت سیکھا ہے۔ اپنی ذات کے اندر بڑی تبدیلیاں کی ہیں ورنہ تو میں ایک عام سی بے علم و عمل زندگی جیتی چلی جاتی حتیٰ کہ انجام قریب آ جاتا۔ آپ سب کی پُرخلوص ادبی خدمات کے لیے ایک تعظیمی سلیوٹ۔“ (اب تو آپ شاگرد سے استاد بن گئی ہیں۔۔۔ اس لیے تبصرہ نگار بن کے حاضر ہونے کی اہل ہیں)

مظہر سلیم، رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ”فروری کا جاسوسی ڈائجسٹ پانچ تاریخ کو جلوہ افروز ہوا۔ غم غلط کرنے کے لیے جاسوسی کا سہارا لیا۔ سرورق کافی سے زیادہ اچھا لگا، برف زاروں میں اسکیٹنگ کرتا مرد اور خاتون کی معنی خیز مسکراہٹ سے تاثر ملتا تھا کہ سرورق کے رنگ کمال کے ہوں گے۔ اداریے میں علی سفیان آفاقی کی وفات کے بارے میں پڑھ کر ہم ملول اور افسردہ ہو گئے۔ مرحوم سے فیملی میگزین کے آفس میں دو بار ملاقات یادگار رہی تھی۔ اللہ پاک آفاقی صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ خطوط میں احسان سحر اور زویا اعجاز کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں ابتدائی صفحات کی کہانی مایا جال کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا، گلین میڈ کی پُرتجسس تحریر کو اردو کے قالب میں ڈھال کر امجد رئیس نے ترجمے کا حق ادا کر دیا۔ جواری میں احمد اقبال نے دلچسپی پیدا کر دی ہے تاہم رمضان نامی شخص کے خط میں نورین یا فاطمہ کی موت کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ آوارہ گرد میں بیگم صاحبہ کا ماضی سامنے آ گیا ہے جو کہانی میں دلچسپی کا سبب بنا۔ سرورق کے رنگوں میں پہلے رنگ، آخری جواب نے اچھا تاثر چھوڑا، کاشف زبیر کا انداز بیاں پرانے موضوع میں بھی جدت پیدا کر دیتا ہے۔ دوسری چال ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی یادگار تحریروں میں سے ایک تھی۔“

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی نیک خواہشات ”جاسوسی اس بار کچھ تاخیر سے ملا۔ سرورق پر کافی سردی تھی اور اس ڈر سے کہ رسالہ پڑھنے سے پہلے ہی نمونیا نہ ہو جائے، ہم نے نکتہ چینی کے گرم ماحول میں پہنچنے کا قصد کیا۔ اداریے میں علی سفیان آفاقی کی جہان فانی سے کوچ کر جانے کی خبر پڑھی۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور ان کے عزیز و اقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ احسان سحر کی باتیں اچھی تھیں۔ زویا اعجاز کا تبصرہ بھی حسب سابق تھا۔ کراچی سے انیلی کو ایڈوانس میں شادی کی مبارک باد۔ بلقیس خان کا تبصرہ ایک بار پھر سر کے اوپر سے گزرا۔ پتا نہیں کس کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔ محمد قاسم رحمان! ایکشن کے بنا بھی کبھی اسٹوری معیاری ہو سکتی ہے؟ ذرا سوچیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ بیگم صاحبہ اور باقی کرداروں کا ماضی پڑھنے کو ملا۔ ماضی کے سین میں چونکہ شہزی صاحب نہیں تھے تو پھر مار دھاڑ اس طرح تو نہ ہوئی مگر ڈپلیکیٹ لئیق شاہ نے کافی حد تک اصل ہیرو کی کمی پوری کی۔ جواری میں احمد اقبال کیا کرنا چاہتے ہیں مجھ سے بالاتر ہے۔ آخری جواب، کاشف زبیر کے قلم سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کہانی کس طرح کی ہو گی اور پھر وہی سلسلہ کہ شروع کی تو ختم کرنے کو دل نہیں چاہا۔ دوسری چال، عبدالرب بھٹی نے چلی اور ایک انتقامی جذبے کے

شفاخانے میں تین لوگ جان سے گئے۔ کہانی ہر لحاظ سے مکمل تھی اور بالکل آخر میں اصل صورتِ حال واضح کی گئی۔ پانچواں سوار میں مریم کے خان نے مغربی معاشرے کی ظاہری شرافت و تہذیب کے لبادے کو تار تار کر کے ان کا اصل چہرہ بے نقاب کرنے کی سعی کی اور کامیاب رہیں۔ دھوکا میں یہ سب سوچا بھی نہ تھا جو ہو گیا۔ ہم تو نکسن یا کار لائل میں سے ایک کو قاتل سمجھ رہے تھے مگر وہ سب آخر میں معلوم ہوا کہ یہ میگی میڈم کی کارستانی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کرکٹ کی عالمی جنگ کا آغاز فروری سے ہو چکا ہے اور پاکستان اپنا اولین مقابلہ روایتی حریف سے ہار بھی چکا ہے مگر پھر بھی ہم سب کی نیک خواہشات پاکستانی کھلاڑیوں کے ہمراہ ہیں۔ تاہم دعا کے ساتھ ساتھ دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔“

محمد مرتضیٰ احتشام کا جھنگ سٹی سے اظہارِ عقیدت ”4 فروری بروز بدھ صبح 10 بجے کے قریب معلوم ہوا کہ جاسوسی شاپ پر آ چکا ہے۔ سیدھا شاپ پر پہنچے اور ڈائجسٹ خریدا۔ سب سے پہلے اپنے خط کو دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ سیدھا گھر گیا اور ماں جی کو اپنا خط دکھایا۔ خط پڑھتے ہوئے ماں جی کے چہرے پر جو خوشی کی قوسِ قزح کو دیکھا تو جاسوسی پر بے حد پیار آیا۔ سرورق کی سب سے خوب صورت چیز لڑکی کی مسکراہٹ تھی۔ اپنی پسندیدہ محفل میں جا پہنچے اور احسان سحر کو آغاز میں موجود پایا۔ زویا اعجاز کا تبصرہ بھی بھرپور تھا۔ مظہر سلیم اور صفدر معاویہ بھائی آپ کے تبصرے بھی بہت جاندار تھے۔ الیلی صاحب! آپ کو بہت بہت شادی کی مبارک باد۔ محمد ہمایوں سعید آپ کے دل میں کھوٹ نہیں ہے جو بھی کہتے ہو بندے کے منہ پر کہتے ہو اور یہی بات آپ کی سب سے اچھی لگتی ہے۔ اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز، تفسیر عباس بابر، ماہتاب گل اور ماہا ایمان کی کمی محسوس ہوئی جہاں بھی ہیں، محفل میں آ کے حاضری دیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مایا جال پڑھی۔ حقیقت میں یہ کہانی ہمارے لیے مغرب کے خزانوں سے نئے سال کا ایک پُرفسوں تحفہ تھی۔ انتہائی زبردست پلاٹ، تھرل، ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانی مدتوں یاد رہے گی۔ مغرور کہانی میں براؤن کے کردار نے بہت متاثر کیا۔ نشہ کام کا پلاٹ کچھ عجیب و غریب سا تھا۔ آوارہ گرد قسط نمبر 10 دل میں جگہ بنانے میں کامیاب رہی۔ منظر امام کی کہانی، نسیم انجم اپنے اندر ایک اخلاقی سبق لیے ہوئے تھی۔ منظر امام صاحب ہمیشہ منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔ گہری سازش، ایک شاہکار کہانی تھی۔ دھوکا میں تنویر ریاض الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے نظر آئے۔ خونی لاٹری میں کیپٹن بریڈ نے انتہائی کامیاب داؤ کھیل کر مجرم کو بے نقاب کیا اور رقم کو حق دار کے پاس پہنچانے کا انتظام بھی کر دیا۔ پانچواں سوار مریم کے خان، بہت ہی زبردست انتخاب تھا۔ آسکر جیسے لوگوں کا انجام ایسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ سرورق کے دونوں رنگ پڑھے۔ کاشف زبیر کی منظر نگاری کی وجہ سے پہلا رنگ دوسرے رنگ پر بازی لے گیا۔ اس بار تمام کہانیاں بہت دلچسپ، مزیدار، ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور تھیں۔ ادارے کو تہِ دل سے مبارک باد۔“

علی پور جتوئی سے ہارٹ کیچر کے دل کی باتیں ”سحر فروری جب ہم ... نیند سے ایک کے بعد دوسری آنکھ کھول کر اٹھ بیٹھے تو سیل فون میں ہمارے اسیرِ زندان ہونے کی دکھ خبری پڑھ کر ہم فورپائی (چارپائی) سے گرتے گرتے بچے۔ مشترکہ انکل جان کو ہمارے بے لاگ و بے باک سندیسے دل میں سے شاید نہیں یقیناً دو لفظ ہارٹ کیچر ہی قابلِ اشاعت محسوس ہوئے۔ چلو کوئی گل نہیں ہم نے فوری سے فوراً خالی شکم کو کچھ عدد سیب اور مسمی کے جوس سے دلاسا دیا اور نئی امنگ و ترنگ کے جذبوں کے سنگ سنگ گنگناتے ہوئے حصولِ جاسوسی کے لیے کتاب شاپ کی جانب خراماں خراماں چل پڑے۔ بزم نکتہ دان کو فی النائم (فی الوقت) تاتا بائے کرتے ہوئے اوّل چشمۂ ادب سے سیر و سیراب ہونے کی ٹھانی۔ آوارہ گرد ہماری طرف سے بیسٹ ایوارڈ حاصل کرنے میں ناکامیاب نہیں رہی۔ میڈم زہرہ بانو اس لحاظ سے ڈبل خوش نصیب ہیں کہ وہ دو کزیل مرد گمبیل دادا اور لئیق شاہ جیسے دیوانوں کے دل کی دیوی بن گئی ہیں۔“

میانوالی، کندیاں سے نادر سیال کے مشورے ”جاسوسی 5 فروری کو ہلکی دھوپ میں خوش گوار موسم کو ملا۔ اس بار ٹائٹل گرل بہت دلکش حسین مسکراہٹ لیے ہوئے تھی۔ اب رخ کرتے ہیں اپنی چھوٹی سے حسین دنیا کی طرف یہاں سب سے پہلے احسان سحر پر نظر پڑی۔ جب آگے قدم بڑھائے تو ڈپٹی اسپیکر زویا اعجاز پر نظر پڑی تو سمجھ گئے کہ بیٹا اپنی خیر مناؤ، اس بار آپ پارلیمنٹ پر حاوی ہو گئی سب کو اکھاڑے کی دھول چٹا دی؟ الیلی کراچی آپ کو آخرکار نائم مل ہی گیا مبارک ہو منہ میٹھا کروانا مت بھولنا ہم دوستوں کا۔ بلقیس خان ہم کو بھی حیرت ہوئی تھی آپ کو دیکھ کر۔ ماریہ جہانگیر صاحب آپ کی پہلی جسارت اچھی لگی، ویلکم۔ ہمایوں سعید چاچا آپ نسوار کے بغیر بھی تبصرہ لکھ سکتے ہو۔ طاہرہ گلزار یہ عینک کا کمال نہیں میری آنکھیں ہی ایسی ہیں کہ فرق جان سکیں۔ صبا گل اتنے عرصے بعد آئیں اور وہ بھی دوستوں کو کھری کھری سنا کے چلی گئیں آپ۔ سید عبادت کاظمی آپ کا بہت بہت شکریہ کسی اور دوست کو تو اللہ نے توفیق نہیں دی۔ محمد قدرت اللہ نیازی اور ماہا ایمان آپ کہاں گم ہو؟ عرفان راجہ، مظہر سلیم، محمد مرتضیٰ احتشام ان سب کے تبصرے اچھے تھے۔“

سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ کی نیو انٹری ”جاسوسی سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ یعنی اس وقت کا جب میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے پیپر ہو رہے تھے اور مجھے جاسوسی ڈائجسٹ ملا اور میں رات کو پیپر کی تیاری کے بہانے جاسوسی پڑھ رہا تھا۔ تب کسی مخبر نے ابو جی کو یہ اطلاع دے دی کہ تیاری کی آڑ میں جاسوسی پڑھا جا رہا ہے اور پھر ابو جی نے اسی رات ریڈ مار دی اور پھر جو حال میرا ہوا، میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے اور پھر جاسوسی سے باہر ملاقات ہونے لگی جو آج تک ہو رہی ہے جب میں نے محفل میں قارئین کے تبصرے دیکھے تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور محفل میں حاضر ہو گیا۔ اب دیکھتے ہیں ہمیں کتنے دوست خوش آمدید کہتے ہیں۔ (تمام) اب تھوڑا تبصرہ ہو جائے۔ ابتدائی تبصرہ احسان سحر کا دیکھا احسان بھائی مبارک ہو، بلقیس خان! ہم بھی پہلی بار حاضر ہو رہے ہیں، ہتھ ہولا رکھیں۔ خدا کرے آپ کی بہن جلد صحت یاب ہو جائے۔ نادر سیال بھائی! میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے کالج کے گیٹ سے بھاگتے ہوئے۔ باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔“

مشال اور نوال کی جہلم سے تشریف آوری ”جیسا کہ آپ کو بتایا تھا کہ ہمیں جاسوسی بہت لیٹ ملتا ہے اس لیے ہر ماہ حاضری نہیں دے سکتی۔ ٹائٹل اس بار ہمیشہ کی طرح ذاکر انکل کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میانوالی سے احسان سحر کو مبارک باد۔ زویا اعجاز آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ محمد صفدر معاویہ یاد آوری کا شکریہ۔ الیلی جی ہماری ناک اونچی ہوگئی۔ جاسوسی اور آپ سب دوستوں کی وجہ سے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی مایا جال پڑھی جو کہ ناقابلِ فراموش تھی۔ پہلا سرورق آخری جواب پڑھ کے مزہ آیا اگر میرا ابھی پکڑی جاتی تو زیادہ اچھا تھا۔ دوسرا سرورق بھی زبردست تھا۔ عبدالرب بھٹی بہت کمال کے رائٹر ہیں۔ میری خواہش ہے کہ طاہر جاوید مغل للکار جیسی کوئی کہانی پھر لکھیں۔ چھوٹی کہانیوں میں مغرور، کوپ کلر، تشنہ کام جو کہ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ کیا کہانی تھی۔ نسیم انجم کا اینڈ پڑھ کر مزہ آیا۔ جواری ہم نے بھی پڑھی نہیں باقی چھوٹی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

واہ کینٹ سے بلقیس خان کا اظہارِ تشکر ”فروری 2015ء کا ٹائٹل پچھلے کئی ٹائٹلو پر سبقت لے گیا۔ ذاکر جی! ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنادیا کہ ہماری تحسین اور ستائش نے آپ کے فن کو 14 چاند لگادیے، وہ بھی چن 14 ویں کے۔ ادارے نے علی سفیان آفاقی کی رحلت کی خبر دی۔ ہم سب نے اپنے اپنے وقت پر جانا ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ احسان سحر میری ہمسری مبارک ہو، نئی بہار نئی برتری مبارک ہو۔ زویا اعجاز! خوچہ کو مالوم نہیں امارا سمجھ کا خانہ خالی اوتا اے۔ اب بتاؤ کون ساوالا؟ مظہر سلیم! آپ کیا کاظمی صاحب سے آفس میں فائلیں لانے لے جانے کا کام کرتے ہیں۔ ہمایوں سعید! پٹھانوں کی بہادری پر کبھی شک نہ کرنا... ہم نے روسیوں کو مار بھگایا، امریکیوں کے منہ پر چیری بلاسم کا پوچا لگایا اور اب چیلے چانٹوں سے نبرد آزما ہیں۔ کیا سمجھے؟ عبادت کاظمی، سید محی الدین آپ کے سید برادر ہیں۔ ہم سید زادوں کا احترام کرنے والے ہیں آئی سمجھ۔ صفدر معاویہ، عرفان راجہ، صبا گل اور عبادت کاظمی مشکور ہوں۔ انسانی رویوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو آشکارا کرتی مایا جال کا اختتام خوش کن رہا۔ منظر امام کی نسیم انجم نے محظوظ کیا۔ مریم کے خان اچھی کاوش پانچواں سوار کی صورت لائیں۔ گہری سازش کا سیو بھی ابتدا ہی سے بے گناہ لگا۔ دھوکا میں تھوڑی سی گڑبڑ اس وقت ہوئی جب جیک، ہکسن سے ملنے جاتا ہے مگر دروازے میں ڈیوڈ کار لائل کو دکھایا گیا۔“

عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سے خیال آفرینی ”نیلگوں برفیلے پہاڑ، ایڈونچر کے شوقین کی سرفنگ، حسرت و یاس لیے تصویر بنا غریب دیہاتی اور امید کے روشن دیپ لیے مسکراتی دوشیزہ الغرض اس دفعہ سرورق مکمل جاذبِ نظر تھا۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں جناب علی سفیان آفاقی کی موت کی خبر سننے کو ملی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ احسان سحر بھی ہر بات کو سحر انگیز بنادیتے ہیں۔ تیرے قلبِ بشر میں نئی امنگیں جو پیدا ہوتی ہیں، جی زویا اعجاز ہمت کرے انسان تو وہ صلاحیتیں بھی نکھرتی ہیں جو خوابیدہ ہوتی ہیں۔ مظہر سلیم تیرے قلم کی روانی کا عجب حال دیکھا، واقعی سانحۂ پشاور جو گزرا تو سب کو بے حال دیکھا۔ سفر جو در پیش ہوا تو سارا جاسوسی ہی پڑھ ڈالا۔ کراچی کینٹ کے صفدر معاویہ نے بھی بھرپور تبصرہ کرڈالا، بڑی مدت کے بعد دیکھا ہے تمہیں تبصرے کے ساتھ، جی بہنا رومی ہے میرا تخلص اور انصاری ہے میری کاسٹ تو انیلی ہے شرمیلی ہے۔ چلو خوشیاں مناؤ، مبارک ہو تمہیں شادی کی مہندی سے اپنے ہاتھوں کو سجاؤ۔ عزت افزائی ہے بلقیس خان سرِفہرست آنا تیرا۔ محفل میں تبصرۂ جاں ہو تم اور نام کمانا تیرا، ہر دم دعائیں ہیں لبوں پر پیاری بہنوں کے لیے، شفائے کاملہ جو انہیں ملے تو سرخرو ہوجانا تیرا، انداز تو بھی کے لگتے ہیں بہت پیارے، عرفان راجہ تبصرے میں آپ نے بھی ہیں بڑے تیر مارے۔ تعلق بھی پرانا ہے شاعری سے لگاؤ بھی ہے بے نظیر، اب محفل میں شریک ہوتی رہا کرواے مار یہ جہانگیر۔ یارانِ محفل بھی ہو اور آپ کا تبصرہ بھی ہو لازمی۔ واقعی محبت بے بس کرتی ہے مائی ڈیئر عبادت کاظمی۔ شمارہ ملا اداسی ختم ہوئی آپ کی بھی ہمایوں سعید، ہاں چینی چینی بھی اچھی ہے مٹھاس لہجہ سے سب کرتے تو ہیں نادیدہ سرد ٹھنڈی ہواؤں میں جاسوسی سے تیری دل لگی۔ آخر کو ورثن ہو گئے واہ اے عبدالغفار تیری دل لگی، کسی کی بے رخی سے خودکشی کا ارادہ نہ کرنا یارو۔ اسد عباس خیال کروایسے تو نہ خود کو مارو۔ ادریس احمد خان محفل میں تیرا تبصرہ کمال تھا۔ صبا گل ایسا کیونکر دکھ ہوا، قطرے قطرے سے دریا بنتا ہے تو پھر شکایت کیسی۔ قاسم رحمان ہینڈسم مرد ہو کے شکوہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آؤ سب دوست محفل سجائیں مل کے، گلے شکوے تو ہوں گے خوشیاں بانٹیں مل کے۔ اب دیکھتے ہیں کہانیوں کا حال، سب سے پہلے پڑھی مایا جال، غم کے سائے نے اچانک حسن کی تصویر کشی کی۔ آخر جینی بھی عالمِ بے خودی میں مارک کے سینے میں چھپی، یوں مایا جال بھی خوف کے سائے میں زبردست رہی، اک نیا موڑ لے کر آ گئی ہے آوارہ گرد، بیگم ستارہ بانو زہرہ، مہر النسا و ممتاز خان مقابل ہوئے گرم سرد۔ عجیب سی رہی صوفیہ شکیل کی کہانی تشنہ کام، کوئی خاص سمجھ تو نہیں آئی یہ خلائی از بام۔ لبوں پر لامحالہ تبسم بکھیر گئی نسیم انجم۔ سنہری والے کی ٹوپی نے بھی کی بہت پرابلم۔ صلائے عام ہے یہاں یارانِ نکتہ داں کے لیے، نظر دوڑائیں تو اوپر سے نیچے تک ہیں سب نسیم انجم، منظر امام نے بھی ہنسا کے لوٹ پوٹ کردیا روحی۔ جیمی بلیک میل ہو کے نہ کرسکی انکار، چالاکی سے سب ہتھیا کے نکلی وہ۔“

پاراچنار گاؤں نورکی سے سیف حاجی حسین کاظمی کی معصوم خواہش ”عرصۂ دراز سے آپ کے شمارے کا خاموش قاری ہوں۔ جاسوسی بے حد شوق سے پڑھتا ہوں۔ ہر کہانی بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی کی دلیری بہت بھاتی ہے۔ ہمیں ایسے کردار بہت پسند ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ کا رسالہ ہمیشہ ایسے ہی شائع ہوتا رہے اور ہمیں ہر دفعہ نت نئی کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ 20 سال سے خاموش قاری تھا۔ آج کاغذ قلم تھام لیا پلیز نظر انداز مت کیجیے گا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ جواہر سعید، حیدرآباد۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ شاہدہ مختار، کراچی۔ راحت علی، میرپور خاص۔ ماہین حنیف، کراچی۔

دامِ تزویر

کاشف زبیر

بدلتے ہوئے ذہنی رجحانات... اور جدید تحقیق... تعلیم یافتہ طبقے کی مجبوری ہے... تحقیقی جبلّت کے زیرِاثر اپنے دائرۂ توجہ کو ان امور تک محدود رکھتے ہوئے جن کا احاطہ کرنا نارمل فہم انسانی کے لیے ممکن ہو... زیادہ سے زیادہ کہاں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے... یہی سائنس ہے جو ہمیں محدود دائرے سے نکال کر لامحدود وسعتوں کا پتا دیتی ہے... اُکساتی ہے... ہر روز کسی نئے تجسس کو جگاتی ہے... تجسس نام ہے جاننے کی خواہش کا... لہٰذا وہ کچھ جو جاننے کے عمل کے لیے درکار ہو... اس سے تجسس کو سروکار ہوتا ہے... واسطہ ہوتا ہے... یہ سفرِ تجسّس ہی ہوتا ہے جو ہر مفہوم... نہ نظر آنے والے رجحانات... ذہن کی موشگافیوں کو جاننے کے لیے ہر لمحے کو بے قرار و بے کل بنا دیتا ہے... نفسیات و فطرت کی ایسی ہی الجھی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف گامزن کہانی کے پیچ در پیچ اُتار چڑھائو... کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں... جن کا پورا سحر... پورا کرشمہ... تمام ترکشش... اور خوداعتمادی ان کی ذات میں سمٹ آتی ہے... ایسی ہی طلسماتی... مبہم شخصیت کے گرد گھومتی تحریر... سب اس تک رسائی چاہتے تھے... مگر وہ ہر ایک کی دسترس سے دور تھی...

جرم اور ذہانت کے ملاپ سے جنم لینے والے منصوبہ ساز ذہن کی کج ادائیاں...

سیرینا خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی قدر طویل قامت اور سڈول جسم والی سیرینا شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر مارک کارٹر صرف اس کا شوہر ہی نہیں، محبوب بھی تھا۔ کارٹر بزنس مین تھا اور اکثر تاخیر سے گھر آتا تھا۔ سیرینا اس کی مجبوری سمجھتی تھی اس لیے وہ اسے اس حوالے سے تنگ نہیں کرتی تھی۔ آج بھی وہ تاخیر کا شکار تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور انہیں نو بجے پارٹی میں پہنچنا تھا۔ لگ رہا تھا کہ وہ دیر سے پارٹی میں شامل ہوں گے۔ وہ واش روم آئی، اس نے لباس اتار کر باتھ گاؤن پہن لیا اور ٹب میں پانی کھول دیا پھر گرم اور ٹھنڈا ملا کر چیک کرنے لگی۔ سرما شروع ہوگیا تھا اور رات کے وقت درجۂ حرارت صفر کے آس پاس پہنچ جاتا تھا۔ اچانک سیرینا کو مکان کی نچلی منزل میں کوئی آہٹ سنائی دی اور وہ باتھ گاؤن کی ڈوری کھولتے کھولتے رک گئی۔ اسے پھر سے لپیٹتے ہوئے وہ باہر آئی اور سیڑھیوں سے نیچے آکر لاؤنج میں جھانکا۔ آواز پھر آئی تو وہ دبے قدموں چلتی ہوئی لیونگ روم میں آئی اور اسے علم ہی نہیں ہوا کہ عقب میں ایک سایہ سا گزرا ہے۔

سیرینا نے پُرتجسس انداز میں چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک کھڑکی کھلی نظر آئی اور ہوا سے لہراتے پردے کے ساتھ میز پر رکھا شوپیس کا گلدان نیچے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ سیرینا نے سکون کا سانس لیا۔ آواز گلدان گرنے کی آئی تھی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ کوئی مکان میں تو نہیں گھس آیا۔ اس نے کھڑکی بند کی اور گلدان کے ٹکڑے اٹھانے کے لیے جھکی تو اس کے عین پیچھے جان کھڑا تھا۔ طویل قامت اور سامنے سے اُڑ جانے والے بالوں کے ساتھ جان مضبوط نقوش کا شخص تھا اس لیے گنج پن برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ غور سے سیرینا کو دیکھ رہا تھا۔ سیرینا نے گلدان کے ٹکڑے چنے اور پلٹ کر اس کے پاس سے ہوتی ہوئی ہال وے کے ساتھ رکھے ڈسٹ بن کی طرف جانے لگی۔ وہ جان کے بالکل پاس سے گزری تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے جان کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

جان، سیرینا کی چیخ اور زمین پر گرنے کی آواز سن کر پلٹا تو اس نے دیکھا کہ سیرینا زمین پر گری ہوئی ہے اور ایک سیاہ پوش اس پر چھایا ہوا ہے۔ سیاہ پوش کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور وہ سیرینا کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے خنجر والا ہاتھ اوپر کیا

ہی تھا کہ سیرینا نے گلدان کا ایک نکیلا ہو جانے والا ٹکڑا فرش سے اٹھاتے ہوئے سیاہ پوش کی گردن میں اتار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گرا اور سیرینا اٹھ کر اندھا دھند اوپر کی طرف بھاگی۔ وہ حواس باختہ واش روم میں گھسی اور اس کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ پھر اس نے جلدی سے دواؤں والی کیبنٹ کھولی اور اس میں سے ایک قینچی نکال کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ ٹب میں پانی بھر گیا تھا اور اب بہہ کر فرش پر آ رہا تھا۔ جان، سیرینا سے کچھ ہی دور کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس بار بھی سیرینا اس کے وجود سے بے خبر نظر آ رہی تھی، اس کی نگاہیں دروازے کے پار بار ہلتے لٹو پر مرکوز تھیں۔ اسے باہر کی طرف سے کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر دروازہ لاک تھا۔

اچانک جان کی توجہ اپنے پیروں کی طرف آتے پانی پر گئی۔ فرش پر تیزی سے پانی پھیل رہا تھا۔ پھر پانی اس کے جوتوں تک آ گیا۔ جان کو ایسا لگا کہ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ہے اور جب منظر تھما تو اس نے خود کو اپنے گھر کے داخلی دروازے کے پاس راہ داری میں کھڑے پایا۔ اوپر سیڑھیوں سے پانی بہہ کر نیچے تک آ گیا تھا۔ جان کا دل دھڑک اٹھا اور وہ اوپر کی طرف بڑھا۔ پانی واش روم سے بیڈ روم میں اور بیڈ روم سے باہر تک بہتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آ رہا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جب اس نے واش روم کا دروازہ کھولا تو اس ٹب کے سرخ پانی میں جولیٹ کی لاش تیر رہی تھی۔ جان اس کی طرف لپکا۔ اس نے جولیٹ کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ وہ دہاڑیں مار کر رو رہا تھا اچانک اسے لگا جیسے اس کے سینے میں دل کے مقام پر شدید درد اٹھ رہا ہو۔ اس کی سانس بھی رک رہی تھی۔ اس نے اپنا سینہ تھام لیا اور سانس لینے کی حتی الامکان کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

جان اسپتال کے کمرے میں بستر پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ نیوز چینل پر اسی کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”رسائی پروجیکٹ کے ذہین ترین مائنڈ اسپائیز میں سے ایک جان کیرنگ، ایک تجربے کے دوران میں طبیعت خرابی کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی حالت تسلی بخش ہے مگر وہ اس سے زیادہ اور کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ جان کیرنگ نے ہائی اسکول کے بعد میرین جوائن کی اور چند سال بعد وہ ایک جونیئر ماتحت کا جبڑا توڑنے کے الزام میں کورٹ مارشل کے بعد آرمی سے فارغ کر دیا گیا۔ جونیئر ماتحت نے جان کی ایک ماتحت خاتون سارجنٹ کو جنسی طور پر ہراساں کیا تھا۔ تشدد کرنے پر اسے فوج سے رخصت کر دیا گیا۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد جان نے واشنگٹن یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات میں داخلہ لیا۔ اسے ذہین ترین طالب علم قرار دیا جاتا تھا۔ جان کی زندگی میں دوسرا مشکل دور اس وقت آیا جب ایک دن آفس سے واپسی پر اس نے اپنی بیوی جولیٹ کیرنگ کو باتھ ٹب میں مردہ حالت میں پایا۔ اس نے جان کے شیونگ استرے سے اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں۔ پولیس نے جامع تفتیش کے بعد اسے خودکشی قرار دیا۔

جان اس وقت سرکاری ملازمت کر رہا تھا اور واشنگٹن کے سب سے بڑے نفسیاتی علاج کے مرکز میں سینئر سائیکوجسٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس سانحے کے بعد اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور گوشہ نشین ہو گیا۔ ایسے میں ڈاکٹر ایڈورڈ اس کے لیے مددگار ثابت ہوا۔ وہ اس کا استاد ہی نہیں، اس کا بہت اچھا واقف کار بھی تھا۔ وہ جان کی شادی میں شریک ہوا تھا۔ جان نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد تین سال اس کے ساتھ بہ طور اپرنٹس کام کیا تھا پھر وہ سرکاری ملازمت میں آ گیا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے جان کو راضی کیا کہ وہ پھر سے نارمل زندگی کی طرف آئے وہی اسے رسائی پروجیکٹ میں لایا۔ یہاں کام کے دوران ڈاکٹر ایڈورڈ نے جان کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ آدمی کو پرانے طریقوں پر انحصار کرنے کے بجائے ہمیشہ نئے طریقوں کی طرف جانا چاہیے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کی کوشش سے بالآخر جان نارمل زندگی کی طرف لوٹ آیا۔“

اسکرین پر جان اور جولیٹ کی مختلف فوٹیج دکھائی جا رہی تھیں پھر سیرینا کی تصویر آئی۔ ”اس تجربے میں سیرینا کارٹر بھی شامل تھی۔ سیرینا، مارک کارٹر کیس میں مشکوک ہے۔ پولیس نے اسے باقاعدہ گرفتار نہیں کیا ہے مگر ابھی تک اسے کلیئر بھی نہیں کیا ہے۔ سیرینا کارٹر کے مطابق دو مہینے پہلے ایک شام جب وہ گھر میں اکیلی تھی ایک نقاب پوش کھڑکی توڑ کر اندر آیا اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود اس کے ہاتھوں زخمی ہوا اور مر گیا۔ بعد میں وہ مارک کارٹر ثابت ہوا۔ اس کی موت گردن میں کرسٹل گلدان کا ایک نکیلا ٹکڑا گھسنے سے واقع ہوئی۔ سیرینا نے اعتراف کیا کہ یہ کام اس نے کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی حفاظت کے لیے یہ کام کیا، نیز اسے علم نہیں تھا کہ نقاب میں اس کا شوہر ہے جو اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ مارک کارٹر کی طرف سے سیرینا کو قتل کرنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ مارک کی ساری دولت اس کے پاس تھی اور سیرینا کا ذاتی طور پر کچھ نہیں تھا اور نہ ہی دونوں میاں بیوی میں ایسا کوئی تنازعہ تھا جس کی وجہ سے مارک، سیرینا کو قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ ممکنہ طور پر سیرینا کو رسائی پروجیکٹ کی مدد سے کلیئر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ستر کی دہائی میں ایف بی آئی نے رسائی کے نام سے ایک پروجیکٹ شروع کیا تھا جس کے تحت مبینہ جرائم پیشہ افراد کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرکے ان کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کا حتمی ثبوت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں ہونے والے جرائم کا پیشگی سدِباب بھی ممکن تھا۔ بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر یہ پروجیکٹ ناکام رہا اور اسے بند کردیا گیا۔ پھر نئی صدی کی پہلی دہائی میں ایف بی آئی اور واشنگٹن یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے سربراہ ڈاکٹر پروفیسر ایڈورڈ جانز نے رسائی پروجیکٹ ازسرنو شروع کیا اور جدید ترین کمپیوٹرائزڈ آلات کی مدد سے انسانی دماغ کی یادداشت تک رسائی کے تجربات شروع کرائے گئے۔ اس بار پروجیکٹ کامیاب رہا۔ رسائی نے نہ صرف کئی مجرموں کے جرائم کا انکشاف کیا بلکہ ہونے والے کئی جرائم کو روکنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ اگرچہ عدالت نے ابھی تک رسائی کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات کو شہادت اور گواہی کا درجہ نہیں دیا ہے اور اس کی حیثیت پولی گراف ٹیسٹ جیسی ہے۔"

جان نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کردیا۔ اسے اسپتال میں دوسرا دن تھا اور اس کے ڈاکٹر نے اسے بتادیا تھا کہ اسے ممکنہ طور پر آج شام فارغ کردیا جائے گا۔ جان سوچ رہا تھا کہ میڈیا نے اسے زیادہ ہی شہرت دے دی تھی اور اس جیسے آدمی کے لیے زیادہ شہرت اچھی نہیں تھی۔ جاسوس کسی قسم کا ہو، اسے شہرت سے دور رہنا چاہیے۔ اس کے موبائل نے بیل دی۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کی کال تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "اب کیسا محسوس کررہے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" جان نے کہا۔ "مائنر ہارٹ اٹیک تھا خوش قسمتی سے اس نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تمہیں کچھ عرصے آرام اور اس سے زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں جلد کام پر آؤں گا۔" جان نے جلدی سے کہا۔

"ضرور میں نے کہا نا تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ "میں نے تمہارے لیے ایک کام تلاش کیا ہے۔ اگر تم بہتر محسوس کررہے ہو تو پرسوں میرے پاس آجاؤ۔"

☆☆☆

واشنگٹن یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات میں ڈاکٹر ایڈورڈ کا آفس پُرتکلف اور قدیم انداز کے بھاری فرنیچر سے مزین تھا۔ وکٹورین اسٹائل کا اور گہرے رنگوں والا فرنیچر۔ واحد چیز جو جدید دور کی عکاسی کررہی تھی۔ وہ اس کی میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر کا سامان تھا۔ لیکن رسائی پروجیکٹ کا آفس یونیورسٹی کے ساتھ ایک جدید ترین عمارت میں تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کا دفتر ایسے شیشوں سے گھرا ہوا تھا جس سے وہ چاروں طرف دیکھ سکتا تھا مگر کوئی اس کے دفتر میں نہیں جھانک سکتا تھا۔ اس قسم کے دفاتر عام طور سے سائی فائی فلموں میں دکھائے جاتے تھے مگر اب عام زندگی میں بھی ان کا چلن عام ہوگیا تھا۔ اس عمارت میں آمدورفت کے تمام راستے مخصوص مقناطیسی کارڈ سے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ رازداری کی وجہ سے غیر متعلقہ افراد کا داخلہ سختی سے ممنوع تھا اور کوئی ایسا فرد جو یہاں آنے کا مجاز نہ ہو وہ، نیچے لابی میں بھی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی وجہ یہاں ہونے والی وہ انتہائی خفیہ تحقیق تھی جو آنے والے وقت میں نہ صرف نفسیات کے علم بلکہ شاید عمرانیات کو بھی بدل کر رکھ دیتی۔ کیونکہ جان فی الحال چھٹی پر تھا اس لیے اس کا مقناطیسی کارڈ کام نہیں کررہا تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کی سکریٹری روبیکا نے اسے نیچے سے ریسیو کیا اور ڈاکٹر ایڈورڈ کے آفس تک چھوڑا۔ ڈاکٹر نے گرم جوشی سے جان کا استقبال کیا اور گلے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیسا محسوس کررہے ہو؟"

"بہتر لیکن مجھے ہوا کیا تھا؟"

"تم نے سیرینا کی یادداشت میں اپنی یادیں بھی شامل کردی تھیں۔ اس سے تمہارے بلڈ سرکولیشن سسٹم میں فرق آیا جو مائنر ہارٹ اٹیک کی وجہ بنا۔"

"یعنی سسٹم میں کوئی مسئلہ نہیں تھا؟"

"بالکل بھی نہیں، سسٹم سو فیصد اپنا کام کررہا تھا اور تمہیں اس کا اچھی طرح تجربہ ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تم اس بارے میں مت سوچو۔" ڈاکٹر میز کے پیچھے چھوٹے سے بار کی طرف بڑھا اور شمپین کی بوتل اور گلاس اٹھا کر بولا۔ "ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

جان نے انکار کیا۔ "نہیں، میں بہتر محسوس کررہا ہوں۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے ایک مہینے کے لیے الکوحل اور نکوٹین پر پابندی لگائی ہے۔"

"اوکے۔" ڈاکٹر نے کہا اور بوتل اور گلاس واپس رکھ دیے۔ وہ جان کی طرف آیا جو ایک ریک پر رکھے شوپیس دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک چینی گن تارہ بھی تھا۔ اس نے اسے اٹھایا۔ "اچھا پیس ہے۔"

گن تارہ آبنوس کی لکڑی کے فریم سے بنا تھا اور اس کے فولادی تاروں میں ہاتھی دانت سے بنے بندر کے چھوٹے چھوٹے مجسمے پروئے ہوئے تھے۔ جان نے اسے سیدھا کیا تو اچانک اس کے دو تار نکل گئے اور ان میں پروئے چھوٹے چھوٹے مجسمے فرش پر بکھر گئے۔ جان نے

معذرت کی۔ ''اوہ آئی ایم سوری۔''
''کوئی بات نہیں۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''چھوڑ دو میں اٹھا لوں گا۔''
مگر جان نے تمام مجسمے سمیٹ کر ڈاکٹر کی میز پر رکھ دیے۔ ''تم نے کہا تھا کہ کوئی کام ہے؟''
''بتاتا ہوں، کافی چلے گی؟''
جان نے اثبات میں سر ہلایا تو ڈاکٹر نے اٹھ کر کیتلی سے اس کے اور اپنے لیے کافی نکالی۔ اس کے سامنے کپ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تم نے ووڈ روز فیملی کے بارے میں سنا ہے؟''
جان نے سر ہلایا۔ ''سائمن ووڈ روز جو معروف بینکر اور اسٹاک بروکر تھا۔''
''ہاں وہی سائمن ووڈ روز۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے سر ہلایا۔ ''وہ میرا کلاس فیلو تھا اور بہت کم عمر میں مر گیا۔ وہ صرف چالیس برس زندہ رہا۔''
''اس کی موت پُراسرار تھی۔''
''اس کی لاش سمندری کھاڑی سے نکالی گئی اور اس کی موت ڈوبنے سے ہوئی تھی مگر اس کی گاڑی میں بہ ظاہر ایسا کوئی نقص نہیں تھا جس سے حادثے کی وجہ سامنے آتی۔ اس نے اپنے پیچھے بیوہ سارہ اور بیٹی جولی چھوڑی۔''
''جولی۔'' جان چونکا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پالیا۔ ''سوری۔''
''میں سمجھتا ہوں۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے سر ہلایا۔ ''جولی اس وقت صرف چار برس کی تھی۔ سائمن کی تمام دولت اور جائداد کی وارث وہی تھی اور اس کی ماں سارہ صرف نگران تھی۔ سائمن نے اس کے لیے کچھ نہیں چھوڑا اگر وہ مخصوص مراعات کی حقدار ضرور بن گئی۔ اس نے سائمن کے مرنے کے ایک سال بعد شادی کر لی تھی اور جس سے شادی کی، وہ سائمن کا بزنس پارٹنر ولیم ایڈگر تھا۔ جولی آنے والے پندرہ دسمبر کو یعنی اب سے تقریباً دو مہینے بعد اٹھارہ برس کی ہو جائے گی۔''
جان کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے خاموشی سے سن رہا تھا۔ ایڈورڈ نے بات جاری رکھی۔ ''جولی بچپن سے کچھ مسائل کا شکار تھی۔''
''نفسیاتی مسائل؟'' جان نے پوچھا۔
''ہاں نفسیاتی بھی اور شاید جسمانی بھی۔ وہ خود کو نقصان پہنچا لیتی تھی۔ کم سے کم ایک بار اس نے خودکشی کی کوشش کی اور اسے بچا لیا گیا۔ وہ گھر کے سوئمنگ پول میں کود گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف سات سال تھی پھر اس نے سارہ پر چاقو سے حملہ کیا، اس میں بھی جولی معمولی زخمی ہوئی۔ اس کے بعد اسے ایک ہوسٹل اسکول میں بھیج دیا گیا جہاں امریکا بھر سے امرا کے منتخب بچے تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ اسکول میں بھی اس کے بارے میں کئی واقعات رپورٹ ہوئے پھر ہائی اسکول کے دوران ایک حادثہ پیش آیا جس میں جولی کی تین ساتھی لڑکیاں چائے میں زہرخوانی کا شکار ہوئیں اور ان میں سے دو لڑکیاں مر گئیں۔ بچ جانے والی لڑکی نے بتایا کہ جولی نے چائے لینے سے انکار کر دیا تھا مگر چائے اسی نے تیار کی تھی۔ البتہ بعد میں چائے کی پتی کے ڈبے پر کیمسٹری کے استاد کارل مین کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے۔ چائے میں شامل زہر بھی کیمسٹری لیب سے حاصل کیا گیا تھا جو کارل مین کی تحویل میں رہتی تھی۔ پولیس نے اس پر فردِ جرم عائد کی کیونکہ وہ ان نشانات کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکا تھا پھر کئی واقعات سامنے آئے اس کے بعد اسے بائیس برس کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد سارہ اور ولیم نے جولی کو اسکول سے اٹھا لیا اور اب وہ گھر میں زیرِ نگرانی ہے۔''
''زیرِ نگرانی؟'' جان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''اسے اپنے کمرے سے باہر آنے کی اجازت اور اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے کمرے کی چوبیس گھنٹے کیمروں سے نگرانی کی جاتی ہے۔''
''کیا اس کا نفسیاتی تجزیہ علاج جاری ہے؟''
''ہاں لیکن میں نے نہیں کیا۔ وہ کبھی براہِ راست میرے زیرِ علاج نہیں رہی اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے سائمن کے جنازے میں شرکت کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ رپورٹ دیکھی ہے اس کے مطابق وہ الجھی ہوئی شخصیت کی مالک ہے اور کسی وقت بھی اپنے یا دوسروں کے لیے بڑے جانی و مالی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔''
''خطرناک رپورٹ ہے۔'' جان نے تبصرہ کیا۔ ''اس کی بنیاد پر اسے نامعلوم مدت کے لیے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کیا جا سکتا ہے۔''
ڈاکٹر ایڈورڈ نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا۔ ''اور اگر دولت ہو تو ایسے نفسیاتی اسپتالوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اصل میں اسپتال کو بزنس کے طور پر چلا رہے ہیں۔''
جان نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے کیوں بلایا ہے؟''

"میں چاہتا ہوں تم ایک بار اس لڑکی سے مل لو اور مناسب سمجھو تو اس کا علاج کرنے کی کوشش کرو۔ اسے علاج کی اشد ضرورت ہے کیونکہ دو مہینے بعد وہ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی اور اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔"

"اس کی میڈیکل ہسٹری ہے؟"

ڈاکٹر ایڈورڈ خوش نظر آنے لگا۔ اس نے ایک ضخیم فائل اپنی میز کی دراز سے نکال کر اس کے سامنے رکھی۔ "اس کا مطلب ہے، تم آمادہ ہو؟"

"اس کا فیصلہ میں بعد میں کروں گا۔" جان نے کہا۔

"نہیں تم آمادہ ہو۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے اصرار کیا۔ "میں تمہیں جانتا ہوں اگر تم راضی نہ ہوتے تو انکار کر دیتے اور میں اس کے لیے تمہارا پیشگی شکر گزار ہوں۔ کیونکہ سائمن میرا بہت اچھا دوست تھا۔"

جان نے فائل اٹھا لی اور کھڑا ہو گیا۔ "اب میں اجازت چاہوں گا۔"

"ضرور۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا اور پھر اپنی میز کے ساتھ رکھا ہوا ایک درمیانے سائز کا گتے کا پیک باکس اٹھایا۔ "اس میں جولی سے متعلق سب کچھ ہے۔ جب تم اس کا علاج شروع کرو گے تو تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔" وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ "مجھے یقین ہے تمہارے لیے یہ نیا اور اچھا تجربہ ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ایڈروڈ کے دفتر سے وہ اینا پولس کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا مگر وہ ان دنوں وہاں نہیں رہتا تھا اس نے مین سٹی میں ایک اپارٹمنٹ لے لیا تھا اور اس میں رہائش تھی۔ اس کا مکان شہر سے باہر ساحلی کھاڑی کے پاس تھا۔ یہاں کا منظر بہت خوب صورت تھا۔ جولیٹ کے بعد جان نے اسے فروخت کرنے کا سوچا اور اس نے برائے فروخت کا بورڈ بھی لگا دیا تھا مگر اتفاق کی بات تھی کہ اب تک کوئی گاہک نہیں آیا اور آیا تو جان نے اس کی آفر میں دلچسپی نہیں لی اس لیے مکان جوں کا توں موجود تھا۔ اس نے ڈرائیو وے میں کار روکی اور لاک کھول کر اندر آیا۔ مکان ویسا ہی تھا۔ صاف ستھرا اور سجا ہوا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس نے واش روم کا دروازہ کھول کر وہ ٹب دیکھا جس میں جولیٹ کی لاش پائی گئی تھی۔

جان نے گہری سانس لی۔

ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ فرار مسئلے کا حل نہیں۔ وہ نیچے آیا اور اس نے مکان کے سامنے لگا برائے فروخت کا بورڈ اتار کر پھینک دیا۔ اس رات ڈنر کے بعد جان نے فائل دیکھنا شروع کی۔ رپورٹس کے مطابق وہ غیر متوازن رویّے اور غائب دماغی کی حامل لڑکی تھی۔ اسے بے خودی کے دورے پڑتے تھے اور اس دوران میں وہ خود سے بیگانہ ہو جاتی تھی۔ سات سال کی عمر سے اس کا علاج جاری تھا۔ نفسی تجزیے کے مطابق وہ غیر معمولی ذہین تھی اور اس میں کوئی بھی کام بہت تیزی سے سیکھنے کی خصوصی صلاحیت تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ حساس اور ناقابلِ پیش گو شخصیت کی حامل تھی۔ فائل میں اس کی تصاویر بھی تھیں۔ جولی دلکش تھی مگر اس کی خوب صورتی میں معصومیت تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ فائل کو مکمل دیکھ کر اس نے ڈاکٹر ایڈورڈ کو کال کی۔ "میں جولی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں سارہ سے بات کر کے جلد تمہیں بتاتا ہوں۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے خوش ہو کر کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکے۔ میں اس کیس میں دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔"

اگلے دن ڈاکٹر ایڈورڈ کی کال آئی۔ "جان تم کل صبح ووڈ روز مینشن کا وزٹ کر سکتے ہو۔ ہنٹنگ ٹاؤن سے آگے ساحل کے ساتھ واقع ہے۔"

☆☆☆

ووڈ روز مینشن اصل میں ایک اسٹیٹ تھی جو کم و بیش ایک مربع میل کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھا۔ اس کے چاروں طرف گھنا مگر سلیقے سے اگا ہوا صاف ستھرا جنگل تھا جس میں سفیدے، شاہ بلوط اور کاٹن ووڈ کی قسم کے درخت لگے تھے۔ جنگل کے درمیان سے راستہ ساحل کے پاس واقع مینشن تک جاتا تھا۔ اینا پولس سے ہنٹنگ ٹاؤن زیادہ دور نہیں تھا لیکن اگر جان ذیلی سڑکوں سے آتا تو یہ راستہ اسے طویل پڑتا اس لیے اس نے ہائی وے کا رخ کیا اور مارلٹن سے نیچے اتر گیا۔ یہاں سے ووڈ روز مینشن پندرہ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا۔ مینشن چار عمارتوں پر مشتمل تھا لیکن اصل عمارت جو قدیم بھی تھی، الگ سے نمایاں تھی۔ اس چار منزلہ عمارت کے آخری فلور پر ترچھی چھتوں والے کمرے تھے جس کی خوب صورت فرنچ ونڈوز نمایاں تھیں۔ اینا پولس سے یہاں تک کے سفر میں جان خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا آیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے وہ ووڈ روز مینشن کے گیٹ کے سامنے تھا۔ گیٹ پر لگے کیمرے کی طرف دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا تو سیاہ جالی دار گیٹ خودکار انداز میں کھلنے لگا۔ وہ صرف اتنا کھلا کہ اس کی کار اندر جا سکے اور جیسے ہی کار اندر

داخل ہوئی، گیٹ خود بہ خود بند ہونے لگا۔ کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بل کھاتا ہوا راستہ خود مینشن کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کار پارکنگ میں روکی اور نیچے آکر مینشن کا جائزہ لیا تو اسے آخری فلور کی درمیانی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا دکھائی دیا۔ دوسری طرف کوئی تھا جو اسے دیکھ رہا تھا کیونکہ اس نے جیسے ہی کھڑکی کی طرف دیکھا، پردہ برابر ہوگیا۔ اسی اثنا میں سارہ اور ولیم باہر آئے۔ سارہ نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔

"ایڈورڈ نے تمہارے بارے میں بتایا ہے، وہ تمہاری بہت تعریف کررہا تھا۔" سارہ نے کہا۔ "ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں کہ تم نے جولی کے لیے یہاں آنا گوارا کیا۔"

سارہ اپنے طبقے کی روایتی عورت تھی جو الفاظ کو سجا سنوار کر اور جذبات کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ البتہ ولیم سرد تھا، اس نے نارمل سے بھی کم گرم جوشی کے ساتھ جان سے ہاتھ ملایا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے جان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ مینشن کے لیونگ روم میں آگئے۔ یہاں فرنیچر اور دوسرا سامان اتنا ہی اعلیٰ درجے کا تھا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ ملازمہ ایک ٹرے میں برانڈی کی بوتل اور گلاس لے آئی مگر جان نے شراب کا منع کردیا۔ اس لیے سارہ نے ملازمہ سے چائے کا کہا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد وہ بولی۔ "جولی ہماری ایک ہی اولاد ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی نفسیاتی الجھنوں سے نجات حاصل کرلے اور عام لڑکیوں جیسی زندگی گزارے، کیوں ولیم؟"

سارہ نے پاس بیٹھے شوہر کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر اس نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ پیچھے کرلیا۔ ولیم نے کہا۔ "اب تک اس کی پروگریس اچھی نہیں رہی ہے اور اس کا علاج کرنے والے ماہر نفسیات نے اسے علاج گاہ بھیجنے کا مشورہ دیا ہے۔ دراصل اسے مکمل علاج کی ضرورت ہے جو گھر میں ممکن نہیں ہے، اسے کسی اسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔"

سارہ بولی۔ "لیکن ڈاکٹر ایڈورڈ سے مشورہ کرکے ہم نے سوچا کہ ایک چانس اور لیا جائے۔"

"میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔" جان نے کہا۔ اس نے جانچ لیا کہ سارہ اگرچہ ہم کا لفظ استعمال کررہی ہے مگر یہ فیصلہ ان دونوں کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ سے سارہ نے رابطہ کیا تھا اور وہی جولی کا گھر میں علاج چاہتی تھی جبکہ ولیم اسے کسی مستقل علاج گاہ بھیجنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ سارہ نے پھر پُرتکلف انداز میں اس کی آمد پر شکریہ ادا کیا۔ جان نے پوچھا۔ "وہ اسکول سے یہاں کب آئی؟"

"ایک سال پہلے جب اس کی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ زہر والا واقعہ پیش آیا۔ اگرچہ وہ اس واقعے میں براہِ راست ملوث نہیں تھی اور نہ ہی اس پر کوئی چارج لگا۔ تب ہم نے بہتر سمجھا کہ اسے واپس بلالیا جائے۔" سارہ نے جواب دیا۔

"واپس آنے کے بعد اس کے رویّے میں کوئی تبدیلی آئی؟"

"شروع میں وہ خوش تھی، مگر پچھلے ایک مہینے سے اس میں تبدیلی آگئی ہے۔ وہ بہت کم سوتی ہے اور نہ ہونے کے برابر کھاتی ہے۔"

ولیم نے کہا۔ "گزشتہ ایک ہفتے میں اس نے بہ مشکل ہی کچھ کھایا ہے صرف پانی پی رہی ہے۔ وہ سوتی بھی کم ہے۔"

"اس کی صحت کیسی ہے؟"

"بہ ظاہر وہ ٹھیک ہے۔" ولیم نے کہا۔ "لیکن وہ ذہنی بیمار ہے اور اسے مستقل علاج اور دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہے۔"

چائے اور لوازمات کے بعد جان نے سارہ سے کہا۔ "پلیز میں جولی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں ذرا مصروف ہوں۔" ولیم کھڑا ہوگیا۔ "ایکسکیوزمی مسٹر جان، میں تم سے مزید ملاقات نہیں کرسکوں گا۔"

"نو پرابلم۔" جان نے جواب دیا اور ولیم کے جانے کے بعد سارہ سے پوچھا۔ "جولی کو کھانے میں کیا پسند ہے؟"

"بٹر چیز سینڈوچ۔"

"پلیز دو بڑے سینڈوچز تیار کرادیں۔"

سارہ نے ملازمہ سے کہا اور وہ چند منٹ میں سینڈوچز لے آئی۔ جان نے اس کا شاپر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ "اب میں جولی سے ملوں گا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" سارہ نے کہا۔ "جولی کا کمرا آخری فلور پر ہے۔"

جان نے سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر کہا۔ "مسٹر سائمن کے انتقال کا وقت تمہارے لیے مشکل ہوگا۔"

"میرے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ سائمن مجھ سے محبت کرتا تھا۔ جولی اس وقت چار سال کی تھی۔"

"جولی تمہاری دوسری شادی سے خوش تھی؟"

سارہ ایک لمحے کو ٹھٹکی لیکن پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ "شاید نہیں مگر اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔"

’’مسٹر ولیم سے اس کے تعلقات کیسے ہیں؟‘‘

’’نارمل قسم کے، وہ اسے ڈیڈی نہیں کہتی لیکن ان کے تعلق میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے۔‘‘

’’کیا جولی جانتی ہے کہ اسے علاج کے لیے اسپتال بھیجنے کا سوچا جا رہا ہے۔‘‘

تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھتی سارہ ایک لمحے کو رکی اور پھر چڑھنے لگی۔ ’’ہاں... ڈاکٹر لائیڈ نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ جولی کا معالج ہے۔‘‘

سیڑھیاں فلور کے وسط میں نکل رہی تھیں اور دائیں طرف جولی کا کمرا تھا۔ سارہ نے اسے بتایا۔ ’’یہ جولی کا کمرا ہے، اسے لاک رکھا جاتا ہے جولی کی حفاظت کے لیے۔‘‘

جان کا اندازہ تھا کہ یہ اسی کمرے کا دروازہ تھا جس کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔

’’حفاظت؟... اسے کس سے خطرہ ہے۔‘‘

’’خود سے۔‘‘ سارہ بولی۔ ’’پہلے تمہیں جولی کی گورنس رومیلا پیٹرسن سے ملنا ہوگا۔ اس کمرے اور جولی کی حد تک وہ مختار ہے۔ تمہیں کسی بھی کام سے پہلے اس سے اجازت لینا ہوگی۔‘‘

سارہ پہلے اسے ایک کمرے میں لائی جہاں ایک طرف درجن بھر اسکرینز تھیں جن پر پورے گھر کے کیمروں کا منظر آ رہا تھا۔ منظر ہر دس سیکنڈ بعد بدل رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ اصل کیمروں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک بڑی اسکرین پر الگ سے جولی کا کمرا دیکھا جا رہا تھا اور اس کے آگے ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔ اس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ باقی اسکرین کے سامنے ایک وردی پوش سیکورٹی گارڈ تھا۔ سارہ نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

’’جان یہ رومیلا پیٹرسن ہے۔ جولی کی گورنس۔ یہ بارہ سال سے ہمارے ساتھ ہے اور اب ہماری فیملی کا ایک حصہ ہے۔‘‘

رومیلا دلکش انداز میں مسکرائی۔ ’’تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر جان۔‘‘

اس نے ہاتھ ملایا تو جان اس کے نرم و نازک ہاتھ کی نرمی گرمی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کیا تو رومیلا پھر مسکرائی۔ اگر وہ بارہ سال سے یہاں تھی تو اس کی عمر کم سے کم پینتیس برس ہونی چاہیے تھی مگر دیکھنے میں وہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ دلکش نقوش اور متناسب جسم کے ساتھ وہ بلاشبہ ان چند حسین ترین عورتوں میں سے تھی جن سے جان آج تک ملا تھا مگر کسی عورت کے لیے اس نے ایسا محسوس نہیں کیا جیسا کہ رومیلا سے ہاتھ ملا کر محسوس کیا تھا۔ سارہ نے اس سے پوچھا۔ ’’جولی کیسی ہے؟‘‘

’’معمول کے مطابق۔‘‘ رومیلا نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ’’اس نے حسبِ معمول ناشتا بہت کم کیا ہے۔ صرف آدھا بسکٹ اور آدھا کپ چائے۔ اس کے بعد سے اپنے مشغلے میں مگن ہے۔‘‘

جان نے دیکھا کہ وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ کرسی پر بیٹھی ہوئی کچھ کر رہی تھی مگر وہ اس کے جسم کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس لیے کیمرے سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسا زاویہ رکھا تھا کہ اس کا کام کیمرے کی زد میں نہ آئے۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سارہ نے کہا۔ ’’جولی کو ڈرائنگ کا کریز ہے۔ وہ بہت اچھے اسکیچ بناتی ہے۔‘‘

’’میں اس سے ملنا چاہوں گا اکیلے میں۔‘‘ جان نے رومیلا کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔

’’کیوں نہیں مسٹر جان۔‘‘

سارہ اسے کمرے تک لائی اور لاک کھولتے ہوئے بولی۔ ’’تم اندر جا سکتے ہو مسٹر جان۔‘‘

وہ اندر آیا تو جولی بدستور ڈرائنگ میں لگی ہوئی تھی اور پنسل گھسنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے یقیناً دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن لی تھی مگر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کی میز پر ایک میٹرونوم رکھا تھا۔ یہ پنڈولم اور گھڑی سے ملتا جلتا آلہ ہوتا ہے جس کی سوئی پنڈولم کی طرح دائیں بائیں حرکت کرتی ہے اور اس سے مسلسل ٹک ٹک کی آواز آتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات عملِ تنویم میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ جان کچھ خاموش کھڑا رہا پھر اس نے کہا۔ ’’میں جان کیرنگ ہوں۔ تم سے ملنے آیا ہوں۔‘‘

جولی نے سر اٹھائے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے میز کے پاس رکھے واحد صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جان صوفے کی طرف آیا اور اس پر پڑا براؤن ٹیڈی بیئر اٹھا کر دیکھا۔ اٹھانے پر اس سے ہلکی سی سیٹی سنائی دی۔ وہ اس نے برابر میں چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیا۔ جولی کے ہلکے بھورے مائل سنہری بال اس کے چہرے پر آئے ہوئے تھے۔ وہ ہلکی جسامت کی لڑکی تھی مگر اپنے بازو اور کلائیوں سے وہ کمزور نہیں لگ رہی تھی۔ پورے ٹراؤزر کے ساتھ اس نے سلیولیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جان کو حیرت ہوئی کہ کم خوراکی نے اس کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کی جلد کی رنگت گلابی اور ناخن و بال بہت اچھی حالت میں تھے۔ اس نے ابھی تک جان پر توجہ نہیں دی تھی۔ جان نے

پوچھا۔ ”میٹرونوم کیوں چلایا ہوا ہے؟“

”اس سے مجھے اپنے کام میں توجہ مرکوز کرنا آسان رہتا ہے۔“ جولی نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ ”اب ٹھیک ہے؟“

”میں تم سے ملنے آیا ہوں۔“

جولی نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے پیارے اور معصوم نقوش والی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور معصومیت تھی۔ تصویروں کے مقابلے میں وہ حقیقت میں زیادہ اچھی اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے موٹی پنسل ایک طرف رکھ دی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے، تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

جان نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں جا بہ جا اسکیچ بورڈ رکھے یا دیوار پر لگے تھے جن پر پنسل سے بنے ہوئے مختلف اسکیچ تھے۔ تقریباً سارے اسکیچ دیکھ کر بنائے ہوئے تھے۔ جولی جس میز کے سامنے بیٹھی تھی اس پر باریک سے لے کر موٹی ترین نوک اور پتلی اور لمبی دھار والی بیشمار پنسلیں تھیں۔ ان میں ہر رنگ تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ تمام پنسلیں صرف سادہ سکے پر مشتمل تھیں اور کسی کے ساتھ بھی لکڑی نہیں تھی۔ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے جولی ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔

”میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔“ جان..... میز کے ساتھ موجود صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا چرمی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟“

جولی نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھتی ہوں۔“

”اوکے ہم ایک سادہ سے ٹیسٹ سے آغاز کرتے ہیں۔“ جان نے بیگ سے تصویروں کا ایک سیٹ نکالا اور اس کی پہلی تصویر جولی کے سامنے کی۔ ”اس آدمی کے چہرے پر کیا تاثر ہے؟“

جولی نے غور سے دیکھا اور بولی۔ ”غصے کا۔“

”لیکن اس کے چہرے پر تو بے بسی کا تاثر ہے۔“

”غصہ اصل میں بے بسی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔“ جولی نے جواب دیا۔ جان نے دل ہی دل میں لڑکی کی ذہانت کو سراہا۔

”اور یہ تصویر؟“

جولی نے دیکھا اور چند لمحے بعد بولی۔ ”یہ عورت خوش ہے۔“

”لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہے۔“

”یہ سکون میں ہے اور خوشی سکون کا دوسرا نام ہے۔“

تیسری تصویر وسیع کینوس والی تھی۔ اس میں ایک چراگاہ تھی جس میں جانور، پرندے، انسان اور ندی و پہاڑ بھی تھے۔ ”اس تصویر میں موضوع کیا ہے؟“

”زندگی۔“ جولی نے کہا۔ ”یہ سب زندگی کی علامات ہیں۔ بائی دی وے میں ایسے بہت سے ٹیسٹ دے چکی ہوں۔ کیا تم ماہرِ نفسیات ہو؟“

جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نئے طریقوں پر بھی کام کر رہا ہوں مگر یہ طریقے بھی موثر ہیں۔“

”تب تم نے میرے بارے میں کیا اندازہ لگایا ہے؟“ جولی اس بار پوری طرح اس کی طرف مڑ گئی۔

”کوئی اندازہ نہیں۔“ جان نے تصویریں واپس بیگ میں ڈال دیں۔ ”کیونکہ تمہیں پرانے طریقے پسند نہیں ہیں اس لیے اب ہم نئے طریقے پر بات کرتے ہیں۔“

جولی کے چہرے پر پہلی بار دلچسپی نظر آئی۔ جان نے ذرا آگے جھک کر اور اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ ”ماضی میں جانا کیسا لگتا ہے؟“

وہ پہلی بار ہچکچائی۔ ”زیادہ اچھا نہیں۔“

”اگر ہم ماضی میں جا کر کچھ یادیں تلاش کریں جو تم سے کھو گئی ہیں؟“

جولی کا چہرہ سپاٹ ہو گیا، اس نے کہا۔ ”مجھے عملِ تنویم سے نفرت ہے مجھے مسمرائز ہونا پسند نہیں ہے۔ ڈاکٹر لائیڈ نے دو بار کوشش کی مگر میری مزاحمت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوا۔“

”یہ تنویمی عمل نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہے؟“

”نیا طریقہ ہے۔“ جان نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”ایک منٹ میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے اپنا بیگ ساتھ رکھا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آیا۔ سارہ نے لاک کھلا رکھا تھا اور وہ باہر موجود تھی۔ جان رومیلا کے پاس آیا اور اس سے اپنے تجربے کی اجازت چاہی۔ رومیلا نے ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”اس پر سائن کر دو کہ اس تجربے اور اس کے بعد ہونے والے اثرات کی تمام تر ذمے داری تم پر ہوگی؟“

جان نے کاغذ اپنی طرف کیا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ خاص سیشن ہے اس میں مجھے جولی کے ماضی میں جانا ہوگا اور اس کی بہت سی یادداشتوں کو دیکھنا ہوگا اس لیے اس سیشن کے دوران میں کمرے کا کیمرا اور مائیک آف رہے گا۔“

رومیلا نے سارہ کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر رومیلا نے کی بورڈ کے چند بٹن دبائے اور اسکرین سادہ ہوگئی۔ ''اب کیمرا آف ہے۔''

جان نے سائن کر دیے اور پوچھا۔ ''کیا تم ڈاکٹر لائیڈ سے بھی اسی طرح سائن لیتی ہو؟''

''نہیں کیونکہ وہ جولی کا اصل معالج ہے۔'' رومیلا نے کہا اور پھر اپنا کارڈ نکال کر جان کی طرف بڑھایا۔ ''یہ میرا کارڈ ہے تم سیشن کے بعد مجھے کال کرنا۔''

جان نے کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے واپس جولی کے کمرے میں آگیا۔ اس نے ایک طرف رکھی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کا انتخاب کیا جس کے گرد دو کرسیاں تھیں۔ وہ جولی کو وہاں لے آیا اور پھر بیگ سے اپنا لیپ ٹاپ، ائر پلگ اور الیکٹروڈ نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ ''اس کی مدد سے ہم ماضی میں جائیں گے بلکہ تم جاؤ گی اور میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔''

''وہ کیسے؟'' جولی نے تجسس سے لیپ ٹاپ اور دوسری چیزوں کو دیکھا۔

''اس لیپ ٹاپ میں موجود سوفٹ ویئر ان آلات کی مدد سے دو ذہنوں کو آپس میں منسلک کر دیتا ہے۔ ایک جو سوچتا ہے وہ دوسرا بھی دیکھتا اور سنتا ہے۔ کیا تم تیار ہو؟''

جولی نے سر ہلایا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جان نے لیپ ٹاپ سے الیکٹروڈ منسلک کر کے اس کا مخصوص سوفٹ ویئر آن کیا۔ اس نے پہلے ائر پلگ جولی کے کان میں لگایا۔ ایسا ہی ایک ائیر پلگ اپنے کان میں لگایا اور پھر الیکٹروڈز اپنے اور جولی کے ماتھے پر دائیں طرف چپکائے۔ یہ تمام آلات وائرلیس تھے اور بلوٹوتھ کی مدد سے لیپ ٹاپ سے منسلک تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم ماضی کی ان یادوں میں جاؤ گی جو تمہارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ میں تمہیں نظر نہیں آؤں گا لیکن تمہارے ساتھ ہوں گا۔ کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال میں، میں تمہیں واپسی کا کہوں گا اور تم جاگ جاؤ گی۔ کیا تم سمجھ رہی ہو؟''

جولی نے سر ہلایا تو جان نے مطمئن ہو کر میٹرونوم میز پر رکھا اور جولی سے کہا۔ ''تم میٹرونوم استعمال کرتی رہی ہو اس لیے اس سے فائدہ ہوگا۔ تم ماضی کی بعید ترین یاد کے بارے میں سوچو اور اپنی توجہ ٹک ٹک کی آواز پر رکھو۔ جب تم محسوس کرو کہ تم ماضی میں پہنچ گئی ہو تو اپنی آنکھیں بند کر لینا۔''

جولی نے پھر سر ہلایا تو جان نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میز پر رکھ لیے۔ ''پُرسکون ہو جاؤ۔''

جولی کی آنکھوں کی پتلی حرکت کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دماغ کا خاکہ نظر آنے لگا۔ ایک بار میں لکیریں اوپر نیچے ہو رہی تھیں جیسے دل کے کارڈیوگراف میں ہوتی ہیں۔ پھر جولی کی پتلی ساکت ہوگئی اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ جان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''چلو آغاز کرتے ہیں۔''

☆☆☆

چار سال کی بچی خوب صورت فراک اور پونی ٹیل کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی، اس نے چھوٹی سی گڑیا اٹھا رکھی تھی اور ماں سے کہہ رہی تھی۔ ''ڈیڈی آنے والے ہیں۔''

''ہاں ڈیئر۔'' ماں نے اسے پیار کیا۔ بچی جولی اور ماں سارہ تھی۔ جولی اچھلتی کودتی کسی جگہ چلی گئی اور وہاں فرش پر بیٹھ کر اپنی گڑیا سے کھیلنے لگی۔ یہ جگہ کسی دفتر جیسی تھی۔ جولی زیرِلب کچھ گا رہی تھی اور وہاں کسی گھڑی کے مترنم الارم کی آواز گونج رہی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک چھوٹی سی جالی دار دیوار کے دوسری طرف سے کوئی شخص اتر کر اندر آیا۔ وہ دروازے کی طرف سے نمودار ہوا۔ وہاں تاریکی تھی جب وہ روشنی میں آیا تو وہ ولیم نکلا۔ جولی سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہیلو سوئٹی مجھ سے مت ڈرو... میرے پاس آؤ۔''

مگر جولی بہت زیادہ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ منظر بدلا اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ جولی نے دروازے سے ہال وے کی طرف دیکھا۔ سارہ نے فون اٹھا رکھا تھا پھر اچانک وہ گھٹنوں کے بل گری اور رونے لگی۔ اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ جان جولی کے عین پیچھے تھا اور وہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جولی سہمی ہوئی اپنی گڑیا سینے سے لگائے ماں کے پاس آئی اور بولی۔ ''مام کیا ہوا ہے؟''

سارہ نے اسے دیکھا اور ملازمہ کو اشارہ کیا کہ وہ اسے وہاں سے لے جائے۔ پھر منظر بدل گیا۔ جولی سیڑھیوں کے اوپر سے دیکھ رہی تھی۔ ولیم نے سارہ کو سینے سے لگایا ہوا تھا اور وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا۔ منظر پھر بدلا۔ وہ قبرستان میں تھے اور سائمن کا تابوت دفنایا جا رہا تھا۔ جولی سیاہ لباس ماں کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کا سوتیلا باپ ولیم ان دونوں کے ساتھ تھا۔ جان دوسری سمت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر جولی نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جب تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ قبر کے پاس جانے لگی۔ وہ اس میں جھانکنا چاہتی تھی۔ اچانک جان نے کہا۔ ''رک جاؤ... واپس آؤ۔''

جولی نے گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ جان نے میٹرونوم روک دیا تھا۔ ''کیسا لگا یہ تجربہ؟''

''حیرت انگیز۔'' جولی نے سر ہلایا۔ ''میں سچ مچ اس منظر میں پہنچ گئی تھی لیکن تم کہاں تھے؟''

''میں تمہارے ساتھ تھا۔''

جولی نے تعجب سے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

جان نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا خاص سوفٹ ویئر مجھے تمہاری یادداشت میں لے گیا اور تم نے جو دیکھا، سنا اور کہا وہ میں نے بھی دیکھا اور سنا۔''

جولی ایک لمحے کو خاموش ہوئی۔ ''کیا تم میری یادداشت تک مکمل رسائی حاصل کر سکتے ہو؟''

''نہیں اس سیشن کے دوران میں جہاں تم جاؤ گی، میں بھی وہیں ہوں گا۔ یوں سمجھ لو کہ دماغ تمہارا گھر ہے اور میں صرف وہیں جا سکوں گا جہاں تم خود مجھے لے کر جاؤ گی۔''

جولی نے سکون کا سانس لیا۔ ''تب تو یہ بہت اچھا تجربہ ہے۔ لیکن تم نے مجھے واپس کیوں بلایا؟''

''قبر میں جھانکنا حقیقی نہیں تھا۔'' جان نے اس کے ماتھے سے الیکٹروڈ اور کان سے ائر پلگ اتار لیا اور جراثیم کش دوا لگی روئی سے اس کا ماتھا صاف کرنے لگا۔ ''سچ میں تم نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ اگر اصل یادداشت میں کوئی غلط بات شامل ہو جائے تو سیشن ناکام ہو جاتا ہے اس لیے آئندہ کوشش کرنا کہ اپنے طور پر کچھ نہ کرو۔''

جولی نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہی ہے مجھے یاد ہے مام نے مجھے تابوت کے پاس جانے نہیں دیا تھا لیکن یہ کیسے دکھائی دیا؟''

''اسے تم نے شامل کیا ہے اپنی خواہش پر۔''

''لیکن کیوں؟''

جان نے لیپ ٹاپ، ائر پلگ اور الیکٹروڈ بیگ میں رکھ لیے۔ ''شاید تم جاننا چاہتی ہو کہ تمہارے باپ کے ساتھ کیا ہوا؟ تم اس کی موت کو پُراسرار سمجھتی ہو۔''

''شاید۔'' جولی نے بے یقینی سے کہا۔ ''لیکن میں نے کبھی اس بارے میں بہت زیادہ نہیں سوچا۔''

''ضروری نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کے بارے میں شعوری طور پر زیادہ نہ سوچے تو وہ اس کے لیے اہم نہ ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہارے باپ کی تمہارے نزدیک کیا اہمیت ہے؟''

''بہت زیادہ۔'' جولی نے کہا۔ ''پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے آج بھی ان کی باتیں یاد ہیں۔''

''تجربہ کیسا لگا؟''

''حیرت انگیز۔'' جولی نے بے ساختہ کہا۔ ''کیا تم پھر دہراؤ گے؟''

''ہاں لیکن ابھی نہیں۔'' جان نے کہا۔

جولی اب مسکرا رہی تھی۔ ''جان اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''تم کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''تم شادی شدہ ہو؟''

''نہیں، تھا۔''

''طلاق ہو گئی ہوگی۔''

''نہیں۔'' جان کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ ''اس کی موت ہو گئی تھی۔''

جولی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی۔ ''اس کا نام کیا ہے؟''

''وہی جو تمہارا ہے۔''

جولی کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔ ''مجھے اس کی تصویر دکھاؤ۔''

''وہ ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔''

''کم آن جان۔'' اس بار جولی نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تمہارے پرس میں اس کی تصویر ہوگی۔''

جان کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے پرس کھول کر اس میں سے جولیٹ کی تصویر نکالی مگر اسے الٹا کر کے جولی کے سامنے رکھ دیا۔ ''تم جولیٹ کو دیکھنا چاہتی ہو لیکن تمہیں ایک ڈیل کرنی ہو، کیا تم تیار ہو؟''

جولی نے سر ہلایا۔ ''میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

جان نے بیگ سے سینڈوچز کا شاپر نکالا اور ایک طرف رکھی ٹرے اٹھا کر دونوں سینڈوچز اس میں رکھ دیے۔ ''یہ کھاؤ اور تصویر دیکھ لو۔''

جولی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سینڈوچ اٹھا لیا۔ دوسرا جان نے اٹھا لیا اور وہ دونوں کھانے لگے۔ کھاتے ہوئے جولی نے تصویر اٹھا کر دیکھی اور بولی۔ ''یہ خوب صورت ہے، تم اسے مس کرتے ہو گے؟''

''انسان کچھ مس نہیں کرتا، سب اس کے دماغ میں موجود رہتا ہے۔''

ان دونوں نے خاموشی سے اپنا اپنا سینڈوچ ختم کیا۔ جان نے تصویر واپس پرس میں رکھی اور کھڑا ہو گیا۔ ''تم

سے مل کر اچھا لگا جولی۔''
''مجھے بھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''تم پھر کب آؤ گے؟''
''میں ایک عارضی ڈیل کے تحت یہاں آیا ہوں کہ شاید میں تمہارے مسئلے کو بہتر طریقے سے حل کر سکوں۔ اگر تمہارا طرزِ عمل بہتر ہوا تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں ٹھیک کام کر رہا ہوں اور اس صورت میں، میں یہاں آتا رہوں گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟''
''ہاں سمجھ رہی ہوں۔'' جولی نے جواب دیا۔ جان اٹھ کر باہر آیا۔ باہر سارہ اس کی منتظر تھی۔ اس نے خود جولی کا کمرا لاک کیا۔ ولیم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ سارہ اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ اس نے پوچھا۔
''کیسا رہا؟''
''حوصلہ افزا، مجھے امید ہے جولی جلد اپنے مسائل سے چھٹکارا پالے گی۔'' جان نے کہا۔ ''وہ تعاون کر رہی ہے۔''
''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ وہ نارمل لڑکی بنے اور زندگی کو انجوائے کرے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہونے والی ہے۔ اپنی لائف بنانے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' سارہ نے کہا۔ ''لیکن میں اس کی کم خوراکی کی وجہ سے پریشان ہوں۔''
''کیا پہلے وہ ٹھیک کھاتی تھی؟''
''ایک سال پہلے تک وہ بہت خوش خوراک تھی۔''
''مسٹر ولیم میری یہاں آمد سے خوش نہیں ہیں؟''
سارہ ہچکچائی۔ ''ہاں اس کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''
''مسٹر ولیم یہاں نہیں ہیں ورنہ میں انہیں بتاتا کہ جولی نے کھانا شروع کر دیا ہے۔''
سارہ خوش ہو گئی۔ ''ریئلی اس صورت میں تمہارا یہاں آتے رہنا ضروری ہے۔''
''میں جلد وزٹ کروں گا۔''
''تم جب چاہے، آسکتے ہو۔'' سارہ نے کہا۔ ''اپنا بل تم بھیج دینا یا بینک اکاؤنٹ کے ساتھ ای میل کر دینا۔''
جان نے سر ہلایا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے مینشن کی اوپری منزل کی طرف دیکھا تو جولی کے کمرے کا پردہ سرکا ہوا تھا پھر ایک ہاتھ نمایاں ہوا اور اس نے جان کو الوداع کہا تھا۔ اس شام جان ڈاکٹر ایڈورڈ سے ملا اور اس نے جولی کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''سائمن اچھا آدمی تھا اور جولی سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جولی ان چکروں سے نکل آئے۔ یہ دولت اس کی ہے اور وہ اسے مثبت انداز میں استعمال کر کے اپنی زندگی بنا سکتی ہے۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے' اتنی دولت کے ہوتے ہوئے اگر وہ کسی علاج گاہ میں بند کر دی گئی تو اس کی نفسیاتی الجھنیں مزید بڑھ جائیں گی۔''
وہ دونوں دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ موسم سرد تھا، اس کے باوجود لوگ تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ گھاس پر بچے کھیل رہے تھے اور جاگنگ کے شوقین ان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے آس پاس اشارہ کیا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ ہمارے آس پاس کتنے ایسے لوگ ہیں جو نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ جی رہے ہیں۔ عام طور سے ننانوے فیصد اپنی الجھنوں کے ساتھ خاموشی سے دنیا سے گزر جاتے ہیں اور صرف ایک فیصد لوگ دوسروں کے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔''
''تمہارا خیال ہے جولی بھی ان ایک فیصد لوگوں میں سے ہے؟'' جان نے کہا اور نزدیک ایک موبائل شاپ سے اپنے اور ڈاکٹر کے لیے گرم چاکلیٹ لینے لگا۔
''بالکل۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے سر ہلایا۔ ''اس کا مسئلہ حقیقی ہے مگر اس کا تعین باقی ہے کہ اس کا علاج ضروری ہے یا نہیں۔ تم درحقیقت اسی مشن پر ہو۔''
''میں سمجھ رہا ہوں۔ ویسے یہ لڑکی اچھی ہے۔ ذہین اور بہت تیز دماغ والی۔''
''ذہین اور تیز دماغ ہی الجھنوں کا شکار بنتے ہیں۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''میری نظر میں بہت کم نفسیاتی مریض ایسے گزرے ہیں جو کم دماغ ہوں۔ درحقیقت وہ نفسیاتی مریض نہیں بلکہ دماغ کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔''
''مجھے جولی میں خاص مسئلہ نظر نہیں آیا۔'' جان نے کہا۔ ''لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر لائیڈ سے ایک ملاقات کر لوں۔''
''میں اسے جانتا ہوں، مگر پسند نہیں کرتا۔''

☆☆☆

ڈاکٹر لائیڈ کو دیکھ کر جان کو اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر ایڈورڈ اسے کیوں ناپسند کرتا ہے۔ وہ انڈے جیسے سر والا شخص تھا جس پر کہیں بھی بال یا رُواں نہیں تھا۔ بڑی سی ناک اور آگے کو نکلا ہوا منہ اسے عجیب سا تاثر دے رہا تھا اور یہ تاثر خوشگوار نہیں تھا۔ اس نے کسی گرم جوشی کے بغیر جان سے ہاتھ ملایا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو مسٹر

کیرنگ۔''

''وقت دینے کا شکریہ۔''

''نہیں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم میرا ہی کام کر رہے ہو۔''

''نہیں، میں اپنا کام کر رہا ہوں لیکن ہو سکتا ہے تم میری مدد کر سکو۔''

ڈاکٹر لائیڈ کے چہرے کا تاثر بدلا مگر اس نے کہا۔ ''مجھ سے جو تعاون ہو سکا، میں ضرور کروں گا۔''

''تم کب سے جولی کا علاج کر رہے ہو؟''

''جب وہ چھ سال کی تھی۔'' لائیڈ نے کہا۔ ''تقریباً بارہ سال ہو گئے ہیں۔''

''درمیان میں وہ اسکول میں رہی؟''

''ہاں لیکن جب وہ چھٹیوں میں گھر آتی تو میرے ساتھ دو سیشن ہوتے تھے۔''

''ان بارہ سالوں میں تم نے اس میں کیا تبدیلی پائی؟''

''کوئی نہیں۔'' ڈاکٹر لائیڈ نے صاف گوئی سے کہا۔

جان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم ناکام رہے؟''

''نہیں کم اس پر میرا علاج اثر نہیں کر سکا۔'' ڈاکٹر لائیڈ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''یوں سمجھ لو جیسے کثرتِ استعمال سے اینٹی بائیوٹک بے اثر ہو جاتی ہے۔''

''لیکن نفسیاتی علاج الگ چیز ہے۔''

''درست کہا۔ میرا مقصد مثال دینا تھا یوں سمجھ لو کہ یہ لڑکی نفسیات کے میدان میں بہت آگے ہے اور اسے بہت اعلیٰ درجے کے علاج کی ضرورت ہے اسی لیے میں نے سارہ اور ولیم کو تجویز کیا کہ اسے کسی اسپتال میں داخل کرا دیا جائے جہاں اس کا باقاعدہ علاج ہو۔''

''کیا سچ مچ اس کی ضرورت ہے؟'' جان کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

ڈاکٹر لائیڈ ذرا آگے جھکا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''مسٹر کیرنگ، ان بارہ سالوں میں صرف اتنی کامیابی حاصل کر سکا ہوں کہ جولی کو سمجھ سکوں۔ اس سے تم چاہو تو اندازہ لگا لو کہ وہ کیسی شخصیت کی مالک ہے۔''

''وہ صرف اٹھارہ سال کی لڑکی ہے۔''

''لیکن اس کا دماغ... خدا کی پناہ۔'' لائیڈ نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''اب تم اس کا علاج کر رہے ہو اس لیے شاید تم بھی جان جاؤ یا پھر ہو سکتا ہے کہ نہ جان سکو۔ سوری مسٹر کیرنگ میں اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکوں گا۔ میں ذرا مصروف بھی ہوں۔''

''شکریہ۔'' جان کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے تک گیا تھا کہ ڈاکٹر لائیڈ نے عقب سے کہا۔ ''ایک مشورہ ہے۔ اس سے ایسے محتاط رہنا جیسے انسان زہریلے سانپ سے رہتا ہے۔ سانپ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو اس کے اندر ہلاکت خیز زہر ہوتا ہے۔''

''مشورے کا بھی شکریہ۔'' جان یہ کہہ کر اس کے دفتر سے نکل آیا۔

☆☆☆

دو دن بعد جان پھر جولی کے کمرے میں تھا۔ آج وہ طویل سیشن کے لیے آیا تھا اور اس کا ارادہ دیر تک جولی کے ساتھ رہنے کا تھا۔ جولی کا بیڈ روم خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ اٹھارہ بائی بیس کے اس کمرے میں خاصی گنجائش تھی۔ اس میں جولی کا بیڈ تھا اور ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ اس کی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ کھانے کی میز بھی چھوٹی سی تھی۔ مہمانوں کے لیے دو عدد چھوٹے صوفے تھے۔ کھڑکی سے پارکنگ کے پار مینشن کی دوسری عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ جان کھڑکی کے پاس آیا تو اسے دیوار سے لگا ہوا جولی کا بنایا اسکیچ دکھائی دیا۔ اس نے اٹھا کر کھڑکی کے پار والی عمارت کو دیکھا۔ اسکیچ ہو بہو اسی عمارت کا تھا۔ اس نے اسکیچ بناتی جولی سے کہا۔ ''تم اچھی ڈرائنگ بناتی ہو۔''

''مجھے ڈرائنگ بنانا بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ اس سے میری سوچیں بٹ جاتی ہیں۔''

''کیسی سوچیں؟''

''مجھے خیال آتا ہے کہ میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں۔ کبھی کبھی مجھے یہ جگہ قید خانہ لگتی ہے۔ میں کسی پرندے کی طرح مکمل آزاد ہونا چاہتی ہوں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ مکمل آزادی نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔ بااختیار ترین لوگوں کی بھی حدود ہوتی ہیں اور انہیں اسی میں رہنا پڑتا ہے۔''

جولی نے سر ہلایا۔ ''میں ایک سال سے یہاں قید ہوں۔ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی اور اب مجھے کسی مستقل علاج گاہ بھیجے جانے کا سوچا جا رہا ہے۔''

''تم نہیں جانا چاہتیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں اس کی مستحق نہیں ہوں۔'' جولی اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''کیا میں مستحق ہوں، تمہارا کیا خیال ہے؟''

’’ابھی میرا کوئی خیال نہیں ہے۔‘‘ جان نے جواب دیا۔
’’پلیز۔‘‘ جولی کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ ’’تم اچھے آدمی ہو مجھے بچا سکتے ہو۔ میں کسی نفسیاتی اسپتال کے قید خانے میں نہیں جانا چاہتی۔ مجھے ایسا سوچ کر ہی خوف آتا ہے۔‘‘
جان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ’’میں اسی کی کوشش کر رہا ہوں۔‘‘
اچانک جولی اس کے سینے لگی اور دھیمے لہجے میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ’’مجھے تم پر اعتبار ہے لیکن ولیم پر نہیں ہے۔‘‘
جان نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں کیمرے میں دیکھا جا رہا ہے اور شاید یہاں ہونے والی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو۔ اگرچہ اسے براہِ راست نہیں سنا جا رہا ہوگا۔ اس نے سر ہلایا۔ ’’کیا خیال ہے آج کا سیشن نا کر لیا جائے۔‘‘
جولی راضی تھی۔ آج جان نئے کرسٹل سلیکون کے بنے ائرپلگ لایا تھا۔ اس کی مدد سے دماغ کے سگنل بہتر ریکارڈ ہوتے تھے۔ اس نے جولی کے کان میں ائرپلگ لگا دیا۔ پھر ماتھے پر الیکٹروڈ چسپاں کر کے اس نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ میٹرونوم چلایا اور جولی سے بولا۔ ’’آج تم اپنے اسکول کی یادوں میں جاؤ گی۔‘‘
جولی نے سر ہلایا۔ چند لمحے وہ جان کو دیکھتی رہی اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جان نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اسکول یونیفارم میں آ جا رہے تھے۔ جولی کینٹین میں تھی اور سامنے کھانے کی ٹرے رکھے اسے گھور رہی تھی۔ اچانک ایک گول اور شوخ چہرے والی لڑکی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ’’ہائے میں سیڈ ہوں۔‘‘
’’میں جولی۔‘‘
’’تم نئی آئی ہو؟‘‘ سیڈ نے پوچھا۔
’’ہاں، میں ہوسٹل میں ہوں۔‘‘
’’میں یہیں پاس رہتی ہوں۔‘‘ سیڈ نے کہا۔ ’’کاش میں بھی ہوسٹل میں رہ سکتی مگر میرے ماما پاپا اجازت نہیں دے رہے۔‘‘
سامنے میز پر این اور اس کی ساتھی لڑکیاں ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ سیڈ سہم گئی، اس نے جولی سے کہا۔ ’’یہ اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔‘‘
جولی نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ’’میں جانتی ہوں۔‘‘
سیڈ مسکرانے لگی۔ ’’تم مجھ سے دوستی کرو گی؟‘‘
جولی نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ’’آج سے ہم اچھی دوست ہیں۔‘‘
جان کیفے ٹیریا کے دروازے پر موجود انہیں دیکھ رہا تھا۔ منظر بدل گیا۔ اب جولی اور سیڈ ہوسٹل کے ایک کمرے میں بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں کتابیں دیکھ رہی تھیں۔ اچانک این، کاٹی اور میرل وہاں آئیں۔ این نے سیڈ کو گھور کر دیکھا اور بولی۔ ’’تم جا سکتی ہو۔‘‘
سیڈ نے جلدی سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور سر جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد این مسکرائی اور بولی۔ ’’سوئٹی تم بہت مغرور ہو، آج تمہارا کچھ غرور نکالنا ہوگا۔‘‘
منظر بدلتا ہے این، کاٹی اور میرل جولی کو کھینچ کر اسٹور روم میں لا رہی ہیں۔ وہ چیخ رہی ہے اور مزاحمت کر رہی ہے مگر وہ ہنستے ہوئے اسے ایک الماری میں دھکیل کر باہر سے لاک لگا دیتی ہیں۔ جولی کی چیخیں بہت بلند ہیں۔ منظر پھر بدلتا ہے اور جولی کارل مین کے آفس میں ہے۔ وہ پڑھانے کے ساتھ طلبا کے آپس کے تنازعات بھی دیکھتا تھا۔ کارل مین وجیہہ چہرے اور ورزشی جسامت والا شخص تھا۔ وہ جولی سے کہہ رہا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کے خلاف شکایت بھی کرے گی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پھر اس نے معنی خیز انداز میں جولی کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ’’لیکن تمہاری خاطر میں ان لڑکیوں کو ایسی سزا دے سکتا ہوں کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔‘‘
جولی نے اس کا ہاتھ اپنی ٹانگ سے ہٹایا اور بولی۔ ’’مجھے کسی کو سزا نہیں دلوانی ہے۔ میں بس چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے نہ چھیڑے۔‘‘
کارل مین کا چہرہ سخت ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے۔ ’’ٹھیک ہے، تم جا سکتی ہو۔‘‘
منظر بدلتا ہے۔ جولی اور دوسری لڑکیاں کیمسٹری لیب میں کارل مین کی زیرِ نگرانی تجربات کر رہی ہیں اور وہ ان کے درمیان ٹہلتے ہوئے انہیں بتا رہا ہے کہ کیمیکل بہت حساس اور اکثر اوقات انسانوں کے لیے خطرناک ہوتے ہیں اس لیے انہیں بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے اور ان کی طرف سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ جولی ایک سینک میں دو کیمیکل آپس میں ملا رہی تھی۔ اچانک اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کیمیکل جارز پر اوندھے منہ گر جائے گی۔ جان نے چٹکی بجا کر کہا۔
’’واپس آ جاؤ۔‘‘

جولی نے آنکھیں کھولیں تو جان اسے گھور رہا تھا۔

''تم نے مجھے واپس بلالیا۔''

''تم کہاں تھیں؟'' جان بولا۔ ''میں نے تمہیں واپس آنے کو کہا مگر تم بدستور ماضی میں تھیں۔ میں نے میٹرونوم روک دیا اور پھر کہا تو تم واپس آئیں۔''

جولی حیرت زدہ نظر آنے لگی۔ ''میں کیمسٹری لیب میں تھی اور مجھے لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تم نے آخری بار کہاں دیکھا؟''

''کارل مین کے دفتر میں، کیا یہ سچ ہے؟''

جولی کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ اس نے سر ہلایا۔ جان نے احتیاط سے اس کے کان سے پلگ اور ماتھے سے الیکٹروڈ الگ کیا اور روئی سے اس کا ماتھا صاف کرنے لگا۔ سیشن کا ایک حصہ اس سے مس ہوگیا تھا اور اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ جولی نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''پوچھو؟'' جان نے سامان بیگ میں ڈالا۔

''کیا تمہارے یہ سیشن، میرا مسئلہ حل کرسکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں، میں بہت پُرامید ہوں کیونکہ تم مکمل تعاون کررہی ہو۔''

''لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر تم ناکام رہے تو مجھے یہاں سے بھیج دیا جائے گا۔''

جان نے ہاتھ بڑھا کر اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو۔''

''میں تمہارے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر التجا کی۔ ''پلیز تم جلدی آیا کرو۔''

''میری کوشش ہوگی۔'' جان نے کہا۔ ''کیا خیال ہے تمہاری اسٹیٹ کا ایک چکر نہ لگایا جائے۔''

جولی کا چہرہ چمک اٹھا، اس نے چہک کر کہا۔ ''کیوں نہیں۔''

جان نے سارہ سے بات کرلی تھی کیونکہ وہ اب جولی کا معالج تھا اس لیے وہی اس کا ذمے دار بھی تھا۔ جولی نے اپنے عام سے لباس پر لمبا سرخ اور سیاہ فر والا گرم کوٹ پہن لیا کیونکہ اچھی خاصی سردی تھی۔ وہ باہر آئے۔ جولی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اس طرح کھلی جگہ سے آسمان دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے نا؟''

''تمہیں اور کیا اچھا لگتا ہے؟''

''گھومنا پھرنا اور نئی نئی جگہوں پر جانا مگر بچپن کے بعد باہر نکلنے کا موقع بہت کم ملا۔''

وہ ٹہلتے ہوئے عمارتوں سے آگے جنگل میں نکل آئے۔ جنگل اگرچہ صاف ستھرا تھا مگر یہاں درخت بہت اونچے اور گھنے تھے۔ درمیان میں کہیں کہیں روش بنی ہوئی تھیں مگر یہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ اندر نہیں گئے۔ جان نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ جگہ کیسی لگتی ہے؟''

''بالکل اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''یہ کم سے کم سو ملین ڈالرز کی اسٹیٹ ہے۔''

''ایک سو بارہ ملین ڈالرز کی میرے ڈیڈی نے لی تھی۔'' جولی بولی۔ ''اب اس کی قیمت اور بڑھ گئی ہوگی۔''

''بہت دولت مند ہونا تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

''بہت ساری دولت بیکار ہے جب تک آپ کو اسے خرچ کرنے کی آزادی نہ ہو۔''

وہ ٹہلتے ہوئے مینشن سے دور نکل گئے تھے۔ واپسی میں شارٹ کٹ کے لیے انہوں نے جنگل کا راستہ اختیار کیا۔ ایک جگہ سے جان اپنے خیال میں مینشن کی طرف مڑنے لگا تھا کہ جولی نے اسے روکا۔ ''یہ راستہ دیوار کی طرف جاتا ہے۔ ہمیں اس طرف جانا ہے۔''

وہ مینشن میں آئے تو جولی نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کہا۔ ''میرا آج کا دن بہت اچھا گزرا۔ اس کے لیے میں تمہاری شکرگزار ہوں۔''

واپسی میں جان، رومیلا کے کمرے میں آیا۔ وہ حسبِ معمول اسکرین کے سامنے بیٹھی تھی۔ جان نے اس سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جولی کے بارے میں؟''

جان نے سر ہلایا۔ ''پہلے میں نے سوچا کہ کال کروں لیکن پھر میں نے تم سے براہِ راست بات کرنا مناسب سمجھا۔ کیا تم کچھ وقت نکال سکتی ہو؟ آج شام، ہم کہیں ڈنر بھی کریں گے۔''

رومیلا مسکرانے لگی۔ ''کیوں نہیں۔''

''اٹالین چپ کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''مجھے پسند ہے۔''

''میں سات بجے انتظار کروں گا۔'' جان نے کہا۔

رومیلا ٹھیک سات بجے اٹالین چپ کے ڈائننگ ہال میں نمودار ہوئی۔ ایک ویٹر اس کی رہنمائی کرتا ہوا اسے جان کی میز تک لے آیا۔ جان نے اس کا استقبال کیا۔ رومیلا نے سنہری رنگ کا میکسی نما لباس پہنا ہوا تھا جو اس کے جسم پر جچ رہا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے لگے۔ رومیلا گریجویشن کے بعد سے ووڈ روز فیملی سے منسلک ہوگئی تھی۔ یہاں گھر جیسا ماحول اور اچھی تنخواہ مل

رہی تھی۔ پہلے اسے مینشن میں ہی .... دو کمروں کا کوارٹر ملا ہوا تھا جو اس کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔ مگر جب جولی آئی اور اسے دوبارہ جولی کی ذمے داری دی گئی تو اس نے اپنا پولس میں گھر لے لیا تھا۔ جان نے پوچھا۔ ''تمہاری ذمے داری ایک نرس کی سی ہے۔''

''کہہ سکتے ہو لیکن مجھے لوگوں کی مدد کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''افسوس کہ یہ فن مجھے نہیں آتا۔''

''میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا۔ ٹی وی پر تمہاری بیوی کی خودکشی کی خبر آئی تھی۔''

''میرے لیے وہ بہت مشکل وقت تھا۔'' جان نے گہری سانس لی۔ ''شادی کے پانچ سال ہم بہت خوش رہے۔ اس دوران میں ہمارا بیٹا بھی ہوا۔ مگر وہ پانی کے ٹب میں حادثاتی طور پر ڈوب گیا۔ اس کے بعد سے سب ختم ہو گیا۔ جولی، جیک کی موت کا ذمے دار خود کو سمجھتی تھی۔ وہ ماضی میں جینے لگی۔ حال سے اس نے اپنا رابطہ ختم کر لیا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اسے سنبھال لوں لیکن میں ناکام رہا۔''

''مجھے افسوس ہے لیکن یہ تمہارا قصور نہیں تھا۔'' رومیلا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''جولیٹ کے بعد تم نے پھر شادی کا نہیں سوچا؟''

''نہیں، بہت عرصے تک تو میں سنبھل نہیں سکا۔ اس کے لیے میں ڈاکٹر ایڈورڈ کا شکر گزار ہوں، وہ مجھے نارمل زندگی میں واپس لایا۔''

''وہ ووڈ روز فیملی کا دوست ہے لیکن مسٹر سائمن کی موت کے بعد وہ پھر مینشن نہیں آیا۔''

''سارہ کا اس سے رابطہ ہے اور مینشن نہ آنے کی وجہ میرا خیال ہے مسٹر ولیم کا طرزِ عمل ہے۔''

''تم مسٹر ولیم کا غلط تاثر لے رہے ہو۔ وہ بہت اچھا اور سلجھا ہوا آدمی ہے۔''

''لیکن وہ جولی کو نفسیاتی اسپتال بھیجنے پر تلا ہوا ہے۔'' جان کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا۔

''ایسا وہ اس کی بھلائی کے لیے چاہتا ہے۔''

جان اس سے متفق نہیں تھا اور اس سے بحث بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ ''تم نے شادی نہیں کی؟''

''نہیں، مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس سے شادی کا سوچ سکتی۔''

''پرو پوز تو کیا ہوگا؟''

''کئی مردوں نے کیا۔ میں نے کہا نا مجھے کوئی جچا نہیں، غلط فیصلہ کر کے پچھتانے سے بہتر ہے کہ میں اکیلی رہتی۔ میں آج تک اس فیصلے سے مطمئن ہوں۔''

جان پھر جولی کی طرف آ گیا۔ ''تم نے اسے بچپن سے دیکھا ہے۔''

''ہاں جب میں یہاں آئی تو وہ پانچ سال کی تھی۔ اصل میں دوسری شادی کے بعد میڈم سارہ کو ایک گورنس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جو جولی کی دیکھ بھال کر سکے۔''

''تم نے جولی کو کیسا پایا؟''

''بہت خاموش اور خود میں مگن رہنے والی بچی۔ اس کی دلچسپی شروع سے اپنے معمولات تک تھی۔ اس سے ہٹ کر اس کے لیے کوئی واقعہ یا بات قابلِ توجہ نہیں تھی۔''

''سوئمنگ پول والا واقعہ...؟''

''وہ خودکشی کی کوشش نہیں تھی۔'' رومیلا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''تب کوئی حادثہ تھا؟''

''یہ میرے سامنے کی بات ہے اور میرا خیال ہے کہ حادثہ بھی نہیں تھا۔ سارہ اور جولی پول پر تھے کہ سارہ کسی وجہ سے اندر آئی۔ اس وقت ایک گارڈ پول سے ذرا فاصلے پر تھا اور میں لاؤنج میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی کہ جولی نے اچانک پول میں چھلانگ لگا دی۔ وہ پانی میں گری اور اندر بیٹھتی چلی گئی، اس نے تیرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ وہ تیرنا جانتی تھی۔''

''اس کی حالت کیسی تھی؟''

''وہ کھانس رہی تھی اور اس کے ناک منہ سے پانی نکل رہا تھا مگر وہ ٹھیک تھی۔''

''سارہ کا اس بارے میں کیا کہنا تھا؟''

''کچھ نہیں، مگر دو دن پہلے طے ہوا تھا کہ جولی اب اسکول ہوسٹل میں رہ کر پڑھے گی۔''

''چاقو والا واقعہ؟''

''میرا خیال ہے وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ جولی کو کہیں سے چاقو مل گیا تھا اور وہ اس سے کھیلتی ہوئی سارہ کے پیچھے آئی۔ اس کا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔''

''اس کے بعد جولی اسکول میں رہی؟''

''بالکل جب تک اس کی ساتھیوں کے ساتھ زہر خورانی والا واقعہ پیش نہیں آیا۔'' رومیلا نے تصدیق کی۔ ''وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی اور امتحان اس نے خصوصی تیاری کے ساتھ بعد میں دیا۔ وہ پورے اسکول میں

پہلے نمبر پر رہی۔"

جان سوچ میں پڑ گیا۔ رومیلا نے پوچھا۔ "تم اس کا علاج کر رہے ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟"

جان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اس کی ہسٹری دیکھی ہے۔ بہ ظاہر وہ بہت سادہ نظر آتی ہے لیکن اس میں کہیں نہ کہیں پیچیدگی ضرور ہے، میں اس کا مروجہ علاج نہیں کر رہا ہوں۔"

"میں نے تمہارے طریقے کے بارے میں سنا ہے اور میں تو تمہاری مداح ہوگئی ہوں۔ یہ نفسیات کے شعبے میں بہت بڑی پیش رفت ہے۔"

"ممکن ہے ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ کچھ عرصے بعد اسے بے سود قرار دے دیا جائے۔ دماغ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا سب سے مشکل ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یوں سمجھو کہ جب ہم کسی مریض کا علاج کرنے جا رہے ہوتے ہیں جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو تو درحقیقت ہم دنیا کی سب سے طاقتور مشین کا مقابلہ کرنے جا رہے ہوتے ہیں.... کبھی ہم کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکام ہو جاتے ہیں۔" جان نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ "جب جولی ہوسٹل چلی گئی تب بھی تم ووڈ روز مینشن میں رہیں؟"

"ہاں سارہ نے میری ذمے داری بدل دی۔ میں اس کی پرسنل سیکریٹری بن گئی۔ پھر جب جولی واپس آئی تو مجھے دوبارہ اس کی ذمے داری سونپ دی گئی۔"

"تم اس کی نگرانی کرتی ہو؟"

"ہاں کیونکہ اب وہ ایک جوان لڑکی ہے اور اسے کسی کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ کام اچھا لگتا ہے؟"

رومیلا ہچکچائی۔ "نہیں... مجھے کسی کی نگرانی کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"اس سے قطع نظر تم نے کبھی جولی کا کوئی غیر معمولی رویہ ریکارڈ کیا؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "وہ جب سے آئی ہے نارمل ہے۔ اس نے خود کو یا کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ پچھلے کچھ عرصے سے اس کا طرزِ عمل عجیب سا ہے۔ اس نے کھانا ترک کر دیا ہے اور بہت کم سوتی ہے۔"

"اس کا کمرا ہمہ وقت زیرِ نگرانی رہتا ہے؟"

"پورا ہفتے چوبیس گھنٹے۔" رومیلا نے جواب دیا۔

"دن میں تم ہوتی ہو لیکن رات میں کون نگرانی کرتا ہے؟"

"ہمہ وقت تو نہیں لیکن ولیم اور سارہ باری باری چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ویسے کیمرے آن ہی ہوتے ہیں، ان کی ریکارڈنگ بعد میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔"

ڈنر سرو ہونے لگا تو دونوں کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس دوران میں وہ ہلکی پھلکی ایک دوسرے کی دلچسپی کی باتیں کرتے رہے اور بہت عرصے بعد جان نے محسوس کیا کہ وہ ایک زندہ انسان ہے، اس کے بھی احساسات اور جذبات ہیں۔ جولیٹ کے بعد وہ خود کو بے جان اور احساس سے عاری فرد محسوس کرنے لگا تھا۔ رومیلا کی قربت نے اس میں زندگی پیدا کر دی تھی۔ ڈنر کے بعد وہ اسے چھوڑنے گیا۔ اتفاق سے رومیلا کا گھر نزدیک ہی تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑے۔ غیر محسوس انداز میں رومیلا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جب وہ گھر کے پاس آئے تو رومیلا اندر جانے سے پہلے ذرا ہچکچائی۔ پھر اچانک اس نے جان کو پیار کیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک گئی۔ اس نے تالا کھولا اور اندر جانے سے پہلے جان کی طرف دیکھا۔ جان سحر زدہ سا کھڑا اپنے ہونٹوں پر نرم گرم لمس محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ چونکا۔ دروازہ کب کا بند ہو گیا تھا اور وہ اسے گھورے جا رہا تھا۔ واپس جانے سے پہلے اس نے ایسے ہی مخالف سمت میں دیکھا تو اسے ایک لڑکی دو مکان آگے گلی میں جاتی نظر آئی۔ اس نے ویسا ہی سرخ اور سنہری فر والا کوٹ پہنا ہوا تھا جیسا کہ اس نے جولی کو مینشن کی سیر کے دوران میں پہنے دیکھا تھا۔ جان نے اس کی بس ایک لمحے کو جھلک دیکھی تھی اور اسے لگا کہ وہ جولی ہے۔

"جولی یہاں کیسے آسکتی ہے؟" اس نے خود سے کہا۔ "وہ تو اپنے گھر میں قید ہے۔"

اپنا شک مٹانے کے لیے وہ گلی کے سرے تک آیا جس میں وہ لڑکی گئی تھی مگر اب دور تک گلی خالی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

جان ڈرائیو کر رہا تھا اور موبائل پر ڈاکٹر ایڈورڈ سے بات کر رہا تھا۔ "کل میں نے جولی کو اینا پولس میں دیکھا۔ رومیلا کے گھر کے پاس۔"

"یہ ناممکن ہے۔ وہ مینشن کیا اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکل سکتی۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں نے دیکھا ہے۔"

"تمہیں دھوکا ہوا ہوگا تم نے جولی جیسی کسی لڑکی کو

دیکھا ہوگا۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ اس دوران میں جان ووڈ روز مینشن کے گیٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے کال ختم کی اور آگے ہو کر کیمرے کی طرف چہرہ کیا۔ چند لمحے بعد گیٹ کھلنے لگا اور چند منٹ بعد وہ جولی کے سامنے تھا۔

''تم یہاں سے باہر جا سکتی ہو؟'' جان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ پنسل استعمال کرتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔''

''فرض کرو تم یہاں سے باہر جانا چاہو تو؟''

جولی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیسے سوال کر رہے ہو جبکہ تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ لاک رہتا ہے اور میں چوبیس گھنٹے کیمرے کی نگرانی میں ہوتی ہوں۔ اگر میں کمرے سے نکل بھی جاؤں تو پورے مینشن میں جگہ جگہ لگے کیمروں سے بچ نہیں سکوں گی۔ گارڈ مجھے دیکھ لیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہاں سے باہر جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ صرف سارہ، ولیم یا کنٹرول روم کا گارڈ کھول سکتا ہے۔''

''وہ صرف دن میں ہوتا ہے۔'' جان نے کہا۔

''درست ہے رات کو کیمروں پر کوئی نہیں ہوتا لیکن وہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور سب ریکارڈ کرتے ہیں۔''

جان اسٹول پر مخصوص پوز بنا کر بیٹھا ہوا تھا اور جولی اس کا پنسل اسکیچ بنا رہی تھی۔ جولی نے آتے ہی اس سے اسکیچ بنوانے کا مطالبہ کیا تھا اور جان نے مان لیا۔ جولی دوبارہ بورڈ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کل میں نے تمہارے جیسی ایک لڑکی دیکھی۔''

جولی کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''وہ میرے جیسی ہوگی لیکن میں نہیں ہوں گی۔''

''شاید۔'' جان بولا۔ ''لیکن اس نے کوٹ بھی بالکل تمہارے جیسا پہنا ہوا تھا۔''

''یہ مکمل ہو گیا۔'' جولی نے پنسل رکھ دی۔ اس نے جان کی بات نظرانداز کر دی تھی۔ جان کو ایسا لگا کہ وہ جان بوجھ کر نظرانداز کر رہی ہے اس لیے اس نے بھی موضوع بدل دیا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

''ابھی نہیں۔'' جولی نے بورڈ جان کے چرمی بیگ میں رکھ دیا۔ ''اسے گھر جا کر دیکھنا۔''

''سیشن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں تیار ہوں۔'' وہ بولی۔ ''عجیب بات ہے مجھے اس میں مزہ آنے لگا ہے۔ اگر میں ٹھیک ہو گئی اور اپنی دولت حاصل کر لی تو میں تمہیں مستقل اپنے پاس جاب پر رکھ لوں گی، ہم ہر روز ماضی میں جائیں گے۔''

جان نے لیپ ٹاپ اور سامان نکالا۔ ''یہ علاج ہے، تفریح نہیں ہے۔''

جولی مسکرائی۔ ''تمہیں معلوم ہے ایک جرمن ڈاکٹر نے جب مارفین سے ہیروئن بنائی تو اس نے اسے دوا قرار دیا تھا۔ آج لوگ اس سے تفریح لیتے ہیں۔''

''یہ نشہ ہے۔''

''ہر چیز نشہ ہوتی ہے جس کا انسان عادی ہو جائے۔'' جولی اس کے سامنے آ بیٹھی۔ ''مجھے لگتا ہے میں بھی اس چیز کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔ مجھے اپنے ماضی میں جانا اچھا لگنے لگا ہے۔''

جان نے اس کے ائرپلگ اور الیکٹروڈ لگایا۔ ''پہلے تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا اور ممکن ہے کچھ عرصے بعد تم بور ہو جاؤ۔''

''آج میں کہاں جاؤں گی؟''

''جب تمہاری ساتھی لڑکیوں کے ساتھ زہرخورانی کا واقعہ پیش آیا تھا۔''

جولی سنجیدہ ہو گئی مگر اس نے کچھ کہا نہیں صرف سر ہلایا۔

☆☆☆

جان دیکھ رہا تھا، این راہداری میں جا رہی تھی کہ اسکول وارڈن مس کمیلا نے اسے روک لیا۔ اس نے این سے کہا۔ ''کل پرنسپل کے دفتر سے وہسکی کی بوتل چوری ہوئی ہے کیا تم اس کے بارے میں جانتی ہو؟''

اسی لمحے جولی قریب اپنا لاکر کھول رہی تھی، اس نے چونک کر این اور مس کمیلا کی طرف دیکھا۔ این کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ منظر بدلا اور اپنے کمرے میں این، کاٹی اور میرل وہسکی پی رہے تھے اور اس ایڈونچر پر خوش ہو رہے تھے۔ دروازہ ذرا کھلا تھا اور وہاں سے گزرتے ہوئے جولی نے یہ سب دیکھا۔ منظر پھر بدلا اور دوبارہ راہداری میں جولی، این اور مس کمیلا نظر آنے لگے۔ این سے پوچھنے کے بعد مس کمیلا نے جولی سے پوچھا۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

جولی نے این کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا مگر جولی نے انکار کیا۔ ''نہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتی۔''

مس کمیلا وہاں سے چلی گئی اور جولی اپنا لاکر بند کر کے آگے بڑھی تو این لپک کر اس کے پیچھے آئی۔ اس نے

آہستہ سے کہا۔ ''میں اس دن کی حرکت پر شرمندہ ہوں۔''

''اوہ یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟''

''ہم دوست ہی ہیں، دشمن نہیں بن گئے ہیں۔'' جولی بولی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

منظر پھر بدلا اور ہوسٹل کے لیونگ روم میں این، کاٹی اور میرل میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہ چائے پینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک طرف جولی صوفے پر سمٹی بیٹھی اسکیچ بنا رہی تھی۔ این سب کے لیے چائے ڈالنے لگی تو اس نے جولی سے پوچھا۔ ''تم بھی چائے پیو گی؟''

''نہیں شکریہ۔'' جولی نے جواب دیا۔

''سچ میں، چائے تم نے بنائی ہے۔''

''ہاں، لیکن مجھے طلب نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے تمہارے لیے بنائی ہے۔'' جولی مسکرائی اور اپنے کام میں لگ گئی۔ این نے تین کپوں میں چائے نکالی اور وہ سب اپنی پسند کا دودھ اور چینی شامل کر کے پینے لگیں۔ سیڈ لاؤنج میں آئی اور چہک کر بولی۔

''چائے پی جا رہی ہے۔''

''تم بھی لے لو۔'' جولی نے کہا تھا کہ اچانک کاٹی نے اپنا گلا پکڑ لیا اور کھانسنے لگی۔ پھر این اور میرل بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ این کھانسی کی شدت سے نیچے جھکی اور اس نے میز کا سہارا لینے کی کوشش کی تو کیتلی الٹ کر نیچے گری اور ٹوٹ گئی۔ چائے فرش پر پھیل گئی تھی۔ این نیچے جھکی ہوئی تھی اور پھر اس کے کھلے منہ سے خون کا فوارہ نکلا تھا۔ میرل اور کاٹی سانس لینے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ جولی اور سیڈ پریشان ہو کر کھڑی ہو گئیں اور سیڈ چلانے لگی، وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ پھر منظر بدلا اور ایمبولینس میں ان تینوں کو لے جایا جا رہا تھا۔ میرل اور کاٹی پلاسٹک کے کفن میں تھیں۔ جبکہ این کو پیرامیڈک طبی امداد دے رہے تھے۔

منظر پھر بدلا اور پولیس والے استاد کارل مین کو ہتھکڑی لگا کر لے جا رہے تھے اور وہ چیخ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا، وہ بے گناہ ہے۔ جب وہ جولی کے سامنے سے گزرا تو اچانک اس نے جولی پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر پولیس والوں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ بے بس ہونے کے بعد چیخ چیخ کر جولی کو گالیاں دے رہا تھا۔ جولی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھی تھی کہ ایک پولیس والے نے اسے روک دیا۔

''تم اس کے پاس نہیں جا سکتیں۔''

''مجھے اس سے بات کرنی ہے۔''

''وہ مشکوک ہے اور فی الحال اس سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔''

''مجھے اس سے بات کرنی ہے۔'' جولی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

جان جو جولی سے ذرا دور کھڑا ہوا تھا، اس نے حکم دیا۔ ''واپس آ جاؤ۔''

جولی نے آنکھیں کھولیں۔ ''تم نے واپس کیوں بلا لیا؟''

''کارل مین تمہیں برا بھلا کہہ رہا تھا؟''

''میں بھی جاننا چاہتی تھی۔'' جولی بولی۔ ''لیکن مجھے آج تک پتا نہیں چلا۔''

''یہ اتنا اہم نہیں ہے، تم نے اس کا کھلونا بننے سے انکار کیا تھا اس لیے اسے تم پر غصہ ہو گا اور جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے جاتے جاتے تم پر اپنا غصہ نکالا۔''

جولی سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہی وجہ ہو سکتی ہے۔''

انہوں نے لنچ ساتھ کیا تھا۔ جولی حسب وعدہ ٹھیک سے کھا رہی تھی۔ اب وہ خود پر بھی توجہ دینے لگی تھی، اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا اور جدید فیشن کے لباس میں تھی۔ جان نے اس کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی۔ ''رئیلی میں اچھی لگ رہی ہوں؟''

''تم بہت خوب صورت ہو۔'' جان نے سر ہلایا۔ ''میں صرف رسمی نہیں کہہ رہا۔''

''تھینک یو۔'' جولی نے کہا اور اس کے گال پر پیار کیا۔

جان واپس آیا تو اسے رومیلا کا خیال آیا مگر آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چھٹی پر تھی۔ اس نے گھر آ کر اپنے بیگ سے جولی کا بنایا ہوا اسکیچ نکالا اور حیران رہ گیا۔ جولی نے ہو بہو اس کے خدوخال کاغذ پر اتار دیے تھے، حد یہ کہ آنکھوں کا تاثر تک موجود تھا۔ اس نے دل میں اعتراف کیا کہ وہ بہت اچھی آرٹسٹ تھی۔ اس نے اسکیچ پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے لکھا تھا۔ ''جان کے لیے جو میرا محافظ ہے۔''

''یہ لڑکی مجھ سے کچھ زیادہ ہی اٹیچ ہو گئی ہے۔'' جان نے سوچا اور مسکرا دیا۔ یہ بات اسے اچھی لگی کہ جولی اس پر بھروسا کرنے لگی تھی اور اسے اپنا محافظ سمجھتی تھی۔ یہ اس کے لیے اضافی آسانی تھی ورنہ عام طور سے مریض نفسیاتی معالج سے محتاط رہتے ہیں۔ مگر وہ اب تک اس کی نفسیاتی الجھن کے

گرے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ معلومات ضرور حاصل کر رہا تھا مگر فی الحال وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ جولی کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکے۔ اس نے محسوس کیا کہ صرف جولی کے سیشن سے کام نہیں چلے گا، اسے اس معاملے میں مزید کھوج کرنا ہوگی۔ اسے جولی کے ماضی تک جانا ہوگا اس ماضی تک جو اس کے مسائل کی وجہ ہے۔

☆☆☆

جولی اسے اپنے البم کی تصاویر دکھا رہی تھی۔ ان میں اس کے اسکول کی ساری لڑکیاں تھیں جو اس کے بیچ سے تعلق رکھتی تھیں۔ البتہ سیڈ کے ساتھ اس کی خاص الگ سے تصویر تھی جس کے نیچے جولی نے لکھا تھا۔ ''سیڈ جو اس دنیا میں میری سب سے اچھی دوست ہے۔''

''تم سیڈ سے زیادہ قریب رہی ہو؟''

''ہاں کیونکہ وہ مجھے اچھی لگی۔ سادہ اور آسانی سے بات مان لینے والی۔''

''تمہاری اور لڑکیوں سے بھی دوستی رہی۔''

''بہت کم، تم جانتے ہو میں خود میں مگن رہنے والی لڑکی ہوں۔''

''رومیلا تمہیں کیسی لگتی ہے؟'' جان نے پوچھا۔

''رومیلا۔'' جولی سوچ کر بولی۔ ''بس ٹھیک ہے میرا اس سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہے۔''

''بچپن میں وہ تمہاری گورنس تھی۔''

''ہاں لیکن اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔'' جولی کا لہجہ سرد تھا پھر اس نے اچانک جان سے سوال کیا۔ ''رومیلا تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

''مجھے...؟'' جان ایک لمحے کو رکا۔ ''ٹھیک لگتی ہے۔''

''وہ خوب صورت عورت ہے نا؟'' جولی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کسی بھی مرد کو متاثر کر سکتی ہے۔''

جان کو لگا جیسے جولی اندر سے رومیلا کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرتی تھی اور اب بھی اس کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا۔ ''یہ تو ہے۔'' جان نے کہا۔ ''آج کے سیشن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

جولی خوش ہو گئی۔ ''میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی۔''

''آج ہم تمہارے بچپن میں جائیں گے۔'' جان نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ولیم، سارہ سے تیز لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''دیکھو ہمارے طبقے میں بچوں کو تعلیم کے لیے دور بھیجا جاتا ہے اگر جولی چلی جائے گی تو اس میں کیا حرج ہے؟''

''میں اس سے دور نہیں رہ سکتی۔'' سارہ بولی۔ ''وہ عام بچی نہیں ہے، اسے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔''

''جو اسے ہم نہیں دے سکتے۔'' ولیم چلایا۔ ''اسے کسی اچھے ہوسٹل اسکول میں داخل کرنا ہوگا۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہو۔''

''کیونکہ میں اس کی ماں ہوں اور تم اس کے باپ نہیں ہو۔'' سارہ جواباً چلائی۔

جولی اپنی گڑیا سینے سے لگائے آفس کے دروازے کے پاس کھڑی تھی اور ان دونوں کو لڑتا دیکھ رہی تھی۔ جان، جولی کے پیچھے موجود تھا۔ ولیم اب سارہ کو گھور رہا تھا۔ ''اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا۔ ہم دونوں اس کے گارجین ہیں۔''

''جولی کی گارجین میں ہوں۔'' سارہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کی مجاز صرف میں ہوں۔''

''یعنی میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' ولیم نے غصے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پھر منظر بدلا اور جولی اسی آفس کے دروازے کے باہر موجود تھی اور اندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جن کا سننا چھ سات سال کی بچی کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا۔ جان اسے دروازے سے دیکھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ ہاں وہ اسے واپس بلا سکتا تھا مگر اب وہ خود... پُرتجسس تھا۔ آج اس نے جولی سے کہا کہ وہ اپنی ان یادوں میں جائے جنہیں وہ سب سے زیادہ ناپسند کرتی ہے۔ جولی نے پہلے سے تھوڑے کھلے دروازے کو دھکیلا۔ تب اس نے اور جان نے دیکھا کہ آفس کا کاؤچ پر ولیم اور رومیلا ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور کوئی آ کر انہیں دیکھ سکتا ہے۔ پھر ولیم کو احساس ہوا اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اپنا لباس درست کرتا ہوا جولی کی طرف آیا۔ وہ سہم گئی۔ ولیم نے اس کا بازو پکڑ کر درشت لہجے میں کہا۔

''جاسوس لڑکی، ابھی میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جاسوسی کرنے والوں کو کیا سزا دی جاتی ہے۔''

رومیلا بھی اپنا لباس درست کرتی آئی اور اس نے ولیم سے کہا۔ ''اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اب یہ اپنی ماں کو بتا دے گی۔''

''نہیں بتائے گی، میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔'' ولیم نے کہتے ہوئے جولی کو گود میں اٹھا لیا۔ منظر بدلتا ہے اور ولیم جولی کو اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ وہ مچل رہی ہے اور چلا رہی ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ مگر ولیم اس کی پروا کیے بغیر اسے ایک چھوٹی سی الماری میں دھکیل کر بند کر دیتا ہے۔ جولی چلا رہی ہے اور اندر سے دروازے پر ہاتھ مار رہی ہے۔ اس کی چیخیں بہت بلند اور ہذیانی تھیں۔ جان وہاں موجود تھا، اس نے کہا۔ ''واپس آؤ۔''

مگر جولی نہیں آئی، وہ چلاتی رہی۔ وہ واپس نہیں آئی تھی پھر منظر بدل گیا۔ جان کیمسٹری لیب میں تھا جہاں جولی اپنے دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ لیب میں فوٹو گرافس ٹیکنیو پروسیس کر رہی تھی۔ جان سوچ رہا تھا کہ وہ واپس کیوں نہیں جا رہی۔ پھر جولی ایک ٹرے اٹھا کر سنک تک گئی، اس نے کیمیکل سنک میں الٹ دیا اور نل کھول کر ٹرے دھوئی۔ اس کے بعد نل بند کیے بغیر ٹرے لے کر واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس نے معنی خیز نظروں سے جان کی طرف دیکھا تھا۔ سنک میں پانی بھر رہا تھا پھر وہ بھر کر فرش پر بہنے لگا اور بہتا ہوا جان کے جوتوں تک آ گیا اس نے نیچے دیکھا اور جب دوبارہ نظر اٹھائی تو وہ لیب میں اکیلا تھا۔ پھر منظر بدل گیا اور جان نے ٹب کے سرخ پانی میں جولیٹ کی لاش تیرتی ہوئی دیکھی۔ اس نے جولیٹ کی لاش سینے سے لگا لی اور اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ میز پر اکیلا تھا اور لیپ ٹاپ پر سوفٹ ویئر کی جگہ سرخ گلابوں والا اسکرین سیور آ رہا تھا۔ جولی کو اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم کیسے واپس آ گئیں؟''

جولی نے شانے اچکائے۔ ''پتا نہیں لیکن جب وہ مجھے الماری میں بند کرنے لے جا رہا تھا تو میں نے سوچا کہ میں کسی صورت الماری میں بند نہیں ہوں گی۔ اس تصور سے میرا دم گھٹنے لگا تھا، میں نے خود کو واپس یہاں پایا اور تم وہیں تھے۔ پھر تم نے چلا کر کہا کہ میں واپس آ جاؤں تو میں نے تمہیں آواز دی کہ میں واپس آ گئی ہوں۔''

جان الجھ رہا تھا۔ ایک تو اس نے رومیلا کو جس روپ میں دیکھا تھا، یہ اس کے لیے دھچکا تھا۔ اگرچہ یہ بہت پرانی بات تھی مگر اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رومیلا ایک شادی شدہ مرد سے تعلق رکھے گی جو اس کا باس بھی تھا۔ پھر جولی غیر متوقع طور پر سیشن سے از خود واپس آ گئی۔ جان ذاتی طور پر پچاس سے زائد سیشن کر چکا تھا اور ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کا معمول از خود واپس آیا ہو۔ تکنیکی طور پر یہ ممکن نہیں تھا مگر یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس نے سوفٹ ویئر کا جائزہ لیا اگر اس میں کوئی خرابی آئی تھی تو صرف اس کا ماہر ہی پکڑ سکتا تھا۔ بہ ظاہر تو سوفٹ ویئر ٹھیک تھا اور اس نے معمول کے مطابق کام کیا تھا۔ جان نے لیپ ٹاپ اور آلات واپس بیگ میں رکھے اور کھڑا ہو گیا۔ جولی نے پوچھا۔ ''تم جا رہے ہو؟''

''ہاں آج میں ذرا مصروف رہوں گا۔''

''پھر کب آؤ گے۔'' جولی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

جان نے اسے دیکھا۔ ''جلد...''

جولی نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ تم نے دیکھا میرے اردگرد جو لوگ ہیں، انہیں میری کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھے کسی کے ساتھ وہ احساس نہیں ہوتا جو تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔''

جان نے اس کا سر تھپتھپایا۔ ''مجھے بھی تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ میں شاید کل آؤں۔''

جولی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیا تم مجھے بچاؤ گے، میرا تحفظ کرو گے؟''

''میں کروں گا۔'' جان نے وعدہ کیا۔

''مجھے یقین ہے۔'' جولی نے اعتماد سے کہا۔

وہ ووڈ روز مینشن سے نکلا اور اس نے راستے میں ڈاکٹر ایڈورڈ کو کال کی۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''فی الحال تو میں نیویارک میں ہوں۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے جواب دیا۔ ''میری بہن کرسٹینا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ جان بچ گئی ہے لیکن وہ آئی سی یو میں ہے۔''

''اوہ، میری طرف سے افسوس قبول کرو۔'' جان نے کہا۔ ''تمہاری واپسی کب تک ہوگی؟''

''کل۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''لیکن میں دو دن بعد آفس آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تین دن بعد تم سے ملنے آؤں گا۔ اہم بات کرنی ہے۔''

☆☆☆

رفتہ رفتہ جولی کے ماضی کے اسرار کھل رہے تھے۔ وہ اپنے باپ سے بہت قریب تھی۔ اس کی پُراسرار موت اور پھر ولیم کو سوتیلے باپ کے روپ میں قبول نہ کرنے سے اس کے اندر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اسے کچھ ناکردہ کاموں کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ ولیم کے طرزِ عمل سے ظاہر تھا کہ وہ جولی سے کیسا رویہ رکھتا تھا۔ مگر سب سے زیادہ دھچکا

اسے رومیلا اور ولیم کے تعلق سے پہنچا تھا۔ ولیم اس کا سوتیلا باپ تھا اور وہ اس کی ماں کو دھوکا دے اس کی سیکریٹری اور جولی کی گورنس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ اب تک جان نے محسوس کیا تھا کہ جولی کا نفسیاتی مسئلہ اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ اسے پیش کیا جا رہا تھا۔ غیر معمولی شخصیت ہونے کے باوجود وہ ایک نارمل لڑکی تھی اور ہرگز اس قابل نہیں تھی کہ اسے کسی نفسیاتی اسپتال بھیج دیا جاتا۔ اس صورت میں عین ممکن تھا کہ وہ سچ مچ نفسیاتی مریض بن جاتی۔ پھر جان اور رومیلا کے درمیان جو تعلق بن رہا تھا، اس سینشن نے یک دم ہی اسے دھندلا دیا تھا۔ شاید اس کی قسمت میں اکیلا پن ہی تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے موبائل کی بیل بجی۔ یہ رومیلا تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہائے جان کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں تم اب کیسی ہو؟'' جان باوجود کوشش کے اپنے لہجے میں گرم جوشی نہ پیدا کر سکا تھا۔ وہ خود کو یاد دلاتا آیا تھا کہ یہ بہت پرانی بات تھی لیکن اس کے باوجود اس کا دل تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں تھا۔ ''تم نے طبیعت خرابی کی وجہ سے آج چھٹی کی ہے؟''

''ہاں۔'' رومیلا کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ ''میں بہت تنہائی محسوس کر رہی ہوں، کیا تم آ سکتے ہو؟''

اشارہ بہت واضح تھا مگر یہ بھی جان کے اندر جم جانے والی برف کو نہیں پگھلا سکا۔ ''سوری میں ابھی ووڈ روز مینشن سے آ رہا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔''

رومیلا خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ''اس اوکے، بائے۔''

''بائے۔'' جان نے کال کاٹ دی۔ اس نے موبائل دروازے کے ساتھ سامان والے ریک پر ڈال دیا۔ اس پر جولیٹ کی تصویر فریم میں مسکرا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے جان کو خیال آیا کہ اس کی مسکراہٹ جولی سے کتنی مل رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی مگر پھر وہ بجھ گئی۔ اسے یاد آیا۔ وہ جولیٹ کو بچا نہیں سکا تھا۔ اس نے شادی کے وقت جولیٹ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر تحفظ دے گا مگر وہ ناکام رہا۔ اب اس نے جولی سے بھی وعدہ کیا تھا، کیا وہ اسے تحفظ دے سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ صرف ایک معالج ہے۔ سارہ اور ولیم کسی وقت بھی مینشن کے دروازے اس پر بند کر سکتے ہیں۔ اسے جولی سے ملنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے جولی سے وعدہ کر لیا تھا۔ اس کی معصومیت اور سہمے انداز نے جان کا دل چھو لیا تھا۔ وہ ننھی سی بچی لگی جو اس سے تحفظ کی طلب گار تھی۔

اس دن اسے اپنی طبیعت بوجھل لگی تھی۔ رات نیند بھی بہت دیر سے آئی اس لیے اگلے دن وہ دیر تک سوتا رہا۔ اسے لگا کہ درمیان میں اس کے موبائل کی بیل بجی تھی مگر وہ بیدار نہیں ہوا۔ دوبارہ بیل بجی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس بار بھی بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر اس کے دماغ نے اشارہ دیا کہ اس کی کال ہے اور اس نے موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف جولی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جان یہاں کچھ ہوا ہے میرے کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہے اور کوئی مجھے جواب نہیں دے رہا پلیز تم یہاں آ جاؤ۔ میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں لیکن تم ریسیو نہیں کر رہے تھے۔''

''میں آ رہا ہوں۔'' جان نے کہا اور دس منٹ بعد ہائی وے پر سوسے اوپر رفتار سے مینشن کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے کا فاصلہ اس نے مشکل سے چالیس منٹ میں طے کیا اور مینشن پہنچ گیا۔ کار سے اتر کر وہ بھاگتا ہوا مینشن میں داخل ہوا اور اندر آتے ہی ٹھٹک گیا۔ سیڑھیوں کے عین نیچے موجود میز اور گلدان فرش پر ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے اور خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کا دل رک سا گیا۔ یہاں کچھ ہوا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اوپر آیا تو کنٹرول روم میں اسے ولیم، مائیک سے بات کرتا دکھائی دیا۔ وہ اند آیا۔

''کیا ہوا ہے یہاں؟''

''رومیلا تیسرے فلور سے نیچے گری ہے۔'' ولیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''گردن پر شدید ضرب آنے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔''

''میرے خدا وہ کیسے گری؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اسے جولی نے دھکا دیا مگر ہماری قسمت کہ اس نے اس خاندان سے تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا ہے کہ وہ اپنی غلطی سے نیچے گری ہے۔'' ولیم نے کہا اور پلٹ کر اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے دکھاؤ۔''

مائیک نے کی بورڈ کا بٹن دبایا تو اسکرین پر رومیلا ایک چیخ کے ساتھ پشت کے بل الٹ کر نیچے گرتی دکھائی دی تھی۔ یہ صرف دو سیکنڈ کی ویڈیو تھی۔ رومیلا سے آگے اندھیرا تھا۔ ''میرے خدا۔'' جان نے پھر کہا۔ ''کیا کسی اور کیمرے نے اسے ریکارڈ نہیں کیا۔''

''یہاں بلائنڈ اسپاٹ ہے۔'' مائیک نے معذرت کی۔
''مگر پیچھے تاریکی ہے۔'' جان نے اسکرین کی طرف دیکھا جس پر رومیلا کے گرنے کا منظر بار بار دکھایا جا رہا تھا۔ ''یہاں روشنی ہونی چاہیے تھی۔''
''یہاں کی روشنی بند تھی۔'' ولیم نے کہا۔
''جولی کا کمرا لاک ہوتا ہے، وہ باہر کیسے آئی؟''
''کوئی نہیں جانتا۔'' ولیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن رومیلا کے گرنے کے بعد اس کا کمرا ان لاک پایا گیا جسے سارہ نے دوبارہ لاک کر دیا۔''
''یعنی جولی اپنے کمرے میں ہے؟''
مائیک نے اسکرین آن کی تو اس پر جولی نظر آنے لگی۔ وہ مضطرب انداز میں ٹہل رہی تھی۔ جان نے نظر جما کر ولیم کو دیکھا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیسے آیا؟''
''مجھے کیسے معلوم ہوگا؟'' اس نے بدمزگی سے کہا۔
''مجھے جولی نے فون کیا اور اس نے بتایا کہ باہر کوئی گڑبڑ ہے اور اسے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس نے رومیلا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''
''رومیلا نے مجھے اور سارہ کو خود بتایا ہے۔'' ولیم بولا۔ ''جولی جھوٹ بول رہی ہے۔''
اسی دوران میں سارہ وہاں آ گئی، اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن اس میں جولی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ حواس میں نہیں تھی۔''
''جب میں تم سے یہ بات کہتا تھا تو تم مجھے جھٹلاتی تھیں۔'' ولیم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو اس کے ساتھ مسئلہ ہے، وہ کسی بھی وقت خطرناک بن سکتی ہے اور وہ بن گئی۔ اب بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اسے کسی مستقل علاج گاہ منتقل کیا جائے۔''
''اس کا علاج ہو رہا ہے۔'' سارہ نے کمزور سے لہجے میں کہا۔
''جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔'' ولیم کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔
''مسٹر ولیم۔'' جان نے مداخلت کی۔ ''جب رومیلا نے پولیس کو بیان نہیں دیا ہے تو تم کیوں اصرار کر رہے ہو؟''
''کیونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ خطرناک ہے۔''
''اتنی جلدی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔'' جان کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''جولی کا کمرے سے باہر آنا مجھ سے بالاتر ہے۔ آخر وہ باہر سے لاک کیسے کھول سکتی ہے؟''
''شاید اس کے پاس کوئی اضافی چابی ہو۔'' ولیم بولا۔
''اس لاک کی صرف دو چابیاں ہیں۔'' سارہ نے کہا۔ ''ایک رومیلا کے پاس ہوتی ہے اور دوسری میرے پاس ہے۔''
''اس لیے جب تک کوئی باہر سے لاک نہ کھولے جولی باہر نہیں آ سکتی......'' جان نے کہا۔ ''اب سوال یہ ہے کہ باہر سے لاک کس نے کھولا؟... اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کمرے کے باہر کی لائٹ کس نے بند کی اور رومیلا اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی؟''
''اس کا کہنا ہے کہ گزشتہ روز چھٹی کے بعد وہ جلدی آ گئی تھی، اسے کچھ کام نمٹانے تھے۔'' ولیم نے کہا۔ ''وہ روشنی چیک کرنے اس حصے میں آئی تھی کہ جولی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے باہر نکل کر اسے نیچے دھکیل دیا۔''
''یہاں تاریکی ہوتی ہے؟'' جان نے اس اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں دوسرے کیمروں کی ریکارڈنگ بھی دیکھنی چاہیے اور یہ بھی کہ یہاں کی روشنی کب بند ہوئی۔''
آدھے گھنٹے میں انہوں نے تمام کیمروں کی ریکارڈنگ دیکھ لی تھی۔ مائیک نو بجے ڈیوٹی پر آیا اور اس نے کچھ اسپیشل ایفکٹس استعمال کر کے بھی دیکھا جن سے ریکارڈنگ صاف ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی دوسرے فرد کی ایک جھلک دیکھنے سے بھی قاصر رہے۔ جولی کے کمرے کے سامنے والی لائٹ رات بارہ بجے کے بعد چند لمحے جھپکنے کے بعد بند ہو گئی تھی۔ لیکن ایسا لائٹ کی خرابی کی وجہ سے نہیں تھا کیونکہ صبح اس کا بٹن آف پایا گیا تھا۔ جولی کے کمرے میں اس وقت اندھیرا تھا اس لیے اس کی ریکارڈنگ سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ جولی مکمل اندھیرے میں سونے کی عادی تھی۔ سارہ چیخ سن کر اپنے فرسٹ فلور کے بیڈ روم سے باہر آئی اور اس نے رومیلا کو فرش پر بکھرے پایا۔ اس نے فوری طور پر ایمبولینس کے لیے کال کی اور رومیلا کو اسپتال منتقل کیا۔ اب سارہ فکر مند تھی اور بجا طور پر اسے جولی کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ جان نے کہا۔
''کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا حتمی تعین لازمی ہے کہ جولی باہر کیسے آئی۔ اگر یہ اسی کا کام ہے تو...؟''
اس پر ولیم غصے میں کنٹرول روم سے چلا گیا۔ سارہ نے جان سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

سارہ اسے تیسرے فلور کے ایک کمرے میں لائی۔ اس نے اندر آتے ہی مضطرب لہجے میں کہا۔ ''میں بہت مشکل میں پڑ گئی ہوں۔''

''جولی یا مسٹر ولیم کے حوالے سے؟''

''دونوں کے حوالے سے۔'' سارہ نے کہا۔ وہ اپنا ماتھا سہلا رہی تھی۔ ''دونوں میرے لیے مسئلہ بن گئے ہیں۔ میرے خدا جولی نے یہ کیا، کیا؟''

جان نے آہستہ سے کہا۔ ''جولی تمہاری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ اس کی زندگی پر بہت زیادہ اثرانداز ہو سکتا ہے۔ میں پُرامید ہوں کہ جلد اس کے مسئلے کی جڑ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا ہے خوب سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے کرنا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں لیکن ولیم...'' وہ خاموش ہو کر پھر ہونٹ کاٹنے لگی۔ ''لگ رہا ہے جلد مجھے جولی یا ولیم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔''

جان کو اس عورت سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک شوہر گنوانے کے بعد وہ دوسرے کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ''مسز ولیم میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم جولی کا علاج کر رہے ہو۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے تمہیں کتنا وقت درکار ہو گا؟''

''نفسیاتی علاج ہمیشہ دیر اور وقت طلب ہوتا ہے اور اس کے بارے میں یقین سے کہنا دشوار ہوتا ہے۔'' جان کا لہجہ محتاط ہو گیا۔

''پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو گا؟'' سارہ بے چین ہو رہی تھی۔ ''تم مجھے وقت بتا سکتے ہو؟''

جان سمجھ رہا تھا سارہ کو وقت اپنے لیے نہیں ولیم کے لیے درکار تھا۔ وہ اسے مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ ''مسز ولیم...''

''پلیز۔'' سارہ کے لہجے میں التجا تھی۔ ''اگر تم نے وقت نہیں دیا تو وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ولیم اسپتال میں جولی کی رجسٹریشن کرا کے اس کی ابتدائی فیس بھی ادا کر چکا ہے۔''

جان نے گہری سانس لی۔ ''تب تم بتاؤ کہ مجھے کتنا وقت مل سکتا ہے؟''

''ایک ہفتہ۔'' سارہ بولی۔

''صرف ایک ہفتہ؟ یہ بہت کم ہے۔''

''ہاں اس کے بعد ہم جولی کو سینڈ پارک مینٹل فیسلٹی منتقل کر دیں گے۔'' سارہ کا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا۔

''او کے۔'' جان نے گہری سانس لی۔ ''ایک ہفتہ... اب میں جولی سے ملنا چاہوں گا۔''

سارہ نے ہاتھ آگے کیا تو اس پر ایک چابی تھی۔ ''یہ جولی کے کمرے کی چابی ہے۔''

جان نے چابی لی اور باہر نکل آیا۔ اس نے جولی کے کمرے کا لاک کھولا تو وہ پریشان حال ٹہل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپکی۔ ''جان یہاں کیا ہوا ہے؟''

جان نے دروازہ بند کیا اور جولی کو بازو سے پکڑ کر کرسی تک لایا۔ اسے بٹھا کر وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظر جما کر پوچھا۔ ''کیا تمہیں کچھ یاد نہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم رات سوئی تھیں؟''

''ہاں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے تمہاری دی ہوئی گولی کھائی تھی۔''

''پھر تمہاری آنکھ کیسے کھلی؟''

''میں نے صبح کے وقت کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی، میں نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر باہر سے کسی نے جواب نہیں دیا پھر میں نے ایک ایمبولینس آتے اور جاتے دیکھی۔''

''تمہارے کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے سے رومیلا ریلنگ سے نیچے گراؤنڈ فلور پر جا گری ہے۔''

جولی کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ ''میرے خدا... وہ کہاں ہے اب؟''

''اسپتال میں ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ وہ زخمی ہے لیکن بچ گئی ہے اور بری خبر یہ ہے کہ اس کا کہنا ہے، اسے تم نے دھکا دیا ہے۔''

جولی اچھل پڑی۔ ''میں نے دھکا دیا ہے، یہ جھوٹ ہے۔''

''لیکن رومیلا کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نہیں جانتی، میں قسم کھاتی ہوں۔ رات میں گولی کھا کر سوئی تھی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں، میں کسی کے چیخنے کی آواز پر اٹھی اور مجھے لگا جیسے وہ مام کی آواز ہو۔''

''تو تمہیں بالکل یاد نہیں کہ تم نے کیا کیا؟''

''جان۔'' جولی کی آواز جذباتی ہو گئی۔ ''تم خود سوچو میں یہاں قید ہوں۔ میرے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک ہوتا ہے اور جب میں اٹھی تب بھی لاک تھا۔''

''ولیم کا بیان ہے کہ یہ ان لاک تھا۔''

''ولیم۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''یہ سب اس شخص کی سازش ہے۔ تم جانتے ہو میرے پاپا کی چار سو ملین ڈالرز مالیت کی دولت کی واحد وارث میں ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہ ساری دولت ایک ٹرسٹ کو چلی جائے گی اس لیے میرا زندہ رہنا ضروری ہے لیکن میں نفسیاتی اسپتال میں رہوں گی تو ولیم اور مام میری دولت استعمال کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہوں گے۔ خدا کے لیے جان سوچو، یہ سب کیا ہے۔ ٹھیک ہے مجھے رومیلا پسند نہیں ہے لیکن مجھے اسے دھکا دے کر نیچے گرانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس طرح میں خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماروں گی؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' جان نے کہا۔

جولی اس کے پاس آئی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی۔ ''پلیز جان تم مجھے بچا سکتے ہو، یہ مجھے ہمیشہ کے لیے نفسیاتی اسپتال بھیجنے کی سازش ہے۔ میری مام کے نزدیک بیٹی سے زیادہ اس کا شوہر اہم ہے۔ یقین کرو اگر ایسا کوئی وقت آیا کہ اسے اولاد یا شوہر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ اپنے شوہر کا انتخاب کرے گی۔''

جان جولی کی بات تسلیم کر رہا تھا کیونکہ سارہ نے ایسا ہی کہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''مگر اب میرے پاس وقت کم ہے۔''

جولی اس کی بات سمجھ گئی کیونکہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ مجھے کسی جگہ بھیجنے کا...''

''ہاں اور میرے پاس صرف ایک ہفتہ ہے۔'' جان بولا۔ ''مجھے اب جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔''

''صرف ایک ہفتہ۔'' جولی جیسے شاک میں آگئی۔

''تم سیشن کے لیے تیار ہو؟''

جولی نے چونک کر اسے دیکھا پھر سر ہلایا۔ جان نے لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے کہا۔ ''آج تم اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو گی۔ کچھ خاص نہیں سوچو گی۔''

اس نے جولی کے ائر پلگ اور الیکٹروڈ لگائے۔ لیپ ٹاپ آن کیا اور میٹرونوم چلا دیا۔ کمرے میں ٹک ٹک کی آواز گونجنے لگی۔ جان نے کہا۔ ''جب تم ماضی میں پہنچ جاؤ تو آنکھیں بند کر لینا۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' جولی بولی۔ جان نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور جولی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔

''مت ڈرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

اس بار جولی مسکرائی پھر اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد جان

نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

بہت بے ترتیب اور بے ہنگم یادداشتیں تھیں جو آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ جولی کے بچپن کی، اس کے باپ کی، ولیم اور سارہ کی، پھر جولی کے اسکول کی، این، کاٹی، میرل اور سیڈ کی یادیں البم کی تصویروں کی طرح بدل رہی تھیں۔ ولیم اور رومیلا کا منظر اور پھر ولیم اور سارہ کی جولی کے حوالے سے لڑائی۔ دونوں آپس میں چیخ چیخ کر بات کر رہے تھے۔ ولیم کہہ رہا تھا کہ جولی بیمار ہے، وہ کسی وقت بھی خود کو یا کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ جولی کے پول میں چھلانگ لگانے کا منظر، وہ تہ میں بیٹھتی جا رہی تھی۔ پھر رومیلا اور سارہ کی گفتگو جو وہ جولی کے بارے میں کر رہے تھے۔ رومیلا ولیم کے موقف کی حمایت کر رہی تھی۔ جولی کچن میں چھریوں کے ریک کو گھور رہی تھی۔ پھر وہ ایک چھوٹی مگر بہت تیز دھار والی چھری لے کر سیڑھیوں سے اتر کے نیچے آنے لگتی ہے۔ وہ چھری کو ریلنگ کی لکڑیوں سے ٹکراتی ہوئی آ رہی ہے۔ وہ چھری لیے اچھلتی کودتی کھلنڈرے انداز میں سارہ اور رومیلا کے عقب میں آتی ہے اور پھر چھری دونوں ہاتھوں میں تھام کر تلوار کی طرح بلند کرتی ہے اور للکارنے کے انداز میں ماں کو آواز دیتی ہے۔ اچانک رومیلا گھومتی ہے اور جولی کے ہاتھوں پر ہاتھ مارتی ہے، چھری اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں گھومتی ہے اور اس کی ہتھیلی پر کٹ لگاتی ہوئی نیچے گر جاتی ہے۔ جولی اپنی ہتھیلی کو دیکھتی ہے جس پر خون پھیل رہا ہے۔ اس کا منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ وہ خوفزدہ ہے۔ جان کہتا ہے۔

"جولی واپس آؤ۔"

جولی نے گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ اپنی شفاف ہتھیلی کی طرف دیکھا۔ لکیروں کے درمیان کٹ کا بہت ہلکا سا نشان آج بھی تھا۔ اس نے جان کی طرف دیکھا۔ "کیا آج بھی کچھ غلط ہوا ہے؟"

"نہیں تمہاری توجہ مرکوز نہیں ہے۔"

"تم نے خود کہا تھا کہ میں کچھ خاص نہ سوچوں، ذہن کو آزاد چھوڑ دوں۔"

"نہیں تم ذہنی طور پر منتشر ہو۔ اس طرح سوچ اتنی تیزی سے نہیں بدلتی ہے۔"

"لیکن میں خود کو بالکل پُرسکون محسوس کر رہی ہوں۔"

"یہ تمہارا شعور ہے۔" جان نے سب چیزیں بیگ میں ڈال دیں۔ "ہم لاشعور میں جاتے ہیں۔"

جان جانے کے لیے تیار ہوا تو جولی نے اس کا بازو تھام لیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جان نے کہا۔ "میں رومیلا کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اگر اس نے کوئی ایسا بیان دیا جو میرے خلاف گیا تو...؟"

جان نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ وہ اپنی غلطی سے نیچے گری تھی۔"

جولی نے سکون کی سانس لی۔ جان نے باہر نکل کر کمرا لاک کیا اور نیچے آیا۔ جان نے سارہ سے اسپتال کے بارے میں پوچھا اور آدھے گھنٹے بعد وہ اسپتال کے ایمرجنسی کے شعبے میں تھا۔ وہ ہوش میں تھی مگر ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ اسے عام وارڈ میں شفٹ کیا جاتا۔ ڈاکٹر نے جان کو بتایا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچا تھا مگر اسپائنل کورڈ بچ گئی تھی۔ فی الحال اسے سخت کالر لگا ہوا تھا۔ تاکہ وہ گردن کو ذرا سا بھی نہ ہلا سکے۔ دائیں کلائی میں کمپاؤنڈ فریکچر تھا کیونکہ وہ اسی کے بل گری تھی اور اسی نے رومیلا کی زندگی بچائی تھی ورنہ اس کا سر فرش سے ٹکراتا تو امکان تھا کہ وہ اسی وقت ختم ہو جاتی۔ گردن میں چوٹ تپائی لگنے سے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے جان سے کہا۔ "ویسے اب بھی اس کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ پچاس فٹ اچھی خاصی بلندی ہوتی ہے۔"

"اوورآل کنڈیشن کیا ہے؟"

"صرف ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ ہے اس کے لیے اسے دو دن آئی سی یو میں رکھنا ہوگا۔"

جان لکڑی سے بنے اس کیبن میں آیا جس میں رومیلا بیڈ پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ جان کو دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ جان کرسی نزدیک کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

"ڈاکٹر کا کہنا ہے، میرا بچنا معجزے سے کم نہیں ہے۔" وہ نیم غنودہ لہجے میں بولی۔ "تکلیف بہت ہے لیکن ڈاکٹر اسپائنل کورڈ کی وجہ سے نیند کی دوا نہیں دے رہے۔"

"یہ ضروری ہے۔" جان نے کہا اور اسے تسلی دی۔ "تم بچ گئی ہو بس دو تین دن میں عام وارڈ میں شفٹ ہو جاؤ گی۔"

"پتا نہیں، یہ سب کیسے ہوا؟"

"تمہارا کہنا ہے کہ تمہیں جولی نے دھکا دیا تھا؟" جان نے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، یہ درست ہے۔ میں صبح اپنی ڈیوٹی پر آئی تو مجھے جولی کے کمرے کے سامنے والی لائٹ آف نظر آئی، میں اسے دیکھنے آئی تھی کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے مجھے ریلنگ کی طرف دھکیل دیا۔ میں بالکل نہیں سنبھل سکی۔ نیچے گری اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔" رومیلا غنودہ سی ٹون میں بول رہی تھی۔

"تم نے جولی کو واضح دیکھا تھا؟"

"نہیں، لیکن اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور مجھے ایک جھلک سی دکھائی دی تھی۔ اس کے کمرے سے اور کون نکل سکتا ہے۔"

"مگر جولی کا کمرا لاک ہوتا ہے۔ اس کی چابی یا تو تمہارے پاس ہوتی ہے یا پھر سارہ کے پاس۔ سارہ کا کہنا ہے کہ تیسری کوئی چابی نہیں ہے۔"

رومیلا الجھ کر بولی۔ "یہ تو میں بھی نہیں سمجھ سکی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر جولی نے ایسا کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔" جان کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "ایک چیز جولی کے خلاف جاسکتی ہے۔ اس نے تمہیں اور ولیم کو پاس دیکھا تھا اور ولیم نے اسے بہ طور سزا الماری میں بند کر دیا تھا۔ وہ تم سے نفرت کرسکتی ہے کیونکہ تم اس کی ماں کے حق پر ڈاکا مار رہی تھیں۔"

رومیلا حیران ہوئی۔ "کیا کہہ رہے ہو، میرا ولیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"شاید اب نہ ہو لیکن ماضی..."

"نہ اب نہ ماضی میں ایسا کوئی تعلق تھا۔" رومیلا اس کی بات کاٹ کر بولی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آرہے تھے۔ "تمہیں اس قسم کی بے بنیاد بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے۔ اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" جان نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "میں پھر آؤں گا۔"

"جان میری بات سنو۔" عقب سے رومیلا نے پکار کر کہا مگر وہ ان سنی کر کے باہر نکل آیا۔ صورتِ حال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ وہ کسی سے مشورے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی فرد تھا مگر ڈاکٹر ایڈورڈ نیویارک میں تھا اور اس کی واپسی کل ہی ہوتی۔ وہ واپس گھر آیا اور اپنے کام کے کمرے میں آیا تو اسے وہ باکس دکھائی دیا جس میں بہ قول ڈاکٹر ایڈورڈ کے جولی سے متعلق ہر چیز تھی۔ اس نے پیپر نائف سے باکس کی سیل کھولی اور اس میں موجود کاغذات کا بڑا سا پلندا نکالا اس کے ساتھ ہی ایک یو ایس بی تھی۔ اس نے یو ایس بی اپنے لیپ ٹاپ میں لگائی۔ اس میں جولی کے دورانِ علاج انٹرویوز اور سیشنز کی ویڈیوز تھیں۔ اس نے ایک ویڈیو چلائی اور کاغذات دیکھنے لگا۔ یہ مختلف سرٹیفکیٹ اور رپورٹس تھیں جو جولی کے بارے میں مختلف ماہرین نے دی تھیں۔ ویڈیو میں جولی ڈاکٹر لائیڈ کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کلر کون سا پسند ہے۔ جولی کہہ رہی تھی کہ اسے سرخ رنگ پسند ہے۔ خاص طور سے سرخ رنگ کا گلاب پسند ہے۔

رپورٹس تسلی بخش نہیں تھیں۔ ڈاکٹر لائیڈ سمیت تین ماہرینِ نفسیات نے جولی کو شدید رجحانات رکھنے والی ایک ایسی نفسیاتی مریضہ قرار دیا تھا جس سے کسی بھی وقت کوئی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کے لاشعور میں پُرتشدد خیالات تھے۔ جان کو سگریٹ کی طلب ہونے لگی، اس نے بہت دن بعد پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لے کر دوبارہ کاغذات کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ایک کاغذ دیکھ کر وہ چونکا۔ یہ جولی سے متعلق نہیں تھا بلکہ استاد کارل مین کا بیان تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے جولی نے پھنسایا ہے۔ اس کے لیپ سے زہرا ای نے چوری کیا تھا اور یہ بالکل جھوٹ ہے کہ وہ کمسن لڑکیوں کو ایب یوز کرنے میں ملوث ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کے لیپ ٹاپ میں کمسن لڑکیوں کی عریاں تصاویر کہاں سے آئیں جن میں سے کئی اس کی شاگرد بھی تھیں۔ جان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یہ نئی چیز سامنے آئی تھی۔ اس رات وہ دیر تک ان چیزوں پر کام کرتا رہا۔

اگلے روز اس نے سب سے پہلے مقامی جیل حکام کو کال کی اور ڈپٹی جیلر سے کارل مین سے ملاقات کی خصوصی اجازت حاصل کی۔ وہ کاؤنٹی جیل میں بند تھا۔ وہ دوپہر میں لنچ کے بعد جیل کے دروازے کے سامنے تھا۔ جیلر سے ملاقات کے بعد وہ اس حصے میں آیا جہاں قیدیوں کو ملاقاتیوں سے ملوایا جاتا ہے۔ وہ شیشے کے ایک طرف بیٹھ گیا چند منٹ بعد جیل کے لباس میں کارل مین وہاں آیا اور جان نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے اسے بھی اٹھانے کا اشارہ کیا۔ کارل مین نے اسے گھورتے ہوئے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور بولا۔ "کون ہو تم، میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"میں جان کیرنگ ہوں۔ ایک ماہرِ نفسیات اور میں

جولی کا علاج کر رہا ہوں۔''

''وہ عفریت۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''اسے علاج نہیں سزا کی ضرورت ہے لیکن اس کی جگہ میں یہاں قید ہوں۔ میری آزادی ہی ختم نہیں ہوئی، میرا کیریئر اور میری ساری لائف ختم ہوگئی ہے۔ میری بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی اور میرے بچے میرا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے ہیں۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ چائے میں زہر تم نے نہیں ملایا تب وہ زہر جولی تک کیسے پہنچا؟''

''جیسے میرے لیپ ٹاپ میں کمسن لڑکیوں کی عریاں تصویریں آئیں۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''مسٹر کیرنگ اگر تم اس لڑکی سے ہمدردی رکھتے ہو تو تم بہت بڑے خطرے کی زد میں ہو۔ تم اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ وہ کتنی شاطرانہ ذہانت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے وہ تمہیں بھی کسی چکر میں پھنسا دے، اس سے دور ہو جاؤ۔''

''وہ صرف اٹھارہ سال کی لڑکی ہے۔'' جان نے نرمی سے کہا۔ ''زہر تمہاری تحویل سے کیسے نکل سکتا ہے اور تمہارا لیپ ٹاپ یقیناً سیکیورٹی کوڈ سے کھلتا ہوگا؟''

کارل مین ہنسا۔ ''اگر میں یہ بات جان سکتا کہ اس نے یہ کام کیسے کیے تو میں آج یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔''

''یعنی تمہارے پاس جولی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ثبوت چھوڑنے والی لڑکی نہیں ہے۔ لیکن میں اپنی جان کی شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی کا کام ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کو یہ کرنے کی ضرورت تھی اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ پورا اسکول جانتا ہے کہ این اور اس کی ساتھیوں نے اس کے ساتھ کیا، کیا تھا۔''

''مگر پورا اسکول یہ نہیں جانتا کہ تم کمسن لڑکیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔'' جان کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم نے جولی کو اپنا کھلونا بنانے کی کوشش کی تھی اور اسے آفر کی تھی کہ وہ تمہاری بات مان لے تو تم این اور اس کی ساتھی لڑکیوں کو سزا دو گے۔''

کارل مین حیران نظر آنے لگا۔ اس نے شدت سے انکار کیا۔ ''یہ قطعی غلط ہے۔ ہاں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں دوسری لڑکیوں کے چکر میں رہا، پتا نہیں میں کیوں اس ... چکر میں پڑ گیا اور شاید میں اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔ باقی جو بھی الزام ہے وہ غلط ہے۔''

جان نے سوچ کر کہا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے۔ تم نے رسائی کا نام سنا ہے۔''

کارل مین نے سر ہلایا۔ ''جس میں لوگوں کی یادداشتوں کو کھنگالا جاتا ہے؟''

''بالکل، میں رسائی کا ایک مائنڈ اسپائی بھی ہوں۔ اگر تم تیار ہو تو ہم تمہاری یادداشت کی مدد سے حقائق تک پہنچ سکتے ہیں؟''

کارل مین کا چہرہ پُرامید ہو گیا۔ ''کیا اس سے مجھے رہائی مل جائے گی؟''

''نہیں کیونکہ ابھی تک عدالت نے اسے بہ طور شہادت اور گواہی کے قبول نہیں کیا ہے لیکن اس سے تمہارا کیس ری اوپن ہونے میں مدد مل سکتی ہے۔''

کارل مین مایوس ہو گیا۔ ''تب کیا فائدہ؟''

''تم سوچ لینا۔'' جان نے اپنا سیل نمبر بتایا۔ ''اسے نوٹ کر لو اگر تمہارا ذہن بنے تو تم مجھے کال کر سکتے ہو۔''

کارل مین نے نمبر نوٹ کر لیا۔ ''او کے، میں سوچوں گا۔''

جان جیل سے نکلا تو وہ سوچ رہا تھا کہ کارل مین جھوٹا نہیں لگتا ہے مگر وہ جولی کو مجرم ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ممکن ہے ایسا غلطی سے ہوا ہو اور جہاں تک کارل مین کے لیپ ٹاپ میں کمسن لڑکیوں کی تصاویر کی موجودگی تھی تو کارل مین نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے دوسری لڑکیوں کو رجھانے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اس نے جولی کے ساتھ ایسا کرنے سے انکار کیا تھا۔ اب اسے این سے ملنا تھا۔ زہر خورانی کے واقعے میں وہ بچنے والی واحد ہستی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس نے ایک گھونٹ لیا تھا۔ جبکہ میرل اور کاٹی نے زیادہ چائے لی تھی۔ پھر این کو الٹی ہوگئی جس کی وجہ سے بیشتر زہر نکل گیا اور وہ بچ گئی۔ این میری لینڈ کے ایک فارمر کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ پال گریم ایک دولت مند آدمی تھا اور اس کے پاس ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی زمینیں تھیں۔ ساتھ ہی وہ ہزاروں مویشیوں کا مالک بھی تھا۔

جان تین گھنٹے کی طویل ڈرائیو کے بعد میری لینڈ میں پال گریم کے فارم پر پہنچا۔ پہلے اس نے فون پر رابطہ کر کے این سے ملاقات کی اجازت مانگی تھی۔ این کسی قدر دقت سے اس ملاقات کے لیے آمادہ ہوئی تھی اور وہ بھی یہ سن کر کہ شاید جولی کو طویل مدت کے لیے کسی نفسیاتی اسپتال منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے جان سے کہا تھا۔ ''وہ اسی کی مستحق ہے۔''

''میں تم سے متفق نہیں ہوں۔'' جان نے کہا۔

"بہرحال اس ملاقات کے لیے میں تمہارا پیشگی شکر گزار ہوں۔"

جان فارم میں داخل ہوا تو اسے گیٹ پر اطلاع مل گئی کہ این اصطبل میں اس کی منتظر تھی۔ اصطبل گیٹ سے کوئی ایک میل دور ثابت ہوا۔ یہ دو منزلہ بہت بڑا اصطبل تھا جس میں بلاشبہ سیکڑوں گھوڑوں کو رکھا جا سکتا تھا۔ دو ٹرینرز اعلیٰ قسم کے ریس کے گھوڑوں کو ایک احاطے میں تربیت دے رہے تھے۔ این گھڑسواری کے مخصوص لباس میں ایک شیڈ تلے اس کی منتظر تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی جتنی کہ تصویر میں نظر آتی تھی۔ جارحانہ مزاج شاید اسے اپنے دیہاتی پس منظر سے ملا تھا مگر اس میں مخصوص نسوانی نزاکتوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے جان سے ہاتھ ملایا۔ "میں تمہیں جانتی ہوں اور تمہیں پسند کرتی ہوں۔ مگر بدقسمتی سے تم ایسی ہستی کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہو جسے علاج کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

جان نے محسوس کیا کہ این ذرا دقت سے اور کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اس نے گھڑسواری کے مخصوص لباس کے ساتھ گلے میں رومال بھی باندھا ہوا تھا۔ "ممکن ہے جولی غلط ہو لیکن بہرحال وہ نفسیاتی مریض ہے اور ہر نفسیاتی مریض کی طرح اسے بھی علاج کی ضرورت ہے۔"

"وہ نفسیاتی مریض نہیں، ایک ایسی مجرمہ ہے جس نے خود پر نفسیاتی ہونے کا خول چڑھا رکھا ہے۔" این جذباتی ہو گئی۔ "ورنہ وہ جو کرتی ہے، بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔"

جولی سے متعلق یہ دوسرا فرد تھا جو اس کے بارے میں اس حد تک جا کر منفی رائے دے رہا تھا۔ جان نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہی ہو؟"

"میرے، میرل اور کائی کے ساتھ جو ہوا ہے، یہ جولی کی سازش تھی۔ اس وقت میں بلکہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکا کہ ہوا کیا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اب مجھے سمجھ میں آ گیا ہے کہ اس نے کیوں ہمیں معاف کرنے کا ڈراما کیا اور کیوں ہمارے قریب آئی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کس درجے کی کینہ پرور ہے۔"

"ایک ذرا سی بات پر اس حد تک چلے جانا سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"اسی وجہ سے تو وہ بچی ہوئی ہے اور اس کی جگہ ایک بے گناہ سزا بھگت رہا ہے۔"

"کارل مین کا کیا قصور تھا؟"

"یہی کہ اس نے الماری میں بند کرنے والے واقعے پر ہمیں سزا نہیں دی۔"

"کارل مین نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس نے سزا کے بدلے جولی سے تعلق مانگا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ سچ ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیں زہر دے دے اور کارل مین کو اس الزام میں جیل بھجوا دے۔"

جان نے سیڈ کے بارے میں پوچھا۔ "اس سے جولی کا تعلق کیسا تھا؟"

این حیران ہوئی۔ "کون سیڈ، ہماری ساتھیوں میں اس نام کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔"

"وہ تھی۔ میں نے خود جولی کے البم میں اس کی تصویر دیکھی۔"

"یہ اس کا ایک اور جھوٹ ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ اس نام کی کوئی لڑکی پورے اسکول میں تھی۔"

جان الجھ گیا پھر اس نے پوچھا۔ "تم مجھے جو بتا رہی ہو، کیا تم نے پولیس کو یہ سب بتایا؟"

"ہاں لیکن کسی نے میری بات نہیں سنی۔ انہیں کارل مین کی صورت میں قربانی کا بکرا مل گیا تھا اس لیے انہیں زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" این نے تلخی سے کہا۔ "میں نے صرف اس لیے تم سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کی کہ تم نے بتایا کہ اسے ہمیشہ کے لیے کسی نفسیاتی اسپتال بھیجا جا سکتا ہے۔"

"یہ درست ہے۔" جان نے کہا۔ "اب اس کے پاس صرف چند دن ہیں۔"

"میری دعا اور میری خواہش ہے وہ ہمیشہ کے لیے وہاں ڈال دی جائے۔ اس نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے، یہ اس کی کم سے کم سزا ہے جو اسے ملنی چاہیے۔ گڈ بائے مسٹر کیرنگ۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ جان نے عقب سے کہا۔

"مس گریم، اس واقعے میں بچنے والی تم واحد فرد ہو اس طرح تم خسارے میں نہیں رہیں۔"

این پلٹی اور اس نے اپنی گردن پر بندھا رومال نیچے کیا تو اس کے نرخرے کے مقام سے ایک نالی سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس نے نالی کی طرف اشارہ کیا اور تلخ لہجے میں بولی۔ "یہ ساری عمر لگی رہے گی۔ تم کہتے ہو، میں خسارے میں نہیں رہی۔"

جان اسے جاتا دیکھتا رہا پھر پلٹ کر واپس اپنی کار کی طرف آیا۔ اس نے دو دن میں جو جانا تھا، اس نے اسے

پیچھے جا رہی تھیں۔ وہ اندر آیا۔ یہ ولیم کا ایک اور دفتر تھا کیونکہ میز کے عقب میں دیوار پر ولیم کی تصاویر عالمی رہنماؤں کے ساتھ آویزاں تھیں۔ امریکی صدر سے لے کر چینی وزیر اعظم تک کئی طاقتور عالمی رہنما ولیم سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

دفتر کو ایک چھوٹی جالی والی دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور دوسری طرف وہی جگہ تھی جو جولی کی یادداشت میں تھی۔ اچانک جان کو خیال آیا اور وہ ولیم کی میز کی طرف بڑھا اس نے اوپری دراز کھولی تو اس میں کئی فائلیں رکھی تھیں۔ اس نے انہیں چیک کیا اور جولی کی نام کی فائل نکالی۔ اس میں وہ معاہدہ تھا جو سینٹ پارک نفسیاتی اسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اس کی رُو سے جولی کم سے کم تین سال کے لیے وہاں بھیجی جاتی اور اگر اسے قبل از وقت ریلیز کیا جاتا تو اسپتال انتظامیہ پیشگی ادا کی ہوئی فیس واپس کرنے کی پابند نہیں تھی۔ گویا ولیم اسے پیشگی ہی طویل مدت کے لیے اسپتال میں داخل کرانے کا سوچ چکا تھا۔ فائل میں ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کے چیک کی کاپی بھی تھی جو اسپتال کو دیا گیا اور سارہ کے مطابق یہ صرف ابتدائی فیس تھی۔ اسے ڈاکٹر ایڈورڈ کی بات یاد آئی کہ اکثر نفسیاتی اسپتال بزنس کر رہے ہیں۔ اس نے فائل واپس دراز میں رکھی اور وہاں سے نکل آیا۔ ملازمہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اس لیے کسی کو علم نہیں ہوا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ وہ اوپر آیا تو جولی متفکر تھی اور اس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ آج وہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اس نے جان کی طرف دیکھا اور شکوہ کیا۔

"تم مجھے کم وقت دے رہے ہو۔ میں زیادہ وقت تمہارا انتظار کرتی رہتی ہوں۔"

"میں کارل مین اور این سے ملاقات میں مصروف تھا۔"

"کارل مین اور این۔۔۔؟"

"ہاں، مجھے ان سے کچھ اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔" جان نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ دونوں ہی تمہیں قصوروار سمجھتے ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جولی نے سکون سے کہا۔

"دوسرے تمہارے اسکول میں سیڈ نام کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔"

جولی برہم ہو گئی۔ "تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو؟"

"تم مجھے الزام دے رہی ہو؟"

جولی اٹھ کر کونے میں رکھی میز تک گئی اور وہاں سے ایک کتاب اٹھا کر لائی۔ اس میں سے ایک تصویر نکال کر اسے دی۔ اس میں سیڈ اسکول کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ تھی اور ان میں این بھی شامل تھی۔ جولی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں این نے بتایا ہوگا۔ اب دیکھ لو وہ خود بھی اس کے ساتھ تصویر میں ہے، وہ کس طرح اس سے انکار کر سکتی ہے۔"

جان نے گہری سانس لی۔ "آئی ایم سوری جولی۔ جولی تم جانتی ہو، ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔"

اس نے جان کی طرف دیکھا۔ "ہاں مجھے معلوم ہے، دو دن بعد میں یہاں سے بھیج دی جاؤں گی۔"

"مجھے تمہاری اہم ترین یادداشتوں تک پہنچنا ہے تاکہ میں مسئلے کو حل کر سکوں اور تم جانے سے بچ جاؤ۔ جولی یہ صرف تمہاری زندگی ہی نہیں میری ساکھ کا سوال بھی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

جولی نے سر ہلایا پھر روہانسے لہجے میں بولی۔ "میں سمجھتی ہوں اور میں تمہارے ساتھ پورا تعاون بھی کر رہی ہوں لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہوں؟"

"آج ہمیں پوری کوشش کرنا ہوگی۔" جان نے لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں میز پر آ گئے۔ جان نے ائرپلگ اور الیکٹروڈ لگائے اور لیپ ٹاپ آن کیا۔ جان نے جولی کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے۔ "آج تمہیں اپنی تلخ اور خوفزدہ کرنے والی یادوں تک جانا ہوگا۔"

جولی نے سر ہلایا۔ اس کی پتلیاں گردش کرتے ہوئے یک دم ساکت ہو گئیں اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جان نے دھیمی گونجتی آواز میں کہا۔ "اب آغاز کرتے ہیں۔"

☆☆☆

منظر بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ جولی کے بچپن کے، اسکول کے، اس کے حالیہ دن، جان کو لگا کہ اسے جولی کو واپس بلانا پڑے گا مگر اچانک ہی منظر رک گیا۔ جولی، ولیم کے آفس میں فرش پر بیٹھی ہوئی اپنی گڑیا سے کھیلتی ہوئی گنگنا رہی تھی۔ پس منظر میں گھنٹا بج رہا تھا۔ اچانک آفس کا دروازہ کھلا اور کوئی سیڑھیوں سے اتر کر اندر آیا۔ جالی دار دیوار کے عقب سے اس کا سایہ نظر آ رہا تھا پھر وہ تاریکی سے ہوتا ہوا اس حصے میں آیا۔ جولی سہمی نظروں سے آنے والے کو دیکھ رہی تھی اور جب وہ روشنی میں آیا تو جان کو اپنی

آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ڈاکٹر ایڈورڈ تھا جو معنی خیز انداز میں جولی کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''ہیلو سوئٹی... ڈرومت میرے پاس آؤ... دیکھو میرے پاس تمہارے لیے کیا ہے؟''

ڈاکٹر ایڈورڈ نے ہاتھ آگے کیا تو اس کی ہتھیلی پر اس کے آفس میں رکھے گن تارہ میں پروئے ہوئے بندروں کے مجسمے تھے جو جان سے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ جولی اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے ہوئے اس تک آئی اور اس کے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا کہ جان نے کہا۔ ''جولی... واپس آجاؤ۔''

جان نے آنکھیں کھولیں تو جولی بدستور آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور پھر وہ لہرا کر کرسی سے نیچے گری۔ جان جھپٹا اور اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں مگر وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور مائیک نے اندر جھانکا۔ ''یہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں پلیز ایک گلاس پانی لے آؤ۔''

مائیک نے پانی لاکر دیا۔ جان جولی کا ماتھا سہلا رہا تھا' اس نے اسے نرمی سے اٹھا کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ چند گھونٹ لے کر جولی ہوش میں آگئی۔ اس نے پوچھا۔ ''مجھے کیا ہوا تھا؟''

جان نے مائیک کی طرف دیکھا تو وہ واپس چلا گیا، اس کے بعد جان نے سہارا دے کر جولی کو کرسی پر بٹھایا۔ ''تم ڈاکٹر ایڈورڈ کو دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔''

''لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔'' جولی نے اپنا ماتھا رگڑا۔ ''تم کہہ رہے ہو، میں نے ڈاکٹر ایڈورڈ کو دیکھا ہے۔ جبکہ میں نے اسے پاپا کی وفات کے بعد سے نہیں دیکھا۔''

جان سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کی موجودگی نے نئے سوالات اٹھا دیے تھے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ اور جولی دونوں کا کہنا تھا کہ وہ سائمن کی موت کے بعد نہیں ملے۔ تب ڈاکٹر جولی کی یادداشت میں کیسے موجود تھا اور وہ اس سے کیوں خوفزدہ تھی؟ کیا ڈاکٹر بھی ولیم کی اس سازش میں شامل تھا؟ جان کو غصہ آنے لگا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ اس کے لیے بہت قابل احترام شخصیت تھی مگر اس کے اس روپ نے اس کا احترام ختم کردیا تھا۔ جولی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مایوس انداز میں کہا۔ ''میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا میں سچ مچ شدید قسم کی نفسیاتی مریضہ بن گئی ہوں؟ کیا مجھے کسی نفسیاتی اسپتال منتقل کردیا جائے گا؟''

جان نے اسے دیکھا اور ایک عزم سے بولا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک میں ہوں، تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہر قیمت پر تمہارا تحفظ کروں گا۔''

جان نے اپنے بیگ سے دواؤں کی ایک شیشی نکالی اور اس سے ایک گولی نکال کر جولی کو دی۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ کس لیے ہے؟''

''یہ سکون کی دوا ہے اس سے نیند بھی آتی ہے لیکن یہ خطرناک نہیں ہے۔'' جان نے شیشی سائڈ دراز پر رکھ دی۔ ''جب تمہیں ضرورت محسوس ہو تم اس سے ایک گولی لے سکتی ہو مگر چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گولی۔''

''زیادہ ڈوز لینے سے کیا ہوگا؟''

''دو یا زیادہ گولیاں لینے سے نیند بہت شدید آئے گی۔''

جولی نے سر ہلایا، وہ بستر پر سمٹی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ کی سائڈ دراز سے ایک چابی نکالی جو چین میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے جان کو دکھائی۔ ''جب میں پیدا ہوئی تو پاپا مام نے مجھے اس گھر کی مالکن کے طور پر یہ علامتی چابی تحفے میں دی۔ میں نے اسے سنبھال کر رکھا کیونکہ یہ مجھے تحفظ کا احساس دیتی تھی۔'' جولی نے کہتے ہوئے چابی جان کے ہاتھ میں رکھ دی۔ ''لیکن اب مجھے تم سے تحفظ کا احساس ہوتا ہے اس لیے یہ چابی میں تمہارے سپرد کر رہی ہوں۔ کیا تم اسے سنبھال کر رکھو گے جب تک میں اس قابل نہیں ہو جاتی کہ اسے پھر سے سنبھال سکوں؟''

جان نے ہاتھ میں موجود سلور رنگ کی چابی دیکھی اور سر ہلایا۔ ''میں اسے سنبھال کر رکھوں گا۔'' اس نے چابی کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

وہ وڈ روز مینشن سے نکلا تو موسم سرد اور بارش والا ہو رہا تھا۔ وہ واشنگٹن کے قریب تھا تو شدید بارش شروع ہو گئی۔ گہرے سیاہ بادلوں کی وجہ سے سرِشام ہی تاریکی چھا گئی تھی۔ جان ڈاکٹر ایڈورڈ کے گھر کے سامنے رکا تو اس کے سامنے والے لاؤنج میں خاصے لوگ جمع تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی اجتماع ہے۔ جان کار سے اتر کر بارش سے بچنے کے لیے تیزی سے شیڈ تک آیا اور اس نے ڈاکٹر ایڈورڈ کو آواز دی۔ وہ چند افراد سے بات کر رہا تھا' اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ''جان کیسے ہو تم؟ تم نے آنے سے پہلے اطلاع نہیں دی۔''

''میں تم سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ جولی اور اس کے معاملے سے دور رہو۔''

''کیا... کیا کہہ رہے ہو؟'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''جولی سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''تم نے جھوٹ بولا کہ تم اس سے نہیں ملے لیکن اس کی یادداشت میں تم موجود ہو۔''

''یہ ناممکن ہے، میں گزشتہ چودہ سال سے اس سے نہیں ملا ہوں۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے انکار کیا۔ ''میں تم کو خود کال کرنے والا تھا کیونکہ رسائی کے ماہرین نے سوفٹ ویئر کو چیک کیا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔''

''تب خرابی کہاں ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے تم اس لڑکی کے سامنے ناکام ہو گئے ہو۔''

''اس کے برعکس مجھے لگ رہا ہے وہ معصوم ہے اور اس کے خلاف کئی طاقتور لوگ ایک ہو گئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر میں تمہیں بتا دوں میں آخری حد تک اس کا تحفظ کروں گا۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اب اس سے دور رہنا۔''

''جان، میری بات سنو۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''وہ لڑکی تمہیں بہکا رہی ہے...''

اسی لمحے اندر سے ایک چھوٹی سی بچی اپنی گڑیا اٹھائے باہر آئی اور ڈاکٹر ایڈورڈ سے کہا۔ ''گرینڈ پا اس کی آنکھ نکل گئی ہے۔''

ڈاکٹر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ''سوئٹی میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔''

ڈاکٹر نے بالکل اسی انداز میں سوئٹی کہا تھا جیسا کہ سیشن کے دوران میں اس نے جولی سے کہا تھا۔ جان کے اندر اشتعال کی لہر اٹھی اور اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر کو خبردار کیا۔ ''اب میں تمہیں جولی کے آس پاس نہ دیکھوں۔''

جان پلٹ کر اپنی کار کی طرف آیا۔ ڈاکٹر نے اسے عقب سے آواز دی مگر وہ سنی ان سنی کر کے... گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود کو ذہنی طور پر منتشر محسوس کر رہا تھا۔ ایسی کیفیت اس نے جولیٹ کی خودکشی کے بعد... بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے گہرے کش لینے لگا۔ گھر پہنچ کر وہ کام والے کمرے میں آیا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور اس میں موجود جولی کے انٹرویو کی ویڈیو دیکھنے لگا۔ اب وہ ایک ماہرِ نفسیات کی نظر سے اس ویڈیو کو دیکھ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر این اور کارل مین کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ این نے سینڈ کے بارے میں جھوٹ بولا اور جولی نے ثابت کر دیا کہ سینڈ اسکول میں موجود تھی۔ ایک خیال کے تحت اس نے جولی کے اسکول کا نام اور گزشتہ سال کے بیچ کا نام ڈال کر گوگل پر سرچ کیا تو اسکول کی سائٹ کھل گئی۔ اس میں نہ صرف تمام بیچز کے طلبا اور طالبات کے نام تھے بلکہ ان کی تصاویر بھی دی ہوئی تھیں۔

اس نے سینڈ کی تصویر تلاش کر لی مگر جب اس کے نیچے نام دیکھا تو وہ اچھل پڑا۔ تصویر والی لڑکی کا نام سینڈ نہیں بلکہ مارلن گارشیا تھا۔ جان نے مارلن گارشیا کا نام گوگل میں ڈال کر سرچ کیا تو بے شمار ویب سائٹس سامنے آ گئیں۔ ان سب میں تقریباً ایک ہی خبر تھی۔ پچھلے سال اکتوبر میں ہائی اسکول کی طالبہ مارلن گارشیا اسکول لیب کیمسٹری کے ٹیسٹ کے دوران حادثاتی طور پر آگ لگنے سے بری طرح جھلس گئی اور اس نے دو دن اسپتال میں رہ کر دم توڑ دیا تھا۔ جان تمام ویب سائٹس چیک کر رہا تھا۔ بعض نامعلوم طالبات نے پولیس کو کال کر کے بتایا کہ مارلن کو کچھ ساتھی طالبات تنگ کر رہی تھیں اور اس کے نتیجے میں اس نے غلطی سے دو ایسے کیمیکل ملا دیے جن سے آگ لگ جاتی ہے۔ پولیس تفتیش میں کسی ساتھی طالبہ یا ٹیچر کارل مین کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکی اور بالآخر سے مارلن کی اپنی غلطی قرار دے کر معاملہ ختم کر دیا گیا۔ جان نے پال گریم کے فارم کا نمبر ملایا اور کال اٹھانے والے سے کہا۔

''میں جان کیرنگ بات کر رہا ہوں، مجھے مس پال سے ایمرجنسی میں بات کرنی ہے۔''

''ون منٹ ہولڈ پلیز۔'' آپریٹر نے کہا اور ایک منٹ سے پہلے این لائن پر تھی۔

''یس مسٹر کیرنگ کیا کچھ پوچھنا باقی رہ گیا تھا؟''

''ہاں۔'' جان کا لہجہ سرد تھا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا کہ سینڈ نام کی کوئی لڑکی اسکول میں نہیں ہے لیکن مارلن گارشیا نام کی لڑکی ضرور تھی جو کیمسٹری کی لیب میں حادثاتی طور پر آگ لگنے سے ہلاک ہوئی۔ تم اس کے بارے میں تو جانتی ہو گی؟''

این خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ''ہاں، تم اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں، مجھے اب معلوم ہو گیا کہ تم لوگوں کے ساتھ کیا اور کیوں ہوا۔'' جان نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جولی یہ سب کر سکتی ہے۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور چند گہرے کش لیے۔ اچانک اسے گھر کے اندر سے کسی کے گنگنانے کی

آواز آئی۔ آواز نسوانی تھی اور اسے لگا کہ جولیٹ گنگنا رہی ہو۔ اس نے آواز دی۔

''کون ہے یہاں؟''

کوئی جواب نہیں آیا اور گنگناہٹ بھی رک گئی۔ جان اٹھ کر باہر آیا، وہ واش روم کی طرف بڑھا۔ حالانکہ جولیٹ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ جان نے اس کے مرنے کے بعد لیا تھا۔ اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور پھر ساکت رہ گیا۔ ٹب میں خون جیسا سرخ پانی بھرا ہوا تھا مگر اس میں جولیٹ کی لاش نہیں تھی۔ وہ ٹب کی طرف جھپٹا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لیپ ٹاپ کے سامنے تھا۔ اس پر سرخ تیرتے گلابوں کا اسکرین سیور چل رہا تھا اور ہاتھ میں سلگتی سگریٹ کا سرا اس کی انگلیوں تک آ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی اور راکھ جھاڑ رہا تھا کہ کال بیل بجی۔ وہ دروازے تک آیا اور اسے کھول کر دیکھا تو باہر کوئی نہیں تھا، اس نے جھانک کر راہداری کے سرے کی طرف دیکھا۔ اسے سرخ اور سنہری جھلک دکھائی دی۔ وہ کوئی لڑکی تھی جو راہداری مڑ گئی تھی۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور آواز دی۔ ''جولی...''

مگر جب وہ راہداری کے سرے پر پہنچا تو دوسری طرف کوئی نہیں تھا۔ وہ گہری سانس لے کر واپس آ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی، اس نے نکال کر دیکھا تو ووڈ روز مینشن کے نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کرنا چاہی تو وہ کٹ گئی۔ جان نے جوابی نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے جولی کے نمبر پر کال کی۔ وہ بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ جان کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ تک آیا، اس نے اسکرین سیور چیک کیا۔ یہ لیپ ٹاپ کا اپنا اسکرین سیور نہیں تھا بلکہ کسی نے اس میں ڈالا تھا۔ اس نے تلاش کی کہ اسکرین سیور کہاں ہے اور جب اس نے مذکورہ فولڈر کھولا تو اس میں ایک فولڈر اور بھی تھا، اس پر پرائیویٹ لکھا تھا اور اس فولڈر میں تصاویر تھیں اور سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ اس نے تصاویر کھولیں اور ایک لمحے کو اس کا ذہن چکرا گیا۔ یہ سب کمسن لڑکیوں کی عریاں تصاویر تھیں۔ اہم بات یہ کہ اس میں جولی کی تصاویر بھی تھیں۔ اگرچہ وہ مکمل عریاں نہیں تھیں مگر اس کی ہیجان انگیز تصاویر اس میں موجود تھیں۔ جان نے لیپ ٹاپ بند کیا اور جھپٹ کر اپنا کوٹ اٹھایا۔ دو منٹ بعد وہ کار میں ووڈ روز مینشن کی طرف جا رہا تھا۔

موسم خراب تھا اور بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن تھی اس لیے وہ تیز ڈرائیو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد مینشن کے سامنے تھا۔ اس نے کار گیٹ پر روکی اور جھانک کر کیمرے کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ روشنی آن تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس وقت کنٹرول روم میں کوئی نہیں ہوتا۔ مائیک چھ بجے چھٹی کر کے چلا جاتا تھا۔ وہ کار سے اتر آیا اور اس نے گیٹ کا جائزہ لیا اس سے اندر جانا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا مگر ساتھ والی دیوار سے شاید اندر کودا جا سکتا تھا۔ اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ وہ پیدل جنگل کے درمیان ڈرائیو وے سے ہوتا ہوا مینشن کی طرف بڑھا۔ مینشن کی پارکنگ میں ولیم، سارہ اور مینشن کی چاروں گاڑیاں موجود تھیں۔ البتہ مائیک کی کار نہیں تھی۔ وہ یقیناً چھٹی کر کے جا چکا تھا۔ جان نے اوپر دیکھا تو اسے جولی کے کمرے میں روشنی دکھائی دی تھی۔ اس وقت وہاں روشنی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ جولی روشنی بند کر کے سونے کی عادی تھی۔

اچانک روشنی بجھ گئی اور جان تیزی سے مینشن کے داخلی دروازے کی طرف لپکا۔ وہ اندر داخل ہوا تو بیشتر روشنیاں بند تھیں اور سیڑھیوں پر کہیں کہیں روشنی تھی۔ لاؤنج اور ہال وے تاریک تھا۔ ولیم کے مینشن والے آفس کی راہداری بھی روشنی کے بغیر تھی۔ جان سیڑھیوں سے اوپر جانے لگا۔ اسے سارے فلور تاریک ملے۔ مگر آخری فلور پر کوئی ضرور تھا ورنہ جولی کے کمرے کی روشنی کون بند کرتا۔ وہ اوپر آیا اور دبے قدموں جولی کے کمرے کی طرف آیا اور اس نے ہینڈل گھمایا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ لاک ہوگا مگر حیرت انگیز طور پر وہ کھلتا چلا گیا۔ جان تیزی سے اندر آیا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگا سوئچ بورڈ کا بٹن دبایا۔ کمرا روشن ہو گیا مگر کمرا خالی تھا۔ جولی وہاں نہیں تھی۔

جان پلٹا تو .... کنٹرول روم کی طرف سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ وہ اس طرف بڑھا اور اس نے اندر جھانکا تو اسے تمام اسکرینز آف نظر آئیں صرف جولی کے کمرے والی اسکرین پر روشنی تھی اور یہی روشنی جھلکی تو اسے پتا چلا کہ کنٹرول روم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اندر آیا اور اس نے کنٹرول پینل کے سامنے رکھے کی بورڈ کے چند بٹن دبائے تو سسٹم آن ہو گیا۔ فوراً ہی تمام اسکرینوں پر منظر آنے لگے۔ یعنی کیمرے کام کر رہے تھے۔ کسی نے کنٹرول پینل ہی آف کر دیا تھا، یہ صرف سارہ یا ولیم کر سکتے تھے۔ کیونکہ

کنٹرول پینل کی چابی صرف ان کے پاس تھی۔ جان اسکرینوں پر دیکھ رہا تھا کہ اس کے عقب میں دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا۔ کھٹکے پر وہ چونک کر مڑا اور تیزی سے دروازے تک آیا اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ مارا اور چلّایا۔ ''باہر کون ہے، دروازہ کھولو۔''

کوئی جواب نہیں ملا۔ باہر مکمل سناٹا تھا، وہ وقفے وقفے سے دروازہ بجاتا اور چلّاتا رہا۔ پھر وہ پلٹ کر کنٹرول پینل کی طرف آیا۔ وہ مختلف کیمروں کے منظر دیکھنے لگا۔ ایک کیمرے پر مینشن کے لاؤنج کا منظر آیا تو وہ چونکا کیونکہ وہاں سارہ ایک صوفے پر بے سدھ پڑی تھی اور فرش پر ولیم اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور دونوں ساکت تھے۔ ''میرے خدا۔'' اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور اسی اثنا میں اسے ایک کیمرے میں کسی کی جھلک دکھائی دی۔ کوئی بہت تیزی سے لاؤنج سے گزر کر مینشن کے داخلی دروازے کی طرف گیا تھا۔ وہ نہیں جان سکا کہ یوں جانے والا کون ہے۔ جان نے نائن ون ون کو کال کی۔ کال ملنے پر اس نے آپریٹر سے کہا۔ ''میں جان کیرنگ ہنٹنگ ٹاؤن کے پاس ووڈ روز مینشن سے بات کر رہا ہوں، یہاں کسی نے مجھے کیمرا کنٹرول سینٹر میں بند کر دیا ہے اور باہر شدید قسم کی گڑبڑ ہے۔ ایک کیمرے میں بہ ظاہر مسٹر اور مسز ولیم بے ہوش نظر آرہے ہیں۔ فوری پولیس اور میڈیکل ایڈ بھیجی جائے۔''

اس نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔ وہ پھر کیمرے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اب اسے باہر کے ایک کیمرے میں کسی کی جھلک دکھائی دی۔ کوئی سفید لباس میں درختوں کی طرف جا رہا تھا۔ جان کنٹرول روم کے دروازے کے پاس آیا اور اس کا لٹو پکڑ کر پوری قوت سے کھینچا تو خلاف توقع دروازہ کھلتا چلا گیا جس نے اسے لاک کیا تھا، اسی نے ان لاک بھی کر دیا۔ وہ تیزی سے باہر اور پھر نیچے آیا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ لاؤنج میں آیا تو سارہ ہوش میں آرہی تھی وہ ہل رہی تھی مگر ولیم گہری بے ہوشی میں تھا۔ جان انہیں دیکھ کر باہر آیا اور ان درختوں کی طرف بڑھا جہاں اس نے آخری بار کسی سائے کو دیکھا تھا، اسے شبہ تھا کہ وہ سایہ جولی کا ہے۔ آسمان پر بادل تھے مگر کہیں کہیں روشن لائٹس کی وجہ سے اندر بھی کسی قدر نظر آرہا تھا۔ اسے دور کسی سفید لباس وجود کی جھلک نظر آئی تو وہ اس طرف بھاگا اور اس نے چلّا کر آواز دی۔
''جولی تم کہاں ہو؟''

جواب میں ایک غیر واضح آواز سنائی دی۔ آواز نسوانی تھی مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ آواز جولی نے نکالی ہے۔ جان درختوں کے درمیان دیوانہ وار دوڑ رہا تھا اور چیخ چیخ کر جولی کو آواز دے رہا تھا۔ بالآخر وہ مینشن کی ایک دیوار تک آگیا۔ یہاں چھوٹی سی پہاڑی تھی اور مین گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی لمحے اسے دور پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ پولیس آرہی تھی۔ اس سے پہلے اس کا جولی تک پہنچنا ضروری تھا۔ اچانک اسے پہاڑی کے اوپری حصے میں سفید وجود دکھائی دیا۔ اس کے عقب میں تیز روشنی تھی، یہ دیواروں پر لگی لائٹس کی روشنی تھی اور اس وجہ سے جولی نمایاں نظر آرہی تھی۔ اس کے خدوخال واضح نہیں تھے مگر وہ جولی ہی تھی۔ جان اس کی طرف بھاگا مگر وہ پہاڑی سے اتری اور غائب ہو گئی۔ قریب پہنچ کر جان پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرنے لگا اور جب جولی کہیں نظر نہیں آئی تو وہ رک کر ہانپنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جولی کس قسم کا کھیل کھیل رہی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ جولی کب اس کے عقب میں آئی اور اس نے آہستہ سے اسے آواز دی۔
''جان۔''

وہ تڑپ کر مڑا اور اس نے جولی کے دونوں بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لیے۔ وہ سرد اور نم ہو رہے تھے۔ وہ اس سرد موسم میں بھی معمولی سی نائٹی میں تھی۔ ''میرے خدا' جولی یہ سب کیا ہے تم ٹھیک ہو نا؟''

جولی اس کے گلے لگ گئی اور اچک کر اس کے کان میں کہا۔ ''آئی ایم سوری جان، آئی ایم رئیلی سوری۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا تم فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں' میں اس سازش کا گواہ ہوں جو ولیم نے سب سے مل کر تمہارے خلاف کی ہے اگر تم نے کچھ کیا ہے تو ہوش حواس میں نہیں کیا۔''

''جان تم بالکل نہیں سمجھ رہے۔'' جولی نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ ''میں تم سے معذرت کر رہی ہوں۔ مجھے اور کسی بات کا افسوس نہیں ہے۔ میری طرف سے سب بھاڑ میں جائیں۔''

جان جلدی جلدی کہنے لگا۔ ''میں مارلن گارشیا کے بارے میں جان گیا ہوں' وہ این اور اس کی ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بنی اور کارل مین کی بے پروائی کی وجہ سے حادثے کا شکار ہو گئی۔ پولیس آرہی ہے اور وہ تمہیں گرفتار کر لے گی مگر میں تمہیں بچا لوں گا۔ میں تمہیں سزا ہونے نہیں دوں گا۔''

''میں نے کہا نا جان' مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔''

جولی بولی۔

اسی لمحے عقب سے پولیس والوں کے چلّانے اور کُتّوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ جان مڑ کر ہاتھ لہرانے لگا۔
”اے اِدھر... ہم یہاں ہیں۔“

اسے پتا نہیں چلا کہ جولی کب اس کے پیچھے سے کھسک گئی اور اب وہ اکیلا کھڑا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی طرف آرہے تھے، جان جولی کی طرف مڑا تو وہ جگہ خالی تھی جہاں چند لمحے پہلے جولی کھڑی تھی۔ اسی اثنا میں پولیس نے اسے گھیر لیا۔ انہوں نے اس پر گنیں تان لی تھیں اور چلّا چلّا کر اس سے ہاتھ اوپر کرنے کو کہہ رہے تھے۔ جان نے ہاتھ اوپر کیے تو اسے ٹارچ کی روشنی میں پہلی بار اپنے ہاتھوں پر سرخی نظر آئی۔ اس کے ہاتھوں پر خون لگا ہوا تھا اور یہ خون جولی کے ہاتھوں سے لگا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ جولی کے ہاتھ کس چیز سے تر تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کیے تو پولیس والوں نے بھی خون دیکھ لیا۔ چند منٹ بعد وہ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا پولیس کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ووڈ روز مینشن پولیس کاروں سے بھر گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایمبولینس بھی آئی تھی۔ پیرا میڈک عملہ اندر گیا تھا۔ وہ سب دیکھ رہا تھا اور اب سب سمجھ بھی رہا تھا مگر اسے دیر ہوگئی تھی۔

☆☆☆

جان کمرے میں ڈسٹرکٹ اٹارنی جان گلین کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ جان گلین، میرین میں اس کے ساتھ آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی آرمی کو خیرباد کہا تھا۔ اس نے وکالت کا پیشہ منتخب کیا اور اب وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی جنرل کے عہدے پر کام کررہا تھا۔ اس نے فائل جان کے سامنے رکھی اور بولا۔ ”تمام شواہد تمہارے خلاف جارہے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں پر لگا خون انسانی ثابت ہوا اور یہ جولی کے بلڈ گروپ کا خون تھا۔ تم ٹریس پاس کرکے ووڈ روز مینشن میں داخل ہوئے۔ کیمروں نے تمہیں اوپر جاتے ہوئے ریکارڈ کیا، اسی طرح تم کسی کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہوئے۔“

”میں بتا چکا ہوں کہ جب میں اوپر پہنچا تو کنٹرول پینل بند تھا اور پھر کسی نے مجھے وہاں بند کردیا۔“

”کم آن جان کیوں بچوں کی سی باتیں کررہے ہو۔“ جان گلین نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا شاپر نکالا جس میں چاندی جیسے رنگ کی چابی تھی۔ ”یہ تمہارے پاس سے برآمد ہوئی ہے نا؟“

”ہاں۔“ جان نے سر ہلایا۔ ”یہ جولی نے مجھے دی تھی، اس کے گھر کی علامتی چابی ہے۔“

”یہ کنٹرول روم کی چابی ہے۔“ جان گلین نے کہا۔ ”اس کے ہوتے ہوئے تم کسی صورت کنٹرول روم میں قید نہیں ہوسکتے۔“

جان دنگ رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں، یہ چابی مجھے جولی نے دی تھی۔“

”جولی کے کمرے کے لاک پر تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے گئے۔ تم نے اپنے سیل سے جولی اور ووڈ روز مینشن کے نمبر پر کال کی۔ تم رات کے اس پہر وہاں گئے، آخر کیوں؟“

”کیونکہ مجھے وہاں سے کال آئی تھی۔“ جان نے برہمی سے کہا۔ ”تم نے میرے سیل کے ریکارڈ سے معلوم کرلیا ہوگا۔“

”کیمروں نے تمہیں ولیم اور سارہ کے پاس ریکارڈ کیا اور پھر تم باہر نکل گئے۔ باہر والے کیمروں نے تمہیں ریکارڈ کیا اور تمہاری آواز بھی جب تم جولی کو پکار رہے تھے۔ تم اس کا پیچھا کررہے تھے۔“

”میں اسے تلاش کررہا تھا۔“ جان کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ ”جان میں تمہیں پوری کہانی سنا چکا ہوں۔“

”جو صرف کہانی ہے اس کا کوئی ثبوت تم پیش نہیں کرسکے۔ تم نے کہا تم نے جولی کو آزاد دیکھا مگر پولیس نے پورا مینشن چھان مارا اور جولی کا کہیں نام و نشان نہیں ملا۔ اس کی تمام چیزیں، حتیٰ کہ سلیپرز اور گرم کوٹ بھی موجود تھا۔ وہ صرف رات کے لباس میں غائب ہوئی۔ کوئی اس موسم میں رات کا لباس پہن کر باہر جاسکتا ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، یہ سب جولی کا کیا دھرا ہے۔ ولیم اور اپنی ماں کو اسی نے بے ہوش کیا۔“

”سارہ کا کہنا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے برانڈی پی تھی اور برانڈی کی یہ بوتل انہوں نے تمہاری آمد پر تمہاری تواضع کے لیے نکالی تھی۔ بعد میں اس میں بے ہوشی کی دوا پائی گئی۔ تم جانتے ہو یہ سکون آور دوا تمہارے پاس بھی ہوتی ہے جو برانڈی میں ملائی گئی تھی اور دوا کی شیشی پر تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے گئے۔“

”لیکن میں یہ سب کیوں کروں گا؟“

”جولی کے لیے، تمہارے لیپ ٹاپ میں جولی سمیت کئی سولڑکیوں کی عریاں تصاویر نکلی ہیں۔“

”یہ جولی نے ڈالی تھیں۔“

''کیسے؟ کیا تم اپنے لیپ ٹاپ پر کوئی کوڈ نہیں رکھتے۔ پولیس نے تو اسے کوڈ کی مدد سے کھولا۔''

''ہاں لیکن جولی نے میرے ذہن سے کوڈ معلوم کر لیا تھا۔''

جان گلین ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''جان تمہاری بیوی جولیٹ نے کیوں خودکشی کی، کیا اس لیے کہ تم اس کے بجائے کم عمر لڑکیوں میں دلچسپی لیتے تھے؟''

''یہ سب بکواس ہے۔''

''جان جولی کہاں ہے اور تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''جو حقیقت تھی، وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

جان گلین کھڑا ہو گیا اور اس نے فائل اٹھالی۔ ''سوری جان یہ سب صرف ایک کہانی ہے اور تمہیں اب حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ تم جیل جانے کی تیاری کر لو اگر تمہیں سزائے موت نہ ہوئی تو...''

جان گلین کمرے سے باہر چلا گیا اور تب جان نے دیکھا دیوار کے ساتھ ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا کیونکہ اینڈرسن ہائر بھی اس کی طرح رسائی پروجیکٹ کے مائنڈ اسپائیز میں سے ایک تھا۔ گہرے سیاہ بالوں اور مونچھوں والا اینڈرسن اسے گھور رہا تھا، اس نے جان سے کہا۔ ''اب واپس آجاؤ۔''

☆☆☆

جان نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ جیل کے لباس میں اینڈرسن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جان کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ یہ جگہ جیل کا ہال تھا جہاں قیدیوں کے لیے تقریبات ہوتی تھیں اور اینڈرسن سے اس کی ملاقات کا اہتمام یہیں ہوا تھا۔ اینڈرسن نے ہاتھ بڑھا کر جان کے ماتھے سے چپکا الیکٹروڈ اتار دیا۔ ائر پلگ جان نے خود نکال لیا۔ برابر میں رکھے لیپ ٹاپ کی کرسٹل کلیئر اسکرین پر رسائی کا سوفٹ ویئر بتا رہا تھا کہ سیشن کامیاب رہا تھا۔ اینڈرسن نے کہا۔ ''تعاون کا شکریہ مسٹر کیرنگ۔''

''کیا مجھے اس سے فائدہ ہوگا؟'' جان نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

اینڈرسن نے گہری سانس لی۔ ''بدقسمتی سے عدالت اب تک اسے ایک ثبوت کے طور پر ماننے کو آمادہ نہیں ہوئی ہے مگر شاید کیس ری اوپن کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

جان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں فیصلہ وہی ہوگا اور میں دوبارہ اپیل کا حق کھو دوں گا۔''

''وش یو گڈ لک۔'' اینڈرسن اپنا لیپ ٹاپ سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف آواز کے ساتھ لوہے کا گرل والا دروازہ کھلا اور دو گارڈز اندر آئے۔ جان کو سزا ہوئے آج ایک مہینا ہو گیا تھا اور کیس دو مہینے تک عدالت میں چلا تھا۔ جان گلین کا کہنا درست ثابت ہوا کہ کیس اس کے خلاف گیا اور عدالت نے بہ آسانی اسے جولی کی گمشدگی کا ذمے دار قرار دے کر دس سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ جان سرد آہ بھر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اسے دنیا میں صرف ایک ہستی اس قید سے چھڑوا سکتی تھی۔ مگر اسی ہستی نے جیل بھجوایا تھا اور اس کے بعد سے غائب تھی۔ جان اکثر سوچتا تھا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے اور اس نے اپنا تحفظ کیسے کیا ہوگا؟ مگر فوراً ہی اسے یاد آجاتا کہ اس لڑکی نے نہ صرف اسے بلکہ ولیم کو بھی کتنی آسانی سے بے وقوف بنا لیا۔ اس نے سارا پلان بہت اچھی طرح ترتیب دیا تھا اور اس پر بہت اچھی طرح عمل کیا۔ اس سے یہ توقع مشکل تھی کہ وہ ایسے ہی منہ اٹھا کر نکل گئی ہو، اس نے یقیناً اس بارے میں بھی اچھی طرح سوچ رکھا ہوگا۔

☆☆☆

جان جیل میں ملاقاتیوں والے حصے میں ڈاکٹر ایڈورڈ کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ شرمندہ تھا۔ وہ اس سے نظریں ملا نہیں پا رہا تھا۔ ملاقات کے آغاز میں اس نے معذرت کی۔ ''سوری ڈاکٹر میں تمہیں غلط سمجھتا رہا۔''

''اس میں تمہارا قصور نہیں ہے جان۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت سے مسائل سے دوچار رہے۔ بیوی کا صدمہ اور پھر ہارٹ اٹیک۔ غلطی مجھ سے ہوئی کہ تم پر اس کیس کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا مگر اس وقت میں اسے بہت عام اور آسان سمجھا تھا۔''

''نہیں تم نے میرے ساتھ اچھا کیا۔'' جان بولا۔ ''غلطی میری تھی، میں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں بھول کر جذبات کے چکر میں پڑ گیا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر جولی کو تحفظ دینے لگا کہ میں اس کے نفسیاتی مسائل تک تو پہنچا ہی نہیں تھا۔''

''وہ بہت ذہین لڑکی ہے لیکن اس نے اپنی ذہانت کا منفی استعمال کیا۔''

''اس نے مارلن گارشیا کی موت کا بدلہ لینے کے لیے یہ ساری چالیں چلیں۔ اس نے منصوبے کے تحت این اور دوسری لڑکیوں سے روابط بڑھائے۔ کارل مین نے اسے

نہیں بلکہ مارلن کو رجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کارل مین کی تحویل سے زہر چرایا اور چائے میں ان تینوں لڑکیوں کو دیا۔ کارل مین اس جرم میں پکڑا گیا اور یوں اس نے اپنی دوست کی موت کا بدلہ لیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے تائید کی۔ "وہ اتنی تیز نکلی کہ اس نے اپنے ذہن میں تمہیں ٹریپ کر کے وہ سب دکھایا جو حقیقت میں نہیں ہوا تھا اور جو حقیقت میں ہوا تھا تمہیں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اس نے رومیلا اور ولیم کے تعلق کے بارے میں جھوٹ دکھایا کیونکہ وہ ان دونوں سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے تمہیں ذہنی طور پر منتشر کرنے کے لیے میرے بارے میں جھوٹ دکھایا کہ میں اس سے متاثر رہا ہوں اور وہ مجھ سے خوفزدہ تھی۔ اس کا مقصد تمہیں اصل حقائق تک پہنچنے سے روکنا تھا۔"

"لیکن میں سمجھ نہیں پایا کہ اس نے مجھے کیوں ٹارگٹ کیا؟"

"کیونکہ تم اس کے لیے آسان شکار بن سکتے تھے۔ اول تم بیوی کی خودکشی کی وجہ سے پہلے ہی ڈسٹرب تھے۔ دوم اس کا نام جولی تھا اور تیسرے اسے تحفظ کی ضرورت تھی۔ جولی نے تمہاری ان ہی نفسیاتی کیفیتوں سے فائدہ اٹھایا۔ مجھے بعد میں سارہ نے بتایا کہ اصل میں جولی نے تم سے علاج کرانے کی فرمائش کی تھی اور سارہ کو پابند کیا تھا کہ وہ ولیم سے اس کا ذکر نہیں کرے گی۔ یوں تم اس تک پہنچے اور اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔"

"یہ سب اس نے نفسیاتی اسپتال نہ جانے کے لیے کیا؟"

"بالکل وہاں اس کی شخصیت کو مکمل کھنگال لیا جاتا اور ممکن ہے اسکول میں اس کے جرائم سامنے آجاتے۔ اس لیے وہ بچ رہی تھی اور اسے ایک راستہ یہ بھی نظر آیا کہ وہ تمہیں استعمال کرے۔"

"مگر فائدہ... وہ اب بھی روپوش ہے اپنے باپ کی دولت استعمال نہیں کر سکتی ہے۔"

ڈاکٹر ایڈورڈ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے اتنی پلاننگ سے سارا کام کرنے والی جولی نے اس چیز کا خیال نہیں رکھا ہوگا، وہ کسی برتے پر ہی یوں گھر سے نکلی ہوگی۔"

"وہ گھر سے نکل سکتی تھی اس کے پاس پورے گھر کی چابیاں تھیں اور وہ آرام سے باہر بھی آسکتی تھی۔ تب اسے میرا سہارا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایسے ہی چلی جاتی۔ اس نے اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کیوں کی... اس نے اتنا رسک کیوں لیا اگر اس کی پلاننگ کا کوئی ایک نقطہ بھی پورا ہونے سے رہ جاتا تو وہ ناکام ہو جاتی۔"

"ہاں یہ قابلِ غور نقطہ ہے لیکن جان اس کی بھی کوئی نہ کوئی وضاحت ہوگی۔ پھر ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بہت زیادہ ذہین ہونے کے باوجود وہ بہرحال ایک نفسیاتی مریضہ تھی اور ایسے لوگوں سے ہم منطقی رویے کی توقع نہیں کر سکتے ہیں۔"

جان نے گہری سانس لی۔ "ڈاکٹر سچ تو یہ ہے میں اب تک جولی کو قصوروار ماننے کو تیار نہیں ہو سکا ہوں۔"

"میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ تم اس سے اٹیچ ہو گئے تھے۔ اس نے تمہیں جذباتی بلیک میل کیا۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ "ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں پیرول پر رہا کرالیں۔ اس کے لیے رسائی پروجیکٹ کو استعمال کیا جائے گا۔ لیکن تم جانتے ہو عدالت اسے بہ طور ثبوت نہیں لیتی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگ جائے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"جان تم اکیلے نہیں ہو، میں اور میری پوری ٹیم تمہارے ساتھ ہے اور ہم سے جو ہو سکا، وہ تمہارے لیے کریں گے۔"

"میں اس کے لیے شکرگزار ہوں۔" جان نے کہا۔

"گڈ بائی جان اپنا خیال رکھنا اور امید کا دامن مت چھوڑنا۔"

گارڈز کے ساتھ اپنے سیل کی طرف جاتے ہوئے جان سوچ رہا تھا کہ جولی اس وقت کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی؟

☆☆☆

شوخ سرخ اسکرٹ اور ذرا ہلکے رنگ کے بلاؤز میں وہ بینک میں داخل ہوئی اور پُراعتماد قدموں سے کاؤنٹر تک آئی۔ "منیجر پلیز۔"

"آئی ڈی پلیز مس۔" کاؤنٹر پر موجود نوجوان نے مؤدب انداز میں کہا۔ یہ ایک بڑے انٹرنیشنل بینک کی اہم شاخ تھی یہاں صرف وہی گاہک آتے تھے جن کے کم سے کم تین مختلف ممالک میں اثاثے ہوں۔ جواب میں لڑکی نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کر دیا۔ نوجوان نے کارڈ لے کر کمپیوٹر میں ڈالا اور بولا۔ "مس آرم اسٹرانگ، آپ کو چند منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ سیٹ پلیز۔" اس نے سامنے موجود

آرام دہ صوفہ نما نشستوں کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی صوفے پر بیٹھی تھی کہ ایک خوش پوش لڑکی آ گئی۔

''اینی ڈرنک مس آرم اسٹرانگ۔''

''نو تھینکس۔'' اس نے جواب دیا اور نزاکت سے پاؤں پر پاؤں رکھ لیا۔ اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا تھی۔ اس کے ہاتھ میں زرد ہیروں کا بریسلٹ تھا۔ مگر کسی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ اس نے اپنا بیگ ساتھ رکھ لیا تھا۔ چند منٹ بعد اندر سے بینک منیجر برآمد ہوا اور سیدھا اس کی طرف آیا۔ اس نے گرم جوشی سے کہا۔

''مس آرم اسٹرانگ تم کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

لڑکی نے نزاکت سے ہاتھ آگے بڑھا دیا تو اس نے احترام سے لبوں سے لگایا۔ ''تھینک یو مسٹر برنارڈ۔''

''میرے ساتھ آیئے۔''

برنارڈ اسے اپنے کمرے میں لایا۔ وہ سفید بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے لڑکی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''تم کیسی ہو اور تم بہت پیاری ہو گئی ہو۔''

''شکریہ۔'' لڑکی مسکرائی۔ اس نے شوخ سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ ''پاپا نے مجھے جب آپ کے بارے میں بتایا تو ان کے الفاظ تھے کہ میں ان کے بعد دنیا میں کسی شخص پر اعتبار کر سکتی ہوں تو وہ آپ ہیں۔''

''میں مسٹر آرم اسٹرانگ کے اس اعتماد کا ان کے بعد بھی شکر گزار ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں یہی نام استعمال کرنے چاہئیں۔ کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا اور میں تمہاری آمد کا منتظر تھا۔''

''کچھ مسائل تھے، میں ان سے نمٹ رہی تھی۔ کاغذات بنوانا تھے اور پھر پاسپورٹ کا مسئلہ بھی تھا۔ بہرحال اب سب مسائل حل ہو گئے ہیں کیونکہ پاپا میرے لیے بہت اچھے انتظامات کر کے گئے تھے۔''

''چائے، کافی کوئی ڈرنک...''

''نہیں شکریہ، میں صرف اپنی امانت لینے آئی ہوں۔''

''ضرور۔'' منیجر برنارڈ نے کہا اور پھر اپنے کمرے میں موجود سیف سے ایک اسٹیل باکس نکالا۔ ''یہ رہی تمہاری امانت جو میں نے پندرہ سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔''

لڑکی نے باکس لیا اور پرس سے ایک چابی نکال کر بکس میں لگائی اور وہ کھل گیا اس نے اس میں موجود چیزوں کا معائنہ کیا۔ یہ اس کے باپ کا اصل اثاثہ تھا اور یہ امریکا سے باہر تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ''مسٹر برنارڈ میں آپ کی شکر گزار ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''مسٹر آرم اسٹرانگ سے میرا دہرا تعلق تھا۔ بزنس کا بھی اور دوستی کا بھی۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس کے بدلے یہ بہت چھوٹی سی کاوش ہے۔''

''آپ کے لیے چھوٹی کاوش ہے لیکن میرے لیے بہت بڑی ہے۔'' لڑکی نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

''پلیز کچھ دیر رکیں۔'' برنارڈ نے التجا کی۔ ''میں نے کہا نا کہ سا... آرم اسٹرانگ میرا بہت اچھا دوست بھی تھا۔''

''تکلف کی ضرورت نہیں ہے مسٹر برنارڈ۔'' لڑکی جو جولی تھی، اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''شاید ہماری پھر ملاقات بھی نہ ہو۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' برنارڈ نے سر ہلایا۔ ''یہی بہتر ہے۔''

برنارڈ، جولی کو بینک سے باہر تک چھوڑنے آیا جہاں اس کے لیے ایک شاندار لیموزین کھڑی تھی۔ باوردی ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ اندر بیٹھ گئی۔ اس نے ڈرائیور سے ایک ایکسپریس سروس کے ہیڈ آفس چلنے کے لیے کہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایکسپریس سروس آفس کے سامنے اتری اور اندر آئی۔ اس نے پارسل ڈلیوری کاؤنٹر پر اپنے ہینڈ بیگ سے ایک لفافہ نکال کر کاؤنٹر گرل کی طرف بڑھایا۔ ''یہ چار دن بعد لکھے پتے پر ڈلیور کرنا ہے۔''

''ہو جائے گا میم۔'' لڑکی نے ادب سے کہا۔ ''اس کے ساتھ اور کچھ؟''

جولی نے آس پاس دیکھا اور پھر ایکسپریس سینٹر کی فلاور شاپ کی طرف بڑھی، اس نے وہاں سے گلاب کا ایک پھول اٹھایا اور لڑکی کو دیا۔ ''میں چاہتی ہوں یہ بھی اس لفافے کے ساتھ ڈلیور ہو۔''

''چار دن میں یہ مرجھا جائے گا لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے ہم تازہ پھول بھیج دیں گے۔ بالکل ایسا ہی۔'' لڑکی نے کہا اور اسے چارجز بتائے۔ جولی نے اسے نقد ادائیگی کر دی۔

☆☆☆

پریس اور میڈیا کے ہجوم نے جیل کے باہر جان کو گھیر رکھا تھا اور اس پر سوالوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کی رہائی کیسے ہوئی اور جو اندر کی بات جانتے تھے وہ جولی کے بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین تھے۔ مگر جان کسی بھی سوال کا جواب دیے بغیر ڈاکٹر ایڈورڈ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر اسے خود لینے آیا تھا۔ جان کے روتے اور گاڑی کی روانگی پر رپورٹرز اور کیمرامینوں کا ہجوم گاڑی کے پیچھے دوڑا تھا۔ ٹی وی کی نیوز کاسٹر یہ منظر دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”جان کیرنگ جسے جولیا وڈ روز کیس میں دس سال کی سزا ہوئی تھی، نئی شہادتوں کے سامنے آنے کے بعد عدالت نے کیس کو نئے سرے سے کھولنے کا حکم دیتے ہوئے جان کو فوری ضمانت پر رہا کر دیا۔ ذرائع کے مطابق جیل حکام کو ایک لفافہ موصول ہوا جو نیویارک سے بھیجا گیا تھا اور ایکسپریس سروس کے مطابق اسے چار دن پہلے حوالے کیا گیا تھا۔ لفافے کے ساتھ ایک گلاب کا پھول بھی بھیجا گیا۔ لفافے میں گمشدہ جولیا وڈ روز کی ایک تصویر اسی دن کے نیویارک ٹائمز کے شمارے کے ساتھ تھی۔ یہ ایک واضح شہادت تھی کہ جولیا نہ صرف زندہ ہے بلکہ آزاد بھی ہے۔ ایکسپریس سروس کے ملازمین اور کیمروں کی ریکارڈنگ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لفافہ اور پھول بھیجنے کے لیے جولیا خود وہاں آئی۔ اس نے ایک کرائے کی لیموزین ہائر کی تھی۔ مگر اس کے ڈرائیور نے پولیس کو کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی جاب کے تقاضوں کے خلاف ہے اور وہ صرف عدالتی حکم پر جولیا کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ مگر فی الحال جولیا وڈ روز کے بارے میں نہ تو پولیس کسی کیس میں تفتیش کر رہی ہے اور نہ عدالت میں اس کے خلاف کوئی کیس ہے۔“

جولی نے بستر پر پڑا ریموٹ اٹھا کر سامنے لگا تقریباً پچاس انچ سائز کا ٹی وی آف کر دیا اور بستر سے اتر کر شیشے کی تقریباً پوری دیوار پر محیط کھڑکی تک آئی۔ کھڑکی کے پار دور بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں تھیں جو پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور ان پر خوش نما ولاز تھے۔ اسپین کے اس ساحلی علاقے میں امرا رہتے تھے اور یہاں رہنے والے کم سے کم کروڑ پتی ضرور ہوتے تھے۔ جولی نے انگڑائی لی اور مسکرانے لگی۔ سائمن وڈ روز نے اپنی اصل دولت سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں رکھی تھی اور یہ اکاؤنٹ جولی کے نام تھے۔ مرنے سے پہلے اس نے جولی مینشن میں جنگل والی پہاڑی کے پاس ایک خفیہ جگہ دکھائی تھی۔ یہیں سے وہ خفیہ راستہ نکلتا تھا جس سے وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر مینشن سے باہر آتی جاتی تھی۔ سائمن مستقبل کا سوچ کر اس کے لیے مکمل انتظامات کر کے گیا تھا۔ جولی واپس بستر کی طرف آئی اور اس نے سیلائٹ فون اٹھا کر روز وڈ مینشن کا نمبر ملایا۔ کال ملازمہ نے ریسیو کی اور اس کی ہدایت پر سارہ کو بلایا۔ جولی کی آواز سن کر وہ بے تاب ہو گئی۔

”جولی... جولی... یہ تم ہو؟“

”یس مام۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”میں نے صرف یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ جلد میرا وکیل تم لوگوں سے رابطہ کرے گا اور تمہیں مینشن خالی کرنا ہوگا۔ اس مینشن یا میری کسی بھی چیز سے اب تمہارا اور ولیم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

سارہ شاک رہ گئی۔ ”تب... تب ہم کیا کریں گے؟“

”اگر تم ولیم کو چھوڑ دیتی ہو تو مینشن میں رہ سکتی ہو اسی طرح عیش و آرام سے ورنہ...“ جولی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور کال کاٹ دی۔

☆☆☆

”بالآخر جولی ہی تمہارے کام آئی۔“ ڈاکٹر ایڈورڈ نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”سچی بات ہے اگر وہ تصویر نہ بھیجتی تو تمہاری ضمانت پر رہائی اور کیس ری اوپن ہونا بہت مشکل تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ جان نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا جولی نے اسے استعمال کیا اور پھر اس طرح سے میرا شکریہ ادا کیا۔ ”اس سے ایک اطمینان ہو گیا کہ وہ خیریت سے ہے۔“

ڈاکٹر ایڈورڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دیا۔ ”تم اس کے لیے بالکل نہیں بدلے۔“

”ہاں ڈاکٹر، یہ سچ ہے۔“ جان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرے ساتھ بہت کچھ ہو گیا لیکن اس کے خلاف میرے دل میں ایک بار بھی کوئی خیال نہیں آیا۔ مجھے اس سے نفرت نہیں ہوئی۔ میرے نزدیک وہ اب بھی مظلوم اور قابلِ معافی ہے۔“

”اس سب کے باوجود جو اس نے کیا؟“

”ہاں اس سب کے باوجود۔“ جان نے سر ہلایا۔ اس کے اپارٹمنٹ کی عمارت آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کار روک دی۔

''اب تم کیا کرو گے؟''

''ڈاکٹر تم نے میرے لیے جو کیا، میں اس پر شکر گزار ہوں لیکن اب میں مزید رسائی کے لیے کام نہیں کر سکتا۔''

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ جولی نے ثابت کر دیا ہے کہ دماغ کسی بھی سوفٹ ویئر اور کمپیوٹر سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور اس طریقے سے ہم درست نتائج حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ جولی جیسا کوئی بھی دماغ ہمیں بہت آسانی سے گمراہ کر سکتا ہے۔ جولی کی بات اور تھی لیکن اب میں مزید کسی کے ہاتھوں بے وقوف نہیں بن سکتا۔''

ڈاکٹر ایڈورڈ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیسی تمہاری مرضی، وش یو گڈ لک جان۔''

''ایک بار پھر شکریہ ڈاکٹر۔'' جان نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ ڈاکٹر نے کار آگے بڑھا دی اور جان اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں جانے سے پہلے بلڈنگ منیجر کے دفتر کا رخ کیا اور اسے اطلاع دی کہ وہ اپارٹمنٹ چھوڑ رہا ہے اگر اس کے ذمے کچھ واجبات رہ گئے ہیں تو وہ ان کا بل اسے ای میل کر دے۔ منیجر سے بات کر کے وہ اوپر آیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ اگلے دن اس نے کئی چکر لگا کر اپنا سامان ساحل والے گھر میں شفٹ کیا۔ یہ اس کا ذاتی سامان تھا کیونکہ فلیٹ فرنش تھا اور اسے کچھ نہیں لے جانا پڑا تھا۔ کئی گھنٹے لگا کر اس نے اپنا سامان سیٹ کیا اور پھر باہر نکل آیا۔ سمندر کی طرف سے بہت سرد ہوا چل رہی تھی مگر ایک مہینے بعد بہار کا آغاز ہو جاتا اور پھر یہاں کا موسم بہت شاندار ہو جاتا۔ اس کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے نکال کر دیکھا۔ نمبر کی جگہ اَن ناؤن کالر لکھا ہوا آ رہا تھا اس نے کال ریسیو کی اور بولا۔ ''ہیلو جولی کیسی ہو؟''

''تمہیں معلوم تھا کہ میری کال آئے گی؟'' جولی کی شوخ آواز آئی۔

''ہاں اب میں تمہیں اتنا تو جان گیا ہوں۔'' جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر مجھے نامعلوم نمبر سے تم ہی کال کر سکتی ہو۔''

''میں سوری نہیں کروں گی کیونکہ میں پہلے ہی سوری کر چکی تھی۔''

''مجھے یاد ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' جان نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ میں نے کال کیوں کی ہے؟''

''شاید اس لیے کہ دیکھ سکو تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کے بعد میرا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟''

''نہیں، میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ اگر میں اس دنیا میں کسی فرد سے محبت کرتی ہوں تو وہ تم ہو۔''

''شاید میں جانتا ہوں اس لیے چاہنے کے باوجود تم سے نفرت نہیں کر سکا۔''

''تم جاننا چاہو گے کہ میں نے یہ سب کس طرح کیا؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ تم نے یہ سب کس طرح کیا۔ ہاں ایک سوال ہے جس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ جب تم ویسے بھی جا سکتی تھیں تو تم نے یہ سب کیوں کیا؟''

''ہاں میں جا سکتی تھی مگر اس صورت میں میری تلاش شروع ہو جاتی اور میں آزادی سے وہ سب کام نہیں کر سکتی تھی جو کرنا ضروری تھے۔ مجھے اپنے شناختی کاغذات حاصل کرنا تھے۔ اپنی دولت حاصل کرنے کے لیے ابتدائی اقدامات کرنے تھے اور اس ملک سے نکلنے کے انتظامات کرنے تھے۔ ان سب کے لیے مجھے وقت درکار تھا اس لیے میں نے تمہارا سہارا لیا۔ تمہیں استعمال کیا اور سب تمہاری طرف متوجہ رہے اور میں اپنا کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئی۔''

''بس یہی ایک کھٹک تھی میرے اندر۔''

جولی نے کہا۔ ''ہاں ایک اور بات کی سوری کرنی ہے۔ میں نے تمہیں رومیلا کے بارے میں مس گائیڈ کیا۔ وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

''ہاں اب میں جان گیا ہوں۔'' جان نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''دیر نہیں ہوئی ہے۔'' جولی نے مشورہ دیا۔ ''تم ایک بار اس سے بات کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری منتظر ہو۔ عورت جس سے ایک بار محبت کرلے اُسے بھی فراموش نہیں کرتی ہے۔''

کال منقطع ہوئی تو جان نے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس نے پلٹ کر اپنے خوب صورت مکان کی طرف دیکھا۔ وہ صرف ایک مکان تھا اور اسے گھر کوئی عورت ہی بنا سکتی تھی۔ اس نے جولی کے مشورے پر غور کیا پھر کچھ دیر بعد پھر موبائل نکالا اور رومیلا کو کال کرنے لگا۔

ہیرو

تنویر ریاض

الفاظ بہت کچھ بدل دینے کی طاقت رکھتے ہیں... مگر بعض اوقات خاموشی ہر لفظ پر سبقت لے جاتی ہے... اندر کی تنہائی اور اُداسی کے بیاباں میں گزرتے ماہ و سال سے دوچار خاندان... ماضی کی ایک غلطی نے انہیں تمام زندگی کے لیے اسیر کرلیا تھا... مگر لبوں کی خاموشی نے اس قید سے آزادی دلا دی تھی...

دوستوں اور خاندان کے لیے ہیرو کا درجہ حاصل کرنے والے نوجوان کا کارنامہ

وہ تینوں بچے جوش کے باپ کی بنائی ہوئی چھوٹی سی گودی پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ اس جگہ لمبی لمبی گھاس اور شاہ بلوط کے درختوں کی کثرت تھی۔ موسم سرما کا آغاز ہوچکا تھا اور فضا میں ہلکی ہلکی خنکی چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تازہ مچھلیاں مچل رہی تھیں جو انہوں نے لکڑی کی کشتی پر سوار ہوکر پکڑی تھیں۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں ماہی گیر اپنے خاندانوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کا ذریعۂ معاش مچھلیاں پکڑنا تھا اور یہ بچے بھی جو اَب سن بلوغت میں

داخل ہو رہے تھے، اپنے والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ شوق پورا کر رہے تھے۔

جوش نے کیکڑے کو اپنے جال میں مچلتے اور پھڑ کتے ہوئے دیکھا جو اپنے پنجوں کے ذریعے جال سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جوش نے جال الٹ کر کیکڑے کو زمین پر ڈال دیا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا تا کہ اسے اس کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آئس بکس میں رکھے لیکن ویلون کسی اور ہی مزاج کا لڑکا تھا۔ اس نے جوش کو ایک طرف دھکیلا اور اپنا پاؤں کیکڑے پر رکھ دیا۔ اس سمندری مخلوق کا جسم پھٹ گیا اور سارے اعضا باہر نکل آئے۔

''اے۔'' میلوڈی بولی۔ ''تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسے اٹھاؤ اور آئس بکس میں ڈال دو۔ تمہیں اتنا ظالم نہیں ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ ویلون کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔

پھر اس نے جوش کی طرف دیکھا۔ شاید وہ جاننا چاہ رہی ہے کہ وہ اسے تفریح پہنچانے کے لیے کیا کرتا ہے۔ ویلون نے میلوڈی کی خواہش پر عمل کرتے ہوئے کچلے ہوئے کیکڑے کو آئس بکس میں ڈال دیا اور ایک زندہ کیکڑا ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے جوش کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میلوڈی کو دکھا دو کہ جب کیکڑے کی ٹانگیں توڑ دی جائیں تو وہ کیسا لگتا ہے، یہ صرف اپنے پنجوں کی مدد سے رینگتا رہے گا۔''

''اے۔'' میلوڈی نے دوبارہ کہا۔ ''اس بے چارے کیکڑے کے ساتھ ایسا مت کرو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

جوش نے کیکڑا پکڑ لیا اور میلوڈی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ میلوڈی کو خوش کرنے کے لیے کوئی تماشا کرنا چاہتا تھا۔ اسے میلوڈی ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی۔ اسے تھوڑی دیر پہلے ویلون سے ہونے والی گفتگو یاد آئی جب وہ دونوں میلوڈی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ اس کے ساتھ کیکڑے پکڑنے یا سمندر میں تیرنے کے لیے جا سکیں۔ نو سال کی عمر سے ان کا ہر گرمیوں میں یہی معمول تھا۔

''میلوڈی کچھ مختلف لگنے لگی ہے۔'' اس نے ویلون سے کہا۔ ''تم نے اس پر غور کیا؟''

ویلون نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا .... ''وہ لڑکی سے عورت بن رہی ہے جس طرح تم بڑے ہو رہے ہو لڑکے۔''

''میں بھی تمہاری عمر کا ہوں۔'' جوش نے کہا۔ ''مجھے لڑکا مت کہو۔ تمہاری طرح میں بھی مرد ہوں۔''

ویلون نے قہقہہ لگایا۔ ''صرف کاغذوں پر، لڑکے، صرف کاغذوں پر۔''

جوش نہیں جانتا تھا کہ اسے یہ باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں لیکن اب وہ میلوڈی کے سامنے ہاتھ میں کیکڑا پکڑے کھڑا تھا جو کسی دلچسپ حرکت کی توقع کر رہی تھی۔ جوش نے وہ کیکڑا زمین پر رکھ دیا اور اس کے پنجے پکڑتے ہوئے بولا۔

''دیکھو، اب یہ ناچے گا۔''

اس نے میلوڈی کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑی تھی ..... اس نے کیکڑے کو آزاد کر دیا اور وہ چھلانگیں مارتا ہوا پانی میں کود گیا۔

''بہت خوب!'' میلوڈی نے قہقہہ لگائے بغیر کہا۔ ''میں گھر جا رہی ہوں۔ ابھی واپس آ جاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد ویلون نے کہا۔ ''لڑکیوں کو دلیری اچھی لگتی ہے۔ اس طرح کی احمقانہ حرکتوں سے تم ان کی توجہ حاصل نہیں کر سکتے۔''

''ہاں رومیو۔'' جوش نے طنزاً کہا۔

''ہنسنے کی ضرورت نہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔''

''لڑکیاں تمہیں اس لیے پسند کرتی ہیں کہ تم بڑے ہو گئے ہو اور امیر باپ کے بیٹے ہو۔''

''تمہارے اندر بھی کوئی کمی نہیں۔ اب تمہیں مردوں کی طرح مضبوط ہونا چاہیے۔''

میلوڈی واپس آ گئی اور وہ تینوں پہلے کی طرح اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی اور اس کی تمازت سے انہیں الجھن ہونے لگی تھی۔ جوش کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ اس نے ساحل کی طرف دیکھا اور اسے وہ چیز نظر آ گئی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے گھاس میں نظر آنے والی کسی شے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ویلون نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوڑے کا ڈھیر ہوگا۔''

جوش اس کشتی کی جانب بڑھا جو گودی پر بندھی ہوئی تھی۔ ویلون اور میلوڈی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ تینوں کشتی میں سوار ہوئے تو جوش بولا۔ ''ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹی سی کشتی ہم تینوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے کشتی کو کھولا اور چپوؤں کی مدد سے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ وہ جب اس مقام تک پہنچے جہاں اسے وہ

شے نظر آئی تھی تو ویلون بے اختیار بولا۔ ''اوہ میرے خدا۔''

میلوڈی نے اپنا منہ کھولا اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے چلّائی۔ ''اوہ میرے خدا! یہ تو لاش ہے۔''

''ہمیں نہیں معلوم کہ یہ مر چکا ہے۔'' جوش بولا۔

''اس کا جسم غبارے کی طرح پھول گیا ہے۔ لاش میں سے بو آرہی ہے۔ یہ مر چکا ہے۔'' ویلون نے کہا۔

''ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' جوش کشتی کو لاش کے قریب لے گیا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن کو چھوا پھر جیسے ہی لاش پلٹی، میلوڈی کی چیخ نکل گئی۔ اس کا پیٹ کھلا ہوا تھا اور تمام اعضا باہر آگئے تھے۔ جوش نے اس کا چہرہ دیکھا جو پیلا پڑ چکا تھا اور مسخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جوش نے زندگی میں پہلی بار کوئی لاش دیکھی تھی۔

''ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' ویلون نے کہا۔

جوش نے کشتی کنارے سے لگائی اور میلوڈی سے بولا۔ ''جلدی سے گھر جاؤ اور اپنی مما سے کہو کہ وہ شیرف کو فون کریں۔''

میلوڈی نے ساحل پر چھلانگ لگائی اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے جانے کے بعد ویلون نے کہا۔ ''ہمیں بھی واپس گودی کی طرف چلنا چاہیے۔''

''نہیں۔'' جوش نے جواب دیا۔

''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے لڑکے؟'' ویلون نے غصے سے کہا۔

جوش نے دل میں سوچا۔ 'میں نہیں جانتا۔' لیکن زبان سے نہ کہہ سکا۔ وہ خود حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح کیوں محسوس نہیں کرتا۔ ہر بار یہی لگتا جیسے وہ کوئی احمقانہ حرکت کر رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ کشتی کو دوبارہ لاش کے نزدیک لے گیا اور چپو ریت میں گاڑ دیے۔ کوئی طاقت اسے لاش کے پاس روک رہی تھی جب تک مدد نہ آجائے حالانکہ وہ شخص مر چکا تھا اور وہاں صرف گوشت کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ جوش کی عقل اسے ویلون کی بات ماننے پر اکسا رہی تھی کہ وہ کشتی کو گودی کی طرف لے جائے لیکن جس طرح اس نے چپو ریت میں گاڑ دیے۔ اسی طرح خود بھی وہیں چپک کر رہ گیا تھا۔

''وہ کیا ہے؟'' ویلون نے کہا۔

جوش نے اس جانب دیکھا جہاں ویلون اشارہ کر رہا تھا۔ مرنے والے نے گہرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی جیکٹ پانی میں بھیگ کر کھل گئی تھی اور اس کی اندرونی جیب سے کوئی چیز جھانک رہی تھی۔ ویلون ایک زوردار نعرہ لگا کر اس جانب جھپٹا اور کشتی تقریباً ڈوبنے کے قریب ہو گئی۔ جوش نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ اتنی دیر میں ویلون واپس کشتی پر آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل تھا۔ وہ پچاس پچاس کے نوٹ تھے۔

''شاید اور بھی نوٹ ہوں۔'' ویلون نے کشتی سے جھک کر دیکھا اور جب وہ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور بنڈل تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بس یہی ہیں۔''

اس نے وہ دونوں بنڈل اکٹھے کیے اور بولا۔ ''لڑکے! تم جانتے ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس کا اشارہ نوٹوں کے بنڈل کی جانب تھا۔

''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تم نے کسی دوسرے شخص کی رقم چرائی ہے۔''

''یہ ایک مردہ شخص کی دولت ہے۔'' ویلون نے کہا۔ ''تمہیں اس میں سے کچھ چاہیے؟''

''یہ پیسے میرے نہیں ہیں۔'' جوش نے کہا۔

ویلون قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کچھ بھی نہیں ہے جب تک کہ تم اسے حاصل نہ کرلو۔ اگر زندگی میں کوئی موقع ملے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

جوش وہیں بیٹھ گیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس نے پیسے نہ لے کر غلطی کی ہے۔

''تمہیں پتا ہے کہ ان پیسوں کی کتنی اہمیت ہے؟'' ویلون نے کہا۔

جوش نے کچھ نہیں کہا تو وہ بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے اپنے باپ سے کچھ نہیں مانگنا پڑے گا۔ وہ دولت کی جھلک دکھا کر مجھے اپنے اشاروں پر چلانا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے کار لانے سے منع کر دیا اور کہا کہ جب تک سولہ سال کا نہ ہو جاؤں وہ میری کوئی بات نہیں سنے گا اور اس کے ساتھ ہی امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی شرط بھی عائد کردی۔ لیکن اب مجھے کوئی پروا نہیں۔ وہ چاہے کچھ بھی کہتا رہے، میں اسے صرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہوں گا۔''

جوش نے اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ وہ کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔ ویلون کو اس کے رویے پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔''

جوش چند لمحوں کے لیے خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''نہیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

میلوڈی اور ایک ڈپٹی تقریباً ساتھ ساتھ گودی پر

پہنچے۔ ڈپٹی نے اشارہ کر کے جوش اور ویلون کو بلایا پھر تینوں کو بٹھا کر ان کے بیانات لینے لگا۔ کچھ دیر بعد شیرف بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی ڈپٹی نے کہا۔ ''میں نے ان تینوں کو الگ الگ اپنا بیان لکھنے کے لیے کہا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں ان سے بات کر کے خود بیان لکھتا اور بعد میں یہ کہتے کہ میں نے غلط لکھا ہے۔''

شیرف ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے انہیں ایک ساتھ کیوں بٹھا رکھا ہے۔ شاید یہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے ہوں اور انہوں نے ایک جیسی کہانی لکھی ہو۔''

ڈپٹی آزردہ نظر آنے لگا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ آپس میں باتیں نہیں کر رہے تھے۔''

''اگلی بار انہیں علیحدہ بٹھانا۔'' یہ کہہ کر اس نے ویلون کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنا لکھا ہوا بیان اسے پکڑا دیا۔ شیرف نے پڑھ کر اسے واپس کر دیا پھر اس نے میلوڈی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ جوش کی باری سب سے آخر میں آئی۔ شیرف نے اس کا بیان دو مرتبہ پڑھا اور بولا۔ ''یہ تمہارے باپ کی گودی ہے۔ وہ یہیں رہتا ہے؟''

''جی جناب۔''

شیرف نے اس کے بیان کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''لگتا ہے تمہاری ماں اور باپ دونوں کو ہی کتابوں سے محبت ہے۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ ''تمہارا باپ نہیں چاہے گا کہ اس کی گودی سے لاش برآمد ہو اور اسے یہ بھی اچھا نہیں لگے گا کہ ایک بار پھر لوگ اس کے بارے میں باتیں کریں۔ تمہارے باپ کے لیے آج کی رات بہت سخت ہوگی۔ وہ ایک اچھا آدمی ہے اور اسے کسی سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔''

جوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی جناب۔''

شیرف کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے چلّا کر کہا۔ ''لاش کے پاس سے ایک بٹوا ملا ہے۔ اس میں کچھ رقم بھی ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ ڈکیتی نہیں بلکہ طیش میں آکر یہ جرم کیا گیا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' شیرف نے کہا۔

''رقم یا جذباتی ہیجان۔ یہاں صرف انہی دو باتوں پر قتل ہوتے ہیں۔''

''اس کی ایک وجہ گھاس بھی ہو سکتی ہے۔'' شیرف نے کہا۔ ''ان دنوں میں نے بہت سے لوگوں کو جھینگوں کے بجائے گھاس کے گٹھے لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس پر بھی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر یہ شخص منشیات کے کاروبار میں ملوث ہوتا تو اس کے پاس سے منشیات یا زیادہ رقم برآمد ہوتی۔''

''ہاں۔'' شیرف نے ان تینوں بچوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس کے پاس پیسے تھے تو وہ کہاں گئے؟''

جوش نے محسوس کیا کہ اسے کچھ کہنا چاہیے لیکن الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ رنگ کی کار وہاں رکی اور اس میں سے ایک شخص گہرے رنگ کا سوٹ پہنے برآمد ہوا۔

''شیرف!'' اس نے ان لوگوں کے قریب آکر کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کو گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''مسٹر جیکب!'' شیرف نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اس کا بیان مکمل ہو جائے۔''

جیکب معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد دلا دوں کہ اگلے سال الیکشن ہونے والے ہیں۔''

شیرف کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ کچھ نہیں بولا پھر اس نے ویلون سے کاغذ لے لیا اور کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ اتنا ہی کافی ہے۔''

''شکریہ شیرف، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے پاس ایسے نمائندے ہیں جن پر ہم بھروسا کر سکتے ہیں۔''

شیرف نے کچھ نہیں کہا تو جیکب بولا۔ ''میں جم تھارن کی بیٹی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اس کا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بلاوجہ یہاں روکا جائے۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد شیرف نے جوش سے کہا کہ وہ بھی اپنا بیان مکمل کروانے کے بعد چلا جائے۔

جوش گھر پہنچا تو وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹے سے لِونگ روم میں ساکت کھڑا رہا۔ پیسے بچانے کی خاطر دن میں لائٹ بند رہتی تھی صرف روشنی کی ایک لکیر چھوٹی سی کھڑکی کے ذریعے اندر آ رہی تھی۔ جوش نے کاؤچ پر نظر ڈالی جسے اس کے باپ نے پرانی لکڑی سے بنایا تھا اور اس کی ماں نے اس پر نرم گدا اور تکیہ رکھ کر آرام کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کچھ دیر کاؤچ پر بیٹھ کر آرام کرلے لیکن اسے کچن سے کچھ کوٹنے کی آواز آئی تو وہ وہاں چلا گیا۔

اس کی ماں رات کے کھانے کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی اور اس کا چھری والا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا جس سے کوٹنے کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہے۔ جوش نے کچھ کہا تو وہ بولی۔

''میں سن چکی ہوں۔'' ساتھ ہی اس کا ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگا۔ جوش خاموش کھڑا رہا۔

بالآخر اس کی ماں نے مڑ کر دیکھا اور غصے سے بولی۔ ''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ میلوڈی کے ساتھ گھومنا تمہارے لیے نقصان دہ ہوگا اور ہم سب مشکل میں پھنس جائیں گے۔ یہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ ذہین اور سمجھ دار، میلوڈی ان جیسی نہیں ہے۔ پیسے نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''مام۔'' جوش نے کہا۔ ''اس میں میلوڈی کا تو کوئی قصور نہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔''

''شیرف کا کہنا ہے کہ ڈیڈی کے لیے یہ اچھی خبر نہیں ہے۔'' جوش نے کہا۔

اس کی ماں نے چھری میز پر رکھ دی اور بولی۔ ''تمہارے باپ نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت ہماری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شخص مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے پاس پیسا تھا۔ میرے گھر والے بھی بہت دولت مند تھے۔ انہوں نے تمہارے باپ کو قصوروار ٹھہرایا۔ بہت سے لوگ اب بھی اسے الزام دیتے ہیں۔ اسی لیے تمہارے دادا اور دادی نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے تمہارے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑا۔''

وہ جوش کا ردِعمل جاننے کے لیے خاموش ہو گئی لیکن وہ صرف سنتا رہا۔ ماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''وہ اس پرانے واقعے کو بنیاد بنا کر ایک بار پھر تمہارے باپ کو اس قتل کا الزام دینے کی کوشش کریں گے کیونکہ ایک قاتل ہمیشہ قاتل ہی رہتا ہے اور اس پر ہی قتل کا شبہ کیا جاتا ہے۔ وہ اب بھی تمہارے باپ کو موردِ الزام ٹھہرا کے اسے سزا دلوانا چاہتے ہیں اور وہ خود کو اس دن کے لیے الزام دیتا ہے۔''

اس نے اپنے نوعمر لڑکے کو دیکھا اور بولی۔ ''لیکن میں اسے الزام نہیں دیتی۔ اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ وہ شخص اسی قابل تھا۔''

جوش نے محسوس کیا کہ اسے کچھ کہنا چاہیے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ بس سر ہلا کر رہ گیا۔

جوش کو یاد نہیں تھا کہ کبھی اس کے باپ نے خاموشی سے کھانا کھایا ہو۔ وہ ہمیشہ قہقہے لگاتا اور لمبی لمبی کہانیاں سناتا لیکن اس رات کھانے کی میز پر خاموشی تھی۔ جوش اور اس کی ماں دیکھ رہے تھے کہ اس کے چہرے پر کسی طوفان کی آمد کے آثار ہیں۔ وہ اس روز بیئر کے بجائے بوربن کی بوتل لیے بیٹھا تھا اور بوتل میں مشروب کی سطح مسلسل کم ہوتی جا رہی تھی۔

جوش اس روز جلدی بستر پر چلا گیا اور لائبریری سے لائی ہوئی کتاب پڑھنا شروع کر دی جو نیویارک کے کسی مصنف نے لکھی تھی اور ان دنوں کافی مقبول ہو رہی تھی لیکن اس کتاب میں اس کا دل نہیں لگا اور اس نے وہ کتاب رکھ کر فاکنر کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔

نصف شب کے بعد اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہاں اس کا باپ کھڑا تھا۔ وہ کافی دیر تک جوش کو دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ جوش نے سوچا کہ اب وہ کوئی لطیفہ سنائے گا لیکن وہ بوتل لہراتے ہوئے بولا۔ ''بوربن اور عزت۔ ایک مرد کو یہی کچھ چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ جوش کافی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں باپ کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ تبھی اس نے کھڑکی پر ہلکی سی دستک سنی۔ جب اس نے کھڑکی کھولی تو وہاں ویلون کھڑا تھا اور اس کی سانسوں سے بیئر کی بو آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر آ گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''لڑکے۔''

''تم نے اپنے ڈیڈی کی بیئر پی ہے۔'' جوش نے کہا۔ ''اسے پتا چل جائے گا کہ تم نے ہی اس کی بوتل چھپائی ہے۔ اس نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بوتلیں گننا شروع کر دے گا۔ جب شیرف تمہیں نشے کی حالت میں لے کر گھر آیا تھا۔''

ویلون بولا۔ ''وہ صرف مذاق کر رہا تھا۔ وہ تو خوش ہوگا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے ڈیڈی کی بیئر نہیں پی اور میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔''

''تم مجھ سے بھی نشہ کرنے کے لیے کہو گے۔ تم جانتے ہو، میرے ڈیڈی اسے پسند نہیں کرتے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ میں تو تمہیں اپنے ساتھ زیکس لے جانے کے لیے آیا تھا۔''

''وہ تمہیں اندر نہیں جانے دیں گے۔'' جوش نے کہا۔

"ہاں اگر تم انہیں اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے وہی نوٹوں کی گڈی نکالی جو مرے ہوئے آدمی کے پاس سے ملی تھی اور اسے جوش کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو، جیب میں مال ہو تو کوئی کسی کو نہیں روکتا۔"

جوش نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "میرے ڈیڈی کہتے ہیں کہ دوسرے کی چیز حاصل کر کے تم مشکل میں پڑ سکتے ہو۔ یہ رقم تمہاری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ چوری کرنا بھی جرم ہے اور تم جیل جا سکتے ہو۔"

"میں نے یہ رقم نہیں چرائی بلکہ مجھے لاش کے پاس سے ملی ہے اور وہ مردہ شخص ہمارے خلاف رپورٹ درج نہیں کروا سکتا۔"

"مجھے وہ چیز نہیں چاہیے جو میری نہیں۔" جوش نے کہا۔

"تم میلوڈی کو چاہتے ہو؟" اس نے ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا۔

جوش نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "پھر تمہیں اسے کچھ دکھانا ہوگا۔" ویلون نے نوٹوں کی گڈی دوبارہ لہرائی۔ "اس میں سے کچھ پیسے لے لو۔ اس کے گھر جاؤ اور اسے لے کر زیکس آجاؤ۔ اسے بتادو کہ تم ایک مرد ہو جو اس کے ساتھ اچھا وقت گزار سکتا ہے۔"

جوش کچھ ہچکچایا تو ویلون نے اس کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی اس کے ہاتھ پر تین نوٹ رکھتے ہوئے بولا۔ "اسے بتادو کہ تم ایک مرد ہو۔"

جوش نے وہ پیسے لے لیے تو ویلون نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور بولا۔ "میں یہیں رک کر تھوڑی سی نیند لوں گا۔ تم واپس آکر مجھے تفصیل بتانا۔"

جوش، میلوڈی کی کھڑکی کے باہر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنا بچپن یاد آگیا جب وہ اسی طرح اس کی کھڑکی پر دستک دیتا اور وہ کود کر باہر آجاتی پھر وہ دونوں آدھی رات کو ساحل پر ٹہلنے چلے جاتے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح اس کی دستک کا جواب دے گی۔ یہ سب کچھ عجیب اور پریشان کن لگ رہا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ فون پر میلوڈی سے بات کرلیتا لیکن اب تو وہاں آ ہی گیا تھا اور بے وقوفوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ ویلون کو اس کے پیسے واپس کرے اور گھر جا کر آرام سے سو جائے۔ لیکن دیر ہو چکی تھی۔ میلوڈی کے کمرے میں روشنی ہوئی اور وہ کھڑکی میں آگئی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک باریک سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ تھوڑا سا ہچکچائی اور اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف کرتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی۔ "ہائے، میں یقیناً بہت بُری لگ رہی ہوں۔"

جوش کا دل چاہا کہہ دے کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر میلوڈی بولی۔ "کتنی اچھی رات ہے۔"

"خوب صورت۔" جوش بولا۔ "یہ رات... میرا مطلب ہے... اگر تم کچھ نہیں کر رہی ہو..." وہ کہتے کہتے رک گیا پھر اس نے ہمت کی اور بولا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر تم میرے ساتھ زیکس تک چلو۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ "ڈیڈی مجھے مار ڈالیں گے۔"

جوش شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ "ہاں، یہ کوئی اچھا آئیڈیا نہیں ہے۔"

"ویسے بھی ہم اندر کیسے جا سکتے ہیں؟" میلوڈی نے کہا۔ "ابھی ہم اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے۔"

"لیکن تم دیکھنے میں اٹھارہ سال کی ہی لگتی ہو۔"

میلوڈی کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے جوش نے اسے ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی ہو، وہ بولی۔ "تم ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔"

ویلون نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوش نے دروازے پر کھڑے دربان کے سامنے نوٹ لہرائے اور اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ہال میں داخل ہو کر وہ ایک لمحے کے لیے رکے پھر دروازے کے ساتھ ہی بنے ہوئے بوتھ میں داخل ہو گئے۔ بارٹینڈر نے انہیں دیکھا اور آرڈر لینے چلا آیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں بیئر پینا چاہو گے۔ تم آرام سے جتنی دیر چاہو یہاں بیٹھ سکتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ اچھی ٹپ دینے میں کنجوسی نہیں کرو گے۔"

جوش نے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ بارٹینڈر نے اسے دیکھا اور اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوش، میلوڈی کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "میں صرف یہی چاہتا تھا۔ اب ہم سکون سے باتیں کر سکتے ہیں۔"

"اسی لیے میں تمہیں پسند کرتی ہوں کیونکہ تم اپنے

بارے میں اچھی طرح جانتے ہو۔"

"یہ میرے لیے ایک خبر ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے بولی۔ "تم سچے انسان ہو اور میں بھی تمہاری طرح بننا چاہتی ہوں۔ میری نظر میں پیسے کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں تو بس ایسی جگہوں پر تم جیسے آدمی کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

اچانک کسی نے میز پر پڑے ہوئے نوٹ پر جھپٹا مارا۔ "تمہیں یہ کہاں سے ملا؟" وہ شخص نوٹ کے ساتھ لگا ہوا کاغذ علیٰحدہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ میرا ہے۔" جوش نے کہا۔

اس شخص نے کاغذ کا ٹکڑا جوش کے چہرے کے سامنے لہرایا اور بولا۔ "یقیناً ایسا ہی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور جوش کے چہرے پر جھکتے ہوئے بولا۔ "کل یہ نوٹ تمہارا نہیں تھا اور آنے والے کل کو بھی یہ تمہارا نہیں ہو گا۔ جو چیز تمہاری نہیں ہوتی، اس کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ کوئی طاقتور شخص تم سے یہ چھین سکتا ہے۔"

جوش نے محسوس کیا کہ میلوڈی اس کی جانب کسی کارروائی کے لیے دیکھ رہی ہے، اسے لگا کہ کمرے میں خاموشی چھا گئی ہے اور سب لوگ منہ کھولے اس کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ وہ کوئی دلچسپ جملہ بول کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرے لیکن اس کے بجائے اس نے ٹھگ کے چہرے پر نظریں جما دیں اور بولا۔ "میں اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔"

ٹھگ نے زوردار قہقہہ لگایا اور کمرے میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دو آدمیوں نے ٹھگ کو دھکا دیا۔

"اسے چھوڑ دو ٹریس۔" ان میں سے ایک بولا۔ "یہ اسمتھ کا بیٹا ہے۔"

ٹھگ سیدھا کھڑا ہو گیا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ کس کا بیٹا ہے۔ البتہ یہ رقم اس کی نہیں ہے اور اس کا مالک بہت خوش ہوگا جب میں یہ اسے واپس کروں گا۔"

وہی کمزور اور بوڑھا شخص بولا۔ "اسمتھ کا خاندان چور نہیں ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ اور ان بچوں کو تنہا چھوڑ دو۔"

ٹریس کچھ دیر اس بوڑھے شخص کو دیکھتا رہا پھر وہاں سے چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بوڑھا شخص جوش سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم بھی گھر جاؤ۔ اسمتھ کے لڑکے کا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

"مسٹر۔" میلوڈی نے کہا۔ "کیا ہم ایک ڈانس کر

سکتے ہیں؟"

"صرف ایک ڈانس۔" بوڑھے نے کہا۔ "اس کے بعد تمہیں گھر جانا ہوگا۔"

میلوڈی نے جوش کو جھٹکے سے کھینچا اور بوتھ سے باہر لے گئی۔ ہال میں تیز موسیقی گونج رہی تھی اور جوڑے اس کی دُھن پر رقص کر رہے تھے۔ جوش ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میلوڈی، مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔"

میلوڈی نے اس کے بازو پکڑ کر اپنی گردن میں ڈال لیے اور اس کے ساتھ قدم ملا کر تھرکنے لگی۔ جوش نے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ دونوں ایک دوسرے جوڑے سے ٹکرا گئے۔ مرد نے اسے غصے سے گھورا لیکن عورت نے صرف اتنا کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ پہلی بار ایسا ہی ہوتا ہے۔"

موسیقی کی دھن تبدیل ہوئی تو مجمع چھٹنا شروع ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد فلور پر صرف جوش اور میلوڈی ہی رہ گئے۔ جوش نے ایک بار پھر دبی دبی آواز میں کہا۔ "میلوڈی! میں نہیں جانتا کہ ڈانس کر سکوں گا۔"

"ششش۔" میلوڈی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بس تم اپنے پیروں کو حرکت دو۔ جس طرح تم چاہو اور میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

جوش نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر دوسرا۔ میلوڈی بھی اس کے ساتھ ہی گھوم گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے پیروں کو حرکت دیتا رہا۔ میلوڈی نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ وہ اس کی سانسوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ میلوڈی مسکرا رہی تھی۔ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے پھر وہ دھن بھی ختم ہو گئی اور وہ بھی ایک جگہ ٹھہر گئے۔ سب لوگ ان کے گرد کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے اور ہاتھ میں بیئر کی بوتلیں لہرا کر چلا رہے تھے۔ میلوڈی نے آہستہ سے اپنے آپ کو اس سے الگ کیا اور بولی۔ "بس، اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے جوش کا ہاتھ پکڑا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" جوش نے پوچھا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دوڑ لگا دی اور بولی۔ "مجھے پکڑو۔"

جوش اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ پارکنگ لاٹ سے نکل کر صنوبر کے درختوں کے درمیان ایک سڑک پر چلی گئی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ایک درخت کے تنے کے پیچھے گیا اور بولا۔ "میں نے تمہیں تلاش کر لیا۔"

"تم مجھے کبھی نہیں پکڑ سکتے جب تک میں خود پکڑائی نہ دوں۔"

اسی وقت ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس ان پر پڑی اور کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔

"مجھے تمہاری تنہائی میں مخل ہونا اچھا نہیں لگتا۔" ٹریس نے روشنی کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہارے پاس میرے دوست کی ایک امانت ہے۔"

جوش نے ویلون کے دیے ہوئے پچاس کے دو نوٹ نکالے اور انہیں ٹریس کے قدموں میں پھینک دیا۔

"یہ پکڑو۔" اس نے کہا۔ "میں انہیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔"

ٹریس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "انہیں بقیہ رقم بھی چاہیے۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا جب یہ سودا ہو رہا تھا۔ کسی وجہ سے سودا خراب ہو گیا اور انہوں نے اسے گولی مار دی۔ باس کو اپنی رقم واپس چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ تمہیں کچھ نہ کہے اگر تم ساری رقم مجھے دے دو۔"

"میرے پاس یہی کچھ تھا۔" جوش نے کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

اس نے چاقو کھلنے کی آواز سنی اور ٹریس اس کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

میلوڈی آگے آتے ہوئے بولی۔ "رک جاؤ، ممکن ہے۔ میں رقم کا انتظام کر سکوں۔"

ٹریس اس کی جانب مڑا۔ جوش نے درخت کی ایک شاخ اٹھائی اور ٹریس کے سر پر دے ماری۔ ٹریس نے لمحہ بھر کے لیے جوش کی طرف دیکھا پھر وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل گر گیا۔

"کم آن۔" جوش نے میلوڈی کا ہاتھ پکڑا اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ دونوں اس وقت تک نہیں رکے جب تک جوش کا گھر نہیں آ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے ویلون کو جھنجوڑا اور بولا۔ "اٹھ جاؤ ویلون۔"

ویلون نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھولیں اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔" میلوڈی نے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ وہ ہمارے پیچھے آئے گا۔"

"نہیں۔" جوش نے کہا لیکن اس کی نظریں کھڑکی کے باہر جمی ہوئی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے والدین کو بتا دینا چاہیے۔" میلوڈی نے کہا۔

"نہیں۔" جوش بولا۔ "ویلون کی جیبیں دیکھو۔"

میلوڈی نے ہچکچاتے ہوئے ویلون کی جینز کی جیب ٹٹولی۔ ”اس میں پچاس کے نوٹ ہیں۔“

جوش بولا۔ ”یہ پیسے اس نے لاش کی جیب سے نکالے تھے جب تم گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ پچاس پچاس کے نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔“

”کیا تم بھی اس کام میں شامل تھے؟“

”نہیں۔“ جوش نے میلوڈی کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اسے مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ ”میں نے رقم نہیں چرائی۔“

وہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”کیوں؟ کیا تمہیں پیسوں کی پروا نہیں؟“

”میں نے کبھی پیسوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ تمہارے اور ویلون کے یہاں آنے سے پہلے میں نہیں جانتا تھا کہ پیسا کیا ہوتا ہے۔ میں اپنے والدین کو دیکھتا ہوں اور انہی جیسا بننا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کبھی پیسے کے پیچھے بھاگوں گا۔“

”پھر تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“

”مجھے ویلون نے دیے تھے تاکہ تمہیں اپنے ساتھ ڈیکس لے جاسکوں۔“

وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم واقعی بہت سچے انسان ہو۔“

وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ میں نے کسی گاڑی کے پہیوں کی آواز سنی ہے۔ باہر کوئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دبے پاؤں الماری کی طرف بڑھا اور الماری میں سے اعشاریہ بائیس کی رائفل نکال لی جو اس کے دادا نے گزشتہ سالگرہ پر دی تھی پھر اس نے اوپر والے خانے سے کارتوسوں کا ڈبا اٹھایا اور مٹھی بھر کر اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔ کمرے کی لائٹ بجھائی اور اندھیرے میں کھڑے ہو کر آنے والے خطرے کا انتظار کرنے لگا۔

میلوڈی سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم کیا کررہے ہو؟“

جوش نے چیمبر میں کارتوس ڈالتے ہوئے کہا۔ ”صرف اسے ڈرانے کے لیے گولی چلاؤں گا۔“

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس نے مکان کے گرد ایک چکر لگایا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک سائے کو مکان کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ دبے قدموں جھاڑیوں سے باہر نکلا اور رائفل کی نال اس آدمی کی کمر پر رکھ دی۔ وہ ٹریس تھا۔

اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”اوہ، تو یہ تم ہو؟“

”ہاں۔“ جوش نے جواب دیا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلے جاؤ اور ہمیں تنہا چھوڑ دو یا تم یہیں مرنا چاہتے ہو؟“

”تم مجھے قتل نہیں کرسکتے۔“ ٹریس اس کی طرف گھوم گیا اور ہاتھ نیچے کرتے ہوئے بولا۔ ”اپنے باپ سے پوچھو کہ کسی کو قتل کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ کس طرح تمہاری زندگی ہمیشہ کے لیے برباد ہوجائے گی اور جب شیرف یہاں آئے گا تو اسے کیا بتاؤ گے کہ تم بار میں چوری کے پیسوں سے بیئر پی رہے تھے اور پھر تم نے مجھے مارنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ میں تمہارے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے قتل کر کے ساری عمر اپنے باپ کی طرح شراب کی بوتل میں قید ہو کر رہ جاؤ گے۔“

جوش نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھی اور بولا۔ ”ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“

”یقیناً تم ایسا کرسکتے ہو۔“ ٹریس نے جوش کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور اس کا رخ جوش کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”اب میں جو کہوں، تمہیں وہی کرنا ہوگا۔ اندر جاؤ اور میرے پیسے واپس لے کر آؤ۔“

جوش اپنی جگہ کھڑا رہا تو ٹریس بولا۔ ”دیکھو لڑکے! میں تمہارے باپ کی طرح نہیں ہوں۔ میں نے پہلی بار کسی شخص کو قتل کیا ہے اور تمہیں مارنے میں بھی کوئی عار نہ ہوگا۔ جاتے ہو یا گولی چلادوں۔“

جوش گودی کی طرف چل دیا۔ ”اس طرف نہیں۔“ ٹریس نے رائفل اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”وہ پیسے ڈیڈی کی کشتی پر ہیں۔“ جوش نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا باپ شرابی ہوسکتا ہے لیکن وہ ایک دیانت دار شخص ہے۔ اس کی کشتی پر کسی شخص سے لوٹی ہوئی رقم نہیں بلکہ جھینگے ملیں گے۔ وہ رقم کسی اور جگہ چھپائی گئی ہے۔“ اس نے گھر کی طرف رائفل لہراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید یہ سن کر اس کا دل ٹوٹ جائے کہ اس کا بیٹا چور ہے۔“

جوش گھر کی طرف مڑا، اس نے محسوس کیا کہ رائفل اس کی کمر سے لگی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ سوتے

ہوئے ویلون کی جیب سے رقم نکال کر ٹریس کو دے سکتا ہے۔اس طرح خطرہ ٹل جائے گا اور ڈیڈی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔

اس نے محسوس کیا کہ رائفل کی جگہ ٹریس کے پستول نے لے لی ہے۔ٹریس نے اسے گھر کے اندر دھکیل دیا۔وہ اندر پہنچا تو میلوڈی نے سرگوشی میں پوچھا۔''تمہاری رائفل کہاں ہے؟''

جب اس نے ٹریس کو جوش کے پیچھے آتے دیکھا تو بے اختیار بولی۔''اوہ...''

''رقم کہاں ہے؟''ٹریس نے پوچھا۔

جوش نے ویلون کی جیب کی طرف اشارہ کر دیا۔

ٹریس نے رائفل بستر کے ساتھ رکھی اور ویلون پر جھک گیا۔اس نے دائیں ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔اس نے اپنا رخ اس طرح رکھا کہ میلوڈی اور جوش پر نظر رکھ سکے اور اپنا ہاتھ ویلون کی جیب میں ڈال دیا۔ویلون نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھولے بغیر ٹریس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ٹریس نے غصے میں آکر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ٹریس نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی نکال لی۔

''ہے۔''ویلون نے کہا۔''یہ پیسے میرے ہیں۔''

ٹریس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔''اب یہ میرے ہوگئے۔''

''اب تم جاسکتے ہو۔''جوش نے کہا۔

ٹریس نے میلوڈی کی طرف دیکھا اور بولا۔''اس طرح کیسے جاسکتا ہوں۔''

میلوڈی اس کی نیت بھانپ گئی اور کھڑکی کی جانب بڑھی۔ٹریس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو جوش نے رائفل اٹھالی اور اس کی جانب لپکا۔ٹریس مڑا تو اس نے ایک ہاتھ سے میلوڈی کی جینز پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تمہارے پاس صرف ایک گولی ہے اور تم اسے چلاتے ہوئے گھبرا رہے ہو کیونکہ تم قتل کرنے سے ڈرتے ہو۔تم اس کے انجام سے ڈرتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے جوش پر پستول تان لیا۔جوش کی انگلیاں ٹریگر پر جم گئیں۔جسے دباتے ہی ایک آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس طرح میلوڈی کی زندگی بچ سکتی تھی۔اس نے محسوس کیا کہ اس کے نتیجے میں خود اس کی زندگی بھی جہنم بن سکتی تھی لیکن جوش کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اچانک ایک زوردار آواز سنائی دی۔ٹریس کے ہاتھ سے پستول گر گیا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔جوش نے اپنے باپ کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔اس کی شکاری بندوق کی نال سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں وحشت ابھر آئی تھی۔

ویلون جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے اپنے پیسے اٹھائے اور کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔''ڈیڈی مجھے یہاں دیکھنا نہیں چاہیں گے۔''

میلوڈی اب جوش کے ساتھ کھڑی تھی.... ویلون نے اس سے کہا۔''تمہارے ڈیڈی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ تم یہاں نظر آؤ۔''یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر کود گیا۔

میلوڈی نے ویلون کو رات کی تاریکی میں غائب ہوتے...... دیکھا پھر وہ جوش کی جانب مڑی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''مجھے افسوس ہے جوش۔''اور کھڑکی سے باہر نکل گئی۔

شیرف گھر کے باہر جوش اور اخباری نمائندوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔''گولی اعشاریہ بائیس کی رائفل سے چلائی گئی ہے۔''اس نے جوش سے کہا۔''لیکن تمہارے ہاتھ بالکل صاف دکھائی دے رہے ہیں۔''

''میں نے انہیں دھویا ہے۔''جوش نے جواب دیا۔

شیرف نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔''ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس قتل کو بھی تمہارے باپ کے کھاتے میں ڈال دیں کیونکہ ان کے ذہن میں پرانا واقعہ تازہ ہو جائے گا اور وہ یہی اصرار کریں گے کہ ایک قاتل دوبارہ بھی قتل کر سکتا ہے جبکہ تمہارا باپ عدم ثبوت کی بنا پر بے گناہ ٹھہرایا گیا تھا۔ہوسکتا ہے کہ اس بار بھی لوگ تحقیقات کا مطالبہ کریں۔شاید مقدمہ بھی چلے لیکن اخبار والے تمہیں ہی ہیرو کا درجہ دیں گے جس نے اپنے خاندان کو ایک مسلح حملہ آور سے بچایا۔تمہاری ماں ہمیں سب کچھ بتا چکی ہے۔''

جوش اپنے گھر کی طرف پشت کیے خاموش کھڑا... تھا۔اس کی نظریں ساحل پر جمی ہوئی تھیں پھر بہت ساری فلیش لائٹس چمکیں اور اس کا چہرہ روشنی میں نہا گیا۔اخبار والوں کی نظر میں وہ ہیرو بن چکا تھا۔ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ دل کی بات زبان پر نہ لا سکا کیونکہ اس خاموشی میں ہی اس کے خاندان کی بھلائی تھی۔

پُرشور ثبوت

جمال دستی

مجرم کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ موقع واردات پر اس کی موجودگی ثابت نہ ہو پائے... ان دونوں مجرموں کی بھی یہی کوشش تھی... اور وہ اپنی اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوئے... مغرب سے برآمد شگوفے میں پڑھیے...

ہنستے کھیلتے لڑتے جھگڑتے ماحول میں رونما ہونے والا قتل...

یہ ہوٹل لینس فورڈ کی ہفتے کی ان راتوں میں سے ایک تھی جو ہوٹل کے ہاؤس ڈیٹکٹو کی نیندیں حرام کر دیتی ہیں۔

پہلے تو چھ سو بیس نمبر کمرے میں مقیم نشے میں دھت ادھیڑ عمر خاتون نے غل غپاڑا مچا دیا اور اپنے کمرے سے اپنی دانست میں سامان کھڑکی سے باہر پھینکنا شروع کر دیا.... جبکہ اس نے کھڑکی کھولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

لہٰذا مجھے اوپر جانا پڑا اور بمشکل تمام اسے خاموش کرایا۔

پھر آٹھ سو سولہ نمبر کمرے میں مقیم ایک شخص اور اس کی بیوی آپس میں لڑ پڑے۔ اس معاملے کو نمٹانا بھی مارٹی بوائل کے فرائض میں شامل تھا۔ مارٹی بوائل میرا نام ہے اور میں ہی ہوٹل لینس فورڈ کا ہاؤس ڈیٹکٹو ہوں۔

وہ شخص چلا چلا کر جو الفاظ کہہ رہا تھا، وہ میرے باپ دادا نے بھی کبھی نہیں سنے ہوں گے۔ اس کی بیوی بھی اس پر... بُری طریقے سے چیخ رہی تھی۔ میں نے ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو وہ اتنا شور وغل مچا رہے تھے کہ انہیں میری دستک کی آواز سنائی نہیں دی۔ تب میں نے حقیقت میں دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

”رک جاؤ، خاموش ہو جاؤ۔ شور مچانا بند کرو۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔

تب اندر خاموشی یوں چھا گئی جیسے کسی ریڈیو کا سوئچ اچانک آف کر دیا جائے۔ ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور ایک پستہ قد گنجا آدمی دروازے سے جھانکنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک موٹی سی عورت کھڑی تھی جو قامت میں اپنے شوہر سے خاصی لمبی اور تنومند تھی۔

”چلے جاؤ۔“ پستہ قد نے کہا۔ ”ہمیں ڈسٹرب مت کرو۔“

”ڈسٹرب تو تم نے سب کو اپنے شور وغل سے کیا ہوا ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”تم ہوتے کون ہو ہمیں روکنے والے؟“

”میں اس ہوٹل کا ہاؤس ڈیٹکٹو ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اتنے میں وہ بھاری بھرکم عورت بول پڑی۔ ”اس کی ناک پر ایک زوردار مکا جڑ دو، ایڈی۔“

گو میری جسامت درمیانے ٹائپ کی ہے لیکن میرا جسم کسرتی اور سخت جان ہے۔ ٹائمز اسکوائر کے ان ہوٹلوں میں جیسے کہ لینس فورڈ ہے، وہ آپ کو صرف آپ کی جوانی اور خوب صورتی کی وجہ سے ہاؤس ڈیٹکٹو ملازم نہیں رکھتے۔ اگر وہ پستہ قد میری ناک پر گھونسا جڑ دیتا تو پھر اپنی اس حرکت پر اسے ہمیشہ افسوس ہی ہوتا۔

”آل رائٹ مسٹر۔“ پستہ قد نے کہا۔ ”سوری، اگر ہماری وجہ سے کوئی ڈسٹرب ہوا ہے۔“

”اس کی ناک پر ایک زوردار مکا جڑ دو، ایڈی۔“ اس کی موٹی بیوی نے ایک بار پھر وہی جملہ دہرا دیا۔

میں نے ایک نگاہ ان کے کمرے کے اندر ڈالی۔ وہاں میز پر بیئر کی ایک صراحی موجود تھی جو نصف خالی تھی۔ اس کے برابر میں دو خالی گلاس بھی رکھے ہوئے تھے۔ مجھے فوراً ہی یہ خیال کوندا کہ جس طرح بظاہر دونوں طیش اور نشے میں دکھائی دے رہے ہیں تو اتنی سی کم شراب کا استعمال ان کے کم ظرف ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔

”خاموش رہو، مارتھا۔“ پستہ قد نے اپنی بیوی سے کہا۔

وہ موٹی عورت ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ہونٹ لٹکا کر اپنی بیزاری کا اظہار کرنے لگی۔ اس نے اپنا مکمل لباس پہنا ہوا تھا۔ پستہ قد نے سفید لینن کے سوٹ کے ساتھ سبز رنگ کی قمیص اور گلابی بو ٹائی پہن رکھی تھی۔ جولائی کی اس گرم رات میں ہوٹل میں مقیم کسی جوڑے کا اس طرح بھرپور لباس پہننا قدرے اچنبھے کی بات تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر دل ہی دل میں ہنسی آگئی کہ اس عورت کا لباس کوئی ٹینٹ بنانے والا ہی تیار کرتا ہوگا۔

”یہ دھیان رہے کہ اب کوئی شور وغل نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے ان دونوں سے اپنے ملائم ترین لہجے میں کہا۔ ”اگر تم دونوں میں سے کسی کی بھی آواز سنائی دی تو تمہیں کان پکڑ کر اس ہوٹل سے باہر نکال دیا جائے گا۔“

یہ کہہ کر میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا اور نیچے لابی میں آگیا۔

نائٹ کلرک ہیری لینگ اپنی میز کے پیچھے بیٹھا... ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر جون فیئر فیلڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک ہے نا، مارٹی؟“ اسسٹنٹ منیجر فیئر فیلڈ نے پوچھا۔ وہ سیاہ بالوں والا ایک دراز قامت نوجوان تھا جو ہمیشہ ڈبل بریسٹڈ سوٹ پہنتا تھا اور مہمانوں کے لیے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ طاری رکھتا تھا۔ ”آٹھ سو سولہ نمبر میں کیا گڑبڑ تھی؟“

”ایک چھوٹی چھوٹی کشتی اور ایک جنگی جہاز میں پیار کی جنگ ہو رہی تھی۔“ میں نے بتایا اور پھر نائٹ کلرک ہیری لینگ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس جوڑے کا کیا نام ہے، ہیری؟“

”وہ مسٹر اینڈ مسز ایڈورڈ براؤن ہیں اور ان کا تعلق شکاگو سے ہے۔“ نائٹ کلرک نے جواب دیا۔ ”اگر تم نے ان میں سے کسی کو بھی چھیڑ دیا تو وہ تمہارے کان کھا جائیں گے اور ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔“

اتنے میں میری نگاہ جمی ڈریک پر پڑی۔ وہ ہمارے ہوٹل کے بیل بوائز میں سے ایک تھا۔ وہ برسوں سے یہاں ملازم تھا اور نہایت سست واقع ہوا تھا۔ اس میں پھرتی اس وقت آتی تھی جب کوئی معاملہ گڑبڑ ہوتا تھا۔ اس وقت وہ تیزی سے ڈیسک کی جانب آ رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ کوئی معاملہ گڑبڑ ہے۔

"آٹھ سو بیس نمبر کمرے میں مقیم شخص...." اس نے ہمارے نزدیک پہنچ کر کہا۔ اس پر قدرے ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ "....وہ وہاں اوپر کمرے میں فرش پر پڑا ہوا ہے اور مر چکا ہے۔"

"یہ شب واقعی بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہو رہی ہے۔" میں نے کہا اور پھر میں نے بے بسی سے نائٹ کلرک کی طرف دیکھا۔ "آٹھ سو بیس نمبر میں کون مقیم ہے، ہیری؟"

"کریگ ہومر۔" ہیری لینگ نے بتایا۔ "تم اس سے واقف ہو، مارٹی۔ وہ جب بھی اس شہر میں آتا ہے، ہمارے ہوٹل ہی میں ٹھہرتا ہے۔ وہ مغرب کی کسی فرم کے لیے ہیروں کی خریداری کرنے آتا ہے۔"

"جمی، تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہومر مر چکا ہے؟" میں نے بیل بوائے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اس کی نبض چیک کی تھی۔" جمی نے بتایا۔ "وہ بالکل بھی نہیں چل رہی۔ جس کسی نے بھی اس کی پیٹھ میں چاقو گھونپا ہے اس کا مقصد بے وقوف بنانا نہیں ہے۔"

"پیٹھ میں چاقو!" میں نے کہا۔ "پھر تو یہ قتل کی واردات ہے۔ وہ ہیروں کا خریدار ہے تو پھر اسے ان جواہرات کے لیے ہی قتل کیا گیا ہوگا۔ میں اوپر جا رہا ہوں۔ فیئر فیلڈ بہتر ہوگا کہ تم پولیس کو فون کردو کہ وہ ہومی سائڈ کو یہاں بھیج دیں۔"

"پولیس سے فون ملاؤ، لینگ۔" اسسٹنٹ منیجر نے کہا۔ "ان سے کہنا کہ چپ چاپ آنے کی کوشش کریں... کہنا کہ پبلسٹی ہمارے ہوٹل کے لیے بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔ میں جمی کو لے کر اوپر جا رہا ہوں۔"

"آؤ، جمی۔" میں نے بیل بوائے سے کہا۔ "شاید تمہیں کوئی ایسی چیز یاد آجائے جو تم نے نظر انداز کردی ہو۔"

میں فیئر فیلڈ اور جمی ڈریک کے ہمراہ لفٹ کے ذریعے اوپر آٹھویں منزل پر پہنچ گیا۔ جب ہم روم نمبر آٹھ سو بیس کے پاس پہنچے تو اس کا دروازہ نصف کھلا ہوا تھا۔ یہ جمی ڈریک کی کوتاہی تھی کہ اس نے نکلتے وقت کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا لیکن قصور اس کا نہیں تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا ہوگا۔

آٹھویں فلور کے کمروں میں تھوڑے سے لوگ مقیم تھے اور شاید یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ باہر کاریڈور میں کیا ہنگامہ جاری ہے۔

جونہی ہم کمرا نمبر آٹھ سو بیس کے دروازے پر پہنچے تو راہداری کے دونوں جانب کے کمروں کے دروازے کھلنا شروع ہو گئے اور تین چار افراد جو اپنے کمروں میں انتظار کر رہے تھے کہ معاملہ کیا ہے، اپنے کمروں سے باہر نکل آئے۔

"اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ آنے والے ہیں تو ہم رت جگے کا اہتمام کر لیتے۔" میں نے ان معصوم تماشائیوں کو سرد نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کمرا نمبر آٹھ سو سولہ کا منہ پھٹ پستہ قدم مسٹر ایڈورڈ براؤن ان تماش بینوں کے درمیان موجود نہیں تھا، نہ ہی اس کی موٹی تازی بیوی کہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور بند دروازے کے پیچھے مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"ان درمیان میں ٹپک پڑنے والوں کو پرے رکھو۔" میں نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "جمی تم اور فیئر فیلڈ انہیں یہاں اندر نہ آنے دینا۔"

اسسٹنٹ منیجر اور بیل بوائے دروازے میں کھڑے ہو گئے اور تماشائیوں کو وہیں روک دیا جبکہ میں لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

کریگ ہومر منہ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ وہ کوٹ کے علاوہ مکمل لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کی سفید قمیص کی پشت پر ڈھیروں خون دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن چاقو کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہ کیا؟" جمی ڈریک نے حیرانی سے کہا۔ "چاقو کہاں گیا؟ جب کچھ دیر پہلے میں نے اسے دیکھا تھا تو چاقو اس کی پیٹھ میں گڑا ہوا تھا۔"

میں نے ہومر کا کوٹ اٹھایا اور اس کی لاش پر لپیٹ دیا۔ اب مزید کارروائی پولیس کو... کرنی تھی اور لاش کا معاملہ ان کے سپرد تھا۔

"آپ لوگ کہیں مت جانا۔" میں نے دروازے کے باہر موجود تماشائیوں سے کہا۔ "پولیس نے یہاں آتے ہی آپ لوگوں سے سوالات کرنے ہیں۔"

بظاہر جوش میں بھرے ان بے چین تماشائیوں کو یہ بات کھل گئی اور وہ سرپٹ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ چند لمحوں میں راہداری ویران ہو گئی۔

میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کمرا نمبر آٹھ سو بیس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر جمی اور فیئر فیلڈ کو دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ دونوں میری طرح ناخوش دکھائی دے رہے تھے۔

"کریگ ہومر نے آج شام مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس اپنے بریف کیس میں پانچ لاکھ ڈالر مالیت کے

ناتراشیدہ ہیرے موجود ہیں۔'' فیئر فیلڈ نے انکشاف کیا۔
''میں نے اس سے کہا تھا بہتر ہوگا کہ وہ اس بریف کیس کو ہوٹل کی تجوری میں رکھ دے لیکن اس نے میری بات ہنس کر ٹال دی تھی۔''

''لیکن اب وہ ہنس نہیں رہا۔'' جمی ڈریک نے کہا۔

''حیران ہوں کہ اس چاقو کا کیا ہوا؟ وہ سفید ہینڈل والا ایک فینسی قسم کا چاقو تھا۔''

کریگ ہومر کا بریف کیس کمرے میں موجود لکھنے کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے بریف کیس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں چند کاروباری خطوط اور کاغذات رکھے ہوئے تھے لیکن ہیرے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہیرے غائب تھے۔

ہومی سائڈ کا اسکواڈ آن پہنچا۔ ان کے ہمراہ ہمارے علاقے کے پولیس تھانے کا سراغ رساں بھی تھا۔ وہ لوگ آتے ہی اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

میں سراغ رساں کیپٹن کو ایک جانب لے گیا اور تمام واقعہ تیزی سے اس کے گوش گزار کردیا۔

''تمہاری باتوں کی روشنی میں معاملہ کچھ گڑبڑ دکھائی دے رہا ہے، مارٹی۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''چلو تفتیش کرتے ہیں۔''

میں کیپٹن کو ساتھ لے کر راہداری میں آگیا اور ہم آٹھ سو سولہ نمبر کمرے کی جانب چل دیے۔ میں نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

دروازہ پستہ قد ایڈورڈ براؤن نے کھولا۔ میں کیپٹن کارسن کے ہمراہ بے دھڑک کمرے میں گھس گیا۔ وہ موٹی عورت ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس طرح دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے پر وہ ہمیں غصے سے گھورنے لگی۔

''ان کے جبڑوں پر گھونسے جڑ دو، ایڈی۔'' اس نے اپنے پستہ قد شوہر کو حکم دیا۔ ''انہیں یہاں سے باہر پھینک دو۔''

میں نے سیاہ بیئر کی اس صراحی کی طرف دیکھا جو بدستور میز پر رکھی ہوئی تھی۔ شیشے کی وہ صراحی ابھی بھی نصف بھری ہوئی تھی۔

''تمہاری بیوی ایک گھٹیا اداکارہ ہے، براؤن۔'' میں نے کہا۔ ساتھ ہی شیشے کی وہ صراحی میز پر سے اٹھالی جس میں سیاہ بیئر موجود تھی۔ میں نے صراحی نزدیک ترین روشنی کے سامنے کردی۔

صراحی کی تہ میں چھوٹے سے گہرے رنگ کے پتھر سے دکھائی دے رہے تھے لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ وہی ناتراشیدہ ہیرے ہیں جن کی وجہ سے کریگ ہومر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

''تمہارا جائے واردات سے عدم موجودگی کا عذر بھی نہایت پُرشور تھا۔'' میں نے پستہ قد ایڈورڈ براؤن سے کہا۔

کیپٹن کارسن کمرے کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی اشیا کا ایک ٹریولنگ ڈیسک سیٹ ڈھونڈ نکالا جس میں کاغذ تراش ایک چاقو بھی تھا جس کا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ اس کاغذ تراش چاقو کا پھل اسٹیل کا تھا اور اس کی دھار بھی نہایت تیز تھی۔

اس کاغذ تراش چاقو کے پھل پر خون کے دھبے بھی پڑے ہوئے تھے جنہیں صاف کرنا وہ میاں بیوی بھول گئے تھے۔

''ٹیسٹ سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ یہ کریگ ہومر کا خون ہے۔'' کیپٹن کارسن نے کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ان پر شبہ کرتے ہوئے اپنے اسمارٹ ہونے کا ثبوت دیا ہے، مارٹی! تمہیں ان پر شبہ کیونکر ہوا تھا؟''

''صرف نصف صراحی بیئر پینے کے بعد یہ جوڑا جس بری طرح غل غپاڑا مچا رہا تھا وہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ابتدا ہی میں یہ بات کھٹک گئی تھی جب میں پہلی بار انہیں خاموش کرانے کے لیے اس کمرے میں آیا تھا اور یہ موٹی عورت بری طرح تلملا رہی تھی اور اپنے شوہر سے مسلسل اصرار کررہی تھی کہ وہ مجھے مکا جڑ دے جیسے کہ ابھی بھی اس نے کہا ہے۔''

''تم اور تمہارے بُرے خیالات۔'' ایڈورڈ براؤن نے اپنی تومند بیوی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم ہی نے اصرار کیا تھا کہ ہم میاں بیوی کے مابین جھگڑے کا ڈراما رچائیں تاکہ واردات کے وقت ہماری عدم موجودگی کا پرشور ثبوت موجود ہو اور کوئی ہم پر شبہ نہ کرسکے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اور اگر تم لوگ خاموش بیٹھے رہتے تو کوئی تم پر شبہ تک نہیں کرتا۔'' میں نے یہ کہہ کر دانت نکال دیے اور پستہ قدم ایڈورڈ براؤن سے مخاطب ہوکر وہی جملہ دہرا دیا جو اس کی بیوی ہمارے لیے کہہ چکی تھی۔ ''اس عورت کے جبڑے پر ایک مکا جڑ دو، ایڈی۔''

اور جانتے ہیں ایڈورڈ نے کیا، کیا؟

اس نے اپنی موٹی بیوی کے جبڑے پر واقعی ایک مکا جڑ دیا۔

فسادِ خون

آصف ملک

رشتوں کی مضبوطی کی بات کی جائے تو خونی رشتوں سے بڑھ کر کوئی بندھن نہیں... مگر بسا اوقات یہی رشتے ایسے زہریلے ناگ بن جاتے ہیں... جو ہمیشہ ڈسنے کے لیے تیار رہتے ہیں... کبھی بسانے اور جینے کا باعث نہیں بنتے... ایسے ہی کشیدہ ماحول اور متضاد کرداروں کی نقاب کشائی... ہر شخص ذاتی مفاد اور عناد کی جنگ میں مبتلا تھا...

ارزاں ہونے کے باوجود خون کی کشش ضرور اپنا رنگ دکھاتی ہے

جہانزیب خان شازی تقریباً تیس سال کا چھریرے جسم اور خوش رونقوش والا گورا چٹا جوان آدمی تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں سوچ کی کیفیت نمایاں تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ سلاخوں والے دروازے کے پاس ایک سپاہی نمودار ہوا اور اس نے تالا کھولتے ہوئے کہا۔ ''چل بھئی، تیری رہائی کا حکم آگیا ہے۔''

جہانزیب باہر آیا تو آس پاس کی کوٹھریوں کے قیدی جھانکنے اور اسے الوداعی آوازوں سے پکارنے لگے مگر وہ

کسی کی طرف توجہ دیے بغیر سپاہی کے ساتھ چلتا ہوا ڈپٹی جیلر کے دفتر تک آیا۔ ڈپٹی جیلر نے اسے رہائی کا حکم نامہ تھما کر میز پر رکھے کپڑوں اور چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سب تمہارا سامان ہے جو جیل میں آتے وقت تمہارے پاس تھا۔''

''شکریہ صاحب۔'' جہانزیب نے بنڈل اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے چیزیں دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ سپاہی کے ساتھ ایک خالی کمرے میں آیا جہاں اس نے جیل کا لباس اتارا اور اپنا لباس پہنا۔ اس کا پرس اور اس میں شناختی دستاویزات تھیں۔ رقم کوئی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی دوسری چیز تھی۔ کپڑے بدل کر وہ باہر آیا جہاں جیل کے گیٹ پر اس نے اپنی رہائی کا حکم نامہ دیا اور سپاہیوں نے چیک کر کے گیٹ کھول دیا۔ یہ ساری معمول کی کارروائی تھی۔ گیٹ کے باہر عبدالکریم اس کا منتظر تھا۔ ذرا دور اس کی شاندار ہیلکس کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھا تو عبدالکریم اس کے گلے لگ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔''

جہانزیب نے سر ہلایا اور دونوں گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ عبدالکریم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اس نے اے سی آن کر دیا تھا۔ ''تم کمزور ہو رہے ہو۔''

جہانزیب باہر دیکھ رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ''اورنگ زیب کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

عبدالکریم ہچکچایا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوشگوار موضوع نہیں ہے مگر اسے بتانا تھا۔ ''ایک ہفتے پہلے اس کی لاش علاقے کی طرف جانے والی سڑک پر پائی گئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں تھا۔''

''قاتل کا کچھ پتا چلا؟'' جہانزیب کا لہجہ سپاٹ تھا۔

عبدالکریم کو تعجب ہوا کیونکہ اورنگ زیب اس کا ایک ہی سگا بھائی تھا اور وہ اس سے چھوٹا بھی تھا۔ ان دونوں کا باپ عبدالرحمان خان شازی جنگ کے دوران میں پڑوسی ملک سے نقل مکانی کر کے یہاں آیا اور پھر یہیں آباد ہو گیا۔ پہلی بیوی اور تین بڑے بیٹے اس کے ساتھ آئے تھے پھر یہاں اس نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کر لی۔ جہانزیب اور اورنگ زیب اسی سے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کو جنم دیتے ہوئے وہ بچ نہیں سکی تھی۔ تب جہانزیب صرف پانچ سال کا تھا اور ماں کے مرنے کے بعد اس نے اورنگ زیب کا ماں کی طرح خیال رکھا تھا۔ یہ سلسلہ تب بھی برقرار رہا جب اورنگ زیب بڑا ہو گیا اور اسے کسی۔۔۔ دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہی۔ عبدالکریم نے کہا۔

''نہیں، پولیس کو کوئی سراغ نہیں ملا۔ جب اس کی لاش ملی تو اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ تم جانتے ہو وہ سڑک ویران رہتی ہے، خاص طور سے رات کے وقت۔''

جہانزیب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں مگر چہرہ سپاٹ رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے اگلا سوال کیا۔ ''بابا کا کیا کہنا ہے... انہیں معلوم تھا کہ وہ حویلی کی طرف آ رہا ہے؟''

عبدالکریم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ حویلی نہیں جاتا تھا اس لیے سردار یا کسی اور کو اس کی آمد کا علم نہیں تھا۔''

''ایک فرد کو تھا۔'' جہانزیب نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

عبدالکریم نے اس شخص کے بارے میں پوچھا نہیں، وہ جانتا تھا کہ اس کا اشارہ قاتل کی طرف ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہیلکس ایک پوش علاقے میں نسبتاً چھوٹی کوٹھی کے سامنے رکی۔ گرمی کی شدت سے سڑکیں ویران تھیں اور یہاں تو ویسے بھی آدمی کم نظر آتا تھا۔ یہ عبدالکریم کی حویلی تھی۔ جہانزیب اس کے ساتھ اندر آیا۔ لاؤنج میں عبدالکریم کی بیوی روبینہ اپنے چھوٹے گود کے بچے سمیت موجود تھی۔ اس نے جہانزیب کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا۔ روبینہ اور اس کے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ وہ جہانزیب سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس گھر سے باہر جہانزیب واحد غیر فرد تھا جس کے سامنے وہ آتی تھی۔ اس نے جہانزیب سے اورنگ زیب کی تعزیت کی اور بولی۔ ''آپ بیٹھیں، میں شربت لاتی ہوں۔''

''پہلے ٹھنڈا پانی۔'' عبدالکریم نے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

''یہ دوسرا بیٹا ہے؟'' جہانزیب نے پوچھا۔

عبدالکریم نے سر ہلایا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ ''ہاں پہلا بچہ نہیں بچا تھا۔ ایک سال کی عمر لایا تھا۔''

جہانزیب تین سال سے جیل میں تھا اور ان تین سالوں میں باہر بہت کچھ ہو چکا تھا۔ عبدالکریم، جہانزیب کا کالج کا دوست اور بزنس پارٹنر تھا۔ پانچ سال پہلے دونوں نے مل کر ایک کمپنی کھولی اور پڑوسی ملک کو اشیا بھیجنے لگے جن کی وہاں مانگ تھی۔ انہوں نے بہت کمایا لیکن پھر ایک جھگڑے میں عبدالکریم کے ہاتھوں ایک آدمی زخمی ہو گیا۔ ان کا قصور نہیں تھا۔ انہوں نے جس پارٹی کو سامان دیا تھا، وہ پیسے دینے میں حجت کر رہی تھی۔ ایک ملاقات میں گرما

گری ہوگئی۔ اسلحہ یہاں پرس اور موبائل فون کی طرح رکھا جاتا ہے اس لیے دونوں پارٹیاں مسلح تھیں۔ زبانی جھگڑے کے بعد اسلحہ نکل آیا اور دو طرفہ فائرنگ میں عبدالکریم اور دوسری پارٹی کا ایک آدمی زخمی ہوا۔ اتفاق سے دونوں ہی ایک دوسرے کی گولی سے زخمی ہوئے تھے اس لیے پارٹیوں کی حد تک معاملہ رفع دفع ہوگیا مگر قانون حرکت میں آگیا۔

یہاں عبدالکریم کو بچانے کے لیے جہانزیب نے اقرارِ جرم کرلیا۔ عبدالکریم کی ابھی شادی ہوئی تھی اور اس کی بیوی ماں بننے والی تھی۔ جہانزیب کو چار سال کی سزا ہوئی لیکن اس کے اچھے رویے اور پھر سالانہ رعایتوں کی وجہ سے وہ تین سال میں رہا ہوگیا تھا۔ جیل میں اس کے خاندان والوں نے اس سے رابطہ نہیں رکھا۔ صرف ایک بار اورنگ زیب ملنے آیا تھا پھر جہانزیب نے اسے بھی منع کردیا کہ وہ جیل نہ آئے۔

عبدالکریم واحد فرد تھا جو ہر ہفتے باقاعدگی سے اس سے ملنے آتا تھا اور اس کے لیے سامان اور چیزیں لاتا تھا۔ ہر بار اس کے لیے گھر کا کھانا لاتا جو روبینہ خاص طور سے اس کے لیے بناتی تھی۔ عبدالکریم نے رقم خرچ کرکے اس کے لیے جیل میں سہولتیں خرید لیں۔ وہ مشقت نہیں کرتا تھا، اسے الگ کوٹھری ملی ہوئی تھی۔ وہ کھانا پینا اپنی پسند کا لے سکتا تھا۔ اسے سگریٹ اور کتابیں مل جاتی تھیں، اسے بس ان دو ہی چیزوں کا شوق تھا۔ بزنس وہی دیکھ رہا تھا اور جہانزیب کی عدم موجودگی میں اسے بہت وقت دینا پڑتا مگر وہ پوری ذمے داری سے کام کررہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بزنس نے خاصی ترقی کی تھی۔ اب انہیں ایک سیمنٹ فیکٹری کی ڈیلرشپ مل گئی تھی۔ وہ اس سے سیمنٹ لے کر پڑوسی ملک برآمد کررہے تھے اور اس میں بہت اچھی بچت تھی۔ عبدالکریم اسے بزنس کے بارے میں بتارہا تھا اور وہ بے دھیانی سے سن رہا تھا۔ اس نے نفع کے ایک ایک روپے کا حساب رکھا تھا اور جہانزیب کے حصے کا نفع اس کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا رہا تھا۔

''کریم! مجھے ایک گاڑی چاہیے۔''

''میرے پاس دو ہیں، تمہاری والی میں نے بیچ دی تھی۔ تین سال میں وہ برباد ہوجاتی۔ جو بھی چاہیے لے جاؤ۔''

''نہیں، مجھے اپنی لینی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے حویلی جانا ہوگا۔''

''تم حویلی جانا چاہتے ہو؟'' عبدالکریم سوچ کر بولا۔ ''اورنگ زیب کی تدفین کے لیے؟''

''ہاں اور میں اسے ماں کے پہلو میں دفنانا چاہتا ہوں۔'' جہانزیب نے کہا۔ ''دوسرے مجھے اس کے قاتل کو تلاش کرنا ہے۔''

''یار! یہ کام پولیس...'' عبدالکریم نے کہنا چاہا لیکن وہ کھڑا ہوگیا۔

''کھانے میں کچھ وقت ہے، میں ذرا نہالوں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''مجھے کمرا دکھادو۔''

عبدالکریم چپ ہوگیا اور اسے اندر لے آیا۔ روبینہ نے اس کے لیے کمرا پہلے ہی سیٹ کردیا تھا۔ یہاں اس کا سامان اور کپڑے بھی تھے۔ جیل جانے سے پہلے وہ کرائے کے ایک چھوٹے بنگلے میں رہتا تھا۔ عبدالکریم نے اس کا سامان اٹھوا کر اسے خالی کردیا تھا۔ اس وقت اورنگ زیب اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ دو سال پہلے حویلی جاچکا تھا۔ اس نے ان ہی دنوں گریجویشن کیا تھا۔ بھائی کا یہ فیصلہ جہانزیب کے لیے شاک سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ اورنگ زیب فطرت میں اس سے خاصا مختلف تھا مگر اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہنے کے بجائے حویلی کا انتخاب کرے گا جبکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے اور جہانزیب کیوں اسے بچپن میں لے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ اس وقت وہ صرف پندرہ سال کا تھا اور اورنگ زیب دس سال کا تھا۔ انہوں نے اپنے اکلوتے سگے ماموں کے پاس پناہ لی تھی مگر جیسے ہی جہانزیب اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، اس نے اس پناہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا۔

جہانزیب نے سوچا نہیں تھا کہ وہ پندرہ سال تک جس حقیقت سے نفرت کرتا رہا، اورنگ زیب کے نزدیک وہی خوبی تھی اور وہ جہانزیب کو قصور وار سمجھتا تھا کہ وہ اسے ایک پُرآسائش زندگی سے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ جہاں بعض اوقات انہیں ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی صبر کرنا پڑتا تھا۔ اس نے کالج کے دنوں میں پہلی بار اس موضوع پر جہانزیب کے سامنے زبان کھولی اور پھر وہ وقفے وقفے سے بولتا رہا۔ اسے شکایت تھی کہ ان کے سوتیلے بھائی عیش کررہے تھے اور وہ یہاں خوار ہورہے تھے۔ جہانزیب اسے سمجھاتا کہ وہ سب حرام کی دولت تھی۔ لوگوں کو منشیات کا زہر پلا کر اور قاتلوں کے ہاتھ میں ناجائز اسلحہ تھما کر حاصل کی ہوئی دولت تھی۔ اس سے تو بہتر ہے انسان فاقے سے مرجائے۔ دراصل جہانزیب کی تربیت اس کی ماں نے کی تھی اور اورنگ زیب کی تربیت باپ نے کی تھی۔ ان کی ماں بہت نیک

عورت تھی۔ اس نے ہمیشہ شوہر کی مخالفت کی اور مرتے دم تک تکلیفیں سہتی رہی۔ شاید اسی وجہ سے وہ صرف بائیس برس کی عمر میں دنیا سے گزر گئی۔

جہانزیب سمجھتا تھا کہ اورنگ زیب اس سے مختلف ہے۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کررہا تھا اور اس نے عبدالکریم کے ساتھ مل کر بزنس شروع کیا تھا کہ اورنگ زیب کو وہ سب دے سکے جس کے لیے وہ تڑپتا تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے اچانک ہی جہانزیب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ پہلے وہ ششدر رہ گیا پھر اس نے اورنگ زیب کو تھپڑ مارا تھا۔

''تم مجھے چھوڑ کر جارہے ہو؟''

''آپ کو مارنے کا حق ہے۔'' اورنگ زیب نے سکون سے کہا۔ ''آپ مجھے قتل بھی کرسکتے ہیں لیکن آپ مجھے وہ سب نہیں دے سکتے جو میں چاہتا ہوں۔''

''تم صرف دولت... اس حرام دولت کے لیے حویلی جارہے ہو؟''

''ہاں، آپ یہی سمجھ لیں اور ایک وجہ اور بھی ہے۔ بابا کا جو کچھ ہے، اس پر ہمارا بھی حق ہے اور میں اس حق کو صرف سوتیلے بھائیوں کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''بات حق کی نہیں، حلال حرام کی ہے۔''

''حرام بابا کے لیے تھا، انہوں نے کمایا۔'' اورنگ زیب بے پروائی سے بولا۔ ''ہمارے لیے تو وراثت ہے اور حلال ہے۔''

اورنگ زیب صرف بیس سال کا تھا مگر وہ جوان ہوگیا تھا۔ ان کے معاشرے میں مرد جوان ہوتے ہی خودمختار ہوجاتا ہے اور پھر اپنے اچھے بُرے کا وہ خود ذمے دار ہوتا ہے۔ جہانزیب چاہنے کے باوجود اسے جانے سے نہیں روک سکا۔ جلد اسے معلوم ہوگیا کہ اورنگ زیب اس کے باپ کے کاروبار میں باقاعدہ شامل ہوگیا ہے جو پہلے ہی اس کے چار سوتیلے بھائی چلارہے تھے۔ اورنگ زیب اس سے ملنے آتا تھا تو جہانزیب اسے سمجھاتا کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس کھیل میں انسان بہت کم طبعی عمر تک جیتا ہے، اس سے پہلے ہی موت کا فرشتہ اچانک کسی وقت بھی آکر اس کی سانس کی ڈوری کاٹ جاتا ہے۔ مگر اورنگ زیب سمجھنے والی حد سے گزر گیا تھا، اسے دولت کے ساتھ ساتھ اقتدار اور طاقت کے کھیل کا چسکا لگ گیا تھا۔ جب وہ جہانزیب سے ملنے جیل میں آیا تو اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ اسے جیل سے نکال سکتا ہے۔ تین سال اس کی جگہ کوئی دوسرا فرد جیل کاٹ لے گا مگر جہانزیب نے انکار کردیا۔ اس کی رہائی میں تین دن رہ گئے تھے جب عبدالکریم غیر متوقع طور پر اس سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا، اسے لگا عبدالکریم کسی خاص وجہ سے آیا ہے اور اس کا اندازہ درست نکلا۔ عبدالکریم اسے اورنگ زیب کے قتل کی خبر دینے آیا تھا۔

جہانزیب نہا کر آیا۔ اس نے اپنا سامان کھولا۔ اس کے سوٹ کیس میں البم تھی جس میں اس کی اور اورنگ زیب کی بے شمار تصاویر تھیں۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک کی تصویریں دیکھنے لگا۔ بچپن میں معصوم صورت اورنگ زیب بڑا ہونے پر کیسے بدل گیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اس کے چہرے سے پکا پن جھلکنے لگا تھا۔ جہانزیب کو حیرت ہوئی۔ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑا تھا۔ ان کی آخری تصویر اس کی کالج گریجویشن کی سند کے ساتھ تھی۔ اس میں جہانزیب کے چہرے پر نرمی اور اورنگ زیب کے چہرے پر سختی تھی۔ شاید یہ اندر کی شخصیت تھی جو ان دونوں کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔ جہانزیب کو حیرت ہوئی، وہ اس کے باوجود اورنگ زیب کو معصوم سمجھتا رہا تھا۔

شام کو وہ عبدالکریم کے ساتھ نکلا، اس نے ایک شوروم سے چند سال پرانی لیکن تقریباً نئی جیسی ٹویوٹا جیپ لی۔ اس کا انجن طاقتور اور یہ پہاڑی راستوں پر چلنے کے لیے بے مثال تھی۔ اس نے ایک موبائل بھی لیا اور واپسی پر عبدالرحمان خان شازی کو کال کی۔ ''بابا! میں آگیا ہوں۔''

''زیب۔'' عبدالرحمان کے لہجے میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

''اورنگ زیب کی تدفین کب ہے؟''

''کل دوپہر ظہر کے بعد۔''

''میں کل آپ سے ملوں گا۔'' اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ڈرائیو عبدالکریم کررہا تھا۔ جب اس نے موبائل رکھا تو اس نے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

جہانزیب نے سر ہلایا۔ ''مجھے کوئی ہتھیار چاہیے۔''

ہتھیار اور گاڑی ان کے بچپن کے کھلونے تھے اور وہ ایک بار چلائیں تو پھر کبھی نہیں بھولتے۔ عبدالکریم نے اسے ایک جدید پستول دیا۔ انہوں نے رات کے وقت دریا کے کنارے مشق کی۔ وہیں ٹہلتے ہوئے جہانزیب نے اسے بتایا۔ ''فی الحال میں تمہارے ساتھ بزنس میں شامل نہیں ہوسکتا۔ بہتر ہوگا تم دوسروں کو بھی بتاؤ کہ میں تم سے الگ ہوچکا ہوں۔''

''کیوں؟''

"میں نہیں چاہتا کہ میرے دشمن تمہارے دشمن بھی ہو جائیں۔"

"وہ میرے دشمن بھی ہیں لیکن تم کن دشمنوں کی بات کررہے ہو؟"

"اورنگ زیب کے قاتل کی۔"

اگلے دن وہ اپنی جیپ پر عبدالکریم کے ہمراہ حویلی جا رہا تھا۔ عبدالرحمان شازی کو ایک قبائلی سردار نے منہ بولا بھائی بنایا اور اپنے علاقے میں جگہ دی۔ عبدالرحمان شازی نے اس کا صلہ یہ دیا کہ منشیات اور اسلحے سے کمایا پیسا دل کھول کر اس علاقے کی ترقی پر خرچ کیا۔ یہی نہیں، اس نے جدید ترین اسلحہ خرید کر سردار کے آدمیوں کو اس علاقے کی سب سے طاقتور فورس بنا دیا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے محافظ تھے۔ عبدالرحمان شازی بذاتِ خود کچھ نہیں تھا مگر سردار کے سیکڑوں مسلح جوان اسے بہت بڑی طاقت بناتے تھے۔ عام لوگوں کے لیے اس نے علاقے میں زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے بہت سا پیسا خرچ کیا تھا۔ ان لوگوں کو مشینیں، آلات اور جدید زرعی ٹیکنالوجی خرید کر دی تھی۔ پانی کے لیے ٹیوب ویل لگائے تھے۔ بارشوں کا پانی جمع کرنے کے لیے ایک چھوٹا ڈیم بنایا تھا اور اس پر پن بجلی گھر بھی بنایا تھا جس سے علاقے کو بجلی ملتی تھی۔ یہاں سڑکیں تھیں اور [illegible]ت اور اسکول بھی تھے۔

مگر یہ سب عبدالرحمان کے کنٹرول میں تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر نہ تو اس علاقے میں کوئی آسکتا تھا اور نہ ہی کوئی یہاں سے باہر جاسکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اس کی قلعہ نما حویلی تھی جہاں وہ بادشاہوں کے سے ٹھاٹ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس حویلی میں دنیا کی بہترین سہولتیں دستیاب تھیں۔ اسے نہایت قیمتی سامان اور چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جہانزیب جانتا تھا اورنگ زیب کا شکوہ اس حد تک درست تھا کہ وہ اسے حویلی سے نکال کر بہت مشکل زندگی میں لے آیا تھا۔ ان کا ماموں ایک کھاتا پیتا شخص تھا مگر سردار عبدالرحمان اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ وہ علاقے میں داخل ہوئے تو سردار کی چیک پوسٹ پر روکا گیا پھر جہانزیب کو دیکھ کر محافظوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

حویلی تقریباً پانچ سو فٹ اور بلند تھی اور یہاں موسم خوشگوار تھا۔ ویسے بھی یہ جگہ سطح سمندر سے کوئی چار ہزار فٹ بلند تھی اس لیے یہاں گرمی اتنی شدت کی نہیں ہوتی تھی اور رات تک ٹھنڈ ہوجاتی تھی۔

عبدالکریم کو مہمان خانے میں چھوڑ کر وہ اندر آیا۔ ستر

سالہ لیکن تنومند اور پوری طرح صحت مند عبدالرحمان اپنے مخصوص کمرے میں خوشبودار تمباکو کی چلم پی رہا تھا۔ لہجے کی طرح اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ اس نے جہانزیب کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دیا۔ اس کا رویہ دیکھ کر جہانزیب نے بھی رسمی گفتگو بالائے طاق رکھی اور براہِ راست سوال کیا۔

"اورنگ زیب کے قاتل کون ہیں؟"

"میرے آدمی جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"ابھی تک کوشش کررہے ہیں؟" جہانزیب کا لہجہ چبھتا ہوا ہوگیا۔ "سردار عبدالرحمان! یہ آپ کا علاقہ ہے۔ یہاں چڑیا کا بچہ بھی آپ کی مرضی کے بغیر پر مارے تو آپ کو پتا چل جاتا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اپنے بیٹے کا قاتل نہیں ملا؟ جبکہ اسے قتل ہوئے آج آٹھ دن ہو چکے ہیں۔"

عبدالرحمان کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہوگیا، اس نے غرا کر کہا۔ "کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"یہی کہ میں اپنے بھائی کے قاتل کو تلاش کرنے آیا ہوں اور اسے تلاش کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

عبدالرحمان کچھ دیر خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں خود بھی کوشش کررہا ہوں۔ مسئلہ اورنگ زیب نے خود پیدا کیا تھا۔"

جہانزیب نے کچھ کہا نہیں، صرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ عبدالرحمان اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اس نے کہا۔ "تم بدر سلفی کو جانتے ہو؟"

بدر سلفی ان کا ہم وطن تھا اور وہ بھی تقریباً اسی زمانے میں یہاں آیا تھا جب عبدالرحمان آیا تھا۔ بدر کو اسی علاقے کے ایک دوسرے خان نے پناہ دی تھی۔ وہ عبدالرحمان کا ہم پیشہ اور حریف تھا۔ ایک زمانے میں ان دونوں کے درمیان کئی بار خون ریز لڑائیاں ہوئیں جن میں کئی افراد مارے گئے تھے۔ مگر پھر انہوں نے ایک ملاقات کرکے آپس کے معاملات طے کر لیے اور آئندہ کے لیے فیصلہ ہوا کہ کسی بھی اختلافی مسئلے پر پہلے دونوں بات کریں گے۔ ہتھیار اس وقت استعمال کیے جائیں گے جب مسئلہ بات سے حل نہ ہو۔ اس کے بعد سے ان میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی۔ مگر مخالفت موجود رہی تھی، وہ بہرحال دوست نہیں بن چکے تھے۔ جہانزیب نے سر ہلایا۔ "جانتا ہوں۔"

"ایک مہینے پہلے بدر کے بیٹے شاہزار کی لاش دریا سے ملی تھی۔ اسے گلے میں پھندا ڈال کر ہلاک کیا گیا تھا۔"

"کیا اس نے اس کا الزام آپ پر لگایا؟"

”نہیں، میں اس کے جنازے میں بھی گیا تھا۔ سب جانتے ہیں میں دشمن کے جنازے میں نہیں جاتا۔“

”تب اس کا ذکر کرنے کا مقصد؟“

عبدالرحمان سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لی۔ ”اس کے چند دن بعد اورنگ زیب نے نشے میں عقیل کے سامنے اعتراف کیا کہ اسی نے شاہزار کو قتل کیا ہے۔ عقیل نے اس کی بات ریکارڈ کرلی اور مجھے سنائی تھی۔“

عقیل، عبدالرحمان کے مرحوم بھائی عبدالرحیم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ عبدالرحیم گاؤں پر ہونے والی بمباری میں مارا گیا تھا۔ اس کے گھر میں صرف عقیل بچا تھا۔ عبدالرحمان نے اس کی پرورش کی تھی اور جوان ہونے کے بعد وہ اس کا دستِ راست بن گیا۔ عبدالرحمان کے تمام بیٹے اس کی بڑے بھائی کی طرح عزت کرتے تھے۔ جہانزیب کی بھی اگر کسی سے بنتی تھی تو وہ عقیل ہی تھا۔ اس نے باپ سے پوچھا۔

”اگر یہ کام اورنگ زیب نے کیا ہے تو یہ بات بدر تک کیسے پہنچی؟“

عبدالرحمان کے چہرے پر تاسف اور دکھ کے آثار نظر آئے۔ ”تم نہیں جانتے، اورنگ زیب غلط راہوں پر چل نکلا تھا۔ وہ بہت زیادہ پینے لگا تھا۔ خراب عورتوں کے پاس جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی بیوی اور دو بچے بھی ہیں۔“

یہ جہانزیب کے لیے انکشاف تھا۔ ”آپ نے اورنگ زیب کی شادی کردی تھی... کب، مجھے پتا ہی نہیں چلا؟“

”تمہارے جیل جانے کے تین مہینے بعد۔“ عبدالرحمان کا لہجہ پھر سپاٹ ہوگیا۔ ”عقیل کی بہن سامیر گل سے۔“

”سامیر گل؟“

”وہ بچ گئی تھی، اپنی خالہ کے ہاں تھی۔ جب عقیل کو پتا چلا تو وہ جاکر اسے لے آیا۔“ عبدالرحمان نے بتایا۔ ”ایک سال پہلے اس نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔“

یہاں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں مگر موضوع فی الحال اورنگ زیب تھا۔ ”سوال وہی ہے، بدر تک یہ بات کیسے پہنچی؟“

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بدر کا کام ہے یا نہیں لیکن جہاں تک بات پہنچنے کا تعلق ہے تو جس طرح اس نے نشے میں عقیل کو بتا دیا، اسی طرح کسی اور کے سامنے بھی یہ بات کرسکتا تھا۔“ عبدالرحمان کا لہجہ پھر تلخ ہوگیا۔ ”میں نے کہا نا وہ بگڑ گیا تھا۔“

”بابا! وہ جس کام میں تھا، اس میں آدمی بگڑتا اور بگاڑتا ہے بنتے اور بناتے میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔“ جہانزیب نے کہا۔ ”کیا مجھے اجازت ہے؟“

عبدالرحمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا تو جہانزیب اس کے کمرے سے نکل گیا۔ حویلی میں عبدالرحمان کے بعد اس کی پہلی بیوی زرمینہ خانم کی حیثیت تھی۔ وہ بھاری جسامت اور غصے والی عورت تھی۔ اپنی اولاد پر بھی اس کا رعب تھا مگر جہانزیب سے وہ ہمیشہ بہت نرمی اور محبت سے پیش آتی تھی۔ البتہ اسے عقیل سے نفرت تھی۔ عقیل کے لیے اس کا حکم تھا کہ وہ اس کے حصے میں نہ آئے۔ جہانزیب اس کے پاس آیا تو اس نے اٹھ کر خاموشی سے اسے اپنے شانے سے لگا لیا۔ تب جہانزیب پہلی بار رویا۔ یہ آنسو باپ کے سامنے نہیں نکلے تھے۔ زرمینہ خانم اسے تھپکتی رہی پھر اسے بٹھا کر ملازمہ کو پانی لانے کو کہا۔ ”زیب! تو کتنا کمزور ہوگیا ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”جیل میں آرام تھا مگر سختی بھی تھی۔“

”مجھے تیرے بابا اور دوسروں نے بتایا لیکن میں اس بات پر کبھی یقین نہیں کرسکتی کہ تو کوئی جرم کرکے جیل گیا ہوگا۔“

جہانزیب نے پہلی بار اپنے خاندان میں کسی کو بتایا کہ وہ کیوں جیل گیا تھا۔ خانم کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے کہا۔ ”دیکھا میرا یقین درست تھا نا... پر تو نے یہ کیا کیا... دوست کی خاطر جیل چلا گیا؟“

”بڑی ماں... میری پروا کسے تھی۔ اس کی شادی ہوئی تھی، اس کی بیوی ماں بننے والی تھی اور آدمی دوست کی خاطر تو قربانی دیتا ہے۔ اگر کبھی وقت آیا تو عبدالکریم میرے لیے اس سے بھی زیادہ کرسکتا ہے۔“

”اچھی بات ہے لیکن یہ غلط بات ہے کہ کسی کو تیری پروا نہیں ہے۔ تیرے بابا کو تیرے بارے میں جب کوئی خبر آتی ہے تو وہ مجھے لازمی بتاتے ہیں۔ خان کو پتا ہے میں تیرے لیے فکرمند رہتی ہوں۔ مجھے تو اورنگ زیب کی بھی فکر ہوئی تھی مگر وہ میرے پاس آنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔“ خانم کا لہجہ دکھی ہوگیا۔ ”اب وہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔“

اورنگ زیب کی لاش شہر کے سرد خانے میں تھی، اسے کچھ دیر میں لایا جاتا۔ کفن دفن کے تمام مراحل پہلے ہی طے کرلیے جاتے اور اسے صرف دیدار کرا کے قبرستان لے جاتے۔ خانم کے پاس سے جہانزیب، سامیر گل کے پاس آیا۔ سفید چادر میں لپٹی وہ دکھ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سادہ اور آنکھیں مسلسل رونے سے سوج رہی تھیں لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ اس کے باوجود خوب صورت اور

دلکش لگ رہی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ مشکل سے بیس سال کی تھی اور اتنی سی عمر میں بیوگی کا داغ سہنا پڑا تھا۔ جہانزیب نے اس سے تعزیت کی اور اپنے بھتیجوں کو دیکھا۔ دونوں ایک جیسے تھے اور ان کے نقوش میں باپ کی شباہت تھی۔ اس نے انہیں گود میں لے لیا تو وہ بے تکلفی سے اس کے پاس آگئے اور ماحول سے قطع نظر اس کے ساتھ ہنسنے کھیلنے لگے۔ یہ شاید خون کی کشش تھی کہ وہ اس سے بے تکلف ہو گئے تھے۔

ایک بجے ایمبولینس میں اورنگ زیب کی لاش آئی۔ پہلے اسے زنانے میں بھیجا گیا تاکہ خواتین دیکھ لیں۔ حویلی کے صحن میں اس وقت ہزار کے قریب لوگ جمع تھے۔ دور دور سے لوگ جنازے میں شرکت اور عبدالرحمان سے تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تدفین حویلی کے عقبی طرف ایک چھوٹی سی چار دیواری میں ان کے خاندانی قبرستان میں ہوئی تھی۔ اس میں فی الوقت چار قبریں تھیں۔ اورنگ زیب کے لیے جگہ ماں کے برابر میں منتخب کی گئی تھی۔ جہانزیب اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے تصور میں اسے زندہ اور ہنستے بولتے اورنگزیب کو یاد رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اسے رسم کے مطابق اس کا دیدار کرنا پڑا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ موت نے نیلگوں کر دیا تھا اور ہونٹ خشک اور مرجھائے ہوئے ہو رہے تھے۔ ان چند سالوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ پھر اسے لے جا کر منوں مٹی تلے دفنا دیا گیا۔ جہانزیب اپنے سوتیلے بھائیوں سے بھی ملا مگر زیادہ بات نہیں کی۔ اس سے ان کا رشتہ سرد مہری کا تھا۔ وہ بھی اس سے ایسے ہی ملتے تھے۔

تدفین کے بعد شام تک عبدالکریم واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے جہانزیب سے کہا۔ ”تمہیں جب ضرورت ہو، تم مجھے فوراً کال کرو گے۔“

”ظاہر ہے، اس دنیا میں تم ہی تو ایک دوست ہو جس پر میں اپنا حق سمجھتا ہوں اور جو مجھ پر حق رکھتا ہے۔“

عقیل انتظامات دیکھ رہا تھا۔ آنے والوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے تھی اس لیے وہ رات تک فارغ نہیں ہوا تھا۔ جہانزیب کا کھانے کا موڈ نہیں تھا اور وہ کسی سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حویلی کے اوپری حصے میں کھلی چھت پر آگیا۔ جب وہ حویلی میں تھا تو یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ سورج ڈھلتے ہی موسم خنک ہو گیا تھا اور ہلکی سی ہوا اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اورنگزیب کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ اچانک عقب سے آواز آئی۔ ”یہاں سکون ہے۔“

وہ عقیل تھا۔ جہانزیب نے مڑ کر دیکھا۔ ”تم مصروف تھے؟“

”ہاں، سب مجھے دیکھنا ہوتا ہے۔ خان جی کا حکم تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ شروع سے عبدالرحمان کو چاچا یا تایا کے بجائے خان جی کہتا آیا تھا۔

”بابا کا کہنا ہے وہ نہیں جانتے کہ اورنگزیب کے ساتھ کیا ہوا؟“

”تم جانتے ہو وہ دل کی بات کسی سے نہیں کرتے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بدر۔“ اس نے بلا جھجک کہا۔ ”مجھے صرف خان جی کا اشارہ درکار ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہوگا وہ سب دیکھیں گے۔“

”تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟“

”اورنگزیب کی لاش جہاں سے ملی ہے، بدر سلطی کا علاقہ وہاں سے صرف آدھے میل کی دوری پر ہے۔“

”یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”تو اور کس کا کام ہو سکتا ہے۔ جیسے اورنگزیب نے اس کے بیٹے کو مارا، اسی طرح وہ بھی اسے مار سکتا ہے۔“

”اورنگزیب نے یہ کام کیوں کیا؟“

”شاہزار زیادہ ہی ہاتھ پاؤں پھیلا رہا تھا، اس نے ہمارے کئی ڈیلرز توڑ دیے تھے۔“

”تو تم لوگ بھی اس کے ڈیلرز توڑ رہے ہو گے۔ اس کھیل میں ایسا تو ہوتا ہے۔ اس پر کوئی قتل نہیں کرتا۔“

”ہاں لیکن اورنگزیب نے اچانک ہی یہ کام کر دیا۔“

”بدر تک یہ بات کیسے پہنچی؟“ جہانزیب نے عقیل سے بھی یہی سوال کیا۔

”میں نہیں جانتا۔“ عقیل کچھ بے چین ہو گیا۔ ”تم جان گئے ہو کہ وہ میرا بہنوئی بھی تھا لیکن اس کے دوسری عورتوں سے بھی تعلقات تھے۔ وہ شہر کے بدنام کوچوں میں جاتا تھا اور سنا ہے کہ اس نے شہر میں کہیں ایک عورت کو بھی رکھا ہوا ہے؟“

جہانزیب گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اورنگزیب کے بارے جو وہ اب جان رہا تھا، خدشات کی صورت وہ ہمیشہ اس کے ذہن میں رہے تھے۔ اس نے صرف ایک اچھا کام کیا تھا اور وہ سامیر گل سے شادی تھی۔ اس نے عقیل سے پوچھا۔ ”اس شادی میں سامیر گل کی مرضی شامل تھی؟“

”فیصلہ خان جی کا تھا۔“ عقیل نے مختصراً کہا۔ گویا اس میں نہ سامیر گل کی مرضی تھی، نہ عقیل اور نہ ہی اورنگزیب کی۔

”شادی کے بعد اورنگزیب کا رویہ کیسا تھا؟“

"میں بتا تو چکا ہوں۔" عقیل کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

جہانزیب خاموش ہو گیا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے، سامیرا اچھی لڑکی ہے۔ اورنگزیب اس کے قابل نہیں تھا۔"

عقیل نے گہری سانس لی۔ "وہ منہ سے نہیں بولتی لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، میں نے اسے خالہ کے ہاں سے لا کر غلط کیا۔ وہ وہاں خوش تھی۔"

عقیل خاموش ہوا تو یہ وقفہ خاصا طویل ہو گیا۔ پھر جہانزیب نے پوچھا۔ "اس کی لاش کہاں سے ملی تھی؟"

"میں ویسے نہیں بتا سکتا، جگہ دکھا سکتا ہوں۔" عقیل نے کہا۔ "لیکن تم دیکھ کر کیا کرو گے؟ بس دکھ میں اضافہ ہو گا۔"

"میں اس کے قاتل کی تلاش میں ہوں۔" جہانزیب نے کہا اور نیچے آ گیا۔ اگلے دن شام کے وقت وہ سڑک پر اس جگہ تھا جہاں گاڑی میں اورنگزیب کی لاش پائی گئی۔ عقیل نے اسے دن میں لا کر جگہ دکھا دی تھی۔ اس وقت وہ اسی کے ساتھ واپس چلا آیا۔ شام کو وہ دوبارہ یہاں آیا تھا۔ لاش صبح فجر کے وقت اس جگہ سے گزرنے والے عبدالرحمان کے آدمیوں نے دیکھی تھی۔ وہ کسی کام سے شہر گئے تھے اور واپس آ رہے تھے۔ عقیل کسی کام سے باہر گیا تھا اور اس کی واپسی بارہ بجے ہوئی تھی۔ گویا لاش نصف رات کے بعد وہاں ڈالی گئی تھی۔ جہانزیب نے آس پاس دیکھا۔ یہ پورا علاقہ ویران اور سنگلاخ تھا۔ یہاں بھورے پتھروں والی چٹانیں تھیں۔ نشیبی زمین میں کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں مگر مجموعی طور پر سبزہ نایاب تھا۔ جہانزیب ایک کسی قدر بلند ٹیلے پر چڑھا اور اس نے آس پاس کا معائنہ کیا، تب اس کی نظر اس چھوٹے پتھروں سے بنے مکان پر گئی جو ایک ٹیلے پر اکیلا کھڑا تھا۔ مخصوص بناوٹ کی وجہ سے یہ چھوٹا سا قلعہ لگ رہا تھا۔

جہانزیب ٹیلے سے اتر کر مکان کی طرف بڑھا۔ اگرچہ سڑک سے مکان نظر نہیں آتا تھا۔ یعنی مکان سے بھی سڑک نظر نہیں آ رہی تھی اس کے باوجود وہ اس مکان میں رہنے والے لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ ٹیلے تک پہنچا اور اس نے اوپر جانے والے راستے پر قدم رکھا تھا کہ اوپر سے کسی نے للکار کر کہا۔ "کون ہو... کیوں آئے ہو؟"

جہانزیب رک گیا پھر اس نے کہا۔ "میں جہانزیب خان شازی ہوں۔ تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"کیا بات کرنی ہے؟"

"ایسے نہیں، سامنے آؤ... میں نہتا ہوں۔"

اس کی بات کا اثر ہوا۔ چند لمحے بعد ایک قبائلی اترتا ہوا نیچے آیا۔ وہ گھنی داڑھی مونچھوں والا تقریباً چالیس سال کا شخص تھا۔ اس کے شانے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ "میں شامل خان ہوں۔"

"شامل خان... یہاں سے کچھ دور سڑک پر میرے بھائی کی لاش گاڑی میں پائی گئی تھی۔ یہ نو دن پرانی بات ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے سنا تھا۔"

جہانزیب نے غور سے اسے دیکھا۔ "صرف سنا تھا؟"

شامل خان ہچکچایا۔ "میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔" جہانزیب نے اسے یقین دلایا۔ "تم جو کہو گے وہ ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔"

شامل خان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں تمہیں جانتا ہوں، تم اپنے خاندان میں اچھے آدمی ہو اس لیے میں تمہیں بتاؤں گا۔ اس رات میں اپنے مکان کی چھت پر تھا۔ اس کی وجہ نہیں بتاؤں گا، تب میں نے دیکھا کہ سڑک پر دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ اس رات چاند پورا تھا اس لیے سب دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں سے ایک سیاہ جیپ تھی اور دوسری سفید رنگ کی ڈبل کیبن تھی۔ سفید گاڑی سے ایک آدمی کو اتار کر دوسری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا گیا اور پھر اسے وہاں لانے والے نے اس کے سر پر پستول رکھ کر فائر کیا۔"

جہانزیب چونکا۔ "میرے بھائی کو یہیں مارا گیا تھا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے، پر وہ بے ہوش تھا یا پہلے ہی مر چکا تھا۔"

"نہیں، اس کے سر میں ایک گولی کا سوراخ تھا۔ اسے یہیں مارا گیا۔ سفید گاڑی سے اترنے والا کون تھا؟"

شامل خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بہت دور تھے، میں شکل نہیں دیکھ سکا۔ پر وہ دو آدمی تھے۔ ایک کالی جیپ چلا کر لایا تھا۔ وہ بعد میں سفید گاڑی والے کے ساتھ گیا۔"

جہانزیب نے پوچھا۔ "کوئی نشانی یاد ہے؟"

شامل خان سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "شاید سفید گاڑی کی سیدھی طرف والی بریک لائٹ خراب تھی، وہ نہیں جل رہی تھی۔"

جہانزیب ذرا مایوس ہو گیا۔ یہ کوئی خاص نشانی نہیں

تھی۔ مگر شامل خان سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اورنگزیب کے قاتل اسے سفید گاڑی میں الگ سے لائے تھے اور پھر اسے اسی کی گاڑی میں بٹھا کر گولی ماری اور چلے گئے۔ وہ دو تھے۔ جہانزیب اس کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا۔ سڑک سے مکان کا فاصلہ کوئی پانچ سو گز تھا اور پھر رات کا وقت تھا۔ اتنی دور سے آدمی کا چہرہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جہانزیب نے سڑک سے دیکھا، اس بار اسے شامل خان کے مکان کی چھت نظر آ گئی مگر ٹیلوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے وہ پہاڑوں کا حصہ ہی لگ رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے قاتلوں نے سمجھا کہ یہ جگہ ویران ہے اور یہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے مگر شامل خان نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

جہانزیب سورج ڈوبنے پر حویلی پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی عبدالرحمان کے معتمدِ خاص نے اسے بتایا کہ خان جی نے اسے آتے ہی طلب کیا ہے۔ وہ عبدالرحمان کے خاص کمرے میں داخل ہوا تو وہ مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ جہانزیب کو دیکھتے ہی اس نے گونجیلی آواز میں پوچھا۔ ''کہاں تھے تم؟''

''میں باہر گیا ہوا تھا؟''

''اکیلے... اور میرا خیال ہے تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔ کیا تم نے اورنگزیب کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا؟'' عبدالرحمان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے، مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''تمہیں خطرہ ہے کیونکہ تم میرے بیٹے ہو۔'' عبدالرحمان نے زور دے کر کہا۔ اس بات پر جہانزیب کے ذہن میں کئی طنزیہ جملے آئے مگر اس نے انہیں زبان پر آنے سے روک دیا۔ اس کے بجائے اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے اورنگزیب کے قاتلوں کا بدر سلفی سے تعلق نہیں ہے۔''

عبدالرحمان چونکا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ اسے بے ہوش حالت میں وہاں لایا گیا تھا۔ اس کی گاڑی کوئی اور شخص ڈرائیو کر رہا تھا اور پھر اسے اس کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر شوٹ کیا گیا تھا۔ آنے والے دو افراد تھے جو سفید رنگ یا اس سے ملتے رنگ کی گاڑی میں تھے۔ ان کی تعداد دو تھی۔ اگر یہ کام بدر کا ہوتا تو اسے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

عبدالرحمان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑایا تو جہانزیب بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور اسے سہارا دیا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں...'' عبدالرحمان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

لیکن جہانزیب دیکھ رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے سہارا دے کر اسے کرسی پر بٹھایا اور پھر پانی دیا۔ پانی پی کر اس کی حالت سنبھلی۔ ''مجھے آپ کے سامنے یوں نہیں بتانا چاہیے تھا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟''

جہانزیب نے سوچا اور پھر اسے شامل خان کے بارے میں بتا دیا۔ ''وہ سڑک پر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں رہتا ہے۔ اس نے اپنے مکان کی چھت سے سب دیکھا تھا۔ لیکن بابا! آپ یہ بات کسی سے مت کہیے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ مجھ سے آگے نہیں جائے گی یہ بات۔''

عبدالرحمان نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھتا ہوں... میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔ بہر حال میں نے تمہیں کسی اور مقصد کے تحت بلایا ہے۔''

جہانزیب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ عبدالرحمان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''سامیر گل اپنی بچی ہے اور ہماری عزت ہے۔ تم جانتے ہو ہم اپنی عزت باہر جانے نہیں دیتے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کی عدت کے بعد اس کا نکاح تم سے کر دیا جائے۔''

جہانزیب خاموش ہو گیا پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا مجھے انکار کا حق ہے؟''

عبدالرحمان نے سر ہلایا۔ ''بالکل کیونکہ تم خود مختار ہو۔ البتہ میں نے اورنگزیب سے پوچھا نہیں تھا، بس فیصلہ سنایا تھا۔''

''میں آپ کو کل تک بتاؤں گا۔'' جہانزیب نے کہا اور اجازت طلب کر کے وہاں سے نکل گیا۔ وہ باپ کی بات سمجھ رہا تھا۔ اگر وہ اس کا دستِ نگر ہوتا تو اسے بھی عبدالرحمان کے ہر حکم کی تعمیل کرنا پڑتی مگر وہ خود مختار تھا۔ جہانزیب مردانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کے رواج کے مطابق سامیر عدت میں بیٹھ گئی تھی اور اب وہ چار مہینے اور دس دن تک کسی نامحرم کے سامنے نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے جہانزیب کو اس سے بات کرنے کے لیے زرینہ کی مدد لینی پڑی۔ اس کی درخواست پر وہ حیران ہوئی۔ ''زیب! تو کیوں اس سے ملنا چاہتا ہے... وہ عدت میں ہے۔''

جہانزیب نے اصرار کیا۔ ''میں جانتا ہوں لیکن میں

بابا کے اس فیصلے کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے سامیر اور میرے بارے میں کیا ہے۔"

خانم یقیناً اس فیصلے سے واقف تھی اس لیے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ مان گئی۔ "ٹھیک ہے لیکن مجھے انتظام کرنا پڑے گا۔ تم اپنے کمرے میں رہنا، میں پارس کو بھجواؤں گی۔ اس کے ساتھ چلے آنا۔"

پارس خانم کی خاص خادمہ تھی۔ وہ تقریباً بارہ بجے آئی اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ جہانزیب نے دروازہ کھولا تو پارس نے آہستہ سے کہا۔ "چھوٹے خان جی! میرے ساتھ آیئے۔"

پارس اسے زنانے میں ایک الگ کمرے میں لائی جس میں پردہ لگا ہوا تھا اور اس کے دوسری طرف سامیر تھی۔ جہانزیب اس طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "سامیر! تم کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

پارس نے اسے کمرے کے باہر بتا دیا تھا کہ اس کے پاس دس منٹ ہیں اس لیے وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ "تم جانتی ہو کہ بابا نے میرے اور تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"جانتی ہوں۔"

"تب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

"کیا میرا کوئی فیصلہ ہوسکتا ہے؟" سامیر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"پہلے کی بات اور تھی، اب ہو سکتا ہے۔" جہانزیب نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارا جواب نہ میں ہے تو یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔"

"آپ کا کیا فیصلہ ہے؟" سامیر نے غیر متوقع طور پر پوچھا۔

"میرا؟" اس نے کہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "میں نے اس بارے میں سوچا نہیں۔"

"میں نے بھی نہیں سوچا کیونکہ میرے پاس یہ واحد موقع ہے۔"

جہانزیب نے پردے کے پاس دیکھا جہاں سامیر دکھائی دے رہی تھی، اس نے خود کو چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ "سامیر! تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"اگر آپ نے انکار کیا تو اس سے میری بے بسی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

جہانزیب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "سامیر! کھل کر بات کرو۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "کھلی بات یہ ہے کہ اگر آپ نے انکار کیا تو خان جی میرا نکاح زرین خان سے کر دیں گے۔"

جہانزیب دنگ رہ گیا۔ زرین خان اس کا سب سے بڑا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ نہ صرف عمر میں سامیر سے دوگنا بڑا تھا بلکہ اس کی دو بیویاں اور ان سے سات بچے پہلے سے تھے۔

"یہ زیادتی ہے۔"

"اسی خوف سے میں آپ کے لیے مان گئی ہوں حالانکہ یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔"

"ایسا مت کہو، وہ شخص خوش نصیب ہوگا جسے تم ملو گی۔"

وہ کراہنے کے انداز میں ہنسی۔ "اورنگزیب ایسا نہیں سوچتے تھے۔ انہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"یہ تمہاری نہیں اورنگزیب کی بدقسمتی تھی جو ہیرا چھوڑ کر کنکروں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔"

"جبھی میں نے آپ کا فیصلہ پوچھا تھا۔"

"سامیر! اگر تم مجھے قبول کرتی ہو تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ اورنگزیب کیسا تھا لیکن میرا بھائی تھا اور مجھے اس کی اولاد اسی کی طرح پیاری ہے۔ تمہارا اور ان بچوں کا سب سے زیادہ حق مجھ پر ہے۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں۔" سامیر کی آواز بھرا گئی۔ "ورنہ... ورنہ شاید حرام موت میرا مقدر بنتی۔"

وہ خودکشی کی بات کر رہی تھی۔ جہانزیب نے بے ساختہ کہا۔ "ایسا سوچنا بھی مت۔"

"جہانزیب! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"بولو۔"

"خدا کے لیے آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

"کیوں؟"

"یہاں آپ کی جان کو خطرہ ہے۔"

"کیسا خطرہ؟"

"یہ میں نہیں جانتی لیکن مجھے لگتا ہے جن لوگوں نے اورنگزیب کی جان لی ہے، وہ آپ کی جان بھی لے سکتے ہیں۔"

"سامیر! مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے لیکن میں اورنگزیب کے قاتل تک ضرور پہنچوں گا۔" جہانزیب نے کہا

اور کمرے سے نکل آیا۔ پارس غائب تھی۔ وہ خود اپنے کمرے میں آ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ وہاں عقیل موجود تھا۔

"میں تم سے ملنے آیا تھا مگر تم..."

"میں خانم کے پاس گیا تھا، ان کی طبیعت پوچھنے۔" جہانزیب نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔ "تمہیں آدھی رات کو مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"میں سامیر کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔" عقیل کا لہجہ بھی بدل گیا۔

"اگر تم بابا کے فیصلے کے بارے میں بات کرنے آئے ہو تو بہتر ہے کہ ان سے خود بات کر لو۔ مجھ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"تم انکار تو کر سکتے ہو۔"

"میں انکار کیوں کروں جبکہ اس پر میرا حق ہے۔ وہ میرے سگے بھائی کی بیوہ ہے۔ اس کی گود میں میرے بھائی کے بچے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں۔ دوسرے تمہیں معلوم ہے اگر میں نے انکار کیا تو بابا نے متبادل فیصلہ بھی کر رکھا ہے۔"

عقیل چونکا۔ "متبادل فیصلہ؟"

"ہاں، اس صورت میں وہ سامیر کا نکاح زرین خان سے کر دیں گے۔"

عقیل کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ جہانزیب نے گہری سانس لی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ حویلی میں اندرونِ خانہ بھی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے خیال میں یہ فطری عمل تھا۔ وہ جس قسم کے لوگ تھے اور جو کرتے تھے، ان کا رویہ اسی قسم کا پُراسرار اور سازشانہ ہونا چاہیے تھا۔

اگلے دن جہانزیب شہر آیا۔ حویلی سے شہر تک کا سفر تقریباً دو گھنٹے کا تھا۔ پہلے زیادہ وقت لگتا تھا مگر اب سڑک اچھی بن گئی تھی۔ عبدالرحمان نے اس کے ساتھ محافظوں کی ایک گاڑی کی تھی جو شہر تک اس کے ساتھ آئی اور پھر واپس چلی گئی۔ عبدالکریم اسے دیکھ کر خوش ہو گیا ویسے وہ تقریباً روز اسے کال کرتا تھا۔ جہانزیب نے اسے اب تک ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کیا۔ وہ سامیر کے بارے میں جان کر پُرجوش ہو گیا۔

"سچ کہوں تو اس کے بارے میں جان کر میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ یہ تمہارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔"

"تب تم ایک مناسب مکان کی تلاش شروع کر دو۔ اسی علاقے میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ میں شادی کے بعد اسے یہیں لے آؤں گا۔"

پھر گفتگو کا رخ اورنگزیب کی طرف مڑ گیا۔ عبدالکریم نے ہچکچا کر مشورہ دیا۔ "یار! تم اب اس معاملے کو چھوڑ دو... یہ پولیس کا کام ہے اور خان جی بھی قاتلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے پاس طاقت اور ذرائع ہیں۔"

"مجھے لگ رہا ہے کہ وہ غلط آدمی پر شک کر رہے ہیں۔ بدر سلفی اس قتل میں ملوث نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔"

"مجھے اس وجہ سے بھی زیادہ فکر ہے۔ پہلے اس کا بیٹا مارا گیا۔ اورنگزیب نے نشے کی حالت میں اقرار کیا کہ یہ کام اس نے کیا ہے اور اب اورنگزیب مارا گیا۔ مجھے لگ رہا ہے ان دونوں کو لڑایا جا رہا ہے۔"

عبدالکریم نے غور سے اسے دیکھا۔ "تمہارا شبہ کس پر ہے... اپنے سوتیلے بھائیوں پر؟"

جہانزیب نے سر ہلایا۔ "ممکن ہے انہیں اورنگزیب کی آمد پسند نہیں آئی ہو کہ وہ حصے دار بن جائے گا۔"

"حصے دار تو تم دونوں ہو۔ اب اس کے بعد اس کی اولاد ہو گی۔"

"میں بابا کے بزنس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت یا شکل نہیں ہے۔ یہ تو چلانے والے کے قبضے میں ہوتا ہے۔ اورنگزیب اس میں شریک ہو گیا تھا۔"

"تو کیا اسے اندر کے لوگوں نے مروایا ہے؟"

جہانزیب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اگر ایسا ہے تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"زیب! یہ گند ہے اسے جتنا کریدو گے اتنا ہی گند نکلے گا۔"

"تو کیا کروں، اپنے بھائی کا قتل بھول جاؤں؟" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"نہیں لیکن اسے قانون اور قدرت پر چھوڑ دو۔ تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ انصاف ضرور ہو گا۔"

"میں قاتلوں تک پہنچنے کی ایک اور وجہ سے بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ہونے والے تصادم کو روک سکوں جس میں بے شمار لوگ مر سکتے ہیں۔"

"تصادم؟" عبدالکریم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں تم سوچو نا، پہلے بدر سلفی کا بیٹا مارا جاتا ہے اور پھر اورنگزیب کو قتل کیا جاتا ہے۔ کیا اس کے بعد دونوں میں تصادم ناگزیر نہیں ہو جائے گا؟"

"اس کا امکان تو ہے۔"

"میں اسے بھی روکنا چاہتا ہوں۔"

جہانزیب اگلے روز واپس روانہ ہو گیا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ اس معاملے پر غور کر رہا تھا اس لیے اسے خاصی تاخیر سے احساس ہوا کہ دو گاڑیوں نے آگے پیچھے سے اسے گھیر لیا ہے اور وہ اسے روک رہی ہیں۔ جہانزیب نے گاڑی روک لی۔ اگلی گاڑی سے ایک لمبا تڑنگا قبائلی اترا اور اس نے جہانزیب سے کہا۔ "خان زادے... نیچے اتر آؤ۔"

"تم لوگ کون ہو اور مجھے کیوں روکا ہے؟"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔" لمبے آدمی نے جواب دیا اور اسے گن پوائنٹ پر دوسری گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد گاڑیاں ایک پہاڑی مکان میں رک گئیں اور وہاں بدر سلفی، جہانزیب کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر جہانزیب نے گہری سانس لی۔

"تو یہ تم ہو خان؟"

بدر سلفی تقریباً ساٹھ باسٹھ سال کا دبلے چہرے اور تیز آنکھوں والا شخص تھا۔ ساتھ ہی وہ نہایت سفاک بھی تھا۔ اپنے دشمنوں کو ذرا رعایت نہیں دیتا تھا مگر اس وقت اس کا رویہ معقول تھا۔ اس کے آدمیوں نے جہانزیب کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا اور اس نے اسے سامنے بٹھایا اور بلاتمہید بولا۔ "خان زادے! میں سیدھی بات کروں گا۔ میرے بیٹے کا قتل عبدالرحمان نہیں کرا سکتا پھر یہ کس کا کام ہے؟"

"میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح مجھے یقین ہے میرے بھائی کا قتل تم نے نہیں کرایا ہے۔"

بدر سلفی کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ "تمہیں کس پر شک ہے؟"

"کسی پر نہیں۔" جہانزیب نے کہا پھر اچانک پوچھا۔ "خان! تمہارے آدمیوں کے پاس کوئی سفید رنگ یا اس کے آس پاس کے رنگ کی کوئی ڈبل کیبن گاڑی ہے؟"

بدر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے یا میرے آدمیوں کے پاس ایسی کوئی گاڑی نہیں ہے۔"

اسی لمحے لمبا تڑنگا شخص آگے آیا اور اس نے جھک کر بدر کے کان میں کچھ کہا۔ اس کا چہرہ تعجب انگیز ہو گیا۔ پھر اس نے جہانزیب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرے پاس ایک کام کی اطلاع ہے لیکن پہلے تم بتاؤ تم نے سفید ڈبل کیبن گاڑی کا ذکر کیوں کیا؟"

جہانزیب نے سوچا اور پھر اسے بتا دیا۔ بدر سلفی غور سے سن رہا تھا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد جہانزیب اپنی جیپ میں واپس جا رہا تھا۔ بدر کے آدمی اس کی گاڑی ساتھ لائے تھے اور وہ اسے اپنے علاقے کی سرحد تک چھوڑنے بھی آئے تھے۔ جاتے وقت لمبے آدمی نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ جہانزیب مطمئن تھا۔ جب بدر کے آدمی اسے لے جا رہے تھے، تب اس کے ذہن میں کچھ خدشات تھے مگر اب اسے لگ رہا تھا کہ یہ اچھا ہوا۔ وہ تاخیر سے حویلی پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی رک گیا۔ وہاں تقریباً ایک درجن بڑی گاڑیاں موجود تھیں جن پر بھاری اسلحہ لدا ہوا تھا۔ زرین اور اس کے تینوں چھوٹے بھائی بھی وہاں موجود تھے۔ مسلح جنگجوؤں کی تعداد سو کے قریب تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں لشکر کشی کی تیاری کر رہے ہوں۔ جہانزیب، زرین خان کے پاس آیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"بدلے کی تیاری۔" اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"کس سے؟"

زرین خان نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم جانتے ہو، بدر نے حد کر دی ہے۔ اس نے شامل خان اور اس کے پورے گھر والوں کو مروا دیا ہے تاکہ اس کے خلاف کوئی گواہ باقی نہ رہے۔"

جہانزیب کے لیے یہ شاک تھا کہ شامل خان اپنے گھر والوں سمیت مارا گیا تھا۔ اس سے زیادہ شاک اسے زرین خان کے منہ سے شامل خان کا نام سن کر لگا تھا۔ وہ اندر جانے لگا تھا کہ ایک گاڑی دیکھ کر چونکا۔ اس نے زرین یا کسی اور سے سوال کرنے کے بجائے یہاں گاڑیوں کی دیکھ بھال کرنے والے ملازم کو پکڑا اور اس سے گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ ملازم نے جو جواب دیا، اس نے جہانزیب کے دماغ میں جیسے کوئی کھڑکی کھول دی اور وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے عبدالرحمان کے کمرے میں جانے کے لیے دستک یا اجازت کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ اندر عقیل کو دیکھ کر چونکا۔ اس نے جہانزیب کو دیکھتے ہی کہا۔ "زیب، خان جی کو بتاؤ کہ اس طرح کھلی جنگ میں کتنے لوگ مارے جائیں گے۔"

"میں اپنے بیٹے کے قاتلوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔" عبدالرحمان غرایا۔

"میں آپ سے متفق ہوں بابا۔" جہانزیب نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے اس لاؤ لشکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قاتل ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

عبدالرحمان اور عقیل دونوں چونکے۔ عبدالرحمان نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ بابا کہ اورنگزیب کے قاتل اسی حویلی میں ہوتے ہیں۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟''

جہانزیب نے باپ کو نظر انداز کر کے عقیل کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے زیرِ استعمال جو ڈبل کیبن گاڑی ہے، اس کا دس دن پہلے کیا رنگ تھا؟''

عقیل نے یہ سنتے ہی اپنا ہاتھ سامنے کیا تو اس میں پستول تھا۔ عبدالرحمان دہاڑا۔ ''رک جا... مجھے اس سے بات کرنے دے۔''

''خان جی! یہ جان گیا ہے۔'' عقیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمارے لیے خطرہ بن جائے گا اورنگزیب کی طرح۔''

''ہاں، میں جان گیا ہوں۔'' جہانزیب کے لہجے میں نفرت آگئی۔ ''انسان کس طرح احسان فراموشی کرتا ہے۔ جس تھالی میں کھاتا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے۔ میں جان گیا ہوں کیسے انسان کے لیے مفادات اپنے خون سے زیادہ اہم ہوجاتے ہیں۔''

عبدالرحمان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''زیب... وہ پاگل ہوگیا تھا۔''

''آپ لوگوں کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''آپ لوگ پاگل نہیں ہیں۔ دوسروں کو زہر دے کر اور ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھما کر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے گھروں میں امن و سکون رہے گا؟ آپ کے بچے پاگل نہیں ہوں گے؟ اورنگزیب پاگل نہیں تھا۔ اس شخص نے آپ کو غلط بتایا۔ مجھے یقین ہے اس نے آپ کو جو ریکارڈ شدہ آواز سنائی ہوگی، وہ اورنگزیب کی نہیں ہوگی۔ نشے کی آواز کہاں پہچانی جاتی ہے۔''

''خان جی! یہ جھوٹ بول رہا ہے، آپ کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب پستول نکال کر دے دیا کیونکہ اپنے خون کو بہانے میں میرا باپ تمہارے ساتھ تھا۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' عبدالرحمان نے پوچھا۔

''بابا! میں نے شامل خان کے بارے میں صرف آپ کو بتایا تھا۔ یہ بات باہر کیسے نکلی اور تعجب کی بات ہے اس کے خاندان سمیت قتل کا الزام بدر پر لگا دیا گیا۔ آخر بدر تک اطلاع کیسے پہنچی؟ مجھے افسوس ہے بابا میں نے جو کہا ہے، وہی سچ ہے۔''

''وہ پاگل ہوگیا تھا۔'' عبدالرحمان نے پھر کہا۔ ''وہ سب کو تباہ کرنے پر تل گیا تھا۔''

''یہ جو باہر تیاری ہے، کیا یہ تعمیر کے لیے ہے۔ آپ کو یقین ہے اس سے کوئی تباہی نہیں آئے گی؟''

''ہمارے پاس موقع ہے۔ ہم آج ہی بدر اور اس کے آدمیوں کا خاتمہ کردیں گے۔'' عقیل بولا جبکہ کچھ دیر پہلے وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ پہلے جھوٹ بول رہا تھا یا اس وقت بول رہا تھا۔

''اس کے بعد اس علاقے میں صرف ہماری حکمرانی ہوگی۔'' عبدالرحمان نے اس کی تائید کی۔

''یہ بات اس نے آپ کو سمجھائی ہوگی۔'' جہانزیب نے طنزیہ نظروں سے عقیل کی طرف دیکھا۔ ''بابا! یہ دراصل آپ کی تباہی کے درپے ہے۔ آپ جانتے ہیں، میں اس وقت کہاں سے آرہا ہوں؟''

''کہاں سے آرہے ہو؟'' عبدالرحمان نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زیب! کیوں مجھے الجھا رہا ہے، کھل کر بات کر۔''

''بابا! اس وقت میں بدر کے پاس سے آرہا ہوں۔ راستے میں اس کے آدمیوں نے مجھے روک لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور میری بدر سے ملاقات ہوئی۔''

عبدالرحمان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''اس کی یہ جرأت، وہ پہلے ہی میرے ایک بیٹے کا قاتل ہے۔''

''بابا! وہ اورنگزیب کا قاتل نہیں ہے۔''

''اسی کی وجہ سے میں مجبور ہوا۔'' عبدالرحمان چلایا۔

''کیا مجبوری تھی؟'' جہانزیب کا لہجہ پھر تلخ ہوگیا۔ ''دنیا کی کوئی مجبوری ایسی ہوتی ہے کہ انسان اپنی اولاد کو قتل کردے؟''

عبدالرحمان خود پر قابو پا رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''زیب! کوئی بات میرا فیصلہ تبدیل نہیں کراسکتی۔''

''بابا! کیا یہ بات بھی آپ کا فیصلہ تبدیل نہیں کراسکتی کہ آپ اپنے چار بیٹوں اور آدمیوں کو موت کے منہ میں بھیج رہے ہیں؟''

''بدر اور اس کے آدمیوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''ان کو پتا ہے اور وہ پوری طرح تیار ہیں۔'' جہانزیب نے جواب دیا۔ ''حیرت ہے آپ یا عقیل نے پوچھا نہیں کہ جب بدر نے مجھے پکڑ لیا تھا تو اس نے چھوڑا کیوں؟''

''کیوں چھوڑا؟''
''بابا! اس نے مجھے بات کرنے کے لیے بلایا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں وہی ہے جو میرے ذہن میں تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو خود مروایا لیکن اس کا بیٹا دشمنوں نے مارا ہے۔ آپ اس پر حملہ کرنے جا رہے ہیں اور اس نے عقل مندی سے کام لیا۔ اگر آج وہ مجھے نہیں بلاتا تو آپ اپنے چار بیٹوں اور سارے لڑنے والے آدمیوں سے محروم ہو جاتے۔ اس کے بعد آپ کی کیا حیثیت رہ جاتی آپ خود سوچ سکتے ہیں۔''
''زیب! تو کیا کہہ رہا ہے، میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔''
''بابا! آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بدر اورنگزیب کے اعتراف سے واقف ہے۔ وہ آج کے حملے سے بھی واقف ہے تو کون شخص اسے اطلاع دے سکتا ہے؟''
''وہ تم ہو۔'' عقیل بولا۔
''میں نے جیل سے بدر کو ریکارڈنگ بھجوائی تھی؟'' جہانزیب نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اچانک عقیل نے عبدالرحمان سے دور ہوتے ہوئے ان دونوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ عبدالرحمان غرایا۔
''یہ کیا کر رہا ہے؟''
''خان جی! چپ کر کے کھڑے رہو۔'' اس نے کہا اور کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ ''وہ جانے والے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد میں تم دونوں کا فیصلہ بھی کر دوں گا۔ ان میں سے کوئی واپس نہیں آئے گا۔''
''تم کیا سمجھتے ہو تم بچ جاؤ گے؟'' جہانزیب نے پوچھا۔
''میں نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ تم ہو اور میرے پاس ثبوت ہے۔ بدر کے آدمی نے خود بتایا کہ تم اس سے ملتے تھے اور یہاں کی اطلاعات دیتے تھے۔ آخری بار جب تم اس سے ملنے گئے تھے تو اسی سفید رنگ کی ڈبل کیبن گاڑی میں تھے۔''
''ہاں۔'' وہ مسکرایا۔ ''اب یہاں صرف میرے وفادار ہیں۔ کل صبح کا سورج نکلے گا تو اس حویلی اور کاروبار کا واحد مالک میں ہوں گا۔ ان عورتوں اور بچوں سے نمٹنا کون سا مشکل کام ہے۔''
عبدالرحمان کو اب شاک لگا تھا۔ ''ذلیل شخص... تو نے میرے احسانات کا یہ صلہ دیا ہے؟''
''احسانات۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''کس احسان کی بات کر رہے ہو؟ تم نے مجھے بھتیجا سمجھ کر نہیں ایک منیجر سمجھ کر پالا اور مجھ سے کام لیا۔ اس میں احسان کہاں سے آ گیا؟ میری بہن کو اپنے اوباش بیٹے سے بیاہ دیا۔ یہ واحد احسان ہے جو تم نے مجھ پر کیا اور میں نے اس کا صلہ بھی اتار دیا۔''
عبدالرحمان غصے سے بے قابو ہو کر اس کی طرف بڑھا لیکن جہانزیب نے اسے روک دیا۔ ''عقیل! جو تم چاہتے ہو وہ کبھی نہیں ہوگا کیونکہ بدر کھلی جنگ کے لیے تیار نہیں ہے، اس میں نقصان دونوں پارٹیوں کا ہوگا۔''
عقیل شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''جب ہماری طرف سے حملہ ہوگا تو وہ جواب دینے پر مجبور ہو جائے گا۔''
جہانزیب محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھنس گئے ہیں۔ عقیل صرف مسلح پارٹی کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ انہیں شوٹ کر دیتا اور حویلی میں اپنے وفاداروں کی مدد سے کنٹرول حاصل کر لیتا۔ عبدالرحمان کا چہرہ اس کی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا کیونکہ وہ گھر میں اپنے پاس ہتھیار نہیں رکھتا تھا۔ عقیل یہ بات جانتا تھا اس لیے مطمئن تھا۔ باہر گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر وہ حویلی سے نکلنے لگیں۔ عقیل دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی آخری گاڑی نکلی اس نے پردہ چھوڑ دیا اور پستول جہانزیب کی طرف سیدھا کیا۔ ''خان! آج تم اپنے دوسرے بیٹے کو اپنے سامنے مرتا دیکھو گے۔''
جہانزیب چونکا۔ ''اورنگزیب بھی...''
''ہاں۔'' عقیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میرے ساتھ دوسرا فرد خان جی تھے۔''
جہانزیب کو لگا کہ اس کی عقل خبط ہو رہی ہے۔ انسان ذاتی مفاد کے لیے کس حد تک گر سکتا ہے، یہ اس نے آج جانا تھا۔ پھر وہ فائر کی آواز پر چونکا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کب عقیل نے گولی چلا دی اور کب عبدالرحمان سامنے آ گیا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور عقیل تیورا کر گرا۔ یہ فائر عبدالرحمان کے چادر میں چھپے پستول سے ہوا تھا۔ عقیل کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ جہانزیب نے عبدالرحمان کے سینے سے چادر ہٹا کر زخم دیکھا۔ گولی دل سے ذرا اوپر لگی تھی اور وہ کچھ دیر کا مہمان تھا۔ وہ بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے موبائل نکال کر زرین خان کو کال کی اور اسے واپس آنے کا حکم دیا۔ جہانزیب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی لمحے زرینہ خانم وہاں آ گئی اور عبدالرحمان نے اس کے سامنے کہا کہ عدت کے بعد سامیر گل کی شادی جہانزیب سے کر دی جائے۔ جس لمحے عبدالرحمان نے آخری سانس لی، اسی لمحے حویلی کا دروازہ کھلا اور جانے والی گاڑیاں واپس آ گئیں۔

آج کل میں ایک خاص اور بڑے پروجیکٹ کے سلسلے میں دن رات مصروف تھا۔ اس لیے زیادہ وقت آفس کی نذر ہو رہا تھا۔ میں اور میرے تمام ورکرز تندہی سے دن رات کام میں جُتے ہوئے تھے۔ کیونکہ میرے کاروباری سفر میں یہ ایک بڑا اور اہم انٹرنیشنل ٹارگٹ تھا۔ اس میں ملنے والی کامیابی پر ہی انٹرنیشنل مارکیٹ میں قدم جماتے پر انحصار تھا.... خوش قسمتی تھی کہ میرے ورکرز بہت تعاون کرنے والے تھے جنہوں نے اپنی محنت، لگن اور ایمانداری سے میرے چھوٹے سے گارمنٹ یونٹ کو ایک بڑی گارمنٹ فیکٹری میں تبدیل کر دیا تھا۔

جواباً میں بھی اس محنت و ایمان داری کا صلہ انصاف کے ساتھ دیتا تھا۔ دیگر گارمنٹس فیکٹریوں کی بہ نسبت میں اپنے ورکرز کو پُرکشش تنخواہ اور سال میں دو بڑے بونس دیا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کسی حادثے یا بیماری کی صورت میں بھی میں دیگر فیکٹریز مالکان کی بہ نسبت اپنے ورکرز کی دل کھول کر مدد کرتا ہوں شاید یہی وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میری توقع اور حیثیت سے زیادہ نوازتا جا رہا تھا۔

آج میں اس مقام پر تھا کہ کئی پرانے گارمنٹس کے کاروبار سے وابستہ حضرات کے بجائے میرے نام قرعۂ فال نکلا اور آج یہ میٹنگ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ دورانِ میٹنگ میری بیوی زیبا کے فون آنے شروع ہو گئے۔

دو تین دن سے ہم باہر کھانے کا پروگرام بنا رہے

جرم کے نتیجے میں جرم کو جنم دینے والا سلسلہ... آپ کے اردگرد سانس لیتی حقیقی کہانی

بڑھتے ہوئے جرائم نے ہر شخص کو خوف و ڈر کے حصار میں مقید کر لیا ہے... سرِشام ہی لوگ گھروں کا رخ کر لیتے ہیں کہ کسی حادثے یا واردات کا شکار نہ بن جائے... احتیاط کے تقاضوں کے باوجود کوئی نہ کوئی شخص واردات کا شکار ہو ہی جاتا ہے... ایک معصوم بچے کے اغوا کی سنسنی خیز روداد...

انکشاف

شازلی سعید مغل

تھے، کافی عرصہ ہو گیا تھا ہم ساتھ باہر نہیں گئے تھے۔ آج میٹنگ سے فراغت کے بعد باہر کہیں کھانا کھانے کا پروگرام تھا۔ اس کی ایک دو کالز آئیں تو میں سمجھا کہ وہ مجھے یاددہانی کے لیے کالز کر رہی ہے لیکن جب لگاتار کالز پہ کالز آنی شروع ہوئیں تو مجھے غصہ آنے لگا۔ اسے معلوم ہے کہ میں میٹنگز کے دوران فون سائیلنٹ موڈ پر رکھتا ہوں۔ اگر بہت ہی کوئی خاص بات ہو تو ریسیپشن پر کال کی جا سکتی ہے۔ ریسپشنسٹ چٹ پر لکھ کر اندر میٹنگ روم میں بھیج سکتی تھی۔

جب میں نے فون اٹینڈ نہ کیا تو زیبا نے ریسیپشن پر کال کی اور پھر جو بات اسے بتائی گئی وہ سن کر ریسپشنسٹ شاہینہ چٹ پر لکھ کر میرے پاس بھجوانے کے بجائے خود حواس باختہ سی میٹنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس طرح مداخلت پر میں نے شاہینہ کو نہایت کڑی نظروں سے دیکھا۔

''سر...'' شاہینہ کا سانس دوڑ کر آنے سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔

''مس شاہینہ!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ کو پتا ہے کہ یہاں میٹنگ چل رہی ہے، آپ بغیر دستک دیے اندر کیسے آ گئیں؟''

''سر! وہ... آپ کے والد صاحب...'' شاہینہ نے اپنے تنفس کو تیزی سے نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''کیا... کیا ہوا ابو کو؟'' میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''سر! وہ ٹھیک ہیں۔ ان کا فون آیا تھا کہ آپ کے بیٹے کو کوئی لے گیا ہے... کڈ... کڈنیپ ہو گیا ہے۔'' شاہینہ نے اپنی کہی ہوئی بات کی بدحواسی میں تشریح کی۔

''کیا؟'' یہ سنتے ہی میں اپنی جگہ لڑکھڑا سا گیا۔

''مجھے جانا ہوگا۔'' میں نے میٹنگ کے شرکاء سے معذرت طلب کی اور تقریباً دوڑتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا جسے ڈرائیور گیٹ پر پہلے سے لگائے مستعد کھڑا تھا۔ میرے بیٹے کے اغوا کی خبر پوری فیکٹری میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ میرے ساتھ میرا منیجر شجاعت بھی میرا بیگ وغیرہ سنبھال کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نواز خان نے آندھی کی طرح گاڑی دوڑا دی۔ گھر پہنچا تو میرے دروازے پر گلی کے کچھ لوگ بھی کھڑے تھے۔ میرے ابو کے دوست اشرف صاحب اور ان کا بیٹا ابو کو سہارا دے کر ڈاکٹر کے ہاں سے لا رہے تھے۔ ابا کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''ابو...'' میں ان کی طرف بڑھا، ان کی ایسی حالت دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہونے لگے۔

''ٹھیک ہوں میں، بیٹا تو آ گیا۔'' ابو رونے لگے۔

''مجھے معاف کر دے، میں حمزہ کی حفاظت نہ کر سکا۔'' ابو میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں ابو، اندر چلیں آپ...'' میں نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو بے تابی سے کھول کر انہیں گلے لگا لیا۔

اندر کا منظر بھی کچھ الگ نہ تھا۔ زیبا، میری ماں اور اشرف صاحب کی بیگم وہیں لاؤنج میں تھیں۔ زیبا مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھی، وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے وہ تیورا کر گر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا کر کمرے میں پہنچایا۔ کسی نے ڈاکٹر کو کال کر دی تھی۔

ڈاکٹر کا کلینک اسی سوسائٹی میں تھا۔ پانچ منٹ میں وہ گھر آ گیا۔ ابا کو بھی اشرف انکل وہیں سے ڈریسنگ کروا کے لائے تھے۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ ہم پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ زیبا کچھ کچھ ہوش میں آنے لگی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی اور نیم بے ہوشی میں حمزہ کو پکار رہی تھی۔

''میں ان کو فی الحال نیند کا انجکشن دیتا ہوں۔ صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھیں، ان کا سونا لازمی ہے، انھیں گی تو اعصاب کچھ سکون پا چکے ہوں گے۔ ہم ابھی اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا۔ زیبا اب انجکشن کے زیرِ اثر گہری نیند سو چکی تھی مگر چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔ زیبا کے پاس اماں اور اشرف انکل کی بیگم تھیں۔

میں باہر لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں اشرف انکل کے علاوہ محلے کے ایک اور بزرگ عارف صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اشرف انکل اور ابا نے حادثے کی رُوداد سنا دی تھی کہ کیونکر حادثہ پیش آیا۔

واقعے کے پیشِ نظر اب مجھے اغوا کنندگان کے فون کا بے صبری سے انتظار تھا۔ میرے لیے وقت تھم سا گیا تھا۔ حمزہ میرا اکلوتا چھ سالہ بیٹا تھا اس کے بعد اللہ نے ہمیں مزید اولاد سے نہیں نوازا تھا۔ چنانچہ وہ ہمارے لیے جینے کا سامان تھا، میرے ابو کی جان تو تھی ہی حمزہ میں۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ زیبا کو جب یہ پتا چلا کہ وہ اب کبھی ماں نہ بن سکے گی تو حمزہ اس کے لیے ہفت اقلیم کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو اسے اپنے آنچل میں چھپائے رکھتی... یہی حال میری اماں کا تھا۔

ابو روزانہ شام کو حمزہ کو لے کر باہر ایک منی مارٹ پر جاتے تھے، یہ مغرب سے کچھ دیر پہلے کا وقت ہوتا تھا۔ حمزہ

کو اس کی پسند کے بسکٹس، چاکلیٹس وغیرہ دلاتے۔ پھر حمزہ کو گھر پر چھوڑ کر مغرب کی نماز کے لیے جاتے۔ حمزہ کے لیے ہر چیز گھر پر لاکر رکھی جاتی تھی۔ مگر اپنے دادا کے ساتھ باہر جا کے خود اپنے لیے چاکلیٹس وغیرہ لینا اس کا ایک مشغلہ سا بن گیا تھا۔ ابا جب تک اسے لے کر شام کو منی مارٹ تک نہ جائیں اس کا دن ہی مکمل نہیں ہوتا تھا۔ جس جگہ میں نے گھر بنایا تھا، یہ علاقہ کچھ سال پہلے جنگل نظیر علاقہ تھا پھر یہاں بلڈرز نے نئی سوسائٹیاں بنانا شروع کردیں جن کی ایک چار دیواری ہوتی تھی، میری سوسائٹی بھی ان میں ہی سے ایک تھی۔ یہاں رفتہ رفتہ آبادکاری ہورہی تھی۔ ہماری گلی میں سے بھی بیشتر پلاٹس پر تعمیر ہوچکی تھی مگر آباد صرف چھ گھر ہوئے تھے، ابھی کئی مکان زیرِ تعمیر تھے۔ مجھے خود یہاں شفٹ ہوئے سال ہی ہوا تھا۔

علاقہ نیا اور پُرسکون تھا، مجھے بہت پسند آیا تھا۔ سوسائٹی کے باہر روڈ پر مارکیٹ بھی حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ اِکادُکا دکانیں کھل چکی تھیں مگر اس ''منی مارٹ'' کی اوپننگ بہت بھرپور انداز میں ہوئی تھی۔ اس کی اوپننگ کے بعد سوسائٹی والوں کو بہت سہولت ہوچکی تھی۔ مارکیٹ کے ساتھ پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے جن پر جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ ایسے نئے علاقے جو ابھی بس رہے ہوں قلیل آبادکاری کی وجہ سے دن میں بھی سناٹے کی حالت میں ہوتے ہیں جبکہ رات تو مزید ہُو کا عالم پیش کرتی ہے۔

سردیوں کے دن تھے، چھ بجے ہی مغرب ہوجاتی تھی۔ آج کل سرِشام ہی سناٹے کا راج ہونے لگا تھا، اس دن بھی ابا، حمزہ کو لے کر منی مارٹ تک آئے تھے۔ یہاں سے انہوں نے حمزہ کو بسکٹس وغیرہ دلائے اور کچھ کچن کا سامان لیا اور مارٹ کے ساتھ خالی پڑے ہوئے پلاٹ کے کنارے چلنے لگے۔ کیونکہ اس کی حدود ختم ہونے کے بعد ہی سوسائٹی کی چار دیواری شروع ہوتی تھی۔ اس پلاٹ میں جنگلی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ ان ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی لال رنگ کی وین کو آتے ہوئے انہوں نے بالکل نوٹ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اکثر اسی طرح خالی پلاٹس کے کنارے گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ جیسے ہی وہ اس کے برابر سے نکلے وین کا دروازہ کھلا اور ابو کی انگلی پکڑے حمزہ کو وین کے اندر گھسیٹ لیا گیا۔ ابو اس اچانک افتاد سے حواس باختہ ہوگئے تھے مگر حمزہ کے لیے کھینچاتانی کرنے لگے۔ ابو کے مطابق وہ تیکھے دبلے دو لڑکے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اور تھا، انہی لڑکوں میں سے ایک نے ابو کو دھکا دیا اور وین فراٹے بھرتی غائب ہوگئی۔ سب کچھ بے حد تیزی سے ہوا۔ منی مارٹ اور جو چند ایک فاصلے پر دکانیں کھلی ہوئی تھیں، ابو کے شور مچانے پر ان میں سے لوگ باہر نکل آئے، کچھ راہ گیر بھی آرہے تھے۔ انہوں نے ابو کو اٹھایا، ماتھے پر چوٹ آئی تھی۔ آناً فاناً خبر پھیل گئی کہ حمزہ کو اغوا کرلیا گیا۔

ابو کی حالت، زیبا کی شکستگی اور حمزہ کا اغوا ہونا بہت اعصاب شکن تھا۔ اس وقت میرے لاؤنج میں محلے کے جو مختصر سے گھر آباد تھے ان میں سے ہر گھر کا ایک نہ ایک فرد ضرور موجود تھا۔ سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ اغوا برائے تاوان کے واقعات تواتر کے ساتھ ہورہے ہیں آج کل۔ مساجد میں بھی کچھ زیادہ اعلانات سننے میں آتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی واردات ہے۔

میرے ایک پڑوسی ریاض احمد صاحب نے کہا۔

''تاوان کے لیے فون ضرور آئے گا۔''

''تو کیا ہم انتظار کریں، چلیے ایف آئی آر درج کراتے ہیں چل کے...'' یہ عارف صاحب تھے جو ایک ریٹائرڈ پروفیسر تھے۔

ابو کھڑے ہونے لگا۔ ''یہ بالکل ٹھیک ہے چلیں پھر...''

''ابو ٹھہریں...'' میں نے ابو کو روکا۔ ''میں اس طرح پولیس کو ملوث کرکے اپنے بچے کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اگر، اگر میرے بچے کو کچھ ہوگیا تو...''

''نہیں ایسا بالکل نہیں ہوگا بیٹے، ایسا نہ بول... ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرا حمزہ صحیح سلامت آجائے بس اور کچھ نہیں چاہیے، کچھ نہیں... ہمیں اغوا کنندگان کے فون کا انتظار کرنا ہوگا۔'' ابو، عارف صاحب کو سمجھانے لگے۔

''لیکن کیا ان کے آگے یوں گھٹنے ٹیک دینا اچھی بات ہوگی؟'' اشرف انکل نے کہا۔

''نہیں انکل... شجاعت... فرخ کو فون کرو۔'' میں نے منیجر سے کہا۔

''جی سر...''

فرخ میرا دوست تھا اور کرائم برانچ کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ میں سب کام اس کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا۔

فرخ کے آنے تک ہمیں انتظار کرنا تھا۔ اشرف انکل بات سمجھ چکے تھے۔ ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ میرا سیل فون رِنگ دینے لگا، میرا اسیل فون میرے ہاتھ میں تھا اور ابو لینڈ لائن فون کے پاس مستعد بیٹھے تھے۔ ایک اجنبی نمبر سیل فون پر فلش کررہا تھا۔ میں نے بے تابی سے فون اٹینڈ کیا۔ میری توقع کے عین مطابق اغوا کنندگان کا فون

تھا۔ بھاری سی اجنبی آواز تھی۔
''شہاب! تمہارا اکلوتا بیٹا ہمارے پاس ہے۔ خیریت کے ساتھ... اور اس کی مزید خیریت نیک مطلوب ہے تو بغیر کسی بکھیڑے کے دو کروڑ کا انتظام کرو اور اگلے فون کا انتظار...''
''ہیلو، ہیلو... سنو... ارے میری بات تو سنو۔'' فون بند ہو چکا تھا۔ میں نے اسی نمبر پر کال بیک کی مگر نمبر بند کر دیا گیا تھا۔
''کیا ہوا؟ کیا کہہ رہے تھے؟''
''دو کروڑ مانگے ہیں، پولیس کو مطلع کرنا، یا کسی کو انوالو کرنا حمزہ کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا، منع کیا ہے اغواکنندگان نے۔'' میں نے بتایا۔
''نہیں شہاب، قانون کو اتنا کمزور مت سمجھو کہ وہ تمہارے بچے کو صحیح سلامت واپس نہ لا سکے۔'' فرخ آ چکا تھا اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج کل اغوا برائے تاوان کی وارداتیں عروج پر ہیں، میں مانتا ہوں کہیں ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مجرموں کے آگے ہار مان جائیں، جیسا وہ کہتے ہیں ہم کرتے جائیں۔''
''مگر کوتاہی تو اس میں پولیس کی ہی ہے نا کہ آئے دن حالات خراب، قتل و غارت گری، بھتا خوروں کا راج، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں اور اب تو بچوں کے اغوا تواتر کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ تین مہینے پہلے کی بات ہے ہمارے رشتے داروں میں سے ایک بچہ اسی طرح اغوا ہوا۔ پولیس کو اطلاع کرنا بچے کی جان لے گیا۔ مار دیا ظالموں نے۔'' ریاض صاحب کہتے چلے گئے۔ ان کی بات سے میں ہل کر رہ گیا۔
''اس طرح ہر بار نہیں ہوتا۔ پلیز آپ سے درخواست ہے قانون کو اتنا کمزور اور لاچار مت سمجھیے۔ یہ دو تین گروپس ہیں جو اِن دنوں شہر میں بچوں کے اغوا کی وارداتیں کر رہے ہیں۔ ہم ان تک پہنچ چکے ہیں، ان میں سے زیادہ تر گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ ان کا دوبارہ فون آنے دیں۔'' فرخ نے میرے سیل فون سے وہ نمبر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سارے انتظامات کر کے آیا ہوں۔ شہاب تم پریشان مت ہو، تمہارے منیجر نے مجھے ساری تفصیل فون پر بتا دی تھی۔'' فرخ نے کہا اور اپنے ڈپارٹمنٹ فون کر کے اغواکنندگان کے فون کی لوکیشن چیک کرنے کی ہدایات دیں۔ اس کے ساتھ آنے والے ماتحت نے میرے لینڈ لائن فون پر بھی آنے والی کسی بھی متوقع کال کی ٹریسنگ کے انتظامات شروع کر دیے۔
تھوڑی دیر میں نمبر کے بارے میں معلوم ہو گیا جس چیز کا خدشہ تھا، وہی بات نکلی۔ سم غیر تصدیق شدہ تھی، کوئی ریکارڈ نہ تھا اور نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ ورنہ لوکیشن معلوم ہو جاتی۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد موبائل کی بیل ہونے لگی۔ یہ کال نئے نمبر سے آ رہی تھی۔ فرخ نے اسپیکر آن کر کے بات کرنے کا اشارہ کیا، میں کال اٹینڈ کر چکا تھا۔ مجھے انہیں زیادہ سے زیادہ باتوں میں الجھانا تھا تاکہ فون کی لوکیشن ٹریس کی جا سکے۔
اسپیکر آن تھا۔ ''ہیلو۔'' دوسری جانب اس مرتبہ کوئی دوسری آواز تھی۔ ''پیسوں کا انتظام کر لیا شہاب احمد؟'' پوچھا گیا۔
''میں اتنا کیش گھر میں نہیں رکھتا، رات ہو گئی ہے، صبح ہوتے ہی بینک سے نکلوا لوں گا، میں نے نہایت عاجز اور لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب تو میری بات کرا دو میرے بیٹے سے پلیز...''
''کرا دیں گے بات بھی جب تم پیسے لے کر نکلو گے تو تمہاری بات بیٹے سے ہو جائے گی۔ چالاکی کی کوشش بھی مت کرنا تم... ورنہ تمہارے بیٹے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے...''
''نن... نن... نہیں۔ پلیز خدا کے واسطے ایسا مت کرنا جو کہو گے، ویسا ہی ہوگا۔'' اچانک فون بند ہو گیا۔
لوکیشن ٹریس ہو گئی تھی۔ کال گلشن حدید کے قریب سے کی گئی تھی۔ پہلے کی طرح یہ نمبر بھی غیر تصدیق شدہ تھا۔ نمبر بند ہو چکا تھا۔ فرخ نے اپنے ماتحتوں کو علاقے کی خفیہ نگرانی پر مامور کر دیا۔
کچھ دیر ہی گزری تھی کہ میرے موبائل پر دوبارہ ایک اجنبی نمبر فلش کرنے لگا۔ میں نے فرخ کی جانب دیکھا۔ اس نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے مجھے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا۔
میں نے دیوانہ وار کال ریسیو کر لی۔ یہ کوئی پی سی او کا نمبر لگ رہا تھا۔ یہ تیسری آواز تھی۔ اس نے بھی وہی باتیں دہرائیں جو اس سے پہلے والے نے کہی تھیں۔
مجھے اس کال کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ابھی 20 منٹ پہلے بھی اس کے ساتھی نے یہی سب کچھ دہرایا تھا۔ فون اسپیکر پر تھا، بیک گراؤنڈ میں ٹرین گزرنے کی آواز کے ساتھ فون کٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہو گیا، علاقہ ڈرگ روڈ کالونی کا تھا جس پی سی او سے فون کیا گیا تھا وہ ریل کی

پٹریوں کے بہت قریب تھا۔
"وہ مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف جگہوں سے فون کر کے کنفیوژ کرنا چاہتے ہیں۔ شاید ان کو شک ہے کہ ان کی لوکیشن ٹریس کی جا رہی ہے۔" فرخ نے کہا۔
"کیا؟" میں چیخ پڑا۔ "اگر ان کو شک ہوا تو میرا بیٹا، میرے حمزہ کا کیا ہوگا۔ وہ لوگ اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔"
"کچھ نہیں ہوگا، بھروسا رکھو مجھ پر، مجھے کام کر لینے دو... پلیز۔"
میں صوفے پر ڈھے سا گیا۔
فرخ مسلسل اپنی ٹیم کو فون پر ہدایات دے رہا تھا۔ رات کے دو بجنے کو آئے تھے۔ ریاض صاحب و دیگر پڑوسی اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اشرف انکل کی طبیعت آج کل ناساز تھی پھر بھی وہ کافی وقت سے ابو کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بصد اصرار ان کو بھی ان کے گھر بھجوایا مگر وہ بھی اس شرط پر گئے کہ صفیہ آنٹی یعنی ان کی بیگم اماں اور زیبا کے ساتھ ہی رہیں گی۔ شجاعت میرا وفادار منیجر میرے اصرار کے باوجود اپنے گھر نہیں گیا۔ زیبا نیند کے انجکشن کے سبب سو رہی تھی، اس کا سونا اس لیے بہت ضروری تھا کہ میں اس کو سنبھالتا یا حالات کو۔
یہ رات بے حد لمبی تھی۔ میری نظریں گھڑی کی سوئیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ فرخ اس اثنا میں صرف ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے رات کا اندھیرا صبح کے اجالے میں تبدیل ہوا۔ زیبا اٹھ چکی تھی مگر مستقل روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے ساری روداد مختصراً بتادی کہ حمزہ کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں۔
فرخ نے مجھے چند خصوصی ہدایات دیں۔ صبح سات بجے میرے سیل پر پہلے والے نمبر سے کال آنے لگی۔ فرخ کا اشارہ پاتے ہی میں نے کال ریسیو کرلی۔
"ہیلو!" اغوا کنندگان کا وہی بھاری آواز والا ساتھی تھا۔ "ٹائم اور جگہ نوٹ کرو۔ ٹھیک 12 بجے تم آجانا۔" انہوں نے جگہ نوٹ کرائی۔ گلشن حدید سے بھی کچھ آگے کا علاقہ تھا۔ ایڈریس کسی ادھوری عمارت کا تھا۔ ابھی میں اور کچھ کہتا کہ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "لے اپنے بیٹے کی آواز سن۔" حمزہ رو رہا تھا۔
"حمزہ... حمزہ... میرا بچہ..." زیبا، حمزہ کی آواز سن کر تڑپ گئی۔
"پاپا... مما مما..." وہ ماں کی آواز سن کر اور شدت سے رونے لگا۔
"بس، بس بیٹا، پاپا آرہے ہیں۔" حمزہ کی روتی ہوئی آواز دور ہونے لگی۔
"بس... سن لی تو نے اپنے بیٹے کی آواز... اور سن پھر یاد دلاتا ہوں، اکیلے آنا اگر اپنے بچے کی زندگی پیاری ہے تو... کوئی چالاکی کی تو... تیرے بچے کی زندگی کو فل اسٹاپ لگادوں گا۔"
"نہیں، سنو... ہیلو... ہیلو..." میں چیختا رہ گیا مگر فون بند ہو چکا تھا۔
میرے فون کا اسپیکر آن تھا۔ اس وقت میرے علاوہ زیبا، فرخ اور اس کے ماتحت موجود تھے جنہوں نے ساری گفتگو سنی تھی۔ میرا منیجر شجاعت بھی اس وقت موجود تھا۔ اس وقت شجاعت کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی چونکہ کال ریکارڈ کی جا رہی تھی، شجاعت نے بڑی تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سر! کیا کال کی ریکارڈنگ ایک بار پلے کی جا سکتی ہے۔"
فرخ کی نظریں شجاعت کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ "شجاعت تم جانتے ہو اسے؟"
"شاید... نہیں... یقیناً وہی ہے۔"
"کون؟ کون شجاعت... پلیز بتاؤ۔" میں جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ "کون ہے یہ کڈنیپر...؟"
کال کی ریکارڈنگ کمرے میں گونجی۔ آخری لائنز دو مرتبہ سننے کے بعد شجاعت کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ "سر! یہ... یہ تو سارنگ ہے سر... ہاں وہی سو فیصد وہی ہے۔"
اس کے بعد جو کچھ ہوا، بہت تیز رفتاری سے ہوا۔ میں بینک ضرور گیا۔ ابھی ان کے دیے گئے وقت میں کافی وقت تھا، میں بینک منیجر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا فرخ کے فون کے انتظار میں۔ فرخ اور میرے منیجر شجاعت نے اپنا کام کر دیا تھا۔ فرخ کی کال آرہی تھی۔
"ہاں شہاب تم پہنچو۔" میں سمجھ گیا اور دیے گئے ایڈریس پر پہنچا۔ سب کچھ کنٹرول میں تھا۔ حمزہ ایک لاوارث سی تعمیر شدہ عمارت میں موجود تھا۔ اللہ کا شکر تھا کہ وہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس تمام ڈرامے میں تنویر، سارنگ اور دو مزید ساتھی شامل تھے۔
میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ہی فیکٹری میں گزشتہ آٹھ سال سے کام کرنے والے مخدوم حسین کا بیٹا تنویر اتنے گھناؤنے جرم کا حصے دار بنے گا۔ سارنگ مہینا بھر

پہلے ہی اندرونِ سندھ کے کسی گاؤں سے آیا تھا، اسے مخدوم حسین کی ہی سفارش پر کام دیا گیا تھا، وہ اس اغوا کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ ان دونوں کی عمریں 19 سے 20 سال کے درمیان تھیں۔ ان کے دو مزید ساتھی بھی اس میں شامل تھے۔ اس واردات میں کئی ایک کمزور پہلو تھے مگر سارنگ کا تکیہ کلام ''فل اسٹاپ لگا دوں گا'' نے ان سب کو پھنسا دیا۔ میرے منیجر شجاعت نے جب اغوا کنندگان کے ساتھی کو سنا، وہ کہہ رہا تھا کہ کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ تیرے بیٹے کی زندگی کو فل اسٹاپ لگا دوں گا۔ تب وہ پہچان گیا کہ یہ سو فیصد سارنگ ہی ہے، آواز تھوڑی سی تبدیل کر کے بول رہا تھا مگر اپنے اسٹائل تکیہ کلام سے مار کھا گیا۔

میرے نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں ورک پریشر نہایت بڑھا ہوا تھا۔ کچھ نئے ورکرز رکھے گئے تھے مگر سب میرے پرانے ورکرز کے ہی توسط سے لائے گئے تھے۔ سارنگ بھی مخدوم حسین کا کوئی رشتے دار تھا جو اندرونِ سندھ سے نوکری کی تلاش میں شہر آیا تھا۔ منیجر شجاعت نے ہی سب کو فائنل کیا تھا۔ اسے سارنگ کا تکیہ کلام ''فل اسٹاپ لگا دوں گا'' سے سخت چڑ تھی۔ سارنگ کو جب کسی کی بات پر غصہ آتا یا وہ کسی سے بحث کرتا تو مخاطب پر رعب ڈالنے کے لیے کہتا کہ فل اسٹاپ لگا دوں گا۔ شجاعت نے کئی بار اسے تنبیہ کی تھی مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ یہی بات سارنگ کی پہچان بنی اور اس کے خلاف گئی۔ تنویر اور سارنگ کل بھی حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی پر آئے تھے۔ دونوں کی نائٹ شفٹ تھی مگر انہوں نے اسے چینج کرایا تھا، ایسا عموماً ہوتا تھا کہ ورکرز اپنی ڈیوٹیز ایک دوسرے سے چینج کرا لیتے تھے۔ صبح بھی وہ حسبِ معمول آئے تھے۔ فیکٹری کے رجسٹر میں اندراج کے بعد انہوں نے متعلقہ ڈپارٹمنٹ کے سپروائزر سے دو گھنٹے کی چھٹی طلب کی تھی کہ وہ بعد میں رات دیر تک کام کر کے اپنے حصے کا کام ختم کر لیں گے۔ شجاعت نے سپروائزر کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتا دی تھی، سارنگ اور تنویر کو چھٹی دے دی گئی تھی۔

فرخ نے اپنے سادہ لباس آدمی فیکٹری کے چاروں طرف لگائے ہوئے تھے۔ سارنگ اور تنویر کو فیکٹری کے گیٹ پر ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ دو تین لاتیں اور گھونسے کھا کر تنویر تو ڈھیر ہو گیا اور فوراً بک پڑا کہ حمزہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ فرخ نے سارنگ سے فون کرا کے پروگرام چینج کرایا کہ اب وہ وہیں پیسے لے کر حمزہ کو سونپیں گے جہاں رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد میں فرخ اور اس کی ٹیم کے ساتھ عمارت میں پہنچ گیا جہاں حمزہ کو رکھا گیا تھا۔

میں ابھی تک حیرت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن تھا کہ مخدوم حسین تو میرے شروع کے محنت کش ورکرز میں سے ایک تھا۔ اس کا بیٹا تنویر بھی نہایت محنتی اور ایمان دار تھا، اس کے خلاف ابھی تک کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی تھی۔ پان، گٹکا، سگریٹ وغیرہ جو اس عمر کے نوجوان کررہے ہیں ان سے کوسوں دور تھا۔ اس کا ایمان دار باپ آج کل بیمار تھا اور ہفتے بھر سے چھٹیوں پر تھا، اسے جب اپنے بیٹے اور رشتے دار سارنگ کے کرتوتوں کے بارے میں اطلاع ملی تو وہ بیماری کی حالت میں کانپتا لرزتا پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ بہت نادم اور شرمندہ تھا، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور خاموش میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھا تھا۔ تنویر مسلسل مجھ سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ سر، مجھے معاف کر دیں، میں سارنگ کی باتوں میں آ گیا۔ میں بھٹک گیا تھا سر، مجھے معاف کر دیں۔''

''اب بتاؤ یہ سب کیوں کیا؟'' فرخ، تنویر کی طرف بڑھا۔

مخدوم حسین روتے ہوئے اٹھا اور اپنے بیٹے تنویر پر جھپٹ پڑا۔ ''تو مر جائے تو اچھا ہے، جس تھالی میں کھایا اس میں چھید کیا۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' وہ تنویر کا گلا دبانے لگا۔ بڑی مشکل سے اسے الگ کیا گیا۔ مخدوم حسین نیم بے ہوشی کے عالم میں ایک طرف ڈھے سا گیا۔

''سر... سر... آج کل اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں کچھ گروپس ملوث ہیں جن میں کچھ سیاسی پارٹیوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ سارنگ نے منصوبہ بنایا کہ اگر ہم شہر میں ایسی وارداتوں کے پسِ پشت رہ کر خود بھی کسی بچے کو اغوا کریں تو ہمیں پیسا بھی ملے گا اور الزام اور شک پہلے سے ایسی وارداتوں میں ملوث گروپس پر جائے گا۔ ہمارا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، ہم صاف بچ جائیں گے۔''

''اوہو، لیکن تم نے میرا ہی بچہ کیوں چنا تنویر...؟''

''شہاب صاحب اس میں تنویر کا کوئی قصور نہیں، یہ میرا آئیڈیا تھا۔'' سارنگ نے کہا۔ ''کیونکہ جو سیٹھ لوگ بھتا نہیں دیتے ٹائم پر ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی اولاد اغوا کر لی جاتی ہے... مجھے پتا تھا کہ اس مرتبہ آپ نے بھی ان لوگوں کو ناراض کر رکھا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ...'' میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی اس انکشاف سے...

دیرینہ خواہش

بابر نعیم

ہوشیاری اور چالاکی سے کھیلے گئے داؤ بعض اوقات توقع کے برخلاف پڑ جاتے ہیں... اس نے بھی وقت کا درست تعین اور جگہ کی تصدیق میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی تھی... اس کے باوجود ہر چیز اس کے مخالف ہوتی چلی گئی...

فائدے کے سودے میں چھپے خسارے کا دلچسپ و اندوہ ناک احوال

سیل فون کی گھنٹی بجنے پر میں نے اپنا موبائل اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ''لینی کولسن بول رہے ہو؟'' یہ ایک کرخت آواز تھی۔ بالکل میری کرخت آواز کی طرح۔

میرے دفتر کے دروازے کے باہر گھنٹیوں اور سیٹیوں کی بلند ہونے والی آوازوں کے باوجود مجھے فون پر بولنے والے کی آواز سننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی لیکن میں اس آواز کو پہچان نہیں پایا تھا۔

یاد رہے کہ میرا کاروبار مکینکل اور الیکٹرانک گیمز سے متعلق ہے... لینی لینڈ آرکیڈ! یہاں پر گاہک پن بال اور وڈیو گیمز وغیرہ کھیلنے آتے ہیں۔

''ہاں، میں لینی ہی بول رہا ہوں۔'' میں نے اپنے سیل فون میں جواب دیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟ جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دو۔ میں اپنی رقم گننے میں مصروف ہوں۔''

میں نے یہ بات مذاق میں نہیں کہی تھی۔ میں اس وقت اپنے دفتر لینی لینڈ آرکیڈ میں لوہے کی ایک خستہ سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ ہر ہفتے میں کارکن ان گیمز مشینوں کو خالی کردیا کرتے تھے اور ان میں موجود پچیس سینٹ مالیت کے سکوں کو کپڑے کے تھیلوں میں بھر کر میرے دفتر میں گھسیٹ کر لے آتے تھے۔

اس وقت بھی سکوں سے بھرے ان تھیلوں نے میری میز کو چاروں طرف سے یوں گھیرا ہوا تھا جیسے میں نے جوار بھاٹے سے بچنے کے لیے ایک بند باندھ رکھا ہو۔ ہاں، میرے پاس سکے گننے والی مشین موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ایک وقت طلب کام تھا اور یہ کام مجھے خود کرنا پڑتا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے کارکن میری آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے میری آمدنی سے محروم کرسکتے ہیں۔

''اب جبکہ تم یہ کام کررہے ہو تو میرے لیے بھی دس ہزار ڈالرز کی رقم گن کر الگ کرلینا۔'' اس کرخت آواز والے نے کہا۔ ''لیکن مجھے پچیس سینٹ کے سکے نہیں چاہئیں۔ صرف بڑے نوٹوں سے کام چلے گا۔''

یہ سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ''آخر تم ہو کون؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑو کہ میں کون ہوں، لینی۔ بس یہ ذہن میں رکھو کہ ہیمپٹن بیچ ٹاؤن کی مقتدر شخصیات کو کہیں یہ نہ پتا چل جائے کہ تم سنگین جرائم کے مقدمات میں جیل کی ہوا کھاچکے ہو۔''

یہ سنتے ہی میری تشویش کا پارا بلند ہوگیا اور اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ میں یہ بات کسی طور سننا نہیں چاہتا تھا جو دھمکی یہ شخص دے رہا تھا۔ میں برسوں قبل اس ریاست سے یہاں ہیمپٹن بیچ منتقل ہوگیا تھا جہاں میں نے ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کے جرم میں قید کی سزا بھگتی تھی۔

اس تمام عرصے میں، میں یہی سمجھتا رہا کہ یہاں ہیمپٹن بیچ میں کوئی بھی میرے ماضی سے واقف نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے اپنے اس آرکیڈ کو چلانے کے لیے لائسنس اور اجازت نامہ کبھی نہیں ملتا۔ یہاں کے صاحب اقتدار جو اس ساحلی قصبے کو سیاحوں اور فیملیز کے لیے پرکشش اور دلچسپی کا باعث بنانا چاہتے تھے، یہ کبھی بھی گوارا نہیں کرتے کہ کوئی بدکردار اور اخلاقی طور پر سزا یافتہ بیک گراؤنڈ کا حامل فرد ان کی سیاحوں کی سونے کی کان کی بربادی کا باعث بنے۔

سو اب فون پر موجود شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اگر میں نے اس کی مطلوبہ رقم ادا نہ کی تو وہ میرے آرکیڈ کے اس منافع بخش کاروبار کو معدوم کردے گا اور شاید اسے اس بارے میں کوئی علم نہ ہو لیکن اس کا اثر میری ان چھوٹی سائڈ کی چیزوں پر بھی پڑسکتا ہے جو میں نے جاری رکھی ہوئی ہیں اور ان کا ستیاناس بھی ہوسکتا ہے۔ وہ سائڈ کی چیزیں بھی مجھے فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ یہ معاملات نمایاں ہوں اور شہرت کا سبب بن جائیں جو یقیناً میرے لیے کسی طرح سودمند ثابت نہیں ہوسکتے تھے۔

میرا ذہن باہر فلور پر لگے گیمز کی چھوٹی گولیوں کے مانند اچھل رہا تھا اور میں اس معاملے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن قسمت میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سو میں نے اسے فی الوقت ٹالنے کی کوشش کی۔

''دیکھو، یہاں اتنا شور غل ہے کہ مجھے تمہاری آواز بمشکل سنائی دے رہی ہے۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کل فون کرلینا۔ ہم پھر بات کریں گے۔''

''تم یقین رکھو، ہم کل ضرور بات کریں گے، لینی۔'' کرخت آواز نے کہا اور پھر فون بند ہوگیا۔

آئندہ چند دنوں تک میں اپنے ذہن پر زور دیتا رہا کہ میں جس مشکل میں پڑگیا ہوں، اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ تلاش کرسکوں۔ اس دوران میں مجھے اس کرخت آواز کی چند فون کالز بھی موصول ہوئیں اور میں نے انہیں تاویل میں ڈالنے کی اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی۔

اس نے آخری کال میں کہہ دیا کہ میری ٹال مٹول کا وقت اب پورا ہوگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بدھ کی رات اپنا آرکیڈ بند کرنے کے بعد مجھے دس ہزار ڈالرز تیار رکھنا ہوں گے۔ اس روز پیر کا دن تھا۔

فون کرنے والے کی آئی ڈی سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ فون کالز مجھے کن نمبروں سے کی گئی تھیں اور فون کمپنی میں ایک شناسا نے مجھے بتادیا کہ فون کالز کہاں سے کی گئی تھیں۔ یہ فون کالز مقامی ساحلی پٹی پر پھیلے ہوئے فون بوتھس سے کی گئی تھیں۔

ان معلومات سے مجھے ایک آئیڈیا مل گیا۔ پے فون کے بند ہونے کے بعد ہیمپٹن کے ساحل پر صرف دو فون بوتھ ایسے رہ گئے تھے جن میں سکے ڈال کر فون کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ بدھ کی شب فون کرنے کے بعد وہ کرخت آواز والا میرے آرکیڈ آنے کا رسک بھی نہیں

لے گا کیونکہ اس طرح اس کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ وہ یہ قدم کبھی نہیں اٹھائے گا۔

نہیں، وہ مجھے فون کرے گا اور مجھے کسی ایسی جگہ رقم پہنچانے کا پختہ راستہ اختیار کرے گا تا کہ رقم بہ آسانی اس کے ہاتھ آجائے اور میں اسے دیکھ بھی نہ پاؤں۔ یہی اس کی بچت کا محفوظ طریقہ ہوسکتا ہے۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو... کم از کم یہی کرتا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی سوچ بھی میری طرح کی ہوگی۔

میرا استدلال یہ بھی تھا کہ جب وہ مجھے رقم پہنچانے کی ہدایات کے بارے میں آخری فون کرے گا تو چاہے گا کہ میرے آرکیڈ سے قریب ترین جگہ پر موجود ہو۔ اس طرح وہ مجھ پر نظر بھی رکھے گا اور یہ یقین دہانی بھی چاہے گا کہ میں اسے باز رکھنے کے لیے کچھ کرنہ گزروں۔

سو مجھے یقین تھا کہ وہ آخری فون کال کرنے کے لیے ساحل پر بنے ہوئے ان دو فون بوتھس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا۔ میرے آرکیڈ سے نزدیک ترین فون بوتھ دوسرے فون بوتھ کے مقابلے میں ساحل کے ایک الگ تھلگ حصے میں بنا ہوا تھا اور وہ کرخت آواز والا غالباً اسی کا انتخاب کرے گا جہاں اس کے دیکھے جانے کا امکان کم سے کم ہوسکتا ہے۔

سو میں نے اسی فون بوتھ کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اتفاقات پچہتر فیصد میرے حق میں ہو سکتے ہیں۔

اگر میرا قیاس کسی صورت غلط نکلتا ہے اور وہ ان دونوں فون بوتھ میں سے کسی پر نہیں آتا تو میں نے دس ہزار ڈالر کی رقم اپنے سیف ڈپازٹ بکس سے نکال کر اپنے آفس کے سیف میں رکھنے کا پلان بنا لیا تھا تا کہ اگر ضرورت پڑے تو فوری طور پر دستیاب ہوسکے۔

نہیں، میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ میں یہ رقم اپنے ہاتھوں سے اسے تھما دوں گا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ کرخت آواز والا کوئی ایسی حرکت نہ کرنے لگے کہ میں اسے رقم کی جھلک دکھانے پر مجبور ہو جاؤں اور اسے یہ باور کراسکوں کہ میں یہ معاملہ طے کرنے میں سنجیدہ ہوں۔

پھر اس کے بعد ہی میں اس کی کھوپڑی چٹخا دوں گا۔

بالآخر جب بدھ کی رات آگئی تو میں نے اپنے دفتر کو تالا لگایا اور آرکیڈ کے بند ہونے کے وقت سے ذرا پہلے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے اپنے نمبر ٹو آدمی سے کہا کہ وہ روشنیاں بند کرنے کا دھیان رکھے۔

کمپیوٹر آج آپ کی بیٹی سے میری ملاقات طے ہو چکی ہے...... ذرا اسے بتا دیں

میں اس بات کی یقین دہانی چاہتا تھا کہ کرخت آواز والے کے فون بوتھ تک پہنچنے اور فون کال کرنے سے قبل ہی میں وہاں پہنچ جاؤں۔

آرکیڈ سے باہر نکل کر مجھے سمندری ہوا کی نمکینی سانس میں محسوس ہونے لگی۔ ساتھ ہی لہروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یقیناً سمندر کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ میں ایک تاریک سڑک پر چل دیا۔ جو ساحلی ریت پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا حتیٰ کہ ریت کے ایک بڑے سے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔

میں بمشکل قدم اٹھاتا اس ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ جب میں ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا تو اب میں نیچے بنے ہوئے ٹیلے کے پار ویران پارک اور اکلوتے فون بوتھ کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک باتھ ہاؤس کے برابر میں تھا جو بند ہو چکا تھا۔ میں سمندری گھاس پر لیٹ گیا اور فون بوتھ پر نظریں جما دیں۔

مجھے اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک میرے آرکیڈ کے بند ہونے کا وقت ہو جاتا۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے ابھی مزید پانچ منٹ انتظار کرنا تھا کیونکہ میرے آرکیڈ کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔

تب میں نے اوشن بولیورڈ کی جانب سے ایک سیاہ کار کو پارکنگ لاٹ کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں لیکن کار کے اندر کی روشنی گل تھی۔ مجھے کار کے پہیوں تلے روڑی بجری کی چرچراہٹ صاف سنائی

دے رہی تھی۔

کار فون بوتھ کے قریب آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے کار کی روشنی بجھا دی اور کار سے نیچے اتر کر فون بوتھ کی جانب چل دیا۔

مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ یہ وہ کرخت آواز والا ہی ہے۔ یہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا جو فون بوتھ استعمال کرنا چاہ رہا ہو۔ مجھے اس وقت بھی یقین نہیں تھا جب اس نے فون بوتھ کا دروازہ کھسکا کر کھولا، بوتھ میں داخل ہونے کے بعد کریڈل پر سے فون اٹھایا، فون بکس میں کچھ سکے ڈالے اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

اچانک اپنی پتلون کی جیب میں مجھے تھرتھراہٹ محسوس ہونے لگی۔ میرا سیل فون بج رہا تھا۔

اب مجھے یقین آ گیا۔

میں سمندری گھاس پر سے اٹھا اور ٹیلے پر سے تیز تیز قدموں سے نیچے اتر کر فون بوتھ کی جانب لپکا۔ اس دوران میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے ... ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

میں نے فون بوتھ میں قدم رکھتے ہی اس کرخت آواز بولے کو گولی مار دی۔

☆☆☆

واپس آرکیڈ جاتے ہوئے مجھے راستے میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا اور مجھے یقین تھا کہ میں بچ نکل گیا ہوں۔ اگر کرخت آواز والے نے کسی کو یہ بتایا بھی ہوگا کہ وہ کس معرکے پر جا رہا ہے تو وہ بھی کچھ نہیں کہیں گے۔ بھلا کیونکر کہہ سکتے تھے؟ اگر وہ کچھ کہتے تو وہ خود بھی اس جبراً وصولی کا حصہ قرار پاتے۔

اب میں خود کو ہلکا پھلکا، ہر قسم کی ٹینشن سے آزاد اور بے حد خوش محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ خوشی اس وقت تک قائم رہی جب تک میں اوشن بولیورڈ کے کارنر تک نہیں پہنچ گیا۔

جونہی کارنر سے گھوما مجھے آگے کیٹی کارنر پر سڑک پار پولیس کی کاریں دکھائی دیں جن کے فلیشر آن تھے اور وہ کاریں لینی لینڈ آرکیڈ کے سامنے ہر طرف کھڑی تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر میرے پیٹ میں اچانک مروڑ سا اٹھنے لگا۔ میں نے پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے سڑک پار کی اور اپنے آرکیڈ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں باہر فٹ پاتھ پر میرا نمبر ٹو، میرا اسسٹنٹ منیجر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ حقیقت میں ایک نہایت ہوشیار اور دانش مند شخص تھا۔ وہ برسوں سے میرے ساتھ تھا اور میرے باقی عملے سے جو زیادہ تر نوعمر لڑکوں پر مشتمل تھا، زیادہ عمر رسیدہ تھا۔

وہ اس وقت ایک پولیس مین سے بات کر رہا تھا۔ وہ پلٹا اور اس نے مجھے دیکھا تو میری جانب دوڑ پڑا۔

''جیسس، لینی۔'' وہ روہانسے لہجے میں گویا ہوا۔ بولتے ہوئے اس کا نرخرہ اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ ''ہم لٹ گئے۔''

میرے معدے میں ایک بار پھر مروڑا اٹھنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' میں بس یہی کہہ پایا۔

مجھے احساس تھا کہ وہ جواب میں کیا کہنے والا ہے۔

مجھے توقع تھی کہ میرا گمان غلط ثابت ہوگا۔

لیکن میں غلطی پر تھا۔

''میں جب آرکیڈ بند کر رہا تھا تو وہ اندر آ گیا۔ اس نے اپنی گن میری کھوپڑی سے لگا دی، لینی۔'' میں نے اس کا نرخرہ اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ''مجھے تجوری کھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔''

تجوری!

اس سے قبل میں نے اپنے دفتر کی تجوری کو کبھی بھی رقم رکھنے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ میں اس میں صرف کاغذات رکھا کرتا تھا۔ لہٰذا میرے اس ہوشیار اسسٹنٹ منیجر کو اس تجوری کا تالا کھولنے کا کمبی نیشن معلوم تھا۔

اب وہ دس ہزار ڈالر کی رقم جا چکی تھی۔

اور میں اس رقم کے غائب ہونے پر اس ہوشیار پر چیخ چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح یہ سوال سامنے آ جاتا کہ میں نے یہ رقم تجوری میں کیوں رکھی ہوئی تھی۔ سو میں نے اپنی زبان قابو میں رکھی اور یہ فیصلہ کیا کہ مجھے یہ برداشت کرنا ہوگا۔

تب اس ہوشیار نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ اس مرتبہ بھی اس کا نرخرہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ ''لینی! اس نے عقبی دروازے کے ساتھ ایک ٹرک بھی لگایا ہوا تھا۔''

اس کے مزید کچھ کہنے سے قبل میں سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنے والا ہے۔ یہی کہ اس کرخت آواز والے ناہنجار نے ہفتے بھر کی کمائی سے حاصل ہونے والے پچیس سینٹ کے سکوں سے بھرے تھیلے جو شمار کیے جانے کے لیے رکھے ہوئے تھے، میرے اسسٹنٹ منیجر کی مدد سے اپنے ٹرک میں لوڈ کروا لیے تھے۔

اور میں بالکل درست تھا۔

اس لیے کہ یہی بات اس ہوشیار نے ڈھیروں الفاظ میں بیان کردی۔ اس نے جو نہیں کہا اور جو اسے کہنا بھی نہیں تھا وہ یہ تھا کہ وہ صرف پچیس سینٹ مالیت کے سکے تھے۔ لیکن اگر ان سب کو جمع کر کے شمار کیا جاتا تو وہ دس ہزار ڈالر سے کہیں زیادہ مالیت کے سکے تھے۔

میرا سر چکرا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی وجہ وہ کچھ تھی جو مجھے ابھی بتایا گیا تھا یا پولیس کاروں کی وہ رنگین فلیش کرتی ہوئی روشنیاں تھیں جس نے ماحول کو غیر حقیقی بنا رکھا تھا۔ آپ سوچیں گے کہ میں ان روشنیوں کا عادی ہو چکا ہوں گا کیونکہ اپنے آرکیڈ میں ہر روز مجھے سیٹیوں، گھنٹیوں کی آوازیں سننے اور رنگ برنگی فلیش کرتی ہوئی روشنیاں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان کا عادی نہیں ہوا تھا۔

مجھے یہ بہت زور کی اور زبردست چپت پڑی تھی۔

لیکن ایک بڑی رقم سے ہاتھ دھونے کے علاوہ ایک بڑی بات اور بھی تھی۔ یقیناً کیونکہ یہ بات مجھے اب یاد آئی تھی۔

فون بوتھ۔

اپنے سیل فون کے بجتے ہی میں نے اس کرخت آواز والے کو گولی ماردی تھی۔ کیا میں نے ایسا نہیں کیا تھا؟

میرے اس ہوشیار اسسٹنٹ نے میرا ذہن پڑھ لیا۔ اس لیے کہ وہ فوراً بول پڑا۔ ''میں نے موقع ملتے ہی فوراً تمہارے سیل فون پر تم سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے فون اٹھایا ہی نہیں۔''

یہ تازہ کھی بات میرے لیے تھی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تھی تو وہ فون کال فون بوتھ میں موجود شخص نہیں کررہا تھا۔ وہ فون کال میرا ہوشیار اسسٹنٹ منیجر کررہا تھا۔

اور ساحل کے نزدیک فون بوتھ میں کرخت آواز والے کی نہیں بلکہ کسی اور کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ کوئی جسے میں نے شوٹ کیا تھا۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون تھا۔

میرا ہوشیار اسسٹنٹ منیجر میرے قریب آگیا اور سرگوشی کرنے لگا۔ اس کے سانسوں سے پپسروٹی کی بو آرہی تھی۔ ''اس شخص نے کہا تھا کہ میں تمہیں کچھ بتادوں لینی۔ اس نے کہا کہ تم اس کے پیچھے مت آنا۔ ان سنگین جرائم کی سزا ذہن میں رہے۔'' میرے ہوشیار اسسٹنٹ منیجر نے ایک سیکنڈ کے لیے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اور اس نے کہا کہ میں لینی کو یہ بھی بتادوں کہ وہ فون بوتھ کو بھی یاد رکھے۔''

میں ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ میں ایک تیز، چالاک اور ہوشیار آدمی ہوں۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میں ایک بھولا اور نادان شخص ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔ اس کرخت آواز والے نے جیسے مجھے کسی تحفے کی طرح خوشنما کاغذ اور ربن میں باندھ دیا ہو۔

دس ہزار ڈالر اور پچیس سینٹ مالیت کے سکوں پر مشتمل اس سے کہیں زیادہ کی رقم ہاتھ سے نکل جانے کا مجھے صدمہ تو ہورہا تھا لیکن میں یہ نقصان سہہ کر زندہ رہ سکتا تھا۔ آسانی کے ساتھ۔ البتہ وہ کرخت آواز والا جو کوئی بھی تھا اگر اسے یہ علم تھا کہ میں فون بوتھ میں کسی کو قتل کرچکا ہوں تو کیا میں اس کے ساتھ نباہ کر کے زندگی گزار سکتا تھا، اس بات کا مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ میں اس حقیقت کا پتا کرلوں گا اور شاید مجھے اس کے لیے سخت راستہ اختیار کرنا پڑے۔

میں پہلے ہی اس بات کا تصور کرسکتا تھا کہ وہ مجھ سے میرا ایک ایک سینٹ اینٹھے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ حتیٰ کہ میرا آرکیڈ بھی ہتھیالے گا۔ شاید اس وقت تک جب تک میرے پاس کچھ بھی باقی نہ بچے اور میں اپنے منہ میں گن رکھ کر اپنی زندگی اور اپنا کاروبار سب کچھ ختم کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ ہاں مجھے یہی کرنا پڑ جائے گا۔

میں سر جھکائے حواس باختہ وہیں کھڑا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک اسی طرح کھڑا رہا۔ یقیناً میری کیفیت دیر تک رہی ہوگی کیونکہ جب میں نے دوبارہ سر اٹھایا تو میری نظر اپنے ہوشیار اسسٹنٹ منیجر پر پڑی۔ وہ آرکیڈ کے سامنے نزدیک ہی کھڑا تھا۔

اس کے عقب میں عمارت کے سامنے کے حصے پر بنا ہوا بھڑکیلا پرپل رنگ کا نمائشی لوگو... لینی لینڈ آرکیڈ خوب جگمگا رہا تھا۔

اور وہ اپنے سیل فون پر کسی سے باتیں کررہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے اس کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی ہو۔

میں اس کی پُراسرار مسکراہٹ کا سبب جان گیا لیکن میں کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ اب صبر کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 11

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

بات ہی ایسی تھی جس نے کھیل دادا کو نامعلوم سے اچنبھے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نوجوان کا اعتماد اور بولنے کے انداز سے اسے ایک عجیب سے غرور کا احساس ہوا تھا اس لیے وہ اس سے کوئی اور سوال کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔

ایک آدمی کے ذریعے جب اس نے اندر بیگم صاحبہ کو اس کی اطلاع پہنچائی تو زہرہ بانو نے فوراً لئیق شاہ کو بلوالیا۔

کھیل دادا خود لئیق شاہ کو لے کر اندر پہنچا تو اس کی تیز نظروں نے بیگم صاحبہ کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے بہت کچھ سمجھ لیا۔ لئیق شاہ کو دیکھتے ہی زہرہ بانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس وقت کھیل دادا کے دل میں ایک گھونسا لگا جب بیگم صاحبہ نے کھیل دادا کو وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے لوٹ گیا۔

زہرہ بانو نے مسکراتی نگاہوں اور دلآویز مسکراہٹ سے لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہو لئیق شاہ؟ پہلی بار یہاں آئے ہو، تمہیں یہاں کا پتا ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟''

وہ جواباً ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''نہیں بیگم صاحبہ! دقت کیسی؟ بھلا یہاں کا پتا کسے معلوم نہیں۔ آپ کی طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا جی؟'' اس نے آخر میں زہرہ بانو کے زخمی کندھے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں، اب تو کافی بہتر ہوں۔ تم بتاؤ... کیسے آنا ہوا؟ کیا صورتِ حال ہے پنڈ کی؟''

''بیگم صاحبہ! خبر اچھی نہیں ہے۔'' لئیق شاہ بولا۔ ''وہ سارے غنڈے چھوٹ گئے ہیں اور چھیما بھی اکڑتا پھر رہا ہے۔''

زہرہ بیگم کے لیے یہ اطلاع ناقابلِ یقین اور چونکا دینے والی تھی۔ غصے سے اس کا خوب صورت چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اور جی... بیگم صاحبہ! چھیما نے تو اپنے منیجر صاحب کو بھی باقاعدہ گھر جا کے دھمکی بھی دے ڈالی ہے۔ شیراز چیمہ صاحب ڈر کے مارے جا چکے ہیں۔ انہوں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔'' لئیق شاہ آگے بتانے لگا۔ ''یہی نہیں، اس کے غنڈے دوسرے مزدوروں اور ورکروں کے بھی گھر گھر جا کے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں کہ سالونٹ پلانٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ ان کی دھمکیوں کے خوف سے اور اپنے گھر بار بچوں کی جانیں بچانے کے لیے کافی سے زیادہ مزدوروں اور ورکروں نے کام چھوڑ دیا ہے۔ بیگم صاحبہ! ام... مجھے افسوس سے یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ سب سے زیادہ منافع دینے والے اس سالونٹ پلانٹ کا کام بالکل ٹھپ ہو کے رہ گیا ہے۔'' وہ بتاتا جا رہا تھا اور زہرہ بانو کو اپنا دل گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لئیق شاہ کی نظریں زہرہ بانو کے تکلیف دہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کو اس قدر پریشان دیکھ کر ایک لمحے کو وہ خود بھی متفکر ہو گیا پھر ازراہِ تشفی بولا۔

''بیگم صاحبہ! آ... آپ... بالکل فکر مت کریں، ہم سب مل کر انشاء اللہ ان سب مسائل پر قابو پالیں گے، بس آپ ذرا حوصلہ رکھیں۔'' زہرہ بانو نے ایک نگاہ لئیق شاہ کے چہرے پر ڈالی پھر گہری سانس لے کر گومگو سے لہجے میں بولی۔

''لئیق شاہ! میں نے حوصلہ ہارنا سیکھا ہی نہیں ہے لیکن بعض خاندانی وجوہ کی بنا پر میں ہمیشہ سے ایسے کسی انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کرتی آئی ہوں جس سے حویلی والوں، بالخصوص بابا جانی کی عزت پر حرف آئے۔ اب تم سے کیا چھپانا... لئیق شاہ۔'' وہ تھوڑے توقف سے بولی۔ ''امی جان، بابا جان کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت رکھتی ہیں۔ ممتاز خان کی چیرہ دستیوں کا میں بھی منہ توڑ جواب دے سکتی ہوں مگر اب شاید پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ ممتاز خان اگر اپنے ساتھ چند بدمعاشوں کو اکٹھا کر کے میرے ساتھ غنڈا گردی کر رہا ہے تو پھر میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو کا دلکش حسین چہرہ اس کے اندرونی غبار اور غصے کا غماز نظر آنے لگا۔ اس کی کشادہ کالی آنکھوں سے عجیب طرح کا جوش چھلکنے لگا۔ لئیق شاہ جو بیگم صاحبہ سے نظریں جھکا کر بات کرنے کا عادی تھا مگر اب وہ یک ٹک اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔ ادھر زہرہ بانو بھی جب اپنی گومگو والی کیفیت سے نکلی اور بے اختیار اس کی نگاہیں لئیق شاہ کی اپنی جانب یک ٹک تکتی نظروں سے ملیں تو جیسے دو طرفہ نظروں کی کمندیں پھنس گئیں۔ کھلی آنکھوں کے اس میل تال میں گہرے پن کا شائبہ بھی تھا اور کسی بے نام و خفتہ جذبات کا نامعلوم سا عمیق پن بھی... چند ثانیے اس طرح گزرے تو معاً لئیق شاہ نے اپنی نظریں نیچے کر لیں اور ہولے سے بولا۔ ''آپ کی بات بھی ٹھیک ہی ہے بیگم صاحبہ مگر آپ کو اپنے دفاع میں بھی قدم اٹھانے کا پورا حق ہونا چاہیے۔'' زہرہ بانو نے دھیمی دھیمی آنچ جیسی نگاہوں اور ہلکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان تھے، زہرہ

بانو تو بڑے کروفر کے انداز میں صوفے کی پشت سے کمر ٹکائے بیٹھی تھی جبکہ اس کے سامنے والے صوفے پر لئیق شاہ اپنے لمبے چوڑے وجود کے باوجود قدرے سکڑ سمٹ کر ''ٹکنے'' کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

''ہوں ...'' اس کی بات پر زہرہ بانو نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کی پھر جیسے موضوع بدلنے کی غرض سے لئیق شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''تمہارے لیے کیا منگواؤں...؟ کھانا کھاؤ گے، پتا نہیں تم نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟''

''نن... نہیں... جی کھانے پینے کی کوئی فکر نہ کریں میں سب کچھ کھا پی کر ہی پنڈ سے چلا تھا۔ اب واپس چلوں گا۔ بس آپ کی ہدایت کا منتظر تھا۔'' لئیق شاہ نے جلدی سے کہا اور ٹکے بیٹھے یوں کسمسایا جیسے رخصت ہونا چاہتا ہو۔

''نہیں، بیٹھو ابھی۔'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دھیمی سی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم پہلی بار یہاں... بیگم ولا آئے ہو، کچھ نہ کچھ تو تمہیں کھانا پینا پڑے گا ہی۔'' یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے کسی کو آواز دی۔ ایک گھریلو ملازم فوراً باادب نمودار ہوا۔ زہرہ بانو نے اسے چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے بلاوجہ چائے کی زحمت کر ڈالی... اس کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔'' لئیق شاہ نے کہا۔

''تم مجھے بیگم صاحبہ مت کہا کرو لئیق شاہ۔'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔

اس کی بات پر لئیق شاہ تھوڑا سا گڑبڑا گیا بولا۔ ''وہ جی... دراصل سب ہی آپ کو اسی طرح مخاطب کرتے ہیں تو...''

''مگر تم مجھے آج سے صرف زہرہ بانو کہو گے۔'' زہرہ بانو نے اس کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ لئیق شاہ ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اچھی طرح آرام سے بیٹھو لئیق شاہ۔ تم میرے ملازموں میں سے نہیں ہو، میرے دوست اور میرے ساتھی ہو، میرے مشکل وقت کے ساتھی۔''

''آ... آپ کی ذرہ نوازی ہے... بیگم... مم... میرا مطلب ہے زہ... رہ صاحبہ! الل... لیکن...''

''ہاں... تمہارا اس طرح مجھے پکارنا اچھا لگا۔ اب ایسے ہی رہنا، بھولنا مت۔'' زہرہ بانو مسکرائی تو بے اختیار لئیق شاہ کے خوبرو چہرے پر بھی تھکتی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ بھی ہنس پڑا۔ اس وقت زہرہ بانو کو وہ بہت خوب صورت لگا۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ ''تم اس طرح ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہو مجھے۔''

جس طرح دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اسی طرح بے اختیار جذبوں کو بھی راہ ملتی ہے۔ لئیق شاہ نے بھی جیسے گویا مچلتے دل سے کہہ ڈالا۔ ''آپ بھی بہت اچھی ہیں... زہرہ صاحبہ۔''

اس دوران میں ایک ملازمہ چائے وغیرہ کے لوازمات سے لدی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور جب واپس لوٹنے لگی تو زہرہ بانو نے اس سے کبیل دادا کو اندر بھیجنے کا کہا۔

ذرا دیر میں کبیل دادا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ سوچا سوچا سا تھا پھر جب اس نے اندر زہرہ بانو اور لئیق شاہ کو مسکراتے اور چائے وغیرہ پیتے دیکھا تو اس کا منہ مزید سوج گیا۔ تاہم اندر آ کے ایک طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑے کے ہولے سے بولا۔

''جی بیگم صاحبہ؟''

زہرہ بانو نے ایک نگاہ پاس کھڑے کبیل دادا پر ڈالی پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے سامنے والے صوفے پر لئیق شاہ کے قریب بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے وہاں جا بیٹھا۔

''چائے پیو۔'' زہرہ بانو نے اس سے کہا۔ کبیل دادا کا جی تو نہیں کیا مگر وہ بیگم صاحبہ کی ہر بات کو ایک حکم کا درجہ دیتا تھا اس لیے اس نے نفیس سے فلاسک سے ایک کپ میں چائے انڈیلی اور ذرا سیدھا ہو کے بیٹھا تو زہرہ بانو اس کے بشرے پر نظریں جمائے جمائے بولی۔

''یہ لئیق شاہ ہے۔ ہمارے ہی پنڈ کا... جانتے ہو تم اسے؟''

''اچھا جی... بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر... ویسے میں نے کبھی دیکھا نہیں، آج پہلی بار مل رہا ہوں۔'' کبیل دادا نے گویا طوعاً و کرہاً جواب دیا۔

''اور لئیق شاہ! یہ کبیل خان ہے میرا خاص آدمی... ہمارے منشی فضل محمد کا بیٹا۔'' زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کبیل دادا کا بھی اس سے تعارف کروایا... تو لئیق شاہ بڑی خوش دلی سے کبیل دادا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا۔

''بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر دوست...'' یہ کام بھی کبیل دادا کو چار و ناچار کرنا پڑا۔ یعنی لئیق شاہ سے ہاتھ ملانا۔

"ویسے نام تو اس کا کبیل خان ہے مگر یہ خود کو کبیل دادا کہلوانا زیادہ پسند کرتا ہے۔" زہرہ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ تمہاری طرح یہ بھی بہت دلیر اور بہادر آدمی ہے۔"

کبیل دادا کو زہرہ بانو کا لئیق شاہ سے اس کی بہادری اور دلیری کو تشبیہ دینا اچھا نہ لگا۔ تاہم وہ چپ رہا۔

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی فراہم کردہ تازہ ترین معلومات سے کبیل دادا کو بھی آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر وہ بھی متفکر نظر آنے لگا اور تیزی سے بولا۔ "بیگم صاحبہ! پھر تو آپ کی جان کو ممتاز خان اور چھیما سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ آپ کا اب تنہا نئے پنڈ کے معاملات سنبھالنا مناسب نہ ہو گا۔ میرا آپ کے ساتھ ہونا اشد ضروری ہو گیا ہے اب..."

"ہم نئے پنڈ میں اب تنہا نہیں ہیں دادا۔" زہرہ بانو نے ایک نگاہ اس کے ساتھ بیٹھے لئیق شاہ کی طرف گہرے انداز سے ڈالتے ہوئے کہا۔

کبیل دادا، زہرہ بانو کے منہ سے لئیق شاہ کی تعریف سن کر سہہ نہ سکا۔ بالآخر جوشِ رقابت میں قریب بیٹھے لئیق شاہ پر نظر ڈالتے ہوئے زہرہ بانو سے بول پڑا۔

"بیگم صاحبہ! لگتا ہے لئیق شاہ آپ کا کوئی نیا آدمی ہے اور آپ اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں، آپ کو نئے آدمی رکھنے کے سلسلے میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ ممتاز خان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ پیسوں کے زور پر ہر کام کرنا جانتا ہے۔ مخبر نما دوست بھی دشمنوں میں چھوڑ دیتا ہے جو وقت پڑنے پر..."

"کبیل دادا! یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" دفعتاً ہی زہرہ بانو... تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "کیا تم لئیق شاہ کی وفاداری پر شبہ کر رہے ہو؟" زہرہ بانو کے اس طرح یک دم برہم ہو جانے پر کبیل دادا خود بھی گھبرا سا گیا لیکن لئیق شاہ کے چہرے پر بھی ہلکی سی تلخی نمودار ہوئی تھی۔

"جس طرح میں تم لوگوں پر اعتماد کرتی ہوں اسی طرح مجھے لئیق شاہ کی وفاداری پر بھی پورا یقین ہے۔ تم ذرا سوچ سمجھ کر کوئی بات اپنے منہ سے نکالا کرو۔ لئیق شاہ کو میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔" زہرہ بانو کا غصہ ابھی تک کم نہ ہوا تھا۔ کبیل دادا کے لئیق شاہ کے بارے میں منفی الفاظ نے اسے یک دم بپھرا دیا تھا جس پر کبیل دادا نادم ہو کے اپنی بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا، اسے زہرہ بانو سے معافی مانگنا پڑی لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ "بیگم صاحبہ" کے چہرے پر ناراضگی کے آثار پھر بھی ماند نہیں پڑے تو اسے مجبوراً لئیق شاہ کو مخاطب کر کے کہنا پڑا۔

"مجھے معاف کر دینا شاہ صاحب! میری بات سے آپ کا دل دکھا ہوگا۔" اس کے معذرت خواہانہ انداز پر لئیق شاہ یک دم خوش دلی سے مسکرایا اور..... دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں دادا! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم بیگم صاحبہ کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط رکھتے ہو، مجھے تو تمہاری یہ محتاط پسندی اچھی لگی ہے اور ویسے بھی تم نے ایسی کوئی غلط بات بھی نہیں کی۔ زہرہ صاحبہ واقعی اس وقت دوسروں سے زیادہ اپنوں سے زخم کھائے ہوئے ہیں۔"

"اب ایسی بات بھی نہیں جو بات غلط ہے... وہ غلط ہے، تم بلاوجہ کسرنفسی سے کام مت لو لئیق شاہ۔"

زہرہ بانو نے اس بار لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تاہم کبیل دادا کو لئیق شاہ کا بیگم صاحبہ کو "زہرہ صاحبہ" کہہ کر بھی مخاطب کرنا عجیب ہی لگا۔ بہرطور اس نے اب زہرہ بانو کے چہرے سے واضح طور پر برہمی کے آثار لئیق شاہ سے معافی مانگنے کے بعد کچھ کم پڑتے ضرور محسوس کیے تھے۔ زہرہ بانو نے بھی شاید ماحول کی اس کدورت کو دھونے کی غرض سے موضوع بدلا اور پھر لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

"لئیق شاہ! ہمارا منیجر شیراز تو ڈر کے مارے نوکری چھوڑ گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر ہم تمہیں اس کی جگہ اپنے سالونٹ پلانٹ کا منیجر رکھ لیں تو؟" اس کی بات پر لئیق شاہ کو حیرت کا جھٹکا لگا ہی تھا مگر کبیل دادا بھی چونکے بنا نہ رہ سکا۔ تاہم اس نے اب اپنا منہ بند ہی رکھا۔ شاید اسے اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اب لئیق شاہ "بیگم صاحبہ" کے لیے کوئی خاص "حیثیت" رکھتا ہے۔ تاہم ابھی وہ پوری طرح اپنے اس خیال پر صاد نہیں کر پایا تھا۔

"زہرہ صاحبہ! آپ کی کرم نوازی ہے لیکن میں خود کو شاید اتنی بڑی ذمے داری کے قابل نہیں سمجھتا۔" بالآخر لئیق شاہ کو کہنا پڑا۔ "میرا خیال ہے میں آپ کی مل کا مزدور ہی ٹھیک ہوں۔"

"کیوں؟ کیا تمہارے اندر سالونٹ پلانٹ کا نظم و نسق چلانے کی صلاحیت نہیں؟ تم ایک سمجھ دار، سلجھے ہوئے اور دیانت دار آدمی ہو اور بہادر بھی..." زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زہرہ صاحبہ! بات صرف ذمے داری اور بہادری کی... نہیں ہے۔" لئیق شاہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں

کہا۔ ''اس کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونا اور شہری سوجھ بوجھ بھی ہوتی ہے اور میں اس سلسلے میں بالکل نااہل ہوں۔''

زہرہ بانو بہ غور اس نیک اور شریف نوجوان کا چہرہ تکتی رہی اور سوچنے لگی۔

کس قدر سادہ آدمی ہے اور مخلص بھی... ورنہ دیکھا جاتا تو اتنی بڑی آفر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کبیل دادا کے اندر کی بے چینی پھر سوا ہونے لگی۔ بیگم صاحبہ کے اس بظاہر عام سے دیہاتی نوجوان پر اس قدر التفات و عنایات کی بارش برستے دیکھ کر وہ ایک بار پھر بولنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس بار اس کا لہجہ لئیق شاہ کی طرف سے محتاط تھا۔

''میرا خیال ہے بیگم صاحبہ! ابھی فی الحال آپ ہی اس پلانٹ کے بنیادی معاملات سنبھالیں... دیگر معاملات کے لیے لئیق شاہ تو ہے پھر ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ بعض اہم نوعیت کے معاملات اور ڈیلنگ وغیرہ آپ ہی کے توسط سے زیادہ بہتر رہے گی۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

لئیق شاہ نے بھی فوراً کھلے دل کے ساتھ کبیل دادا کی بات کی تائید کی۔ یہی نہیں خود زہرہ بانو کو بھی کبیل دادا کا یہ مشورہ اچھا لگا اور وہ کبیل دادا کی سمجھ داری کی قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور توصیفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

''تمہاری بات قابلِ غور ہی نہیں، مناسب بھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اور لئیق شاہ کے سلسلے میں میرا انتخاب خود میرے لیے قابلِ فخر ہے، ویلڈن گائز۔''

زہرہ بانو کے دلنشین مسکراتے لبوں سے اپنی تعریف پر کبیل دادا کے اندر ایک مسرت سی چھکی مگر اسے اپنی یہ مسرت جانے کیوں گہن زدہ سی محسوس ہوئی، شاید اس لیے کہ اس تعریف کا ایک ''حصے دار'' لئیق شاہ بھی تھا۔

کمرے میں چند ثانیے کے لیے خاموشی طاری رہی، اس کے بعد لئیق شاہ نے ہی رخصت ہونے کی غرض سے زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اب آپ کا آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے؟''

''تمہیں واپس نئے پنڈ لوٹنے کی جلدی تو نہیں ہے؟'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر الٹا سوال داغ دیا۔ وہ جواباً بولا۔

''کچھ خاص جلدی تو نہیں، بس ذرا کام کی فکر ہو رہی ہے اور پھر نئے پنڈ کے حالات...''

''بس تم ٹھہرو میں کچھ تیاری باندھ لوں۔ مجھے بھی ابھی حویلی لوٹنا ہے۔'' زہرہ بولی اور لئیق شاہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پھر کبیل دادا جانے کیوں زہرہ بانو کے بیگم ولا سے نئے پنڈ جانے پر بے چین سا نظر آنے لگا، بولا۔

''بیگم صاحبہ! میرے لیے کیا حکم ہے؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی...''

''نہیں۔'' زہرہ بانو نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ''تم اِدھر ہی رہو گے، اور یہاں کے معاملات و معمولات پر کڑی نگاہ رکھو گے، میں کسی غیر متعلقہ شخص کو خواہ وہ عورت ہی کیوں نا ہو... یہاں برداشت نہیں کروں گی، بلکہ کبیل! تم ایک کام کر کے رکھو گے۔''

''جی بیگم صاحبہ! حکم کریں۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

''تم یہاں اب شہر کی بود و باش اختیار کر چکے ہو، یہاں کے طور طریقے سے آگاہ ہو چکے ہو۔ یقیناً تمہارا اور لوگوں میں بھی اٹھنا بیٹھنا ہوگا۔ تم یہاں کے کسی بڑے اخبار میں نوکری کے لیے اشتہار جاری کر دو... منیجر کے لیے... باقی سب تمہیں پتا ہے جتنے امیدوار آئیں، تم ان میں سے اپنی فہم و ذہنی فراست اور سوجھ بوجھ کے مطابق انٹرویو کے لیے چند لوگوں کو چن کے باقی سب کو فارغ کر دو... پھر مجھ سے فون پر رابطہ کر لینا۔ حویلی اور سالونٹ پلانٹ کے کسی بھی فون نمبر پر... میں ان امیدواروں کے انٹرویوز وغیرہ کے لیے خود آ جاؤں گی۔''

''جی بہتر بیگم صاحبہ، میں کل ہی یہ کام شروع کر دوں گا۔''

''گڈ۔''

اس کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد زہرہ بانو اپنے ایک مسلح باڈی گارڈ اور لئیق شاہ کے ہمراہ بیگم ولا سے نئے پنڈ کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جانے کیا بات تھی، زہرہ بانو اگر صرف چند دنوں کے لیے بھی نئے پنڈ سے شہر (بیگم ولا) میں گزارتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ ایک طویل عرصہ حویلی سے دور رہی ہو۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ اس نے اپنے بچپن سے جوانی تک کا ایک طویل عرصہ یہاں (نئے پنڈ میں) گزارا تھا یا پھر شاید اس لیے بھی کہ وہ بیگم ولا سے زیادہ نئے پنڈ کے معاملات میں الجھی ہوئی تھی۔ ماں کی فکر کے ساتھ اسے باپ کی بھی فکر رہتی تھی۔ اپنے مزدوروں کی، ورکروں کی، اور یہاں اپنے حصے

کی جائداد کے انتظام و انصرام کی بھی...
نئے پنڈ کی حدود میں داخل ہونے تک وہ اندر ہی اندر انہی سوچوں میں کھوئی رہی۔ حالانکہ لئیق شاہ اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی تو گویا ایک اور پہاڑ جیسا امتحان ایستادہ دیکھتی... ایک اور کڑی آزمائش کی دھوپ میں اپنے وجود کو تپتا ہوا محسوس کرنے لگتی۔
اس نے سب سے پہلے لئیق شاہ کو اس کے گھر پر چھوڑا اور حویلی کا رخ کیا۔ باپ کے کمرے میں گئی۔ ان کی حالت میں ابھی کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ بس وہ ویسے ہی تھے جیسے ایک طویل اور یکساں بیماری کی حالت میں ایک مریض ہوتا ہے۔ نہ زندہ... نہ مردہ... بس آتی جاتی بے حس سانسوں کی بازگشت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور اپنے پیاروں کے لیے اپنے "یہاں ہونے" کا مستعار سہی... خوش کن احساس دلاتا رہتا ہے۔
باپ کی قدم بوسی کے بعد وہ ماں سے ملی۔ حویلی کے پرانے اور قدامت پسندانہ دستور کے مطابق وہ اپنی سوتیلی ماں مہر النسا کے کمرے میں بھی گئی جہاں اس کا ٹیڑھی نگاہ سے استقبال ہوا۔
وہ دوبارہ اپنی ماں کے پاس آگئی۔ دن ڈھلنے لگا تھا اور افق کے پار سورج غروب ہونے لگا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر ستارہ بیگم کی تھکی تھکی آنکھوں میں زندگی کی رمق دوڑ گئی۔ "زہرہ بیٹی! اس بار تم نے بہت دن لگا دیے شہر میں۔" ماں کی آنکھوں اور لہجے سے جھلکتی فکر مندی دیکھ کر زہرہ بولی۔
"امی جان! آپ اتنی فکر نہ کیا کریں، میں آپ کی بیٹی ہوں مگر بیٹا بن کر دکھاؤں گی آپ کو۔ شہر میں میرا آتے جاتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔"
پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ "بابا جانی کیسے ہیں اب؟ آپ کو کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہوتی؟"
"اللہ انہیں صحت و شفا دے۔ میں تو ان کے لیے دعا ہی کرتی رہتی ہوں۔" ستارہ بیگم نے جواب دیا۔
زہرہ نے اگلے دن صبح سویرے لئیق شاہ کو حویلی آنے کی تاکید کی تھی۔ وہ آچکا تھا اور زہرہ بانو کی خاص ہدایت کے مطابق اسے حویلی کی بیٹھک کے بجائے مہمان گاہ میں بٹھایا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زہرہ بانو، لئیق شاہ اور ایک گارڈ کے ساتھ متعلقہ تھانے پہنچی... اس وقت اس کا خوب صورت چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اس بات پر سخت طیش تھا کہ پولیس نے اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والے وسیم عرف چھیما کو اس کے ساتھیوں سمیت چھوڑ دیا تھا جبکہ کم

از کم زہرہ بانو کو انسپکٹر جہانزیب جیسے ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر سے ایسی ناانصافی کی توقع نہ تھی، آج وہ اس سے گویا دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی مگر تھانے پہنچ کر اس پر ایک اور کریہہ انگیز حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ انسپکٹر جہانزیب کا تبادلہ ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ نیا تھانے دار انسپکٹر جرار خان تعینات کیا جا چکا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا۔ زہرہ بانو بپھری ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود ایک موٹے سے اردلی نے زہرہ کو اندر جانے سے روک دیا۔ لئیق شاہ بھی زہرہ کے ساتھ تھا۔
"صاحب اندر ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔"
وہ بولا۔ زہرہ بانو نے پُرطیش نگاہوں سے اردلی کو گھورا اور اسی لہجے میں بولی۔
"میرا اس وقت ان سے ملنا ضروری ہے راستہ چھوڑ میرا۔ تمہارے صاحب کی میٹنگ سے زیادہ ضروری میرا ان سے ملنا ہے۔"
صورتِ حال دیکھ کر دو وردی پوش کانسٹیبل... جو زہرہ بانو کو دیکھتے ہی ارے قریب ہی چھٹکنے لگے تھے فوراً اس جانب لپکے۔ اس کے قریب آکر ایک نے اکھڑ اور سرد لہجے میں زہرہ سے کہا۔ "او بی بی! یہ کوئی دکان یا مچھلی مارکیٹ نہیں ہے جو آپ اس طرح دندناتی ہوئی اندر اپنی مرضی سے جا گھسیں گی... یہ تھانہ ہے تھانہ... بتایا تو ہے آپ کو... اندر صاحب ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔" زہرہ بانو کو اس پولیس والے کی بدتمیزی پر غصہ آیا۔ لئیق شاہ تو جیسے ہتھے سے اکھڑنے لگا۔ زہرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے اس پولیس والے کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔
"بیگم صاحبہ سے تمیز سے بات کرو۔ جانتے نہیں تم یہ کس کی بیٹی ہیں؟"
"اوئے... ہمیں تمیز سکھائے گا تو..." دوسرے پولیس والے نے لئیق شاہ کو گھورا۔ "تمیز تو ہم تجھے سکھا دیں گے، اندر کر کے... آواز نیچی رکھ اپنی سمجھے..."
"یو شٹ اپ۔" زہرہ غصے سے اس پولیس والے کو گھور کے بارعب لہجے میں بولی۔ "تم لوگ یہاں وردی کے نام پر بدمعاشی کرتے ہو یا عوام کی خدمت... اندر اطلاع کرو کہ جاگیردار چودھری الف خان کی بیٹی آئی ہے۔"
اس کی بات پر دونوں پولیس والوں کے بشروں پر خلافِ توقع استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھری پھر ایک نے تضحیک آمیز

لہجے میں کہا۔

''پچ... پچ... بے چارے چودھری صاحب کو اللہ شفا دے۔ وہ تو بستر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کے بیٹے... چودھری ممتاز خان کی بات کریں بی بی...''

اس کی بات پر زہرہ بانو کو ایک چونکا دینے والا جھٹکا لگا۔ ذہین اور پڑھی لکھی تھی، فوراً بھانپ گئی کہ یہاں کیا صورتِ حال پروان چڑھ چکی ہے، مصلحت اندیشی کے تحت وہ کچھ لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں فالتو بحث میں نہیں پڑھنا چاہتی، مجھے یہ بتاؤ، کب تک تمہارے صاحب میٹنگ سے فارغ ہوں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' پہلے والے کانسٹیبل نے بے اعتنائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر... جب تک میٹنگ ختم ہو ہم اِدھر ہی انتظار کریں گے۔''

''آپ باہر احاطے میں بچھی بینچوں پر بیٹھ جائیں جا کر، یہاں کسی غیر متعلقہ لوگوں کو کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی اجازت نہیں۔''

زہرہ بانو نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ لئیق شاہ نے برہم ہو کر کچھ بولنے کی کوشش چاہی مگر زہرہ بانو نے اسے روک دیا اور دونوں پولیس والوں کی طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔ ''میں سب سمجھ رہی ہوں کہ یہاں میرے آنے سے پہلے کیا کھچڑی پکائی جا چکی ہے مگر یاد رکھنا میں بھی بہت اوپر تک جا سکتی ہوں... آؤ... لئیق شاہ...'' کہتے ہوئے زہرہ بانو غصے سے پاؤں پٹخ کر واپس پلٹی تو اسے اپنے عقب میں ایک پولیس والے کی بے ہودہ انداز میں ''کھی کھی کھی'' اور بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''اوپر نہیں... بی بی! سیدھا اوپر... آسمان کی طرف...''

لئیق شاہ سے بیگم زہرہ بانو کی تھانے میں ہوئی یہ تذلیل برداشت نہ ہو سکی۔ وہ یوں بھی مزاجاً تیز طبع اور جوشیلا نوجوان تھا، زہرہ بانو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ یک دم رک کر پلٹا اور ''کھیس'' نکال کر بڑبڑانے والے اس بدتمیز پولیس والے کے قریب جا کر غیظ بھرے جوش سے بولا۔

''کسی کے ٹکڑوں کی خیرات پر اپنی اوقات سے زیادہ اونچا مت بولو... تم زہرہ بی بی کو نہیں جانتے... نئے پنڈ کے حوالے سے ان کا تعارف بہت چھوٹا ہے۔ وہ اپنی حیثیت میں کیا ہیں اس کا تم سب کو جلد پتا چل جائے گا۔''

زہرہ بانو مڑ کر حیرت بھری نگاہوں سے لئیق شاہ کو ان دونوں پولیس والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سب کہتے ہوئے سن رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ دونوں پولیس والے لئیق شاہ کے ساتھ کوئی جوابی حرکت کرتے اچانک کمرے کی چق ہٹی اور ایک لمبا تڑنگا اور بھاری جسامت کا آدمی پولیس انسپکٹر کی وردی میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر گھنڈی ہوئی کرختگی اس کی غصہ ور طبیعت کا پتا دیتی تھی جبکہ بڑی بڑی آنکھوں کے ڈیلے کسی بھینسے کی آنکھوں کی طرح ابھرے، اور ابلے پڑتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے ہمراہ دو عام سے حلیے اور شکل وصورت کے آدمی بھی تھے، تاہم صاحب ثروت نظر آتے تھے۔ زہرہ بانو تو نہیں البتہ لئیق شاہ ان دونوں کو دیکھ کر چونکا ضرور تھا۔ اس کا شائبہ زہرہ بانو نے بھی لئیق شاہ کے چہرے سے محسوس تو کر لیا تھا لیکن انسپکٹر کو اندر سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ اس جانب خاص توجہ نہ دے سکی۔

انسپکٹر کی نظر بھی زہرہ بانو پر پڑی تھی، صرف ایک لمحے کے لیے... اس کے بعد وہ اپنے دونوں ملاقاتیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جنہیں وہ شاید خود بہ نفسِ نفیس باہر تک رخصت کرنے آیا تھا۔ اس دوران میں زہرہ بانو کی ایک بار پھر غیر ارادی طور پر لئیق شاہ کے چہرے پر دوبارہ نگاہ پڑی جو مسلسل ان دونوں ملاقاتیوں کو تکے جا رہا تھا۔

''بس... بس جی... انسپکٹر جرار صاحب! اب ہمیں اور شرمندہ نہ کریں، ہم اب چلتے ہیں... آپ بیٹھیں۔'' دونوں ملاقاتیوں میں سے ایک نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا تو انسپکٹر جرار بھی جواباً اپنے لمبوترے اور موٹی آنکھوں والے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کھردری آواز میں بولا۔

''او جی بشیر صاحب! آپ نے تو خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ مانی ٹکر کھاتے... کوئی لسی پانی... صرف سوکھی چائے پی ہے آپ نے۔''

''پھر کبھی سہی... بس ہمارا کام ہو جائے، سمجھو ہم نے آپ کی شاندار دعوت اُڑا لی۔'' دوسرے ملاقاتی نے انسپکٹر سے کہا اور پھر رخصت ہو کے آگے بڑھ گئے جبکہ اس کے مخصوص اشارے پر دونوں پولیس اہلکار جو غالباً اپنے ''صاحب'' کو دیکھتے ہی یک دم ''اٹین شن'' ہو گئے تھے، اشارہ سمجھ کر فوراً مؤدبانہ انداز میں ملاقاتیوں کے رہنما بنے ان کے پیچھے ہو لیے۔ لئیق شاہ کی ہنوز سوچتی نظریں جاتے ہوئے دونوں ملاقاتیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' ملاقاتیوں کے رخصت ہوتے

ہی انسپکٹر جرار خان نے ایک اچٹتی ہوئی نظر زہرہ اور لئیق شاہ کے بشروں پر ڈالی اور قریب کھڑے اپنے اردلی سے بارعب لہجے میں استفسار کیا۔

''سر جی! ان دونوں نے تو یہاں کافی دیر سے شور مچا رکھا ہے، آپ سے ملنے کے لیے۔'' اردلی نے.... سخت شکایتی لہجے میں جواب دیا۔ وہ جیسے زہرہ بانو اور لئیق شاہ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں ہیں کون یہ دونوں؟'' اس نے غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا تو زہرہ بانو خود چند قدم اس کی جانب بڑھ کر اپنا تعارف کرواتے ہوئے پُروقار لہجے میں بولی۔

''میں چودھری الف خان کی بیٹی... زہرہ بانو ہوں۔ اگر آپ کی میٹنگ ختم ہوگئی ہے تو مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

انسپکٹر جرار خان کے چہرے پر چونکنے کے آثار صرف چند ثانیے کے لیے ابھرے تھے، اس کی موٹی موٹی بدہیئت آنکھیں زہرہ بانو کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں پھر دوسرے ہی لمحے اس کے لبوترے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، اس مسکراہٹ کی تہ میں حقارت بھی چھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اسی لہجے میں کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''او... زہرہ بانو... چودھری الف خان کی بیٹی... کیا واقعی... تم چودھری الف خان کی بیٹی ہو؟'' اتنا کہہ کر وہ ذرا متوقف ہوا پھر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''خیر، مجھے تمہارے ذاتی اور خاندانی معاملے سے کوئی سروکار نہیں مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اندر آجاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹا۔ زہرہ بانو کا اس کی ہرزہ سرائی پر چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی مگر بہت کچھ سمجھ بھی رہی تھی، انسپکٹر جرار اندر جا چکا تھا۔ اس کے پیچھے زہرہ بانو اور لئیق شاہ بھی آگئے۔ انسپکٹر جرار اپنی بڑی سی میز کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا اور زہرہ بانو کو بیٹھنے کے لیے محض اپنے ہاتھ کا اشارہ سامنے والی کرسی کی طرف کر دیا۔ زہرہ بانو جلتی سلگتی کیفیات کے ساتھ بظاہر خاموش کرسی پر بیٹھی تو انسپکٹر نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟'' اس کا اشارہ لئیق شاہ کی طرف تھا۔

''یہ لئیق شاہ ہے۔ ہماری مل میں کام کرتا ہے۔'' زہرہ بانو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر خود ہی قریب کھڑے لئیق شاہ سے بولی۔ ''بیٹھو... لئیق شاہ۔''

''نہیں۔'' معاً انسپکٹر اپنی کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔ ''یہ باہر جائے گا۔''

''یہ میرے ساتھ ہے انسپکٹر...''

''میں نے کہا نا یہ باہر جائے گا۔ میرے پاس بحث کا وقت نہیں۔'' انسپکٹر جرار خان نے کرخت لہجے میں کہا تو لئیق شاہ کا دماغ بھی بھک سے اُڑ گیا اور وہ زبردستی کرسی پر آکر براجمان ہوگیا اور اپنی جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے انسپکٹر سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''انسپکٹر! تمہارے یہاں تعینات ہوتے ہی زہرہ بی بی کے ساتھ یہاں جس قسم کا جان بوجھ کر سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اس کی وجہ سے ہم اچھی طرح واقف ہیں اور اب آپ سے ہمیں انصاف کی کوئی امید بھی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کس کس کے کہنے پر کیا جا رہا ہے ہمارے ساتھ...''

''میں تمہیں اس بدتمیزی پر اسی وقت لاک اپ کر سکتا ہوں بڑ بولے نوجوان۔'' انسپکٹر جرار خان خشم آلودہ نظروں سے لئیق شاہ کے جوش سے سرخ پڑتے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

''اور اگر تمہارے تھانے کی چہار دیواری کے اندر تمہارے سدھائے ہوئے پولیس اہلکار کسی شریف اور معزز آدمیوں کے ساتھ بدتہذیبی کے ساتھ پیش آئیں تو پھر پہلے انہیں بھی آپ کو اندر کرنا چاہیے انسپکٹر۔'' زہرہ بانو بھی چپ نہ رہ سکی۔ انسپکٹر نے غصیلے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور بولا۔

''صرف پانچ منٹ بچے ہیں باقی۔''

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وسیم عرف جھیما اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کو کس قانون کے تحت چھوڑا گیا ہے؟'' زہرہ بانو نے سیاہ بدروح چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''ان کی ضمانتیں کرالی گئی ہیں۔ قانون کے مطابق۔'' انسپکٹر نے یوں بتایا جیسے اسے پہلے ہی سے اس سوال کی توقع تھی۔

''اچھا... قانون کے مطابق؟'' زہرہ بانو کی مارے طیش کے سانس چڑھنے لگی۔ ''یا پھر بھاری رشوت لے کر؟''

''تم ایک ذمے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر پر رشوت لینے کا جھوٹا الزام لگانے کی سزا جانتی ہو؟''

''اور تم انسپکٹر؟'' زہرہ بانو بھی ترکی بہ ترکی اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی کا اشارہ اس کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''اور تم انسپکٹر! وسیم عرف جھیما جیسے خونی آدمی کو

چھوڑنے کی سزا نہیں جانتے شاید۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا... بی بی؟" اچانک انسپکٹر کے بدہیئت کالے ہونٹوں پر خبیثانہ مسکراہٹ ابھری۔

"اس نے اپنے ساتھی خونی ٹولے کے ساتھ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ تم سے پہلے یہاں تعینات انسپکٹر جہانزیب نے اس سلسلے میں اپنی ساری تحقیقات مکمل کرلی تھیں مگر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چالان پکا کرنے سے پہلے ہی اس ایمان دار انسپکٹر کا تبادلہ کروادیا گیا اور میں جانتی ہوں وہ سارے تحقیقاتی ثبوت بھی بوگس کر دیے گئے ہوں گے کیونکہ اب .... ایک سازش کے تحت آپ کی اس تھانے میں راجدھانی جو قائم کردی گئی ہے۔"

"بس... وقت ختم ہوگیا۔" انسپکٹر جرار نے اپنا ایک ہاتھ کھڑا کرکے بیزاری سے کہا۔ "تم دونوں جاسکتے ہو۔"

"ہم چلے جائیں گے انسپکٹر۔" اس بار لئیق شاہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مگر ایک بات یاد رکھنا، ہم انصاف لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے، یہ سب جانتے ہیں ہم... تم یہ سب چودھری ممتاز خان کے ایما پر کررہے ہو... بتادینا اُسے ہم بھی ایسی سازشیں تیار کرنا جانتے ہیں، آئیں بیگم صاحبہ۔"

اس نے آخر میں زہرہ بانو کی طرف دیکھا۔ جوش سے لئیق شاہ کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ زہرہ بانو بھی جب تک اپنی کرسی چھوڑ چکی تھی۔ پھر دونوں کمرے سے باہر راہداری میں آگئے۔ احاطے میں ان کی کار کھڑی تھی، یہ اس میں سوار ہوگئے۔

"چودھری ممتاز کے ہاتھ یہاں تک بھی پہنچ گئے ہیں زہرہ صاحبہ۔" زہرہ بانو کے کار اسٹارٹ کرتے ہی اس کے برابر کی نشست سنبھالتے ہوئے لئیق شاہ نے دانت پیس کر کہا۔ "اور یہ سب پہلے سے سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ انسپکٹر جہانزیب کے تبادلے سے لے کر راشی انسپکٹر جرار خان کے تعینات ہونے تک ایک لمبی سازش کھیلی گئی ہے۔ گویا ممتاز خان کو آپ کے خلاف گل کھلانے کا اب قانونی طور پر بھی پورا پورا "تحفظ" حاصل ہو چکا ہے۔" لئیق شاہ نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

"دونوں ماں بیٹے شروع ہی سے سازشی ذہن کے مالک ہیں۔" زہرہ بانو نے بھی اس کی تائید میں کہا۔ وہ گیئر ڈال کر کار آگے بڑھا چکی تھی۔ "مہر النساء میری رقابت کے جوشِ انتقام میں اپنے سگے بیٹے ممتاز خان کو ایک خطرناک زہریلا سانپ بنا چکی ہے۔ اس کی رگوں میں نفرت و انتقام کا زہر بھر چکی ہے۔ وہ خود تو ہم ماں بیٹی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی مگر اب اپنے بیٹے کے دل و دماغ میں زہر بھر کے ہم ماں بیٹیوں کے راستے کا پتھر بنانا چاہتی ہے۔"

"زہرہ صاحبہ! ایسی مائیں تو پھر خود اپنی اولاد کی دشمن ہوتی ہیں۔" لئیق شاہ نے مختصراً تبصرہ کیا۔

"ہاں۔" زہرہ بانو ونڈ اسکرین پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ "وہ نہیں جانتی کہ انتقام میں اندھی ہوکر اپنے بیٹے کی غلط بلکہ خطرناک تربیت کررہی ہے، اس طرح اسے ایک غلط راہ پر لگارہی ہے۔ اسے انسان سے شیطان بنارہی ہے۔"

"یقیناً زہرہ صاحبہ۔" لئیق شاہ نے ہولے سے اپنے سر کو تائیداً جنبش دی۔

"لئیق شاہ! آخر کو میری بھی ماں ہے مگر اس نے کبھی مجھے اپنی سوکن اور اس کے بیٹے کے خلاف نہیں اکسایا۔ اگر بابا جان نے ان سے اپنا عہد نبھایا تو امی جان (ستارہ بیگم) نے بھی ان کے ساتھ وفاشعاری اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آج تک۔ ان کے ساتھ کیسی کیسی گھناؤنی سازشیں حویلی میں کھیلی گئیں مگر امی جان نے کبھی بھی انتقامی روش اختیار نہیں کی۔ وہ تو بے چاری الٹا مجھے ہی منع کرتی ہیں کہ میں ان دونوں بغض کے مارے ماں بیٹے کے منہ ہی نہ لگوں... مگر وہ اپنے لیے نہیں میرے مستقبل کے لیے پریشان بھی ہوتی ہیں مگر میں نے بھی عہد کررکھا ہے لئیق شاہ! میں ان دونوں سازشی ماں بیٹوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنوں گی۔"

"اور... مجھے آپ ہردم اپنے ساتھ پائیں گی زہرہ صاحبہ۔" لئیق شاہ کے منہ سے پُرعزم ہوکے بے اختیار یہ جملہ نکلا تھا۔ زہرہ بانو کو نہ جانے کیا ہوا، اس نے اچانک گاڑی کو روک دیا۔

ان کا رخ سالونٹ پلانٹ جانے والے کچے راستے پر تھا، قرب و جوار میں ویرانی کا راج تھا۔ کہیں کہیں کھیت کھلیان دکھائی دیتے تھے، خودرو جھاڑیوں اور کچھ کھجوروں کے سوکھے سوکھے پتلے درخت نظر آتے تھے۔

کار روک کر زہرہ بانو نے عجیب اور گہری نگاہوں سے لئیق شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی جانب تکے جارہا تھا۔ زہرہ بانو کے عنابی لبوں پر اظہارِ دل کا امڈتا ہوا ارتعاش ساتھرک رہا تھا۔

"وعدہ کرتے ہو؟" زہرہ بانو نے جیسے گومگو سے لہجے میں

اس کی طرف بے دستور دیکھتے ہوئے پُرخمار لہجے میں پوچھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں زہرہ صاحبہ! آپ کو اس جنگ میں بالکل تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' جواباً لئیق شاہ نے بھی پُرعزم ہو کر کہا۔ دونوں کی یک ٹک نگاہیں ایک دوسرے کی کھلی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں جو کسی نئے پنپتے ہوئے تعلقِ خاطر کا... پتا دیتی تھیں، سینوں میں دھڑکتے دلوں کے شوریدہ جذبات، محبت کی اس پہلی سیڑھی سے ادغام کی راہ پا رہے تھے اور جیسے دو دیوانوں کو دشتِ الفت کی ایسی راہ سجھا رہے تھے کہ اس برابر کی لگی ہوئی آتشِ عشق میں کئی امتحاں بھی آئیں گے، اس آگ میں جل کر انہیں سونا بھی بننا ہوگا، تپ کر کندن بھی اور گلاب بھی... کیا خبر... خاکستر بھی ہونا پڑے...

بہتے اُمڈتے جذبات پر اب تک جو عارضی مصلحتوں کے بند باندھے گئے تھے، وہ نگاہوں کے پُرمعنی میل نے توڑ ڈالے۔ زہرہ بانو نے بے اختیار اپنا نرم و نازک مرمریں ہاتھ لئیق شاہ کے گھنے بالوں سے ڈھکے ہاتھ پر رکھا تو یکبارگی لئیق شاہ کے اندر بھی ایک تڑپ ابھری اور اس نے بھی پلٹ کر زہرہ کا مرمریں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، یکبارگی زہرہ بانو کو اپنے پورے وجود میں سرشاری کی کیفیات اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی، تب ہی اچانک کیا ہوا کہ لئیق شاہ نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور زہرہ بانو کے خمار آلود چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر سامنے ونڈ اسکرین کے پار... ویران بل کھاتے کچے راستے پر جما دیں اور ایکا ایکی جیسے کہیں دور... بہت دور... کھو سا گیا۔

''کیا ہوا... لئیق شاہ؟ تم بے چین ہو گئے؟'' زہرہ بانو بے قرار سی ہو گئی۔ لئیق شاہ اس بار سامنے ہی نظریں جمائے جمائے گومگو سے لہجے میں بولا۔

''زہرہ صاحبہ! شش... شاید... ہم بہت آگے نکل رہے تھے۔''

''تم ڈرتے ہو اس بندھن سے؟'' وہ شاید اس کی جھجک کو تاڑ گئی۔

''میں اس بندھن سے نہیں اپنی اوقات سے ڈرتا ہوں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''میرے دل سے پوچھو، تم میرے لیے کیا ہو... تمہارے سامنے میں تو کہیں بھی نہیں۔'' وہ جیسے ڈوبے لہجے میں بولی۔

''ایسا مت کہیں زہرہ صاحبہ!'' اس کی بات پر لئیق شاہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میرا اور آپ کا بھلا کیا جوڑ؟ آپ ایک محل کی رانی ہیں اور میں... جھونپڑی میں رہنے والا گدا۔ کتنے لوگوں کے منہ کھل جائیں گے، کتنے آپ کی جان کے بیری بن جائیں گے اور پھر... اور... پھر... زہرہ صاحبہ! بات اتنی سی بھی تو نہیں۔''

''مجھے کسی بات کی پروا نہیں، مجھے صرف تمہاری محبت چاہیے... پیار چاہیے تمہارا... اس کے سامنے دنیا کا سارا عیش و آرام میرے لیے ہیچ ہوگا۔'' زہرہ بانو کی آواز سے ہی نہیں لہجے سے بھی محبت کی مدھرتا مترشح تھی۔

''زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں ایسی محبتوں کو داغ دار بنا دیتی ہیں۔ شاید اسی لیے لوگوں کا محبت سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ میں چاند کو چاند ہی رہنے دینا چاہتا ہوں... داغ دار چاند کی صورت نہیں۔''

''مگر چاند کی روشنی بھی تو طلوع ہوتے سورج کی ہی محتاج ہوتی ہے۔ جبھی وہ نگینہ بن کر چمکتا ہے۔'' زہرہ نے عمیق لہجے میں کہا مگر لئیق شاہ کے لہجے کا سپاٹ پن جوں کا توں رہا۔

''مگر چاند سورج کبھی آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔''

''میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہوگا۔'' زہرہ نے دوسرے طریقے سے اسے مطمئن کرنا چاہا اور یہیں اس سے غلطی ہو گئی، کیونکہ اس کی بات پر لئیق شاہ نے پہلی بار ناراض سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

''آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا۔ عورت کے مال و متاع پر کبھی بھی مرد کا حق نہیں ہوتا جبکہ عورت، مرد کے مال پر اپنا پورا حق و اختیار رکھتی ہے۔ مجھے یہ سب پسند نہیں ہوگا، بہتر یہی ہے... اس پریم کہانی کی شروعات کو اِدھر ہی ختم کر دیا جائے، مجھے میری اوقات میں رہنے دیں... زہرہ صاحبہ! گاڑی آگے بڑھائیں... ہمارا زیادہ دیر یہاں رکنا ویسے بھی مناسب نہیں ہوگا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''مگر ابھی تو تم نے میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا؟''

''میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں جب تک آپ کی ملازمت میں ہوں... نمک حلال رہوں گا مگر اتنا بڑا وعدہ نہیں کر سکتا اس میں آپ ہی کی بہتری ہے۔''

''میری بہتری کس میں ہے، یہ خود میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تو ٹھیک ہے پھر... مجھے بتا دو... تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

زہرہ بانو کی تڑپ فزوں تر ہونے لگی۔ اسے آج لئیق شاہ کی ایک اور خوبی کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ ایک خوددار

دلکش خوشبوؤں سے بسا مارچ 2015ء کا پُر بہار پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے دلنشیں ناول
زاھدہ پروین کا خوب صورت منی ناول...... جنگل کا پھول
زمر نعیم تشریف لائی ہیں متاثر کُن مکمل ناول اسیرِ وفا کے ساتھ
نبیلہ ابر راجا کا نیا ناولٹ متاعِ دل صرف آپ کے لیے
شیریں حیدر کی پُرسوچ تحریر...... آئینہ
رضوانہ پرنس کی حاضری
فسانہ نہیں حقیقت ھے یہ کے ہمراہ
پڑھیے اداکارہ سنبل اقبال کی دلچسپ باتیں
صحرائے تھر کی کٹھنائیوں سے متعلق سیما رضا ردا کا پُرفکر افسانہ
اس کے ساتھ ساتھ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہر قلمکاروں کی فکر انگیز مگر دلآویز تحریریں'
جن میں سیما بنت عاصم' ام ثمامه' روشانے عبد القیوم'
فرزانه نگہت' بشریٰ باجوه' نظیر فاطمه' سلمیٰ غزل'
سحرش فاطمه' نادیه جهانگیر' فرحت احمد اور قراۃ العین شکیل شامل ہیں
حسبِ معمول مختلف دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پُرمسرت دلفریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

انسان ہے۔ کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود وہ اسے کسی ڈگری یافتہ عالم کی طرح زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ الفت بھی پڑھا رہا تھا۔

زہرہ بانو کے اس آخری.... استفسار پر لئیق شاہ کو لاجواب ہونا پڑا۔ اس نے جواب دینے سے پہلوتہی کرنے کی کوشش چاہی مگر مفر کی راہ نہ پاکر بالآخر صاف گوئی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"زہرہ صاحبہ! آپ میرے لیے ایک ایسا چاند ہو... جسے میں صرف دیکھ سکتا ہوں... انوکھے لاڈلے کی طرح پانے کی آرزو کرسکتا ہوں... لل... لیکن اسے پا نہیں سکتا۔"

"آہ... مگر یہ چاند تمہارے دامن میں اترنے کے لیے خود بے چین ہے لئیق شاہ... اور تم... اسے ٹھکرا رہے ہو۔" زہرہ بانو کے جذبۂ دل سے بے اختیار ایک آہ سی خارج ہوئی، لئیق شاہ فوراً بولا۔

"ایسا مت کہیے زہرہ صاحبہ! بھلا میری کیا اوقات کہ میں آپ کو ٹھکراؤں؟"

"تو پھر... یہ بے رخی کیسی؟"

"یہ بے رخی نہیں ہے۔"

"مجھے یقین ہے پورا... تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تم نے اس کے بیچ ایک خودساختہ دیوار بنا ڈالی ہے۔ تفاوت کی دیوار... مگر میرے لیے یہ ریت کی دیوار ہے۔"

یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سالونٹ پلانٹ پہنچنے پر زہرہ بانو کو سب سے پہلے وہاں پھیلی ویرانی کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا دل جیسے مسوس کر رہ گیا۔ کہاں تو جب بھی وہ یہاں آتی تھی ہر طرف مزدوروں اور ورکروں کی چہل پہل اسے نظر آتی تھی۔ پلانٹ کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں... ترقی کی جانب نظر آتا تھا، مشینوں کے مخصوص شور سے جیسے یہاں زندگی دوڑتی محسوس ہوتی تھی مگر آج چمنیاں بجھ گئی تھیں، ان سے ویرانی کا نادیدہ دھواں سا اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ کئی سال پہلے یہ پلانٹ اسی طرح ویران پڑا تھا۔ اس کے احاطے میں خودرو جھاڑیاں اُگ آئی تھیں، مشینیں زنگ آلود ہو کر ناکارہ ہوچکی تھیں، در و دیوار سے کہنہ برسنے لگتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی، جب چودھری الف خان جوان مرد تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی، جو بلاشبہ اب بھی تھی، دیگر ذرائع سے آمدنی آتی تھی۔ اس نے بھی اس کی پروا نہ کی، لیکن ستارہ بیگم سے ایک طوفانی محبت کے نتیجے میں شادی کے بعد جب ایک وسیع عریض کارآمد پلانٹ کی حیثیت سے یہ اس کی ملکیت میں دی گئی اور جب ستارہ بیگم نے زمینوں کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لیے تو انہوں نے سب سے پہلے اس پلانٹ پر توجہ مرکوز کی، ایک اجتماعی سوچ کو انہوں نے پروان چڑھاتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر یہ پلانٹ نئے سرے سے دوبارہ کام کرنے لگے تو نجانے کتنے غریب لوگوں کو روزگار میسر آئے گا۔ اس کا فائدہ بھی ہوگا ایک خطیر منافع کی صورت میں... لہٰذا ستارہ بیگم نے اس مردہ پڑتے پلانٹ کو منشی فضل محمد کے ساتھ مل کر دوبارہ زندہ کیا تھا، اور ایک طرح سے اپنے خون پسینے سے اسے سینچا تھا۔ اس کے بعد زہرہ جوان ہوئی تو ستارہ بیگم تھک چکی تھی۔ اس کی بیٹی اس کا بازو بنی اور پلانٹ کو جدید خطوط پر استوار کیا مگر آج چودھری الف خان کی پہلی بیوی مہرالنسا کا... اپنے بیٹے کو پڑھائے گئے زہریلے سبق سے اور اپنے سگے بیٹے ممتاز خان نے ہی ذاتی عناد کے لیے اسی تھالی میں چھید کیا تھا جس میں اس نے کھایا تھا۔ یہ سب اسی کا تو کیا دھرا تھا۔

یہ سب دیکھ اور سوچ کر بے اختیار زہرہ بانو کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے روتا اور دکھی دیکھ کر لئیق شاہ کو اپنا دل گھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر زہرہ بانو کو سنبھال لیا اور بولا۔

"زہرہ صاحبہ! اس کا غم نہ کریں... حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا، آپ تو بہت ہمت والی خاتون ہیں پھر یہ آنسو...؟"

"لئیق شاہ! تم شاید نہیں جانتے... اس پلانٹ کو دوبارہ چلانے کے لیے امی جان نے بذاتِ خود کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ پھر کہیں جاکر یہ دوبارہ کارآمد ہوا تھا۔ گاؤں میں نہ جانے کتنے غریب لوگوں کے بجھے چولہے جل اٹھے، کتنوں کو روزگار ملا تھا، کتنے بوڑھوں نے اپنی بیٹیاں بیاہی تھیں۔ ادھر ہی سے مزدوری کر کے کتنے ہی خالی پیٹ روٹی سے سیراب ہوئے تھے مگر... اب..." فرطِ رقت سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکی اور سسک پڑی۔ اسے رنجیدہ خاطر پاکر لئیق شاہ کا دل گھٹنے لگا، اس نے پھر زہرہ کو سنبھالا دیا اور ازراہِ تشفی بولا۔

"خدا کے لیے... زہرہ صاحبہ! خود کو سنبھالیے... کیا آپ کو میرا وعدہ یاد نہیں رہا؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں خود ایک بار پھر سارے مزدوروں کو ورکروں کو اکٹھا

کروں گا۔ یہاں کے لوگ اگر ڈرتے ہیں تو انہیں ڈرنے دو۔۔۔ میں شہر سے مزدور لاؤں گا۔ دیکھتا ہوں پھر کون مائی کا لال۔۔۔ ہمارے راستے کی دیوار بنتا ہے۔ پہلے تو میں آپ کی وجہ سے خاموش تھا کہ ٹکا چودھری ممتاز خان آپ کا بھائی ہے مگر اب مجھے خود بھی بہت سی حقیقتوں کا پتا چل گیا ہے۔ اس نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آپ کا پکا دشمن ہے اور آپ کی طرف بڑھنے والا ہاتھ میں اب کاٹ کر رکھ دوں گا۔''

اپنی جان کے تحفظ کے لیے۔۔۔ لئیق شاہ کو ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دیکھ کر زہرہ بانو کو ایک فخر کا سا احساس ہوا اور بے اختیار اس نے لئیق شاہ کے بازو سے اپنا سر ٹکا دیا اور لئیق شاہ کو زہرہ بانو کے بدن کی مہک۔۔۔ اس کا لطافت بھرا لمس۔۔۔ دل و دماغ کو بے اختیار سا کرنے لگا اور پھر دفعتاً ہی جیسے وہ دونوں ایک خواب آگیں کیفیات سے جاگے۔ ایک بڑی سی لینڈ کروزر۔۔۔ بڑی تیزی کے ساتھ پلانٹ کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی، زہرہ بانو کے چہرے پر ایک لمحے کو خوف کی پرچھائیوں نے ڈیرا جمایا۔ لئیق شاہ بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ گاڑی دونوں پہچان گئے تھے۔ زہرہ بانو نے جلدی سے خود کو لئیق شاہ سے الگ کر لیا مگر لینڈ کروزر میں ڈرائیور کے برابر والی نشست پر براجمان ممتاز خان کی نظروں نے دور سے ہی سب دیکھ لیا تھا۔

لینڈ کروزر ان کے قریب آکر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پھر دروازے کھلے، سب سے پہلے ممتاز خان اترا۔ اس نے بیش قیمت ڈبل گھوڑا بوسکی کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بغل سے سیاہ رنگ کا ہولسٹر بھی جھول رہا تھا۔ جس کے اندر بھرا ہوا پستول تھا اس کی غضبناک نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔ زہرہ کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا پستول کار کے گلوو کمپارٹمنٹ میں کیوں چھوڑ دیا تھا۔ ممتاز خان کے گاڑی سے اترتے ہی اس کے چار مسلح حواری بھی نیچے اتر آئے تھے۔ ان میں وسیم عرف چھیما بھی تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر ممتاز خان کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔

''تو تم اب اس کمی کمین کے ساتھ یہ گل کھلانے لگی ہو۔'' ممتاز خان نے غیظ آلود لہجے میں زہرہ بانو کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بھی قصور نہیں، آخر بیٹی کس کی ہو ایک کوٹھے والی کی۔''

''زبان سنبھال کے بات کرو۔۔۔ ممتاز خان۔'' زہرہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیرنی کی طرح گرجی۔ ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ سن کر اس نے ہر قسم کے ڈر و خوف کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

''میری ماں، صرف ایک گائیک تھی۔ ایک فنکار۔۔۔ وہ بری ہوتی تو۔۔۔ ایک باعزت اور معزز جاگیردار اسے عزت کے ساتھ بیاہ کر اپنی حویلی میں نہیں لاتا۔''

''بابا جانی کا تو جوانی میں دماغ خراب ہو گیا تھا، لڑکی۔'' ممتاز خان بولا۔ ''لیکن بعد میں انہیں عقل آگئی تھی، اور اپنی اس حقیقت کا پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا مگر تمہاری بازاری ماں نے۔۔۔''

''زبان کو لگام دو ممتاز خان۔'' اپنی ماں کے بارے میں یاوہ گوئی پر زہرہ بانو ایک بار پھر چلائی۔

''تمہیں تو اپنے سگے باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں، تم بھلا کسی اور کی عزت کا کیا پاس کرو گے ممتاز خان! تم اس طرح اپنے باپ کی شان میں بدکلامی اور بدتمیزی نہیں کر رہے ہوتے، حقیقت سنو گے تو تم گھڑوں پانی میں مارے شرم کے ڈوب مرو گے۔ تمہاری اپنی ماں نے اپنی کمزوریوں اور خطاؤں پر پردہ ڈالنے کے لیے تمہاری رگوں میں بھی اپنی رقابت کا زہر بھر دیا ہے جو اسے ابتدا ہی سے میری ماں اور مجھ سے ہو گئی تھی، کیونکہ وہ حسد کی آگ میں ہی جلتی رہی اور اب تک جل رہی ہے کیوں؟ اس لیے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ بابا جانی کا دل جیتنے میں ناکام رہی ہے، جبکہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بھی بابا جانی ابھی تک میری ماں کا دم بھرتے ہیں۔ یہی اصل محبت ہے۔''

زہرہ بانو کی جوابی کارروائی نے ممتاز خان کو بری طرح زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لڑکی! تو نے اپنی اوقات بھلا کر بڑی غلطی کی ہے۔۔۔ اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار ہو جا۔ آج اس کم کمین کتّے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ کر ثابت کر دیا ہے تو نے کہ تیری اپنی اوقات کیا ہے۔'' اس نے آخر میں لئیق شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لئیق شاہ اب ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چند قدم ممتاز خان کی طرف بڑھا تو اس کے ساتھ کھڑے حواری چھیما نے آگے بڑھ کر اس پر اپنی گن سیدھی کر لی۔ زہرہ بانو۔۔۔ لئیق شاہ کی جان کو خطرے میں دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھی مگر جب تک لئیق شاہ، ممتاز خان سے الجھ پڑا تھا اور۔۔۔ جنوں خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کمّے چودھری! کتوں کی فوج تو تُو نے پال رکھی ہے اور ہتھیاروں کے زور پر تو اتنا بھونک رہا ہے۔ میدان میں آ کے دیکھ بہادروں کی طرح پھر تجھے پتا چلے کون بلّے کی طرح چیاؤں... چیاؤں کر کے میدان چھوڑ کے بھاگتا ہے۔''

لئیق شاہ کی اس کراری جوابی کارروائی نے صورت حال کو یک دم جان لیوا حد تک خطرناک بنا دیا اور زہرہ بانو کو اصل خوف اس وقت لئیق شاہ کی جان جانے کا تھا کیونکہ ممتاز خان اور اس کے حواری اس وقت پوری طرح مسلح تھے اور ان پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ ایسے میں لئیق شاہ کی جوش بھری دلیرانہ حرکت انہیں مزید مشتعل کر سکتی تھی اور ہوا بھی یہی... ممتاز خان کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی غضب ناکی آگ کی طرح برسنے لگی جبکہ چھیما نے تو اپنی سیدھی کی ہوئی گن کی لبلبی پر بھی انگلی رکھ دی اور اس کی گن کی نال کے نشانے پر لئیق شاہ تنا کھڑا... انہیں للکار رہا تھا۔

''دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر ڈیرے پر لے چلو۔'' دفعتاً ممتاز خان نے دہاڑ کر کہا۔ چاروں حواری حرکت میں آ گئے اور زہرہ بانو اور لئیق شاہ کو گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹوں کی طرف بٹھا دیا گیا۔

''چودھری صاحب! اس کمین لئیق شاہ کو تو ادھر ہی مار کے قبر کھود دینی چاہیے۔'' چھیما نے ممتاز خان کو مشورہ دیا۔

''نہیں، یہ منہ زور گھوڑی... اسی لگام کے سہارے ہمارے مطالبات ماننے پر مجبور ہوگی۔ ٹبی والے ڈیرے پر چلو۔'' ممتاز خان غرا کر بولا اور زہرہ بانو اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکی۔ آخر اس کا سوتیلا بھائی، لئیق شاہ کو اس کی کمزوری بنا کر کون سی بات منوانا چاہتا تھا؟ وہ ایک اچنبھے کا شکار ہو گئی۔

☆☆☆

ٹبی والے ڈیرے پر یہ لوگ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد پہنچ گئے۔ ایک حواری ان کی کار بھی وہیں لے آیا تھا۔ زہرہ بانو پریشان تھی جبکہ لئیق شاہ بھی متفکر تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی پریشان تھے۔ ٹبی والا ڈیرا کچھ زیادہ ہی خوفناک منظر پیش کرتا تھا۔ آبادی سے دور جاگیر کے آخری سرے پر بنجر ویرانوں میں جا بجا اونچے نیچے ٹیلوں ٹبوں پر مشتمل تھا۔ یہاں خودرو جھاڑیوں کے علاوہ ٹبی کے سوکھے لمبے درختوں کی بھی بہتات نظر آتی تھی اور انہی کے بیچ وہ گارے مٹی کی عمارت تھی جو کچھ زیادہ رقبے پر تو نہیں پھیلی ہوئی تھی تاہم اس کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اندر کہیں ایک جانب گھوڑے بندھے ہوئے تھے، ایک تانگا بھی نظر آ رہا تھا۔ چھکڑا سا ٹرک بھی ٹائروں کے بجائے اینٹوں پر کھڑا تھا، کچھ لکڑ... بھی بکھرے تھے۔ دو تین مسلح حواری وہاں بھی موجود تھے، ان دونوں کو گاڑی سے اتار کر سیدھا اندر لایا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی زہرہ اور لئیق کو یوں لگا جیسے یک دم بنجر صحرا سے وہ کسی آرام دہ اور پُرتعیش گھر میں آ گئے ہوں۔ باہر سے بظاہر کھنڈر نظر آنے والی عمارت اندر سے برعکس تھی۔ بہرطور انہیں ایک کمرے میں لا کر دو سادہ سی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ ممتاز خان کے ساتھ چھیما بھی موجود تھا اور ایک حواری بھی... باقی کو ممتاز خان نے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ خود وہ دونوں آرام دہ صوفے پر براجمان ہو گئے، حواری کھڑا تھا۔

''ہمیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟'' زہرہ بانو نے ممتاز خان کی طرف تکتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔ تاہم اس کے لہجے کی تہ میں کہیں چھپے ہراس کی جھلک بھی محسوس ہوتی تھی، ممتاز خان نے کوئی جواب دیے بغیر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے ایک سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لے کر دھواں فضا میں اگلتے ہوئے پُرغور نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ تم دونوں کو اس جہان سے ہی رخصت کر ڈالوں مگر تمہاری ماں ستارہ بیگم کا ٹنٹا پھر بھی باقی رہتا اور یقیناً وہ ہمارے لیے پریشانی کھڑی کر سکتی تھی، اگرچہ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ وہ تمہارے مرنے کے بعد خود بھی ادھ موئی ہو کر رہ جاتی۔ خیر...'' کہتے ہوئے اس نے اپنے قریب بیٹھے چھیما کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور قریب کونے میں ... پڑی ایک چھوٹی سی میز کی دراز سے اس نے ایک ہینڈ بیگ نکالا۔ زہرہ اور لئیق کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ زہرہ بانو کچھ سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھی جبکہ لئیق شاہ کا ذہن موجودہ ماحول سے ہٹ کر اس سوچ میں مستغرق تھا کہ ان خونخوار بھیڑیوں کے چنگل سے نکلا کس طرح جائے؟ لئیق شاہ... اس قبیل کا آدمی تو نہیں تھا یعنی ہتھیار بہ دست جنگجو وغیرہ... ہاں البتہ پہلوانی ضرور کیا کرتا تھا، کسرت بھی کرتا تھا۔ لڑائی بھڑائی کے مواقع کم ہی آتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ لئیق شاہ خود ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ دوسرے کا قصور معاف کر دیا کرتا تھا۔ اپنی ذات میں سادہ فطرت تھا اب یہ

اس کی خاصیت تھی یا خامی کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا بھی تھا۔ خاموش رہتا تو جیسے پُرسکون جھیل یا ٹھہرا سمندر... مگر جب اس پر کوئی نفرت یا انتشار کے کنکر پھینک دے تو پھر اندر سے متلاطم تیز پُرجوش طوفان کی صورت یکا یک ابل بھی پڑتا تھا۔ اس وقت کیتی شاہ دھیرے دھیرے اپنی اسی خامی یا خوبی جیسی کیفیات سے دوچار تھا۔

''یہ ایک اسٹامپ پیپر ہے۔'' معاً کمرے میں ممتاز خان کی آواز گونجی۔ وہ اس چرمی ہینڈ بیگ سے ایک ٹائپ شدہ پیپر نکال چکا تھا اور ایک پین بھی... جسے چھیما کو تھماتے ہوئے اس نے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس پر تم اپنے دستخط کردو... قصہ ختم... اور یہ دشمنی بھی۔'' ممتاز خان نے آخر میں جیسے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ کس قسم کا اسٹامپ پیپر ہے؟'' زہرہ بانو نے اپنی بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

''اس میں ان جائیداد کی حصہ داری کا اندراج ہے جو میرے باپ نے جوشِ جوانی اور تمہاری ماں کے حسن کے جادو میں آکر تمہارے نام کر ڈالی تھی، جبکہ ان پر میرا حق ہے۔ میں اپنا یہ حق واپس لینا چاہتا ہوں۔''

ممتاز خان نے جیسے اپنی بات مکمل کی ، زہرہ بانو اس کی بات کا مقصد سمجھتے ہی جوش سے سرخ نظر آنے لگی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وقت اور حالات کی موجودہ نزاکت کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے اس کے اندر کی چالاک اور معاملہ فہم عورت بیدار ہوگئی۔ حتی الوسیع اپنے لہجے کو ہر قسم کے جوشِ غیظ سے عاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہموار آواز میں بولی۔

''یہ سب میرے نام نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ امی جان ہی اس پر دستخط کرسکتی ہیں۔ اگر میں ان سے کہوں تو... مگر... پھر بھی اس بات کی ضمانت کیا ہوگی کہ ہم دونوں ماں بیٹیوں کو زندہ رہنے دیا جائے گا؟''

اس کی بات پر ممتاز خان کے چہرے پر بڑی خبیثانہ مسکراہٹ ابھری۔ زہرہ بانو کی اس بات پر جانے اس کی کون سی جبلّت کی تسکین ہوئی تھی کہ وہ کمینگی سے ایک آنکھ میچتے ہوئے بولا۔

''ہم بلاوجہ خون خرابے کے قائل نہیں ہیں۔ بغیر اس کے اپنا مقصد حاصل ہوجاتا ہے تو دشمن بھی ہمارے لیے بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔''

''مجھے اس سلسلے میں امی جان سے بات کرنا ہو

رنگین کتاب

ناشر نے معذرت کرتے ہوئے مصنف سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں ایسی رنگین کتاب شائع نہیں کرسکتا۔''

''جنابِ عالی! آپ کیا بات کرتے ہیں۔ میری کتاب میں تو کوئی رنگینی نہیں ہے۔'' مصنف نے ترش لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ہے؟ پہلے ہی باب میں ایک بوڑھا آدمی خوف سے پیلا پڑ جاتا ہے۔ ہیرو غصے سے سفید ہو جاتا ہے۔ ہیروئن شرم و حیا سے سرخ ہو جاتی ہے۔ ہیروئن کا باپ سردی سے نیلا پڑ جاتا ہے اور رقیب حسد سے ہرا ہو جاتا ہے۔ یہ رنگین بیانی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟'' ناشر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

ایمان دار چور

ایک گھر میں چور آ گئے اور سب سامان اٹھا کر نکلنے لگے تھے کہ مالکِ مکان کی آنکھ کھل گئی۔

مالک مکان نے دیکھا کہ چور سب سامان لے جا رہے ہیں اور ایک چور کے سر پر تخت پوش (جائے نماز) رکھا ہوا ہے۔ اس نے چور سے کہا۔

''ارے بھائی یہ تو چھوڑ جاؤ نماز پڑھوں گا۔''

یہ سن کر چور نے کہا۔ ''کیوں، کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟''

(ساہیوال سے قیصر گل اور ملک اعجاز کا تعاون)

گی... یوں بھی اس اسٹامپ پر میرے نہیں انہی کے سائن ہوں گے۔''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا، مجھے سب معلوم ہے۔ تمہاری مکار ماں اپنا سب کچھ تمہارے نام پہلے ہی کر چکی ہے.... اب تم ہی اس پر اپنے دستخط کروگی۔'' غصیلے لہجے میں یہ کہتے ہوئے ممتاز خان نے چھیما کو اشارہ کیا۔ وہ ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر اور پین لیے زہرہ بانو کی طرف بڑھا اور دونوں اس کی گود میں ڈال کر اپنے صوفے کی طرف پلٹ آیا۔ ممتاز خان کی خونخوار گھورتی ہوئی نظریں زہرہ بانو کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ زہرہ بانو اپنے ہاتھوں کے ارتعاش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے ایک نگاہ اسٹامپ پیپر پر ڈالتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگی۔

اس ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر میں ان ساری ملکیتوں کا

ذکر موجود تھا، جو زہرہ بانو کے نام تھیں۔ ان میں نئے پنڈی کی کچھ زمینوں کے علاوہ سالونٹ پلانٹ اور ملتان میں واقع کوٹھی "بیگم ولا" کے ساتھ... ملتان ہی کے گردونواح میں موجود رائس اور فلور ملیں تھیں۔ زہرہ بانو کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی، وہ یہ سب اتنی آسانی سے ممتاز خان جیسے شیطان صفت خونی آدمی کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا مگر اس وقت ان سب باتوں سے زیادہ اہم اس کے لیے لئیق شاہ تھا، مرد کا معاملہ اور ہوتا ہے لیکن ایک عورت کے لیے اس صورت میں دولت و جائداد کوئی معنی نہیں رکھتی جب اس کے کسی چاہنے والے کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ لئیق شاہ اس کی چاہت تھا، اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کی زندگی بچانے کی خاطر ممتاز خان کی یہ شرط بھی مان لینے کو تیار ہوجاتی مگر جانے کیوں اس کے دل کو تسلی نہیں ہورہی تھی۔ ممتاز خان اسے یا لئیق شاہ کو اپنا مقصد پورا ہوجانے کے باوجود بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔

"میں یہ سب کرنے کو تیار ہوں۔" بالآخر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ممتاز خان کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ قریب بیٹھے لئیق شاہ کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندر سے چونکے بنا نہیں رہی، بظاہر پُرسکون سمندر کی طرح نظر آنے والے لئیق شاہ کے بشرے پر زہرہ کو ایک متلاطم خیز طوفان کی آمد کے آثار اُمڈتے محسوس ہوئے، جس نے ایک لمحے کو اسے اندر سے دہلا بھی دیا۔ اسے ڈر تھا کہیں جوش میں لئیق شاہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے اور ان خونخوار خون کے پیاسے بھیڑیوں کے ہاتھوں اپنی جان سے نہ چلا جائے۔

"اب کی نا تم نے ہمارے مطلب کی بات۔" دفعتاً ممتاز خان خوش ہوکر مکروہ لہجے میں بولا۔

"مگر میری ایک شرط ہے۔ میں اپنی زندگی کی ضمانت نہیں مانگتی... لل... لیکن لئیق شاہ کا ہمارے اس معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے اسے یہاں سے جانے دیا جائے۔"

زہرہ بانو نے کہا۔ اس کی یہ شرط ممتاز خان کے لیے واقعی ایک معمولی شرط تھی لیکن اس شیطان کی نیت میں کیا تھا یہ، وہی جانتا تھا۔

"مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ تم اِدھر کاغذ پر اپنے سائن کرو اُدھر تمہارے عاشق لئیق شاہ کو جانے دیا جائے گا۔"

"نہیں، پہلے اسے یہاں سے بھیجو۔" زہرہ بانو نے کہا۔ "یہ جب تک خیریت کے ساتھ اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا اور اس کی عافیت کی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ جاتی، میں مطمئن نہیں ہوں گی۔"

اس کی بات سن کر ممتاز خان سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"لئیق شاہ کو میں چھوڑ دیتا ہوں، یہ یہاں سے چلا جائے گا۔ میرا خیال ہے یہ اطمینان تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ اب گھر پہنچ کر اس کی خیریت دینے کی اطلاع تک انتظار کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، یہ وہاں پہنچ کر کوئی گل بھی کھلا سکتا ہے۔ پولیس کو بھی بتا سکتا ہے۔"

"حیرت ہے ممتاز خان۔" زہرہ بانو استہزائیہ حیرت سے بولی۔ "یہاں کی پولیس کو تم پہلے ہی خرید چکے ہو اور پھر لئیق شاہ بھلا کیا گل کھلا سکتا ہے؟ اور مجھے اس کاغذ پر دستخط کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟ اتنی طاقت اور اثر ورسوخ کے باوجود تم لئیق جیسے عام آدمی سے ڈر رہے ہو؟"

زہرہ بانو کی بات اپنی جگہ معقول تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ممتاز خان رضامند نظر آنے لگا مگر زہرہ بانو کو ایک بات پر حیرت ہورہی تھی کہ ابھی تک لئیق شاہ کی طرف سے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا؟ ورنہ اسے پوری توقع تھی کہ لئیق شاہ کو اس کی بات پر سخت اختلاف ہوگا۔ وہ جانے سے انکار کردے گا مگر زہرہ بانو نے دیکھا لئیق شاہ بدستور خاموش تھا۔ کیا واقعی وہ صرف اپنی خیریت چاہتا تھا؟ اسے صرف اپنی جان بچانے کی پروا تھی؟ کیا وہ خودغرض تھا؟ آخری وقت تک زہرہ بانو کے اندر ایک نامعلوم سی حسرت سر اٹھاتی رہی کہ لئیق شاہ انکار کردے۔ چیخ کر کہہ ڈالے۔ "نہیں... ہرگز نہیں، مجھے یہ سب منظور نہیں، میں زہرہ صاحبہ کے بغیر اکیلا اپنی جان، اپنی عافیت کی خاطر نہیں جاؤں گا یہاں سے۔ اپنی زہرہ صاحبہ کی زندگی داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ انہیں، خونی دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کی خاطر ایک قدم بھی اس عمارت سے باہر نہیں نکالوں گا تو... زہرہ بانو کا مان کتنا بڑھ جاتا۔

بالآخر زہرہ بانو اور چودھری ممتاز خان کے درمیان یہ معاہدہ حتمی طور پر طے پا گیا۔

زہرہ بانو نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا۔ ممتاز خان نے چھیما کو اشارہ کیا۔ اس نے قریب کھڑے حواری کو.... بلایا اور تحکمانہ کہا۔ "لئیق شاہ کو لے جاؤ یہاں سے اور

جہاں یہ کہتا ہے اسے چھوڑ آؤ، تم اپنے ساتھ صرف شوکے کو لے جاؤ۔"

"بہت بہتر جناب۔" حواری نے مؤدبانہ انداز میں چھیما سے کہا اور پھر لئیق شاہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے قریب بیٹھی زہرہ بانو حسرت و یاس سے لئیق شاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے ایک آزردہ سی حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا اور وہ اندر سے بے اختیار اپنا دل مسوس کر رہ گئی، جب اس نے اپنے محبوب اپنی پہلی اور آخری محبت... لئیق شاہ کو کرسی سے خاموشی کے ساتھ اٹھتے دیکھا۔ لئیق شاہ نے وہاں سے جاتے جاتے ہوئے بھی ایک آخری نگاہ تک زہرہ بانو پر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور اسی طرح سے خاموشی کے ساتھ اپنا سر جھکائے، ممتاز خان کے حواری کے ساتھ چل دیا۔ کرسی پر دم بہ خود سی بیٹھی زہرہ بانو کی مجبور سی نگاہیں لئیق شاہ کی پشت پر جمی ہوئی تھیں حتیٰ کہ وہ حواری کے ساتھ چلتا ہوا دروازے سے باہر غائب ہو گیا۔

چونکی اس وقت... جب اس نے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور پھر دور ہوتی چلی گئی۔ لئیق شاہ جا چکا تھا۔ آنسوؤں کے موتی تھے جو زہرہ بانو کی کجراری آنکھوں کی گھنی پلکوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے... یک دم بہہ نکلے۔

"تمہارا... عاشق تو بڑا ہی فریبی نکلا... لڑکی..." زہرہ بانو کی جھیر جھیر سماعتوں سے ممتاز خان کی تضحیک آمیز آواز ٹکرائی۔

"چودھری صاحب! کچا عاشق ہوگا۔ جان پر بنی تو اپنی جان بچا کر رفوچکر ہو گیا۔" چھیما نے بھی زہرہ بانو کے روہانسے پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"اس نے سوچا ہوگا جان بچی سو لاکھوں پائے۔" ممتاز خان نے لقمہ دیا پھر کمرے میں دونوں کے بدہیئت قہقہے گونجنے لگے۔

زہرہ بانو گم صم بیٹھی تھی، ممتاز خان بڑی اکڑ کے ساتھ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا.. شیطانی مسکراہٹ سے زہرہ بانو کو گھورے جا رہا تھا۔ وقت جیسے بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ زہرہ بانو کے اندازے کے مطابق لئیق شاہ کے خیریت سے کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانے کی اطلاع پندرہ بیس منٹ بعد آجانی چاہیے تھی۔

کافی دیر گزر گئی، ممتاز خان اور چھیما چائے پی رہے تھے۔ اچانک باہر کسی گاڑی کے انجن کی تیز آواز ابھری، وہ... سب چونکے۔ یہی سمجھے کہ لئیق شاہ کو چھوڑ کے ان کے وہ دونوں حواری لوٹ آئے ہیں، زہرہ بانو کا دل بھی جیسے بے طرح دھڑکنے لگا گویا کڑے فیصلے کی گھڑی سر پر آن لگی تھی۔ گاڑی کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی اور ساتھ ہی کچھ اضافی "کھڑبڑاہٹ" کے ساتھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے باہر کوئی گڑبڑ سی ہو رہی ہو، دفعتاً کچھ چیخوں کی آواز سنائی دی پھر گولیاں چلیں اور تھوڑی دیر بعد سپاٹ سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ممتاز خان اور چھیما بری طرح ٹھٹکے۔ زہرہ بانو کا چہرہ بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ ممتاز خان نے اپنے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا جبکہ اس سے پہلے چھیما اپنے ہاتھ میں گن سنبھالے کمرے کے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اس نے ابھی کمرے کے دروازے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ایک زوردار لمبا بانس چھیما کے منہ پر پڑا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اندر کو لڑکھڑا گیا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ زہرہ بانو کی پھٹی پھٹی نگاہوں نے دروازے سے لئیق شاہ کو ایک بانس نما ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے اندر نمودار ہوتے دیکھا اور جیسے اپنی جگہ سن ہو کے رہ گئی، ممتاز خان بھی اسے غیر یقینی نظروں سے تکنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے اسے ہوش آگیا ہو، اس نے اپنا پستول والا ہاتھ لئیق شاہ پر تان لیا۔ اسے گولی کے نشانے پر دیکھ کر زہرہ بانو کا دل دھک سے رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے لئیق شاہ نے کسی ماہر "لٹھ باز" کی طرح اپنے گنڈاسا نما بانس کو حرکت دی تھی، ادھر ممتاز خان نے گولی چلا دی۔ زہرہ بانو کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ لئیق شاہ موٹے گنڈاسے کو پنکھے کی طرح بڑی مہارت کے ساتھ حرکت دے رہا تھا، گولی گنڈاسے کے ساتھ ٹکرائی تھی، لکڑی کے پرخچے اڑے اور دوسرے ہی لمحے بانس کی ضرب ممتاز کے پستول والے ہاتھ پر پڑی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، نہ صرف پستول ممتاز خان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا بلکہ اس کے ہاتھ کی ہڈی بھی چٹخ گئی۔ وہ کربیہ آمیز انداز میں چیخا۔ لئیق شاہ کا خوبرو نقوش والا چہرہ اس وقت جوشِ غیظ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا اور بڑی بڑی روشن آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"جلدی آیئے، زہرہ صاحبہ۔" وہ چیخا۔ زہرہ اپنی جگہ جامد تھی۔ لئیق شاہ کے پکارنے پر جیسے اس کے اندر بھی بجلی بھر گئی اور وہ اس کی جانب دوڑی پڑی۔ اس اثنا میں چھیما نے فرش پر گرے پڑے ہونے کے باوجود پھرتی کے ساتھ لوٹ لگائی اور اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر

دوسرے ہی لمحے لئیق شاہ کا گنڈاسا حرکت میں آیا۔ فرش پر ایک پٹاخا چھوٹا اور دوسرا پٹاخا چھیما کے بازو کی ہڈی ٹوٹنے کا ابھرا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بڑی کرب ناک تھی۔

لئیق شاہ نے زہرہ بانو کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں لمبا بانس تھامے دروازے کی طرف دوڑا۔ زہرہ بانو کو باہر تین چار حواریوں کے بے سدھ زخمی پڑے وجود نظر آگئے۔ دونوں اپنی کار کی جانب بڑھے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی، زہرہ نے پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور لئیق شاہ کے سوار ہوتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

''تم نے تو مجھے حیران کر دیا لئیق شاہ۔'' احاطے کا ادھ کھلا پھاٹک توڑتی ہوئی زہرہ کی کار پکے راستے پر آگئی۔ لئیق شاہ خاموش تھا۔ ''میں... میں تو سمجھی تھی کہ تم جا چکے۔'' زہرہ نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

اس کی بات پر لئیق شاہ نے ایک ذرا گردن... موڑ کے زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور ایک عجیب طرح کے جوش سے بولا۔

''کیا آپ مجھے ایسا خود غرض سمجھتی تھیں زہرہ صاحبہ؟''

''ہرگز نہیں، کبھی نہیں، میرا دل ہی نہیں، دماغ بھی اس بات کو تسلیم کرنے سے آخر تک قاصر رہا۔'' زہرہ نے جیسے جوشِ جذب کی سی کیفیت میں ڈوب کر کہا۔ اس وقت اس کا رواں رواں فخر و انبساط سے لرزیدہ تھا۔ اس کا گلنار چہرہ کھل اٹھا تھا اور وہ بار بار بڑی محبت اور چاہتِ دیرینہ کے ساتھ لئیق شاہ کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

''میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آپ کی جان خطرے میں ڈال کر اپنی زندگی بچانے کی کوشش کروں۔'' لئیق شاہ ایک دبدبے سے بولا۔

''اس وقت وہ سب ہم پر بھاری تھے۔ ہماری ذرا سی بے پروائی یا جوش دکھانے پر مشتعل ہو سکتے تھے۔ مجھے کسی موقع کی تلاش تھی اور یہ موقع مجھے آپ ہی نے دیا تھا۔''

''تم نے یہ سب کیا کیسے؟ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''دونوں حواری مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر جیسے ہی روانہ ہوئے تو میں نے دانستہ جان بچ جانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ مجھے سادہ لوح سمجھے تھے، میری جانب سے جیسے ہی انہوں نے غیر محتاطی کا مظاہرہ کیا تو میں نے سب سے پہلے اپنے قریب بیٹھے حواری پر حملہ کر دیا۔ اس کی گن سے لٹھ کا کام لے کر اس کا سر پھاڑ ڈالا اور دوسرے کا بھی یہی حشر کیا۔ پھر گاڑی لے کر پلٹا اور اندھا دھند احاطے میں داخل ہوگیا۔ باقی حواری گاڑی دیکھ کر اسی مغالطے میں رہے کہ اس میں ان کے اپنے ہی ساتھی ہوں گے مگر جب تک وہ مجھے پہچانتے، میں ان کے سر پر پہنچ چکا تھا اور گاڑی ان سے ٹکرا دی۔ انہوں نے ٹکر سے بچنے کی کوشش بھی کی، فائرنگ بھی کی، مگر گاڑی کی طوفانی ٹکروں سے خود کو نہ بچا پائے، مجھے ہتھیار چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر جمانی چاچا کے اکھاڑے میں کسرت ضرور کیا کرتا تھا لٹھ بازی اور گنڈاسا برداری بھی میں نے انہی سے سیکھی تھی، جمانی چاچا کی زمینوں پر میں ٹریکٹر بھی چلایا کرتا تھا مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی، قریبی احاطے میں بکھرے لکڑ... کے ڈھیر سے بانس اٹھائے اندر آگیا۔''

''واؤ... تم نے حیران کر دیا لئیق...'' زہرہ ایک بار پھر یہ سب سن کر چہکی۔

''مجھے آگے کی فکر ہو رہی ہے زہرہ صاحبہ... مجھے اپنی فکر تو نہیں لیکن آپ کی جان خطرے میں ہے۔'' لئیق شاہ نے پُرتفکر متانت سے کہا تو زہرہ بولی۔

''کیوں... تمہیں کیوں نہیں اپنی جان کی پروا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے بغیر میں جی سکوں گی؟''

''تو پھر آپ نے مجھ سے ایسی توقع کیسے کر لی تھی کہ میں آپ کو ان خونی درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کے چلا جاؤں گا اور اگر خدانخواستہ وہ آپ کی جان کو نقصان پہنچا دیتے تو...''

''تو کیا؟ میں تمہاری زندگی کی خاطر اپنی موت کو خوشی سے گلے لگا لیتی۔'' زہرہ بانو نے گھمبیر لہجے میں کہا تو لئیق شاہ نے جیسے تڑپ کر اپنا ایک ہاتھ زہرہ کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اور زہرہ نے بے اختیار اپنا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کر اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے چوم لیا۔ لئیق شاہ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا بولا۔ ''پھر ایسی بات نہ کیجیے گا زہرہ صاحبہ۔''

''ایک بات بتاؤ، لئیق شاہ۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔ ''مجھے ممتاز خان کے چنگل سے بچانے کے پیچھے تمہارے دل میں کون سا جذبہ کارفرما تھا؟ محض ایک جاں نثار اور وفادار ملازم کا یا پھر...؟''

''میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا آپ کو۔'' لئیق شاہ نے ہولے سے کہا۔

"کیوں؟"

"میں آپ کا نمک خوار ہوں۔"

"مگر تم جانتے ہو... میں نے تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"زہرہ صاحبہ! آگے کی سوچیے، ہمیں جانا کدھر ہے؟ یہاں کی پولیس سے تو ہمیں انصاف کی امید نہیں۔" لئیق شاہ نے اس موضوع سے پہلوتہی کرنے کی کوشش چاہی تو زہرہ بانو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ سامنے نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔

"مجھے شہر جا کے کسی اعلیٰ اور ذمے دار پولیس آفیسر سے ملنا پڑے گا۔"

"ایک مشورہ دوں زہرہ صاحبہ؟" لئیق شاہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔

"ہاں، بولو۔"

"آپ کا شاید اب نئے پنڈ میں رہنا مناسب نہیں ہو گا۔ وڈے چودھری (الف خان) کو سوہنا رب صحت دے ان کی بات اور تھی مگر اب..."

"تمہاری بات ٹھیک ہے لئیق شاہ۔" وہ بولی۔ "مگر شاید امی جان... بابا جان کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں، بابا جان کی حالت ٹھیک ہوتی تو اور بات تھی۔"

"ایک بات پوچھوں آپ سے... برا تو نہیں مانیں گی آپ؟"

"نہیں، نہیں... پوچھو۔ میں بھلا تمہاری کسی بات کا برا مان سکتی ہوں؟"

"میں نے سن رکھا ہے وڈے چودھری نے آپ کی امی جان سے محبت کی شادی کی تھی؟"

"ہاں، اور بابا جان نے امی جان سے شادی کے بعد ان کا پورا ساتھ بھی نبھایا تھا اور میں اپنی ماں کو جانتی ہوں، وہ مر جائیں گی مگر اس حالت میں وہ بابا جان کا ساتھ بھی نہیں چھوڑیں گی۔"

یہ سب بتاتے ہوئے زہرہ نے اسے اپنے اور اپنی ماں ستارہ بیگم کے بارے میں بھی بتا دیا۔

حویلی پہنچے تو شہر سے ایک ماہر ڈاکٹر چودھری الف خان کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اس نے چودھری الف خان کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ خوش خبری سنائی تھی کہ چودھری الف خان اب روبہ صحت تھے، پوری حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ستارہ بیگم کے تو خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے، ڈاکٹر نے بھی ان کی خدمات کو سراہا جنہوں نے دن رات اپنے شوہر کی تیمارداری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہلکی پھلکی ورزش (فزیوتھراپی) سے لے کر سہارا دے کر چہل قدمی کرانے تک... سب کچھ ستارہ بیگم نے انجام دیا تھا۔ الف خان اب باتیں بھی کرنے لگا تھا۔

زہرہ نے حویلی پہنچ کر... لئیق شاہ کو ابھی جانے نہیں دیا تھا۔ اسے مہمان خانے میں بٹھایا تھا اور اپنے کچھ آدمیوں کو وہاں اس کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا۔

چودھری الف خان کی صحت یابی سے اس کی پہلی بیوی مہرالنسا خوش نہیں تھی۔ پھر صحت یابی کے بعد تو اس کی سوکن ستارہ بیگم کی شوہر کی نظروں میں قدر و منزلت بھی سوا ہو گئی تھی، وہ جل بھن کر رہ گئی۔ زہرہ نے ابھی ممتاز خان کی چیرہ دستیوں کے حوالے سے باپ سے بات نہیں کی تھی مگر خاموش بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ البتہ ماں سے جب اس نے اس کا ذکر کیا تو وہ یک دم پریشان اور ہراساں نظر آنے لگی۔ وہ لئیق شاہ نامی نوجوان سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ زہرہ نے ماں کو اس سے مہمان گاہ میں ملوا بھی دیا۔ لئیق شاہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی، وہ گھبرا سا گیا اور فوراً کھڑے ہو کر ادب سے انہیں سلام کیا۔ ستارہ بیگم کو یہ سیدھا سادہ شریف سا نوجوان اچھا لگا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا، تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ ہم ماں بیٹی تو تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں اتار سکتے۔" ستارہ بیگم نے اپنے مہین آنچل کا پلو درست کرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو لئیق شاہ نے نظریں اور سر جھکائے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ سب سوہنے رب نے کیا۔ اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ پھر ایک نوکر کی حیثیت سے یہ میرا فرض بھی تو بنتا تھا۔"

"نہیں بیٹا! نہیں، تم نوکر نہیں ہو۔ اگر تم نوکر ہوتے تو میری بیٹی زہرہ بانو کبھی بھی مجھے تم سے نہیں ملواتی۔" ستارہ بیگم کے لہجے میں برسوں کا تجربہ بول رہا تھا۔ ان کے لفظوں کی معنی خیزی کو نہ صرف قریب کھڑی زہرہ بانو نے بلکہ خود لئیق شاہ نے بھی سمجھ لیا تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔

"ماں جی...! میں آپ کا اور زہرہ صاحبہ کا بھی تہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔"

لئیق شاہ کا ستارہ بیگم کو "ماں جی" کہنا زہرہ بانو کو بھلا لگا تھا۔

''ارے بیٹی! لئیق پُتر کو کچھ کھلایا پلایا بھی ہے، بہت تھکا تھکا نظر آرہا ہے۔'' ستارہ بیگم نے بیٹی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے۔ ابھی کھانا لگاتے ہیں۔'' وہ جواباً بولی۔

''نہیں جی... اس کی ضرورت نہیں۔ میں گھر جا کر کھالوں گا۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔'' لئیق شاہ بولا۔''میری ماں اور بابا پریشان ہورہے ہوں گے۔''

''ان کی فکر نہ کرو۔ میں ایک ملازم کو وہاں بھیج کر تمہاری خیریت کی اطلاع ان تک پہنچا دوں گی۔'' زہرہ بولی۔

''آپ کی مہربانی جی لیکن میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔''

''لئیق! وہ تمہارے خون کے پیاسے ہورہے ہوں گے۔'' زہرہ متذبذب نظر آنے لگی تو لئیق شاہ ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ بزدل ہیں سامنے سے وار نہیں کریں گے۔ میں نے ان سے محتاط ہونا سیکھ لیا ہے، زہرہ صاحبہ! بس آپ اپنی فکر کیجیے گا کیونکہ آپ ان کے درمیان رہتی ہیں۔''

زہرہ نے اسے بتایا کہ چودھری الف خان اب روبہ صحت ہیں۔ اب کسی کی ہمت نہیں ہوگی ان پر ہاتھ اٹھانے کی اور وہ بہت جلد الف خان سے اس کی شکایت بھی کرنے والی تھی۔ لئیق شاہ چلا گیا۔

☆☆☆

یہ اسی رات کا ذکر تھا، ہر سو خاموشی تھی، چودھری الف خان کو حویلی کے پائیں باغ میں ٹہلانے کے بعد ستارہ بیگم انہیں اندر کمرے میں لے آئی اور انہیں سہارا دے کر آرام سے مسہری پر لٹا دیا تو الف خان نے ستارہ بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت بھری مسکراہٹ سے بولا۔

''تم بھی بیٹھو میرے ساتھ... ہمیں لگتا ہے جیسے آج ہم دوبارہ زندہ ہوئے ہیں۔''

ستارہ بیگم شرم سے گلنار ہوتے ہوئے بولی۔''میری جان آپ پر قربان، اللہ آپ کو صحت اور لمبی عمر دے۔ آپ آرام سے لیٹ جائیں۔''

''نہیں تم بھی ہمارے ساتھ لیٹو... آج ہم لیٹ کر باتیں کریں گے، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔'' الف خان سرور میں بولا۔ ستارہ بیگم ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔

''چودھری صاحب! اب وہ عمر کہاں رہی مگر میرے لیے وہ یادیں ایک بڑی دولت سے بڑھ کر سرمایۂ حیات ہیں۔''

''کاش! تمہارے ساتھ وہ سیندور والی سازش نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم تم سے کوئی اچھا سا رومانی گانا سنتے... آج جانے کیوں بڑا دل کررہا ہے کوئی اچھا سا گیت سننے کو۔'' شوہر کی بات پر ستارہ بیگم کا چہرہ مغموم سا ہوگیا۔ چودھری الف خان نے ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے خود سے قریب کرلیا۔ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ جذبات پر کبھی ضعف نہیں آتا، بلکہ سچی محبت کرنے والوں کی محبت کو تو وقت کی دھول ماند کرسکتی ہے نہ عمر کی طوالت... وہ بس محبت کرنا جانتے ہیں پھر سچی وفا محض جسمانی ملاپ ہی کا نام تو نہیں، یہ تو دو پیاسی روحوں کا سنجوگ ہوتا ہے۔

رات کے کسی پہر جب چودھری الف خان کی آنکھ لگ گئی تو ستارہ بیگم آہستگی سے مسہری سے اٹھی، اپنا مسکا ہوا لباس اور آنچل درست کر کے اپنے کمرے میں آئی تو چونک پڑی، اس کی مسہری کے قریب سائڈ میز پر دودھ کا بھرا گلاس رکھا تھا اور اوپر کپڑے کا نفیس کور رکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اپنا دودھ خود کچن میں جا کر نکال کر پیتی تھی، پھر کچھ سوچ کر اس کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ عود کر آئی... ''زہرہ بیٹی ضرور کمرے میں آئی ہوگی اور مجھے نہ پا کر یہ دودھ بنا کے رکھ گئی ہوگی۔ کتنا خیال ہے میری بیٹی کو میرا۔'' اس نے سوچا۔ وہ واقعی تھکی ہوئی تھی، آج اس کا کچن میں جا کر دودھ بنانے کا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ویسے ہی سو جانا چاہتی تھی مگر چونکہ وہ رات کا کھانا کھانے کی عادی نہ تھی، صرف دودھ کا گلاس پیتی تھی، اسے معدے کی تکلیف تھی، اس لیے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ وہ خالی پیٹ نہ سویا کرے۔ کم از کم دودھ کا گلاس ضرور پی کر سویا کرے۔

وہ مسہری پر آکر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی، پھر دودھ کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اوپر سے کور ہٹایا اور گلاس منہ سے لگالیا مگر اس سے جانے کیوں بمشکل نصف گلاس ہی پیا جاسکا۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ تھی یا کچھ اور... اس نے باقی ادھ بھرا گلاس کور سے دوبارہ ڈھانپ کر رکھ دیا اور لائٹ آف کر کے سوگئی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور مسہری کے قریب ہی کھڑکی سے دو قاتل خونی آنکھیں اندر جھانک رہی تھیں اور پھر اگلے ہی لمحے مسہری پر دراز ستارہ بیگم کے وجود کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے کو

سہلانے لگی اور مسہری پر پڑے پڑے جاں کنی کے عالم میں تڑپنے لگی... یہاں تک کہ اس کا وجود بے حس و حرکت ہو گیا۔

کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی دو قاتل خونی آنکھوں نے یہ کرب ناک منظر دیکھا اور پھر جیسے تسلی کرنے کے بعد وہ غائب ہو گئیں۔ یہ اس کی سوکن مہر النسا تھی۔

شوہر کی صحت یابی اور اس کے دوبارہ ستارہ بیگم کی طرف ملتفت ہونے پر مہر النسا اندر تک جل بھن گئی تھی۔

''مجھے یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' کھڑکی سے ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بڑبڑائی۔ ''مگر کیسے کرتی؟ اس وقت چودھری بڑا دم خم رکھتا تھا۔ پھر میں بھی اکیلی تھی، اس کا سیدھا شبہ مجھ پر جاتا... اب چودھری بوڑھا ہو چکا ہے اور میں خود ایک جوان بیٹے کی ماں بن چکی ہوں۔''

شیطانی سوچوں کے تلاطم میں وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح پوری حویلی میں ہی نہیں بلکہ پورے نئے پنڈ میں کہرام مچ گیا۔ چھوٹی چودھرائن ستارہ بیگم انتقال کر گئی تھیں۔ زہرہ بانو تو ماں کی لاش دیکھ کر کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں آ گئی۔ چودھری الف خان جو روبہ صحت تھے، اپنی لاڈلی اور چہیتی بیگم کے اس طرح خاموشی سے روٹھ جانے کے باعث پھر ڈھے گئے۔ مہر النسا جو خود ایک زہریلی ناگن تھی، سوتن کی لاش پر کھڑے ہو کر مگرمچھ کے آنسو بہانے لگی۔ حویلی کی اور دیگر عورتوں نے زہرہ بانو کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس کا سکتہ توڑا تو زہرہ ایک کرب ناک اور ہذیانی چیخ مار کر ماں کی لاش سے لپٹ کر رو پڑی... مگر کچھ دیر بعد جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کے اندر بیداری کی لہر ابھری۔ خرد نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کیا، موجودہ حالات کی تلخی نے مہمیز کیا تو... یونہی اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر مسہری کی سائڈ ٹیبل پر پڑی۔ وہاں ادھ بھرا دودھ کا گلاس رکھا تھا۔ مہر النسا بھی قریب کھڑی تھی۔ مجرم جتنا بھی چالاک ہو، کتنی ہی بے داغ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کے لیے گڑھا کھودے... کہیں نہ کہیں اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ مہر النسا کو بھی اپنی ایک فاش غلطی کا احساس ہوا، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ زہرہ بانو کا خیال دودھ کے ادھ بھرے ..... گلاس کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ اس نے فوراً ایک خادمہ کے کان میں دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی، وہ گھبرا کر فوراً آگے بڑھی اور دودھ کا گلاس وہاں سے اچکنے لگی تو زہرہ بانو نے درشت آواز میں اسے منع کر دیا۔

''ٹھہرو، اسے ادھر ہی رکھا رہنے دو۔''

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زہرہ بانو دودھ کا گلاس اٹھا کر اسے اپنی آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنے لگی۔ پھر کور ہٹا کر اسے سونگھا۔ اسے کچھ شبہ ہونے لگا پھر اس نے بہ آواز بلند پوچھا۔

''یہ دودھ کا گلاس کس نے رات کو یہاں رکھا تھا؟''

کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ زہرہ نے حویلی کی تمام خادماؤں سے پوچھ لیا۔ سب نے انکار میں سر ہلا دیا تو بالآخر مہر النسا نے ہی آگے بڑھ کر مکارانہ فروتنی سے کہا۔

''ارے بیٹی... یہ تو دودھ ہے۔ ہوسکتا ہے ستارہ نے رات کو خود اپنے لیے یہ دودھ نکالا ہو اور آدھا پی کر... چھوڑ دیا ہو، لاش کو کفنانے کا انتظام ہمیں کرنا چاہیے... موسم ایسا نہیں ہے کہ لاش کو زیادہ پڑا رہنے دیا جائے۔''

زہرہ بانو کو اپنی سوتیلی ماں کے لہجے سے بے حسی کی بو محسوس ہوئی، اس نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ایک ملازمہ سے تحکمانہ بولی۔ ''ایک خالی اور صاف بوتل لے کر آؤ... میری ماں اس دودھ کو پینے کے بعد مری ہے۔ میں اس کا لیبارٹری تجزیہ کرواؤں گی۔''

اس کی بات سن کر مہر النسا دھک سے رہ گئی اور فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔ دونوں بھائی وراثت علی اور رئیس خان بھی موجود تھے۔ زہر کی پڑیا انہوں نے ہی لا کر دی تھی اور دودھ کا گلاس مہر النسا نے ہی اپنی سوتن کے کمرے میں رکھا تھا۔ زہر اسی نے ہی دودھ میں ملایا تھا۔

''یہ مصیبت تو گلے پڑ رہی ہے۔ جلدی کچھ کرو۔ وہ دودھ کا پتا نہیں کیا کرنے والی ہے۔'' مہرو نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

ممتاز خان کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ اس پر بینڈیج بندھی ہوئی تھی بولا۔ ''ماں جی! تمہیں دودھ کا گلاس پہلے ہی وہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ منحوس ستارہ بیگم آدھا دودھ بچا دے گی۔''

''ہمیں جلدی کچھ کرنا ہوگا۔ یہ لڑکی... ڈاڈی اوکھی ہے... سیدھا شہر کا رخ کرے گی اور ہم سب پر بہت بڑا مقدمہ کر دے گی۔'' وراثت علی نے متفکر ہو کے کہا۔ ممتاز خان کو اس کی پروا نہ تھی، وہ بولا۔

''کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس، اپنے منہ بند رکھو۔ ایک بڑی مصیبت سے آج ہمیں چھٹکارا مل گیا ہے تو اس مصیبت (زہرہ بانو) سے جلد ہی جان چھوٹ جائے گی۔''

''مگر وہ دودھ... وہ دودھ زہریلا ہے۔'' مہرالنسا متفکر ہوکر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بے شک ہوتا رہے۔''

''ہم سب جیل چلے جائیں گے پتر۔'' ماں ہراساں نظر آنے لگی۔ رئیس خان نے سمجھایا۔

''باجی جی! آسی فکر نہ کرو، زہرہ کا ہم راستہ کاٹ دیں گے۔''

''ہاں، وہ شہر پہنچ پائے گی تو زہریلے دودھ کا معائنہ کروائے گی نا، ماں جی۔'' ممتاز خان کے بدہیئت ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔ مہرالنسا بیٹے اور بھائی کی بات کا مطلب سمجھ کر تفہیمی انداز میں ہولے ہولے اپنے سر کو جنبش دینے لگی۔ تاہم پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''ابھی ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے چودھری صاحب حویلی کی عزت کی خاطر ایسا کرنے سے منع کردیں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔''

زہرہ بانو نے یہ بات باپ کو بتائی۔ چودھری الف خان الجھ کر رہ گیا۔ اسی وقت مہرالنسا اور ممتاز خان بھی وہاں آن موجود ہوئے، اور دونوں ماں بیٹا، زہرہ بانو کو تلخ اور زہریلی نظروں سے گھورنے لگے۔

''چودھری صاحب! آپ نے سنا... یہ لڑکی کیا گل کھلانے جارہی ہے؟''

''کیوں چودھرائن جی! آپ کو کوئی اعتراض ہے یا پھر کسی بات کا ڈر ہے؟'' اب زہرہ بانو بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی، ورنہ کم از کم باپ کے سامنے وہ اپنی سوتیلی ماں سے کبھی نہیں الجھی تھی اور آج اس نے بھی اسے وڈی ماں جی کے بجائے وڈی چودھرائن کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ چہرہ اب بھی اشکبار تھا۔ اتنی محبت کرنے والی، جان نچھاور کرنے والی ماں... آج ظالم زمانے کی نفرتوں، کدورتوں اور محلاتی سازشوں کا شکار ہوکر اس سے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی تھی۔ حقیقی باپ کا سایہ تو پہلے ہی سر سے اٹھ گیا تھا۔ اب ماں بھی نہیں رہی تھی۔ سوتیلا باپ تھا۔ پتا نہیں اب ماں کے مرنے کے بعد اس کا اس کے ساتھ بھی کوئی رشتہ بنتا تھا یا نہیں، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ زہرہ بانو کو اس تلخ اور کریہہ حقیقت کا ادراک ضرور ہونے لگا تھا کہ جو شخص (الف خان) اپنی چہیتی اور لاڈلی بیوی کے خلاف اندر ہی اندر اس حویلی میں پلنے والی سازشوں سے چشم پوشی کرتا رہا اور بالآخر اسے سازشی موت کھا گئی، وہ بھلا اب یہاں اس کا... ایک یتیم و یسر لڑکی کا کیا تحفظ کر پائے گا؟

''تم خاموش رہو مہرو، مجھے بات کرنے دو۔'' جہازی سائز مسہری پر نیم دراز چودھری الف خان نے بیوی سے تیز لہجے میں کہا۔ پھر زہرہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔

''بیٹی! اللہ گواہ ہے میں نے تجھے کبھی سوتیلے پن کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تیری ماں کے ساتھ تجھے بھی اپنانے اور ایک باپ کا پیار دینے کا جو وعدہ میں نے تیری ماں ستارہ بیگم سے کیا تھا، وہ میں نے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔''

''میں جانتی ہوں... بابا جانی۔'' زہرہ بانو یک دم تڑپ کر بولی۔ ایک ایسی بے آسرا مجبور لڑکی جس کے سر پر اب نہ باپ کا سایہ تھا نہ ماں کا... وہ اپنے سوتیلے باپ کی اس بات سے جھیر جھیر ہونے لگی۔ ہمدردی کے ان بولوں نے اسے رنجیدہ خاطر کردیا۔

چودھری الف خان نے کہا۔ ''بیٹی! مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں... بات کیا ہے وہ بتاؤ؟''

زہرہ بانو نے انہیں بتادیا کہ ان کی ماں کا انتقال نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں دودھ میں زہر دے کر قتل کیا گیا ہے اور... اس نے وہ سب بھی بتادیا جو وہ آئندہ کا لائحہ عمل اپنے ذہن میں رکھتی تھی۔

یہ سب سن کر چودھری الف خان کے جھریوں زدہ چہرے پر شکنوں کا جال مزید گہرا ہوگیا اور آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی، وہ زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بیٹی! تمہیں اس بات کا صرف شبہ ہے یا یقین؟''

''شبہ ہی ہے مگر یقین کی حد تک شبہ۔''

''اس کی کوئی ٹھوس وجہ تو ہوگی؟'' الف خان نے گہری متانت سے کہا۔ ''کیونکہ بسا اوقات چھوٹے موٹے خاندانی جھگڑوں میں اگر اس طرح کا کوئی قدرتی یا طبی حادثہ ہوجائے تو خوامخواہ ہی دلوں میں بڑی بڑی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا محض شبے کی بنا پر یہ معاملہ حویلی سے باہر جائے اور خوامخواہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے۔''

باپ کی بات پر زہرہ بانو نے ایک تلخ سی نگاہ سامنے ماں کے ساتھ کھڑے ممتاز خان پر ڈالی اور باپ سے بولی۔

''بابا جانی! آپ کی بات مجھے تسلیم ہے۔ مجھے اس

میں برسوں کے تجربے کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ بسا اوقات چھوٹی موٹی خاندانی تلخیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس دوران کوئی اتفاقاً حادثہ ہو جائے تو بڑی خطرناک غلط فہمی جنم لیتی ہے لیکن اگر میں اس ضمن میں آپ سے اپنے شبے کی بنیاد پر ایک ٹھوس ثبوت پیش کرنا چاہوں تو کیا آپ اسے تسلیم کریں گے؟''

''بالکل تسلیم کروں گا زہرہ بیٹی۔ کیوں نہیں کروں گا۔ ہم تمہارے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ بولو... کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی؟''

زہرہ بانو نے ایک گہری سانس لی اور پھر انہیں شروع سے آخر تک اس کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان کی بدمعاشیوں اور چیرہ دستیوں کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ الف خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ممتاز خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

''اب آپ ہی انصاف سے بتائیں مجھے بابا جانی کہ میرے شبے کی وجہ چھوٹی موٹی ہے یا ٹھوس ہے؟'' زہرہ بانو نے ساری صراحت بتانے کے بعد چودھری الف خان سے کہا تو ممتاز خان غصے سے پھٹ پڑا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے بابا جانی! سفید جھوٹ۔''

''اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر تمہارے بازو پر پلستر کیوں چڑھا ہوا ہے؟'' زہرہ بانو نے طنزیہ کہا۔

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ وہاں میرے ساتھ معمولی حادثہ پیش آ گیا تھا۔''

زہرہ بانو اس سفید جھوٹ پر ششدر رہ گئی۔ مہرو بھی بیٹے کی حمایت میں بولی۔ ''لڑکی! تمہیں شرم آنی چاہیے میرے بیٹے پر ایسا گھناؤنا اور گھٹیا الزام لگاتے ہوئے۔''

''وہ مزدور اور ورکرز گواہ ہیں ان سب باتوں کے۔ وہ لئیق شاہ نامی نوجوان بھی... جو سالونٹ پلانٹ کے مزدوروں کا لیڈر ہے۔'' زہرہ نے کہا۔

''تم جن مزدوروں اور ورکروں کی بات کر رہی ہو، وہ سب تمہارے خریدے ہوئے ہیں۔ رہی بات لئیق شاہ جیسے کی کمین کی تو اس کے ساتھ تم اس روز سالونٹ پلانٹ کے ویران احاطے میں کیا راز و نیاز میں مصروف تھیں، وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مجھے تو بابا جان کے سامنے ایسی بات بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔'' ممتاز خان نے موقع ملتے ہی پانسا پھینکا۔

''تو تم تسلیم کرتے ہو کہ اس روز تم وہاں آئے تھے۔'' زہرہ بانو نے اس کی بات پکڑ لی۔

"بے شک آیا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تمہاری وجہ سے سالونٹ پلانٹ جیسا دھندا کیوں ٹھپ ہو کر رہ گیا؟" ممتاز خان نے چالاکی سے ایک اور جھوٹ بولا۔ مکار مہر النسا نے ممتاز خان کو وہاں سے جانے کا کہا۔ وہ زہرہ کو زہریلی نظروں سے گھورتا ہوا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ مہر النسا نے نفرت بھری نظروں سے زہرہ بانو سے کہا۔

"بس لڑکی! ثابت ہو چکا ہے، تم جھوٹی ہو اور درحقیقت اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میرے معصوم بیٹے پر گھناؤنا الزام لگا رہی ہو۔ تمہیں بھلا خاندان کی عزت کی کیونکر فکر ہوگی؟ لئیق شاہ والے معاملے کی وجہ سے تو لوگ ابھی سے ہی ہمارے بارے میں باتیں کرنے لگے ہیں اور اب تم شہر جا کر ہمارے خلاف مزید گل کھلانا چاہتی ہو؟"

"یہ لئیق شاہ والا کیا معاملہ ہے زہرہ بیٹی؟" چودھری الف خان نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زہرہ بانو سازشی اور مکاریاں بیٹے کے جھوٹ درجھوٹ پر پہلے ہی اندر سے کھلی جا رہی تھی، ماں کی اچانک وفات کا اسے پہلے ہی غم کھائے جا رہا تھا۔ اب تو خود کو واقعی تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اب سب اس کے دشمن ہونے لگے ہوں۔ انصاف ملنے کی ایک امید تھی، وہ بھی الف خان کی خاموشی سے دم توڑتی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل رقیق سا ہونے لگا۔ آنکھوں کے گوشے فرطِ رقت سے نمناک ہونے لگے، تاہم باپ کے سوال پر وہ جواباً بولی۔

"بابا جانی! مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں کو جھوٹ اور الزام سمجھا جا رہا ہے جبکہ سچ..."

"ہم نے تم سے لئیق شاہ کے بارے میں پوچھا ہے زہرہ بانو؟" اس بار چودھری الف خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا تو زہرہ بانو کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ قریب کھڑی مہر النسا کے عیار چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"بابا جانی! لئیق شاہ ایک غریب ماں باپ کا شریف لڑکا ہے اور ہمارے پلانٹ کا پرانا ورکر ہے۔" بالآخر زہرہ بانو نے بتایا۔

"کیا وہ سب سچ ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بیٹے ممتاز خان نے اس کے اور تمہارے بارے میں بتایا؟"

"کمال ہے بابا جانی، آپ نے اپنے بیٹے ممتاز خان کی محض ایک بات پر بڑے کڑے انداز میں مجھ سے باز پرس شروع کر دی اور میں نے اتنی بات حقیقت بتائی اس سلسلے میں آپ نے اپنے بیٹے ممتاز خان سے ایک سوال بھی نہیں پوچھا؟"

چودھری الف خان کی جانبداری محسوس کر کے زہرہ بانو کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں باپ بیٹی کے درمیان اس طرح تلخ انداز میں ایک اہم موضوع پر بحث چھڑ گئی تھی۔

چودھری الف خان لاجواب ضرور ہوا مگر اس کی چودھراہٹ والی رگ پر لئیق شاہ کے موضوع نے شدید ضرب لگائی تھی اور یہ حساس نوعیت کی چال دونوں مکار اور سازشی ماں بیٹے نے سوچ سمجھ کر ہی کھیلی تھی۔

"زہرہ بیٹی! خاندان کی آن بان اور عزت پر ایک ذرا سی آنچ آنے سے پہلے ہم جانیں تک داؤ پر لگانے سے نہیں ہچکچاتے... تمہارا لئیق شاہ کے سلسلے میں جواب سخت ابہام کا شکار ہے۔ اگر بات واقعی وہی ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں تو پھر اس بات کو ابھی ختم کر ڈالو۔ بہ صورت دیگر تمہیں یا... اس لڑکے کو... یہ گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔"

چودھری الف خان نے خالص جاگیردارانہ لہجے میں کہا۔ زہرہ بانو کے چہرے پر تلخی کھل گئی۔ منہ پھٹ تو وہ شروع ہی سے تھی، مگر حفظِ مراتب کا پاس کرنا بھی جانتی تھی، لیکن جب بات صحیح غلط اور حق سچ کی آئی تو وہ چپ نہیں رہ سکی اور بولی۔

"بابا جانی! آپ نے بھی تو امی جان سے محبت کی شادی کی تھی۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے، وہ کون تھیں کیا تھیں مگر آپ نے تو کسی کی پروا نہیں کی اور میں تو سمجھتی تھی آپ جذبۂ محبت کے بڑے قدرداں اور داعی ہیں۔ مجھے اس پر ساری عمر فخر بھی رہا ہے کہ آپ دونوں نے جس محبت کا عمر بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا، وہ پورا بھی کیا تھا پھر... اب میرے سلسلے میں یہ جانب داری کیوں برتی جا رہی ہے؟"

مہر النسا جو باپ بیٹی کے دلوں میں ایک نفاق کا بیج بو چکی تھی اور اندر ہی اندر اپنی اس کامیابی پر خوش بھی ہو رہی تھی، فوراً زہرہ بانو کو جھڑکتے ہوئے غصے سے بولی۔

"لڑکی! کیا تم اب تمیز بھی کھونے لگی ہو، اپنے باپ سے اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"تم جاؤ مہر النسا! میں خود اس سے بات کر رہا ہوں۔" چودھری الف خان نے بارعب لہجے میں بیوی سے کہا اور وہ زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے

ہوئے کمرے سے نکل گئی، مگر دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی ہوگئی، اب وہ اندر کی سن گن لے رہی تھی۔

''دیکھو بیٹی! ہماری بات اور تھی، ایک مرد کی سو خامیاں چھپ جاتی ہیں مگر ہماری نظر میں عورت کا معاملہ اور ہوتا ہے۔ پھر بات خاندان کی عورت کی ہو تو... بات اور بھی حساس ہو جاتی ہے۔ بے شک تمہارا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم نے ستارہ بیگم سے تمہارے تحفظ اور تربیت کے سلسلے میں جو ہو سکا، وہ کیا ہم نے... لیکن بہرحال، اب ایک حوالے سے تم بھی ہمارے خاندان سے نتھی ہو چکی ہو۔ میں تمہارے لہجے سے سرکشی کی بو محسوس کررہا ہوں۔ میں تم پر اب شاید کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر تم ایسے کسی معاملے پر بضد ہو جس میں ہماری مرضی شامل نہیں... تو پھر تم اپنا راستہ الگ کر سکتی ہو جو تمہارا حق تھا، وہ ہم تمہیں دے چکے۔''

باپ کی بات پر زہرہ بانو کے وجود میں کرب کی لہر سی ابھری۔ لئیق شاہ سے وہ محبت کرتی تھی، وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی مگر چودھری الف خان نے آج خود ہی اس کے اور اپنے رشتے کے بیچ گویا خط تنسیخ کھینچ دی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی جس کا بہت پہلے سے زہرہ بانو کو بھی اندازہ تھا تو پھر اس بحث کو بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''میں شاید خود بھی اب یہاں نہ رہ سکوں بابا جانی۔''

''تو تم نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے یہاں سے؟''

''جی ہاں، بابا جانی! لیکن میں آپ کی محبت کو نہیں بھولوں گی۔''

''ہم بھی تمہیں ستارہ بیگم کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھیں گے، اب اس موضوع کو اِدھر ہی دفن کردو، ہم تمہیں جو دے چکے وہ دے چکے اس پر اب تمہارا ہی حق ہے۔''

''اور امی جان کے خلاف سازش اور ان کے قتل نما انتقال کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' زہرہ بانو نے حلق میں اترتی رقت سے پوچھا۔

''ہمیں اس بات پر قطعاً یقین نہیں ہے کہ ایسا ہوا بھی ہوگا۔'' چودھری الف خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ کو یقین آئے گا بھی کیوں بابا جانی! اس لیے کہ اس کا تعلق آپ کے خاندان سے جڑا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی زہرہ بانو کے گھٹے گھٹے لہجے میں تلخی اتر آئی اور اس نے دانستہ لفظ ''خاندان'' کو چبا کر ادا کیا۔

''اب تم ہم پر طنز بھی کرو گی؟'' چودھری الف خان نے اس کی طرف گھورا۔

''تو کیا پھر... میں امی جان کا خون رائگاں جانے دوں؟''

''یہ تمہارے اپنے دماغ کا خلل ہے۔''

''میں دودھ کا لیبارٹری تجزیہ کرواؤں گی پھر تو آپ کو یقین آجائے گا نا... بابا جانی؟''

''اگر ایسا کرو گی تو... پھر تم ہمیں بابا جانی کے حق سے بھی محروم کردو گی۔'' الف خان نے سرد لہجے میں کہا۔

''پھر ہم بھی یہی سمجھیں گے کہ اس دودھ میں زہر ملایا گیا ہے۔ ہم پر، ہماری آن اور ہمارے خاندان کو برباد کرنے کے لیے...''

زہرہ بانو، چودھری الف خان کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار اس احساس سے آنسو بہہ نکلے کہ شاید اب اس کی ماں کا خون بھی رائگاں چلا گیا۔

وہ روتی ہوئی پلٹ گئی۔ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور اوندھے... منہ بستر پر گر کر تکیے میں اپنا منہ دیے پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ جب دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو ماں کی بڑی سی فریم کی ہوئی تصویر سے باتیں کرنے لگی۔

''امی جان! مجھے معاف کر دیجیے گا۔ شاید میں وہ سب نہ کر سکوں جو آپ کے خون ناحق کے بہہ جانے پر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کی وجہ بھی آپ ہی تو ہیں امی جان! میں جانتی ہوں آپ کو بھی شوہر سے کتنی محبت تھی۔ آپ بھی تو نہیں چاہیں گی نا کہ میں آپ کے محبوب شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھاؤں جو اُن کے لیے دکھ اور ذہنی اذیت کا باعث بنے۔ میں بھی اس وجہ سے مجبور ہوگئی امی جان! اگر ایسا سب کچھ ہوا ہے آپ کو کسی نے موت سے ہمکنار کیا ہے تو امی جان! پھر میں یہ معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔ وہی سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ مگر امی جان! اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں آپ کی تصویر کو اپنے سینے سے لگائے یہاں سے چلی جاؤں گی، ہمیشہ کے لیے۔''

☆☆☆

ماں کے مرنے کے بعد زہرہ بانو کو اب اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ اب اس کی حویلی میں بلکہ نئے پنڈ میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ چودھری الف خان نے بھی ستارہ بیگم کی وفات کے بعد ''محلاتی'' مصلحت کوشی اپنالی تھی اور اب اس کا جھکاؤ مہرالنسا اور اپنے بیٹے ممتاز خان کی طرف زیادہ ہونے لگا تھا۔ شاید وہ بھی سمجھ

رہا تھا کہ ستارہ بیگم کے بعد ان کی گئے وقتوں کی اس طوفانی محبت کا بھی خاتمہ ہو چکا۔ اب ذرا خوابوں سے نکل کر حقیقت کو دنیا کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ اس پر مستزاد لئیق شاہ والے معاملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا اور ایک طرح سے چودھری الف خان نے زہرہ بانو کو بھی اپنی زندگی سے نکال پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ زہرہ بانو کو اس بات کا قلق تھا۔ وہ چودھری الف خان کی اس بے حسی سے دل برداشتہ بھی ہوئی مگر اس کے دل میں وفا کا خمیر اس کی ماں ستارہ بیگم سے ہی تو اٹھا تھا۔ اس نے دلی طور پر الف خان سے ناتا نہیں توڑا تھا۔ وہ اسے اب بھی اپنا باپ سمجھتی تھی۔ چاہے سوتیلا سہی۔ کیونکہ بہرحال اس نے زہرہ بانو کی ایک باپ ہی کی طرح پرورش کی تھی۔ زہرہ بانو ان سے ایک بیٹی ہی کی طرح محبت کرتی تھی، انہیں باپ سمجھتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ باپ کے ساتھ ہی رہے۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ان کی خدمت کرے، مگر سازش کی آندھیوں نے حالات کا رخ موڑ دیا تھا۔ اب تو بقول شاعر... وہی پتے ہوا دینے لگے جن پر تکیہ تھا۔ چودھری الف خان نے خود ہی ایک طرح سے زہرہ بانو کو خود سے علیحدہ کر دیا تھا۔

زہرہ بانو نے ان ساری باتوں اور کربیہ حقیقتوں کے باوجود خود کو ڈھنے نہیں دیا تھا۔ اس کے حوصلوں کے سفینے اب بھی بلند تھے۔ چودھری الف خان سمیت سبھی نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جو کرنا چاہتی تھی، اس سے بھی روک دیا گیا تھا۔ زہرہ بانو ہٹ کی پکی تھی، حوصلہ اور ہمت ہارنے والی نہیں تھی، مگر باپ نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ تاہم زہرہ نے اپنے یقین کی حد تک قائم ہونے والے شبہے کی تصدیق کرانے کا عزمِ صمیم ضرور کر رکھا تھا۔

اس نے حویلی (نئے پنڈ) سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے سے پہلے کچھ دن یہاں گزارنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا۔ اپنا سامان وغیرہ سمیٹنے کے بہانے اس نے چودھری الف خان سے گویا کچھ دن یہاں قیام کے لیے مستعار لے لیے تھے، مگر ایک کام فوری طور پر اس نے یہ ضرور کیا تھا کہ یہاں موجود اپنے ایک آدمی کو دودھ کی بوتل دے کر فوراً ملتان روانہ کر دیا اور کمیل دادا کو بھی ضروری ہدایات فون پر دے دیں۔

دودھ کا لیبارٹری تجزیہ کرانا ضروری تھا اور اس نے کمیل دادا کو سختی سے تاکید کی تھی یہ کام پہلی فرصت میں کروا کے اس کی رپورٹ دے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ لئیق شاہ سے بھی ایک ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی۔

ماں کے سوگ کا تیسرا دن تھا۔ اس روز کی حتمی گفتگو کے بعد سے جیسے مہر النسا اور ممتاز خان کو کھلی چھوٹ مل گئی تھی، دونوں ماں بیٹا اب بڑے دھڑلے کے ساتھ زہرہ بانو کو تنہا اور اب ''بے آسرا'' جان کر سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے لگے۔ ممتاز خان کو تو اس نے دانت پیس کر خونخوار انداز میں بڑبڑاتے بھی پایا تھا۔ ''تم اب زندہ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ تمہیں اس حویلی اور اس پنڈ سے ہی نہیں ہر اس چیز سے دستبردار ہونا پڑے گا جو تمہاری ملکیت میں لکھ دیا گیا تھا۔''

زہرہ بانو ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والی نہیں تھی۔ تاہم اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ حویلی کے روزن... ایک ذرا شہ پر مخالفتوں کی تیز آندھیوں سے کشادہ ہونے لگے تھے، دشمن کے عزائم خطرناک نظر آنے لگے تھے۔ اس روز جب وہ ایک سنسان راہداری سے ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی، تو یک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے کہیں سے ممتاز خان کی پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''ماں جی! اس ناگن کا اس طرح حویلی سے جانے کا ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ یہاں سے بہت سی جائداد لوٹ کر جا رہی ہے اور میں اسے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔''

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے زہرہ بانو کے قدم رک گئے۔ ساتھ ہی اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ سن گن لینے کی اس میں عادت نہیں تھی، لیکن موجودہ حالات کی ''جنگ'' سب جائز ہے کا تقاضا کرتی تھی، وہ رک گئی۔ جس کمرے کے دروازے سے آواز ابھری تھی، وہ اس کے ذرا اور قریب ہو گئی۔ وقت سہ پہر کا تھا۔ کسی کی آمدورفت کم ہی تھی۔

''جا رہی ہے تو دفع ہونے دو، پلانٹ پر تو اب اس کا قبضہ ختم ہی سمجھو۔ اب یہاں کے بجائے شہر ہی میں نمٹنا اس ناگن سے۔''

یہ مہر النسا کی آواز تھی۔ ''تم نے دیکھا نہیں، اسے ہم پر شبہ ہو چکا ہے بلکہ یقین کہو کہ ہم نے ہی اس کی ماں کو دودھ میں زہر دے کر مارا ہے۔ اب اگر اس کا بھی ادھر ہی خاتمہ کرو گے تو... تمہارے بابا جانی کا کہیں ہم سے بھی دل خراب نہ ہو جائے۔''

زہرہ بانو اس بات پر بری طرح ٹھٹکی۔ اس کا دل کرب سے بھر گیا۔ ''اب بھلا کسی لیبارٹری تجزیے کی کیا

ضرورت باقی رہ گئی تھی؟" یہ سنتے ہی زہرہ کو اپنا پورا وجود سلگتی آگ کی لپیٹ میں محسوس ہونے لگا۔

"بابا جانی اب کیا بگاڑ سکتے ہیں ہمارا ماں جی۔" ممتاز خان کی خرانٹ زدہ آواز ابھری۔ "انہوں نے جو کرنا تھا، وہ کر چکے اب باقی کا کام ہمیں ہی کرنا ہے۔ میں اس ناگن کی کمزور رگ سے واقف ہوں، ایک آخری داؤ کھیلنا چاہتا ہوں میں ماں جی، پھر دیکھنا یہ ناگن اپنا سب کچھ ہمارے نام کردے گی۔"

اسی وقت زہرہ بانو کو کہیں قریب ہی ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اس طرف آرہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور جب اپنے کمرے میں پہنچی تو اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں، اس کے جی میں تو آئی کہ وہ ان دونوں سازشی ماں بیٹے کے خلاف اپنی ماں کو قتل کر دینے کا مقدمہ کردے۔ مگر پھر دل مسوس کر رہ گئی، چودھری الف خان آڑے آجاتا، اور ماں کا چہرہ چشم تر میں لرزنے لگتا... اچانک اسے ممتاز خان کی آخری بات یاد آئی، اس نے اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے اس کی کمزور رگ کا ذکر کیا تھا اور اس کی کمزوری لئیق شاہ کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی، اس کی وجہ سے تو وہ حویلی بدر ہونے والی تھی۔

"تو کیا یہ لوگ اب... اس غریب نوجوان کو بھی اپنی کسی مکروہ اور گھناؤنی سازش کا نشانہ بنانے والے تھے؟"

اس خیال نے ہی زہرہ بانو کو سرتاپا لرزہ کر رکھ دیا۔

"ممتاز خان! اگر لئیق شاہ کا تم نے ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش چاہی تو میں حقیقتاً تم دونوں ماں بیٹے کے لیے ناگن بننے میں بھی دیر نہیں لگاؤں گی، ایک زہریلی ناگن۔" دفعتاً زہرہ بانو جوشِ غیظ تلے غرائی۔

اس بات نے اسے بے چین کر دیا تھا کہ اب ممتاز خان.... اس کے محبوب کے خون کا بھی پیاسا ہو رہا تھا۔ وہ پھر نہیں بیٹھی، اسی وقت اپنی کار میں نکلی اور لئیق شاہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی، یوں بھی اب وہ یہاں سے جانے سے پہلے... لئیق شاہ سے ایک ملاقات ضرور کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس کے گھر پہنچی تو بری طرح ٹھٹکی۔ وہاں شور وغل مچا ہوا تھا۔ ایک کہرام تھا جو بپا تھا۔ لئیق شاہ کے جھونپڑ نما کچی گارے مٹی کی دیواروں والے گھر کو کسی نے آگ لگا دی تھی۔ وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ یہ دیکھ کر زہرہ بانو کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ وہ کار سے اتر کر دیوانہ وار بھڑکتے شعلوں کی طرف بڑھی، اس کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ "لئیق شاہ.... لئیق شاہ۔"

وہ اس قدر غم زدہ اور مایوسی کی گہرائی میں تھی کہ اسے اس بات کا بھی یارا نہیں رہا کہ وہ آگ کے بھڑکتے ہوئے عفریت کی جانب بڑھ رہی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لا رہے تھے اور آگ بجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دھواں بھی اٹھ رہا تھا، دور دور تک سلگتی ہوئی آگ کی تپش بھی جا رہی تھی، کچھ لوگوں نے زہرہ بانو کو دیوانہ وار چلاتے ہوئے، آگ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش بھی کی مگر زہرہ بانو کے سر پر ایک ہی جنون سوار تھا، لئیق شاہ... وہ نہیں رکی، دوڑتی رہی۔ حتیٰ کہ آگ کی تپش سے اس کا نازک اندام وجود جھلسنے لگا۔ وہ پسینے سے تربہ تر ہوگئی، اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ خود کو بھی دیوانہ وار شعلوں کی نذر کرنے والی تھی کہ اچانک عقب سے کسی نے اسے پکڑ لیا۔ اسے روک لیا بلکہ بے اختیار اپنے دو مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر خود سے لگا لیا۔ اور اس "گھیرے" میں نڈھال سی زہرہ بانو کو نہ جانے کیسا سکون ملا تھا کہ اس کی روح تک سرشار ہوگئی اور یہ سرشاری شاید اس کی برداشت سے باہر تھی کہ وہ غش کھا گئی۔

☆☆☆

جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اسے ماحول میں اندھیرے کی کیفیت محسوس ہوئی۔ فضا میں جلی جلی سی بو پھیلی ہوئی تھی، کچھ سیلن کا بھی احساس ہوتا تھا۔ وہ چند ثانیے تو اسی طرح پڑی جھکی جھکی سرکنڈوں کی چھت کو خالی نظروں سے گھورتی رہی۔ ذہن کی بیداری کے ساتھ اسے رفتہ رفتہ پیش آمدہ واقعے کی دھندلاہٹ چھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پھر اسے وہ بھڑکتی آگ یاد آنے لگی جس کی لپیٹ میں لئیق شاہ کا گھر بھی تھا اور شاید وہ خود بھی یہی سمجھ کر تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور دیوانہ وار بھڑکتی آگ میں کود پڑنے کو بھی تیار تھی مگر نہیں عین وقت پر اسے دو مضبوط بازوؤں کے حلقے میں لے لیا گیا تھا جس کی گرفت اور قربت میں شناسائی کی خوشبو آئی تھی جس کی سرشاری نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ پوری طرح بیدار ہوگئی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی چارپائی پر پڑی تھی جس پر پرانا سا کھیس بچھا ہوا تھا۔ ایک کھلی کھڑکی کے راستے سے باہر کی ملگجی سی روشنی اندر آرہی تھی۔

اس نے گردن موڑ کے دیکھا اور یک دم چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔ وہ پھر بے قراری ہوگئی۔ کمرا کشادہ تھا۔ کچے ناہموار فرش پر بڑی سی میلی دری بچھی تھی، اور اس میں کچھ جوان اور بوڑھی عورتیں، سر تھامے بیٹھی تھیں کہ زہرہ بانو کو

ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی سانولی عورت اٹھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

''م... میں کہاں ہوں؟ کیا ہوا تھا؟ وہ آگ... لئیق شاہ...'' زہرہ بانو کے کپکپاتے لبوں سے بے ربط الفاظ برآمد ہوئے، شاید اس کے حواس ہنوز نیم غشی کا شکار تھے، ایک موٹی سی سانولی جوان دیہاتن عورت اٹھ کر چارپائی کے قریب آگئی اور قدرے جھک کر بولی۔

''چودھرائن... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا... اب؟''

''ہاں... ہاں میں ٹھیک ہوں، مجھے بتاؤ وہ... وہ...'' الفاظ اس کے مرتعش لبوں میں ہی اٹک کر رہ گئے اور اس کی پھٹی پھٹی نگاہوں کے سامنے کشادہ کمرے کی کھلی چوکھٹ تھی، وہاں اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ لئیق شاہ کھڑا تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کسرتی بدن پر جھولتا ہوا کرتہ تھا بازو ادھڑے ہوئے اور اوپر کو چڑھے ہوئے، کچھ بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے، جس میں سے بالوں بھرا وجیہہ سینہ جھانک رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ غم کی عکاسی کر رہا تھا اور آنکھوں سے غیظ اور کرب کے ملے جلے تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔

لئیق شاہ کو جیتا جاگتا اپنے سامنے پا کر زہرہ بانو کا جیسے سارا دھڑکتا وجود یک دم پُرسکون ہو گیا۔ اپنے محبوب کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت اٹھ کر باہر گئی تھی شاید اس نے ہی باہر جا کر لئیق شاہ کو زہرہ کے ہوش میں آنے کی اطلاع پہنچائی تھی۔

''لئیق شاہ۔'' زہرہ نے بے اختیار اسے پکارا اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، اسے لئیق شاہ کے اترے اترے غمناک چہرے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس کے پکارنے کے باوجود لئیق شاہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، وہیں کھڑے کھڑے اس سے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''آپ کو ہوش آگیا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو آپ یہاں سے جاسکتی ہیں۔''

زہرہ بانو کو آج لئیق شاہ کا لہجہ بدلا ہوا سا محسوس ہوا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''یہ... یہ... آگ... تت... تمہارے گھر کو کس نے آگ لگائی تھی، یہ سب کیسے ہوا؟ تمہارے ماں باپ؟''

''کون لگا سکتا ہے یہ آگ زہرہ صاحبہ؟'' لئیق شاہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور نظریں سرد، لہجہ غم کی چغلی کھایا ہوا تھا۔ ''میں اب حویلی کو آگ لگا دوں گا، کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یک دم جیسے لئیق شاہ گرج کر بولا۔

''لل... لیکن...'' زہرہ بانو نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر کھردرے لہجے میں بولا۔

''زہرہ صاحبہ! میں نے باہر برادری کے لوگوں کو بڑی مشکلوں سے روک کے رکھا ہے۔ وہ آپ کی بھی جان کے دشمن ہو رہے تھے، میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی حویلی والوں کی نظروں میں کیا حیثیت ہے مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ باہر آپ کی کار موجود ہے۔ بہتر یہی ہے آپ کے لیے کہ جتنی جلدی ہو سکے، آپ یہاں سے چلی جائیں۔''

سرد سپاٹ اور بے رحم لہجے میں یہ سب کہنے کے بعد لئیق شاہ واپس جانے کے لیے پلٹا تو زہرہ بانو کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آگے بڑھی۔

''لئیق شاہ... ٹھہرو۔''

وہ رک گیا مگر اس کی طرف پلٹا نہیں، پیٹھ کیے کھڑا رہا۔

''م... میرا اب اس حویلی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ان ظالموں نے میری ماں کو بھی دودھ میں زہر ملا کر مار ڈالا۔'' اس کا خیال تھا یہ سن کر لئیق شاہ یک دم اس کی طرف پلٹ پڑے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہاں البتہ اس نے ایک ذرا اپنے شانے تک گردن موڑ کر پُرسوچ انداز میں کچھ غور کرنے کی کوشش ضرور چاہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں لئیق شاہ... پھر تم تو سب جانتے ہو، کیا تم اپنے لوگوں کی میری طرف سے غلط فہمی دور نہیں کر سکتے؟''

''بات اب غلط فہمی کی نہیں رہی ہے۔ یہ تم لوگوں کا اپنا معاملہ ہے۔ میرے ماں باپ آگ میں زندہ جلا دیے گئے، حویلی والوں کے ایسے ظلم نے ہم سب کو خون کے آنسو رلا دیا ہے اس لیے تو آپ یہاں، اب تک زندہ کھڑی ہو۔ یہ معاملہ اب بڑے سردار جی کے جرگے میں پیش ہونے جا رہا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔'' انتہائی سرد مہری سے یہ سب کہتے ہوئے لئیق شاہ... صحن کی طرف چلا گیا۔ ہکا بکا رنجوری کھڑی زہرہ کو باہر کافی سارے مرد و جوان غصے سے بھرے ہوئے آپس میں بڑبڑاتے دکھائی دیے۔ کمرے میں موجود باقی عورتیں بھی زہرہ بانو کو اب چبھتی ہوئی نظروں

سے گھورنے لگی تھیں۔ زہرہ بانو اپنے سر کا آنچل درست کیے صحن کے درمیان سے گزرنے لگی۔ اس کے آگے آگے لئیق شاہ چلا جا رہا تھا۔ وہ اسے دروازے کے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہاں اتری ہوئی شام کا کاجل بکھرا ہوا تھا۔ سامنے اس کی کار کھڑی تھی، کچھ ننگ دھڑنگ بچے کار کے گرد جمع تھے، دائیں بائیں گارے مٹی اور اپلے تھپی ہوئی دیواروں اور سرکنڈوں کے گھروں کی بے ترتیب قطار تھی۔ ایک عجیب سوگوار سا منظر تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر جہاں لئیق شاہ کا گھر تھا وہاں اب راکھ جلا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ اب بھی وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ زہرہ بانو کو بے اختیار اپنے وجود میں کرب کی لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ لئیق شاہ اسے آگے بڑھنے کا راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

زہرہ بانو نے ایک مجبور سی نگاہ اس کے جلتے سلگتے چہرے پر ڈالی مگر وہاں اپنے لیے کوئی رمق نہ پا کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی، اپنی کار کے قریب آئی، دروازہ کھولا۔ اندر سوار ہونے سے پہلے اس نے ایک نگاہ قریب کھڑے لئیق شاہ پر ڈالی اور ہولے سے اسے مخاطب کر کے بولی۔

”لئیق شاہ! میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، م م... میں تو... خود مظلوم ہوں، تم فقط اتنا بتا دو مجھے... کک... کیا... تم بھی مجھے... قصوروار سمجھتے ہو؟“ یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے زہرہ بانو کا لہجہ ڈبڈبا گیا۔ مجبور نگاہیں چھلک پڑیں۔ اس کی بات پر لئیق شاہ نے پہلی بار تڑپ کر اس کی جانب دیکھا تو بے اختیار اس کا اپنا بھی جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر زہرہ کو اپنے سینے سے لگا لے۔ اس کی محبت میں اس نے جو اپنے اندر طبقاتی تفاوت کی ایک بے نام سی مصلحت اور کسی کی بھلائی کی خاطر جو خودساختہ بند باندھ رکھا ہے، اسے توڑ ڈالے اور کہہ ڈالے اس سے۔

”نہیں... زہرہ صاحبہ! ہرگز نہیں۔ بھلا میں آپ کو قصوروار کیوں کہوں گا؟ آپ کے ساتھ بتائے ہوئے شناسائی کے روز و شب نے مجھے آپ کے دکھ درد سے بھی آگاہ کر رکھا ہے مگر... زہرہ صاحبہ! میں مجبور ہوں۔ یہ معاملہ اب کچھ اور صورت اختیار کر گیا ہے۔“ مگر وہ اس کی ہمت نہ کر سکا۔ نہ ہی وہ کوئی جواب بھی دے پایا بس وہ اس کی طرف تکتا رہ گیا تو زہرہ بانو کو جیسے خود ہی اس کا جواب بھی مل گیا۔

”خوب! تو تم اپنی برادری کے لوگوں کی وجہ سے مجبور ہو لیکن لئیق شاہ... کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہاری خاطر حویلی کے عیش و آرام کو ٹھکرا دیا اور اب کچھ ہی روز میں نئے پنڈ کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے جانے والی ہوں۔ تت... تت... تمہاری خاطر ہی میں نے اس شخص کی شفقت و محبت کو بھی نہیں گردانا جس نے بہرحال مجھے میرا باپ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بیٹیوں کی طرح ہی پالا... لئیق شاہ! میں نے تو... ان چیزوں کی پروا نہیں کی اور تم نے...“ اس کا لہجہ پھر چھلک پڑا۔

پھر وہ نہیں رکی۔ کار کا دروازہ کھولا۔ روتے روتے... اشکبار چہرے کے ساتھ کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ لئیق شاہ کی آنکھوں میں بھی کرب کی نمی جھلملانے لگی تھی۔

☆☆☆

کار ناہموار اور بل کھاتے راستے پر ہچکولے کھاتی دوڑی جا رہی تھی، زہرہ بانو کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ جیسے لرز رہا تھا۔ نمناک نگاہیں ونڈ اسکرین سے پار اتری ہوئی ملگجی شام کی مدھم تاریکی پر جمی ہوئی تھیں مگر اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ یہ تعین نہیں کر پا رہی تھی کہ آخر وہ لئیق شاہ کے اس سرد رویے کو کیا نام دے؟ جس نے برادری کے نام پر اس کے ساتھ یوں بے اعتنائی برتی تھی۔ آخر اس نے بھی تو لئیق شاہ کی خاطر... سب سے ناتا توڑنے کا عہد کر لیا تھا۔ تو پھر... لئیق شاہ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ دونوں میں سے کون زیادہ مجبور تھا۔ وہ یا لئیق شاہ؟

تب اچانک زہرہ بانو نے حقیقت کی نگاہ سے غور کیا تو اسے لئیق شاہ بھی زیادہ قصوروار نہیں محسوس ہوا۔ عاشق و معشوق میں یہی تو ہوتا ہے۔ محبوب کی کسی خامی کو خود ہی تاویلیں اور توجیہات کے سہارے ہر قصور سے بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ زہرہ بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

اگلے دن صبح... زہرہ بانو نے اپنے کچھ ذاتی اور خفیہ ذرائع سے پتا چلایا تو اسے یہی معلوم ہوا کہ اس بات سے تقریباً بہت سے قریبی لوگ واقف تھے کہ اس کی وجہ سے لئیق شاہ کی چھوٹے چودھری ممتاز خان اور اس کے حواریوں بالخصوص وسیم اور جھیما کے ساتھ دیرینہ مخاصمت چلی آ رہی تھی اور انہوں نے اس کا انتقام لئیق شاہ کے گھر کو آگ لگا کے پورا کرنے کی کوشش کی، یہی نہیں زہرہ کو اپنے بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آگ لگنے کے واقعے سے محض تقریباً آدھا پونا گھنٹا پہلے کچھ لوگوں نے جھیما اور اس کے

ساتھیوں کو لئیق شاہ کو علی الاعلان یہ دھمکیاں دیتے ہوئے پایا تھا کہ "ہم سے ٹکر لینے کا انجام تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔"

اس وقت لئیق شاہ ایک چھپر ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ اس کے آدھا پون گھنٹے بعد ہی یہ واردات ہوئی جس میں لئیق شاہ کے بوڑھے ماں باپ بھی جل کر مر گئے۔

حویلی سے رخصتی اور نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کرنے کی زہرہ بانو نے ساری تیاری بشمول اپنے چھوٹے موٹے سازوسامان کی پیکنگ وغیرہ بھی مکمل کر لی تھی بس اب یہاں سے شہر روانگی کی دیر تھی مگر تازہ ترین واقعے نے زہرہ بانو کو ایک نئی کشمکش وپیچ میں ڈال دیا تھا۔ اس کا ارادہ بھی تھا کہ وہ لئیق شاہ کو بھی اپنے اعتماد میں لے کر اپنے ساتھ شہر لے جائے گی، اور وہاں اپنے کچھ کاروباری معاملات اس کے سپرد کرے گی مگر آتش زدگی کے واقعے اور لئیق شاہ کی طرف سے سرد مہری نے زہرہ بانو کو تشویش آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے زیادہ فکر لئیق شاہ کی تھی مگر وہ اب یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ممتاز خان وغیرہ لئیق شاہ سے اس کی وفاداری کے "جرم وفا" کی اسے جو سزا دے چکے تھے وہ اب شاید اس کے دور ہو جانے سے اس کا اعادہ نہ کریں یا لئیق شاہ سے بدلہ چکانے کے بعد ان کی دشمنی کم از کم لئیق شاہ سے ختم ہو جائے۔ مگر کیا واقعی وہ ایسا ٹھیک سوچ رہی تھی؟

زہرہ بانو کو یاد تھا۔ لئیق شاہ نے اسے بتایا تھا کہ برادری والے بہت جلد سردار سے ملاقات کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ اس سے انصاف کی بھیک مانگنے والے تھے۔ سارے ٹھوس ثبوت اور شواہد اس سلسلے میں کیا کہتے تھے یہ تو اب جرگے کے بعد ہی معلوم ہوتا۔

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے بارے میں بہت غور و خوض کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ سردست لئیق شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مزید یہ کہ اب اس کا فی الفور یہاں سے چلے جانا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس روز زہرہ بانو... آخری بار... چودھری الف خان سے رخصت ہو کے ہمیشہ کے لیے شہر بیگم ولا آ گئی۔

☆☆☆

کمیل دادا... زہرہ بانو کو دوبارہ یہاں بیگم ولا میں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمایا تھا لیکن جب اسے نئے پنڈ کے حالات اور "بیگم صاحبہ" یعنی زہرہ بانو کے عزائم کا علم ہوا تو اس کی دلی مسرت دیدنی ہونے لگی تھی۔ مگر جانتا تھا وہ کہ بیگم صاحبہ کا اس سلسلے میں موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں اور نہ ہی وہ اس پر خوش ہیں اس لیے بمشکل ہی اس نے اپنے انداز و اطوار سے ایسی کوئی بات آشکارا نہ ہونے دی تھی کہ جس سے اسے بیگم صاحبہ کی ناراضی کا خطرہ مول لینا پڑے۔ وہ چپ چاپ حکم بجالاتا رہا۔ البتہ رسماً اس نے لئیق شاہ سمیت دیگر معاملات پر زہرہ بانو سے افسوس کا اظہار ضرور کیا تھا۔

لئیق شاہ کا یا زہرہ بانو کا لئیق شاہ سے دور ہو جانا... کمیل دادا کی آتشِ رقابت کو سرد کرنے کا سبب تو ضرور بنا مگر کمیل دادا کو یہ بھی اچھا نہیں لگا تھا کہ گاؤں سے شہر مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی بیگم صاحبہ بجھی بجھی اور افسردہ تھی۔

اگلے دن سے زہرہ بانو نے یہاں کے کاروباری معاملات کا بذاتِ خود جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دو فلور ملز ایک رائس مل کے علاوہ نئے پنڈ کی کچھ زمینیں تھیں جس پر سالونٹ پلانٹ بھی قائم تھا۔ بے شک ابھی وہاں اس کا عملی طور پر تصرف نہ تھا مگر قانوناً وہ اس کی وارث ضرور تھی۔ اسے کسی موقع کا انتظار تھا جب وہ انہیں بھی فروخت کر دیتی... کیونکہ وہ زمینیں ایک اور بے اثر زمیندار کی زمینوں سے ملحق تھیں۔ زہرہ بانو اس سے معاملات طے کر کے اسے فروخت کرنے کا قانونی حق رکھتی تھی۔ ارادہ تو اس نے یہی کیا تھا کہ وہ عملی قدم اٹھالے مگر چودھری الف خان کی زندگی میں اسے یہ کرنا مناسب نہ لگا۔ کیونکہ یقینی طور پر انہیں یہ بات پسند نہ آتی۔ تاہم وہ مطمئن تھی کہ قانونی طور پر وہ اس کی وارث ضرور تھی اور مختار بھی۔

دو تین روز اسے یہاں کے معاملات سنبھالنے میں صرف ہو گئے۔ تیسرے روز وہ کچھ سکون سے بیٹھی تو اسے لئیق شاہ کا خیال آیا۔ اس کا خیال تو ہر وقت اس کے دل و دماغ میں جاگزیں رہتا ہی تھا مگر وہاں اب تک کیا پیش رفت ہوئی تھی اور کیا کچھ ہو رہا تھا، اس کے بارے میں وہ بالکل لاعلم تھی اور اس کی جان کاری کے لیے اس نے کمیل دادا کے ساتھ ایک بند کمرے میں میٹنگ کی۔

"کمیل! مجھے نئے پنڈ کے معاملات کے بارے میں بھی مکمل آگاہی رکھنی چاہیے۔ اس سلسلے میں تم کیا مشورہ دو گے؟"

کمیل دادا، زہرہ بانو کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"بیگم صاحبہ! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے طفیل کو نئے پنڈ روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ ایک ہی دن میں

ساری معلومات لے آئے گا۔"

"مجھے صرف ایک دن کی معلومات نہیں چاہیے، کبیل۔" زہرہ بانو نے پُرسوچ لہجے میں کہا اور کبیل دادا مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ زہرہ بانو آگے بولی۔

"کسی ایسے قابلِ اعتبار آدمی کو نئے پنڈ روانہ کرنا ہوگا جو مستقل طور پر وہاں رہتے ہوئے ہمیں ایک ایک دن سے باخبر رکھے۔" کبیل دادا شاید زہرہ بانو کی بات کا اصل مقصد نہیں سمجھا تھا۔ لہٰذا قدرے الجھ کر مستفسر ہوا۔

"بیگم صاحبہ! اس کی کیا ضرورت ہے؟ بھلا اب آپ کا نئے پنڈ والوں سے کیا لینا دینا۔ مٹی ڈالیں اب ان کے معاملات پر..."

"وہ نہیں کبیل دادا، میرا ابھی نئے پنڈ سے پوری طرح ناتا نہیں ٹوٹا ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ کبیل دادا کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ آگے بولی۔ "مجھے کل تک بتادو کہ تم نے اس سلسلے میں کس آدمی کا انتخاب کیا ہے؟ مگر خیال رہے... وہ آدمی... نئے پنڈ سے تعلق نہ رکھتا ہو مگر وہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہے اور ہمیں ایک ایک بات سے باخبر رکھے۔ اس آدمی سے مجھے کل تک ملوا دو۔ باقی میں خود اسے سمجھا دوں گی کہ اسے نئے پنڈ میں رہتے ہوئے ہمارے لیے مزید کیا کرنا ہے۔" زہرہ بانو نے تحکمانہ انداز میں اپنی بات ختم کر ڈالی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کبیل دادا بھی احتراماً فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم اس کے چہرے پر سلوٹیں بکھر گئی تھیں۔ وہ شاید کچھ کچھ صورتِ حال کو اور بیگم صاحبہ کی باتوں کو سمجھ رہا تھا۔

اگلے دن کبیل دادا نے طفیل نامی آدمی سے زہرہ بانو کو ملوا دیا۔ طفیل شہر کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ ایک جوان مرد تھا۔ دبلا پتلا اور سانولی رنگت تھی، ابھی حال ہی میں وہ زہرہ بانو کے گروپ میں شامل ہوا تھا۔

زہرہ بانو نے اس سے رسماً چند باتیں کیں، اس کے بعد اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔

"تمہیں بڑی ہوشیاری اور رازداری سے ایک کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ نئے پنڈ میں گزارنا ہوگا۔"

وہ جواباً فدویانہ انداز میں بولا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر... میرے لیے یہ کام مشکل نہ ہوگا۔"

"ابھی ہم نے تمہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ تمہیں وہاں نئے پنڈ میں رہتے ہوئے کرنا کیا ہوگا۔ اصل کام وہی ہوگا کرنے کا... اس میں، میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گی۔" زہرہ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ مگر تحکمانہ لہجے میں کہا تو اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے مؤدبانہ کہا۔

"جی بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"نئے پنڈ میں تمہیں عام آدمی کی طرح رہنا ہوگا۔ مخصوص لوگوں کے درمیان گھلنا ملنا بھی ہوگا۔ کچھ لوگوں کے سلسلے میں معلومات رکھنا ہوں گی۔"

"جی بہتر بیگم صاحبہ۔"

"باقی چند بنیادی باتیں تو کبیل دادا نے تمہیں سمجھا ہی دی ہوں گی مگر اصل بات، ہم تمہیں سمجھائیں گے، مگر تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس سلسلے میں کیا ابتدائی لائحہ عمل طے کیا ہے؟"
زہرہ بانو کی بات پر کبیل دادا بولا۔

"بیگم صاحبہ! طفیل وہاں ایک کھاد کی دکان کھولے گا یا کسی فارم وغیرہ میں کھیت مزدوری... وہاں قدم جمانے کے لیے میں نے اسے اسی طرح کا لائحہ عمل پہلے سے سمجھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" زہرہ بانو نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔ پھر طفیل کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تمہیں وہاں کے جاگیردار الف خان، اس کے بیٹے ممتاز خان اور اس کے قریبی ساتھیوں اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان کسی غریب مزارع کا بیٹا ہے ابھی چند روز پہلے اس کے گھر کو آگ لگادی گئی تھی۔ نوجوان کا نام لئیق شاہ ہے۔ وہ بچ گیا تھا۔ ماں باپ اس آتش زدگی میں جانبر نہیں ہوسکے۔ یہ آگ چودھری الف خان کے بیٹے ممتاز خان نے اپنے خاص حواری چھیما کے ذریعے لگوائی تھی۔ اس کے متعلق جرگے میں کیا فیصلہ ہوا اس کے بارے میں بھی مکمل آگاہی حاصل کروگے۔" زہرہ بانو نے بات ختم کردی۔ طفیل عرف طیفہ تفہیمی انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے جنبش دے رہا تھا۔ دودھ کی تجزیاتی رپورٹ آگئی تھی، اور اس میں زہر کی آمیزش کی تصدیق ہوچکی تھی۔ اس رپورٹ کو دیکھ کر ایک بار پھر زہرہ بانو کے دل میں ایک غبار سا اٹھا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ ساری مجبوریوں اور باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اپنی سوتیلی ماں مہرالنسا اور ممتاز خان کے خلاف قانونی کارروائی کرڈالے مگر پھر چودھری الف خان کا بیمار چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا۔ یہ

ایک ایسے آدمی کا بھتیجی چہرہ تھا جس نے باپ بن کر اس کی پرورش کی تھی۔

وقت گزرنے لگا۔ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی یاد ستانے لگی۔ طفیلے کی تازہ ترین بھیجی جانے والی رپورٹ خاصی سنسنی خیز تھی۔ برادری کے لوگوں نے اپنے سردار کی بیٹھک میں فریاد ڈالی تھی مگر اس سلسلے میں ان سے معذرت کرلی گئی، وجہ یہی بتائی گئی تھی، جرگہ سسٹم پر قانونی پابندی عائد ہونے کی وجہ سے وہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھے، وغیرہ۔ لہٰذا اب ان لوگوں کو انصاف کے لیے قانون کا ہی دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تھے لہٰذا اتنی پیش رفت کیا تھی، ابھی یہ سب اندھیرے میں تھا۔

زہرہ بانو اس سلسلے میں لئیق شاہ کو انصاف ملنے کی دعا ہی کرسکتی تھی۔ شہر ''بیگم ولا'' میں زہرہ بانو کے روز و شب بظاہر پرسکون گزر رہے تھے مگر اندر سے وہ بے کلی کا شکار ہی رہتی تھی۔ اس کا دل و دماغ اور ذہن نئے پنڈ میں اٹکا ہوا تھا۔ لئیق شاہ کو تو وہ ایک لمحے کو بھی فراموش نہیں کرسکی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ نئے پنڈ کا قصد کرلے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے جائے اور محض دیدار محبوب ہی کر کے لوٹ آئے کہ اس کے بے چین دل کو کچھ قرار تو میسر ہو۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی، جانے نہ جانے پر وہ ابھی غور ہی کررہی تھی کہ ایک روز طفیل خود نئے پنڈ سے بیگم ولا آن دھمکا۔ اس نے زہرہ بانو کو جو اطلاع دی اسے سن کر وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ اس نے بتایا کہ لئیق شاہ کو نئے پنڈ سے اچانک غائب کردیا گیا تھا۔ اور شدید یہی تھا کہ اسے ممتاز خان کے خونی حواری چھیما نے اغوا کیا تھا۔

اس اطلاع پر زہرہ بانو کا سکون غارت ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ کبیل دادا کو لیا۔ دو مسلح گارڈز لے کر اسی وقت نئے پنڈ روانہ ہوگئی۔

نئے پنڈ پہنچ کر زہرہ بانو نے حویلی کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہاں سے سیدھی اس گھر پہنچی تھی جہاں زہرہ بانو، لئیق شاہ سے آخری بار رخصت ہوئی تھی۔ وہاں اریب قریب میں کچھ گھر لئیق شاہ کی برادری کے تھے۔ کچھ لوگوں سے اس نے بہ ذات خود ملاقات کر کے لئیق شاہ کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔ پہلے پہل تو اس کے ساتھ سرد رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ پھر چند لوگوں نے ہی اسے لئیق شاہ کے اچانک ''غیاب'' کے بارے میں بتایا۔

کبیل دادا وہاں سے زہرہ بانو کو اپنے گھر لے آیا۔ جو اَب بھی خالی پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ منشی فضل محمد کو بھی زہرہ بانو نے شہر بلالیا تھا۔

یہاں یہ لوگ کھلے صحن میں سر جوڑے بیٹھ گئے۔

''بیگم صاحبہ! ہمیں سب سے پہلے چھیما پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔'' کبیل دادا نے مشورہ دیا۔ ''اس کمینے کے جنے نے نکے چودھری کے حکم پر لئیق شاہ کو اغوا کیا ہوگا۔''

زہرہ بانو کا قرار لٹا ہوا تھا۔ جو اندیشناک اور زہریلے وسوسے ہر وقت اس کے دل و دماغ کو گھیرے رکھتے تھے، انجام آخر وہی ہوا تھا۔ کبیل دادا کی بات پر صاد کرتے ہوئے زہرہ بانو نے اندر ہی اندر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''ہمیں بھی اب اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی روش پر چلنا ہوگا۔ ہمارا شکار چھیما سے کم کا نہیں ہونا چاہیے، کبیل۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی بیگم صاحبہ۔'' کبیل دادا جیسے یک دم چہک کر بولا۔ ''چھیما ہمارے لیے ایک ایسا شکار ثابت ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ کہ جس سے ہمیں بہ آسانی لئیق شاہ کا سراغ مل سکتا ہے۔ آپ ایسا کریں واپس شہر لوٹ جائیں اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''نہیں کبیل دادا۔'' زہرہ بانو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ خطرناک کام تم اکیلے نہیں کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں بھی ابھی ادھر ہی رہوں گی۔ ساتھیوں کے آتے ہی تم اپنا کام شروع کر دینا۔''

کبیل دادا سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اسے زہرہ بانو کی بات ماننا پڑی۔ اس وقت دو گارڈز میں سے ایک کو ضروری ہدایت دے کر کار میں شہر کی طرف روانہ کردیا گیا۔ اب گھر میں زہرہ بانو کے ساتھ کبیل دادا اور گارڈ موجود تھا۔ اس گارڈ کا نام انور تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ تب تک کبیل دادا نے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کردیا تھا۔ گھر عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہاں کھانے پینے کو تھا ہی کیا، لیکن کبیل دادا نے پھر بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیا۔

وقت بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی طرف سے تشویش اور فکر کھائے جارہی تھی۔ ممتاز خان اور چھیما کی چیرہ دستیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ لوگ اب باقاعدہ خون خرابے پر اتر آئے تھے، پھر تازہ حالات نے بھی ان کی ہمت کو ہوا دی تھی۔ زہرہ بانو کو اس بات کا بھی شدید قلق ہو رہا تھا کہ لئیق شاہ نے .... جس برادری کی خاطر اس کے ساتھ سرد رویہ اختیار کیا، اسے چھوڑا، اب ... ممتاز خان اور اس کے خونی ہرکاروں کے خوف

نے لئیق شاہ کو تنہا کر ڈالا تھا۔ بسا اوقات بقا کی جنگ میں اس طرح کی بے حسی دیکھنے میں آتی ہے جب ظالم طاقت ور ہو پھر انصاف ملنے کی ساری امیدیں بھی دم توڑتی جائیں اور مظلوم مزید کمزور ہوتا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

"لئیق شاہ کو اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں خود کو ساری زندگی معاف نہیں کر سکتی۔" زہرہ بانو کے دل ودماغ میں بار بار اسی بات کی گردان ہو رہی تھی۔ کمیل دادا بھی اسے لئیق شاہ کے لیے پریشان، آزردہ اور تشویش زدہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور اپنا دل بھی مسوس رہا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ رقابت کی آگ میں بیگم صاحبہ سے وفاداری اور اس کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ بے شک اس کی محبت یک طرفہ اور خاموش سہی... مگر اس نے خود غرضی کا لبادہ ابھی نہیں پہنا تھا۔ اس نے آخر تک بیگم صاحبہ سے ساتھ نبھانے کا دم بھرا تھا۔ پختہ عزم کیا تھا۔

اس کے ساتھی آگئے۔ یہ تعداد میں پانچ تھے، زہرہ بانو بھی ساتھ جانا چاہتی تھی مگر کمیل دادا نے اسے منع کر دیا اور دو آدمی وہیں اس کے پاس چھوڑ کر وہ دیگر ساتھیوں کے ساتھ کار میں روانہ ہو گیا۔

شام جھکنے لگی تھی۔ زہرہ بانو کے دل ودماغ کی بے چینی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی، رات پڑتے ہی باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری۔ کمیل دادا بے نیل مرام لوٹا تھا۔ وہ نہ لئیق شاہ کا سراغ لگا پایا تھا نہ ہی چھیما پر ہاتھ ڈال سکا تھا۔ منہ لٹکائے کمیل دادا نے اپنی شکست کا اعتراف کیا تو اس کا چہرہ ناکامی اور شرمندگی کے احساس تلے چھپا ہوا تھا۔

"حیرت کی بات ہے بیگم صاحبہ! اس چھیما کا سایہ بھی نہیں ملا... گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے وہ بھی۔"

اس نے بتایا تو زہرہ بانو بولی۔ "ہو سکتا ہے لئیق شاہ کو وہ کسی دور دراز مقام کی طرف لے گیا ہو اور جہاں اسے یرغمال بنایا گیا ہو چھیما بھی وہیں روپوش ہو۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" کمیل دادا گومگو سے لہجے میں بولا۔ "لیکن بیگم صاحبہ! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، آخر لئیق شاہ کو اغوا کرنے کا مقصد ان کا کیا ہو سکتا ہے؟ جبکہ اب تو آپ نے بھی نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا اور پھر برادری والوں نے بھی لئیق شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے تنہا اور بے قیمت آدمی کو اغوا کرنے کا آخر تک چودھری ممتاز خان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

کمیل دادا کی بات پر زہرہ بانو کے دل میں ایک آہ سی ابھی جو درد کی لہر بن کر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ وہ کمیل دادا کو کیا بتاتی کہ لئیق شاہ کس کی پاداش میں یہ ظلم بھگت رہا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ ایک سادہ لوح آدمی وفا اور وفاداری کے نام پر کس کے لیے اتنی صعوبتیں اٹھا رہا ہے۔

"لئیق شاہ بے قیمت ہوتا تو آج سکون کی زندگی بسر کر رہا ہوتا کمیل دادا! دشمنوں نے اس کے سر کی قیمت لگا رکھی ہے اور ہمیں اس کے سر کو بچانا ہے۔" زہرہ نے کمیل کو جواب دیا۔

"میرا تو خیال ہے بیگم صاحبہ! ہمیں واپس شہر لوٹ جانا چاہیے۔ اپنا طیفہ ہے نا اسے بھیج دیں گے۔ وہ یہاں رہتے ہوئے لئیق شاہ کا کھوج لگا لے گا۔" بالآخر کمیل دادا نے مشورہ دینے کے انداز میں زہرہ بانو سے کہا اور تب پہلی بار زہرہ بانو کے دل میں کمیل دادا کی طرف سے ایک کھٹک محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ تھا کہ کمیل دادا کے دل میں اس کے لیے کیا تھا۔ وہ اس کی وفاداری پر شبہ نہیں کر رہی تھی، جانتی تھی وقت پڑنے پر وہ اس کی خاطر اپنی جان پر کھیل جائے گا اور اب بھی اس نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، کیونکہ ممتاز خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے دشمنی معمولی بات نہ تھی۔ ان ساری باتوں کے باوجود... کمیل دادا کی وفاداری اپنی جگہ لیکن رقابت کا زہر بھی ایک تلخ حقیقت تھی۔ کمیل دادا بھی لئیق شاہ سے اس لاشعوری رقابت کا شکار تھا ممکن ہے اس نے لئیق شاہ کی تلاش میں اپنی سی پوری کوشش کی مگر وہ بات نہیں ہو سکتی تھی؟ اس کی "تلاش" میں جو غیر جانب داری کا تقاضا کرتی... لہٰذا زہرہ بانو نے دانستہ مبہم سے لہجے میں کہا۔

"کمیل! شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ کل طفیل کو یہاں بھیج دیں گے۔"

کمیل اس کی بات پر مطمئن نظر آنے لگا۔

یہ لوگ راتوں رات واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ زہرہ بانو کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ سارے راستے خاموش رہی، بیگم ولا پہنچی تو وہاں اسے گیٹ پر پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی نظر آگئیں، کار میں بیٹھے یہ سب لوگ بری طرح چونک پڑے۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

سبز دروازہ

سیریناراض

مصنف دنیا کے کسی بھی خطّے سے تعلق رکھتا ہو... اس کے جذبات و احساسات اور سوچنے کے انداز یکساں ہوتے ہیں... ان کی حساسیت ہی انہیں عام فرد سے مختلف بناتی ہے... ایک پُراسرار اور ذہین تر مصنف کا قصہ... مرنے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا سحر ختم نہیں ہوا... اس کی ناگہانی موت نے ہر ایک کو اپنے حصار میں قید کر لیا تھا...

کتابوں سے دوستی نبھانے والے لفظ شناسوں کا زندگی نامہ
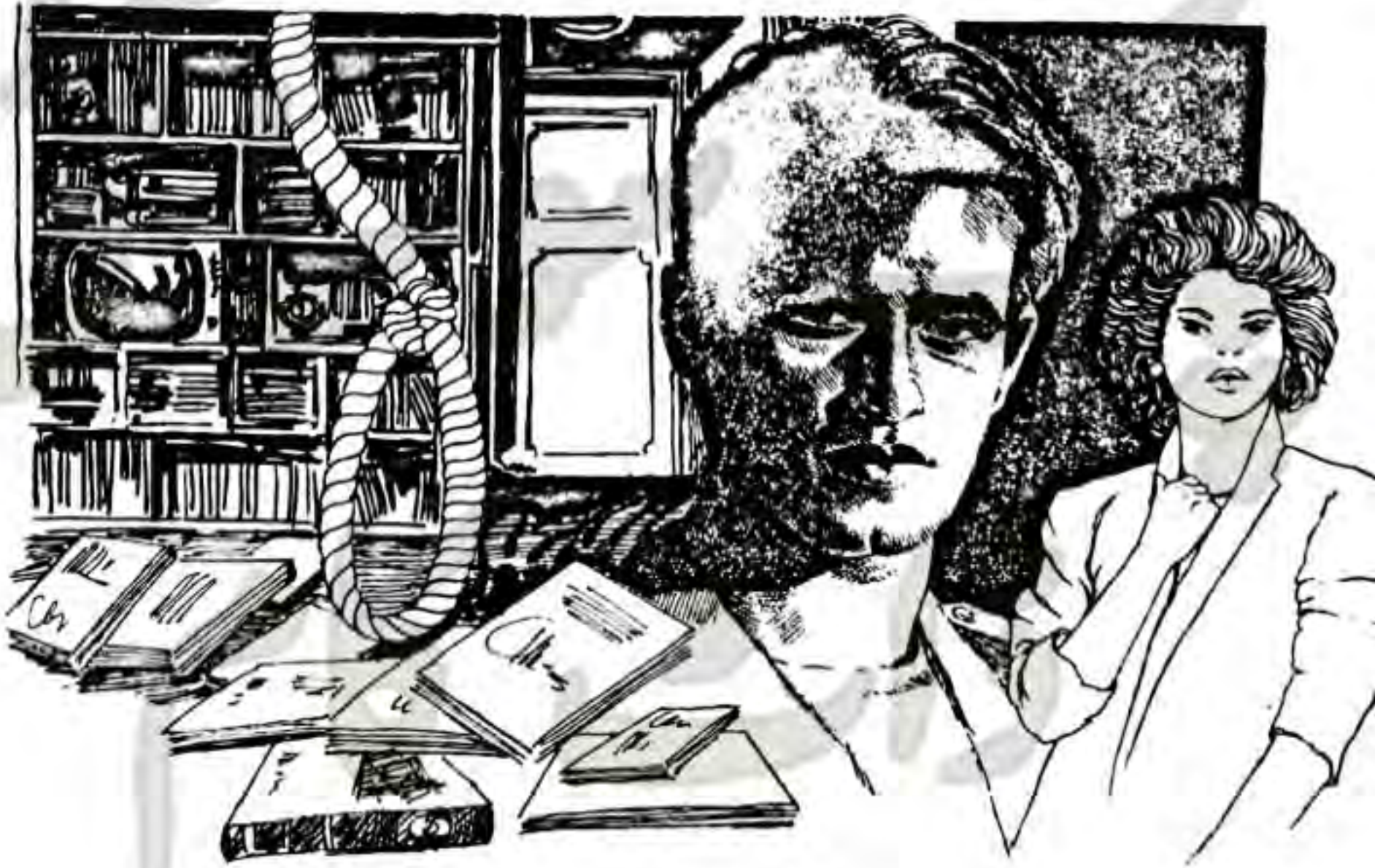
میونسپل لائبریری کے ریفرنس سیکشن کے کاؤنٹر پر بیٹھی سوادا ہوناجی نے پوچھا۔ ”کیا کل تمہاری کوئی مصروفیت ہے؟“

”ہاں، مجھے فکشن نووا کے ایڈیٹر سے ملنا ہے۔ شاید وہ مجھ سے ایک مختصر کہانی لکھنے کے لیے کہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ میں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس کی زبان سے یہ الفاظ ضرور ادا ہوئے لیکن وہ مایوس نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا

لگتا تھا جیسے اس نے اس بات کا کوئی اثر نہ لیا ہو۔ ہونامی، پبلک ریڈنگ روم کی لائبریرین تھی۔
نوری زوئی افتارو نے اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں یہ پروگرام کینسل کر دیتا ہوں اگر تم واقعی میرے ساتھ جانے میں سنجیدہ ہو۔"
ہونامی اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "کیا خوب اتفاق ہے۔ میں صرف تمہیں دعوت دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی عظیم مصنف نوری زوئی۔ اگر تم واقعی میرے ساتھ جانا چاہتے ہو۔"
اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتا، ایک لڑکا کاؤنٹر پر آیا اور اس نے کچھ میگزین واپس کیے۔ ہونامی نے چیک کیا اور انہیں لے کر اندر رکھنے چلی گئی۔ واپس آکر اس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹا اور بولی۔ "فکشن نووا کے ایڈیٹر کا نام، نمبر کیا ہے؟"
افتارو جانتا تھا کہ وہ نہیں سننا پسند نہیں کرتی چنانچہ اس نے نمبر بتا دیا۔ ہونامی نے نمبر ڈائل کیا اور نرم لہجے میں بولی۔ "کیا میں ایڈیٹوریل ڈیپارٹمنٹ میں بات کر سکتی ہوں؟ میں نوری زوئی افتارو کی سیکریٹری سوادا بول رہی ہوں۔ مجھے کل کے اپائنٹمنٹ کے بارے میں بات کرنا ہے۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے انہیں یہ اپائنٹمنٹ کینسل کرنا پڑ رہا ہے۔ دراصل ایک قتل ہو گیا ہے اور وہاں اس کی مدد درکار ہے۔"
افتارو نے ہونامی کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور بولا۔ "میں نوری زوئی بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی تمہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ سچ نہیں ہے۔ ایسا کوئی قتل نہیں ہوا تم پریشان مت ہونا البتہ میں کل نہیں آسکتا۔ ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔ میں کہانی ضرور لکھوں گا۔ فکشن نووا ایک معیاری میگزین ہے۔ ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ اسی موضوع پر لکھوں گا جو تم بتا رہے ہو۔ ناممکن جرم، بند کمرے میں قتل... یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کتنے صفحات کی کہانی چاہیے اور کب تک؟ میں سمجھ گیا، مائنڈ نہ کرنا میری سیکریٹری کو مذاق کرنے کی عادت ہے۔"
"کیا تم اپنے ایڈیٹروں سے ہمیشہ اسی خوشامدی لہجے میں بات کرتے ہو؟" وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔
"تم نے اپنی فضول گفتگو سے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ بند کمرے میں قتل تمہارے لیے یہ کہنا بہت آسان تھا لیکن اس کی وجہ سے میں ایک مشکل کام کے بوجھ تلے دب گیا۔"
دوسرے دن افتارو خوشی خوشی اس جگہ پہنچا جہاں انہیں ملنا تھا۔ ہونامی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے اسے پکارا لیکن وہ غصے سے بولی۔ "میں نے فکشن نووا میگزین دیکھا ہے، اس کے سرورق پر ریڈیو ایکٹرسوں کی عریاں تصاویر تھیں۔ اگر تم ایسے میگزین کے لیے لکھو گے تو تمہاری پڑھنے والیاں تم سے ناراض ہو جائیں گی۔"
"وہ عریاں تصاویر نہیں ہیں۔" افتارو نے اطمینان سے جواب دیا۔
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر وہ عریاں تصاویر نہیں تو پھر انہیں کیا کہو گے؟"
"کیلنڈر، وہ ایک کیلنڈر ہے۔" افتارو نے کہا اور اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"
"میں اس وقت بھی ڈیوٹی پر ہوں۔" ہونامی نے کہا۔ "دراصل کچھ عرصہ پہلے ہماری لائبریری کو کچھ کتابیں عطیے میں ملنے والی تھیں لیکن بعد میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے اور اب ہمیں دوسری پارٹی کی جانب سے مشکلات کا سامنا ہے۔ لائبریری کے ڈائریکٹر نے مجھے ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے نامزد کیا ہے اور میں اس پارٹی سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ ہم اس وقت ان کتابوں کی مالکن سے ملنے جا رہے ہیں۔ ہمیں دو بجے جی یو جی پہنچنا ہے اس لیے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں تمہیں راستے میں تفصیل بتا دوں گی۔ تم اپنی کار تو لائے ہو نا؟"
افتارو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اب اسے اس لڑکی کا ڈرائیور بھی بننا پڑے گا لیکن اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے خیال سے وہ راضی ہو گیا۔ موسم خوشگوار تھا اور ایسے میں کسی حسین لڑکی کے ساتھ ڈرائیونگ کرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کچھ دور چلنے کے بعد ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ ہونامی کچھ دیر موسیقی سے لطف اندوز ہوتی رہی پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا، وہ بولی۔ "کیا تم اس کی آواز کم کر سکتے ہو، میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔"
افتارو نے منہ بناتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا اور کہا۔ "بولو، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"
"وہ کتابیں عطیہ کرنے والے شخص کا نام سوگا تا کنیا کی ہے۔ اسے بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔ وہ نوعمری سے ہی نایاب اور قیمتی کتابیں جمع کرتا رہا جن میں سے بیشتر کا تعلق عقیدے اور روحانیت سے تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کچھ عرصہ ایک بینک میں ملازمت کی

لیکن یہ اس کے ذوق کے مطابق نہ تھی لہٰذا اس نے استعفیٰ دے کر فلکیات کے بارے میں ایک رسالہ شائع کرنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کردری اواشیتا کے نام سے ترجمے کا کام بھی شروع کردیا اور اپنی کتابوں کی دنیا میں مگن رہنے لگا۔ ایک تقریب میں ہمارے ڈائریکٹر کی سوگا تا سے ملاقات ہوئی تو وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اسے لائبریری کے غیر ملکی ادب سے متعلق سیمینار میں لیکچر دینے کے لیے بلایا جانے لگا۔ وہ اس اعزاز سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اپنی موت کے بعد تمام کتابیں لائبریری کو عطیہ کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اس نے صرف زبان سے ہی نہیں کیا بلکہ اپنی وصیت میں بھی یہ بات لکھ دی۔''

افارو سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا سوگا تا کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے؟''

ہونامی نے پُراسرار انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ سال کے اختتام پر وہ اپنی اسٹڈیز میں چھت سے لٹکا ہوا پایا گیا۔''

''یعنی اس نے خودکشی کرلی؟''

''ہاں، وہ ڈپریشن کا شکار تھا اور اسپتال میں زیرِعلاج بھی رہ چکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے بینک کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی گو کہ اس نے مرنے سے قبل کوئی تحریر نہیں چھوڑی لیکن لگتا یہی ہے کہ اس نے ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوکر خودکشی کرلی۔''

''واقعی یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔''

''اس کا کوئی بچہ نہیں تھا اور وارثوں میں صرف ایک بیوی ہی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کی وصیت کو نظرانداز کرتے ہوئے کتابیں دینے سے انکار کردیا اور ایک کے بعد ایک بہانہ بنا رہی ہے۔ ہم اتنی آسانی سے ان کتابوں سے دستبردار نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ مرنے والے کی جانب سے خیرسگالی کے طور پر ایک تحفہ ہے۔ ہم اس کی ہر بات سننے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ عورت اس کا موقع ہی نہیں دے رہی۔''

''کیا وجہ ہے کہ وہ کتابیں دینا نہیں چاہتی؟''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ ہم ابھی تک وجہ نہیں جان سکے۔ ممکن ہے کہ کسی کتابوں کے شوقین یا دکان دار نے اسے ان کتابوں کی بھاری قیمت ادا کرنے کی پیشکش کی ہو۔ یہ ایسا نایاب ذخیرہ ہے جسے دیکھ کر کسی کے منہ میں بھی پانی آسکتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تب بھی اسے بتا دینا چاہیے تاکہ ہم اس کا کوئی حل نکال سکیں۔ ابھی تک ہم یہ نہیں جان سکے کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ یہاں تک کہ ڈائریکٹر کو بھی اس سے رابطہ کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے لہٰذا اس نے مجھے یہ ذمے داری سونپی ہے کہ اس سے مل کر جاننے کی کوشش کروں کہ اس کی نیت کیا ہے۔''

''اوہ، اب میں سمجھا۔''

ہونامی کی زبانی یہ کہانی سن کر افارو کی دلچسپی بڑھ گئی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جیسے ہونامی نے بتایا بلکہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی اس نے خودکشی کی تھی؟ کیا پولیس نے اس کے تمام پہلوؤں پر غور کیا تھا؟''

''دروازہ اندر سے بند تھا اور انہیں اسے توڑ کر اندر جانا پڑا۔ سیدھی سی بات ہے کہ کمرا اندر سے بند تھا اور کوئی بھی شخص اس میں داخل یا باہر نہیں آسکتا تھا۔''

''بند کمرے میں بھی قتل ہوسکتا ہے، یاد ہے تم نے کل فون پر ایڈیٹر سے کیا کہا تھا؟''

''ٹھیک ہے لیکن مجھے اس کیس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ویسے بھی اس طرح کے قتل صرف کہانیوں میں ہی ہوتے ہیں۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ یہ ایک قتل تھا لیکن تمہاری باتیں سن کر مجھے بھی کچھ شک ہونے لگا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تم نے وہ کتاب پڑھی ہے، داڈوران داوال؟''

''ہاں لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کیونکہ سوگا تا کی اسٹڈی میں بھی ایسا ہی ایک سبز دروازہ ہے۔ سوگا تا کو یہ کہانی بہت پسند تھی، ممکن ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو کہانی کے ہیرو کی طرح سمجھتا ہو جو حقیقی دنیا کو چھوڑ کر اس دروازے کے ذریعے تصوراتی دنیا میں چلا جاتا تھا۔''

افارو کو یقین نہیں آیا، اس نے پوچھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شیطان سے کہہ کر یہ دروازہ بنوا سکتا۔''

''بالکل نہیں، وہ روحانی ماہر ہوسکتا ہے لیکن تصوراتی دنیا میں جانے کے لیے ایسا دروازہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کا مکان پرانے طرز کا ہے۔ اس کی اسٹڈی میں دو دروازے ہیں لیکن ان میں سے ایک کبھی نہیں کھولا گیا۔ شاید اس کے قبضے زنگ آلود ہوگئے تھے یا ایسی ہی کوئی اور بات تھی جس کی وجہ سے وہ معمولی سی حرکت بھی نہیں کرتا تھا لہٰذا اس نے اس پر سبز رنگ کردیا۔ یہی اس کا سبز دروازہ تھا کیونکہ کمرے میں آنے جانے کے لیے ایک اور دروازہ بھی تھا۔ اس لیے کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کہتے ہیں کہ سبز دروازہ دس سال سے

نہیں کھولا گیا تھا اور اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں گا تو یہ دروازہ کھل جائے گا۔"

"اور وہ دروازہ واقعی کھل گیا؟"

ہونامی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔"شاید نہیں، میں نے اس بارے میں نہیں سنا۔ جو دروازہ توڑا گیا، وہ دوسرا تھا۔ اگر سبز دروازہ کھل سکتا تو اسٹڈی کو مقفل کمرا نہیں کہا جاتا۔ پولیس نے اس کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد اس کی موت کو خودکشی قرار دیا کیونکہ اس میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی۔"

"پھر بھی ہمیں ایک مرتبہ اس کمرے اور سبز دروازے کو دیکھ لینا چاہیے۔ کیا تم اس عورت کو باتوں میں لگا کر اس کا بندوبست کرسکتی ہو؟"

"ٹھیک ہے لیکن میں اسے واقعی قتل نہیں سمجھتی۔ بعد میں مجھے الزام نہ دینا اگر تمہیں وہاں سے کوئی سراغ نہ ملے۔"

"مطمئن رہو، میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

وہ مکان جی یو جی اسٹیشن کے شمال میں واقع تھا۔ یہ ایک دو منزلہ خستہ حال عمارت تھی جس کی پیشانی پر ویسٹرن مینشن لکھا ہوا تھا۔ ہونامی بولی۔"اگر مجھے اس عمارت میں رہنا پڑے تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہوسکتا ہے۔" پھر اس نے بیرونی دروازے پر دستک دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔"گھر میں کوئی ہے؟"

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ان کے سامنے ایک عورت روایتی جاپانی لباس میں کھڑی تھی۔"کیا تم لائبریری سے آئی ہو؟" اس نے پوچھا۔

ہونامی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ہماری ٹیلی فون پر بات ہوچکی ہے۔ میں لائبریرین سوادا ہوں۔"

"میں سوگاتا کی بیوی ہوں۔"

وہ سینتیس اڑتیس سال کی ایک پُرکشش عورت تھی۔ خوبصورت آنکھیں، پتلی ناک، چمکتے ہونٹ اور سفید بے داغ جلد۔ اس نے اکارو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"تمہارے ساتھ کون آیا ہے؟"

اس سوال پر اکارو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔"میرا نام نوری زوگی ہے۔"

"تم لائبریری کے آدمی تو نہیں لگتے۔" اس عورت نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔"وکیل ہو یا اسی سے ملتا جلتا کوئی کام کرتے ہو؟"

"نہیں، میں ایک بے ضرر سا تماشائی ہوں۔ میں نے گزشتہ برس مسٹر سوگاتا کو ایک سیمینار میں دیکھا تھا۔ جب سے ان کا عقیدت مند ہوں اسی لیے ان کا گھر دیکھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے سوادا سے درخواست کی تھی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں خاص طور پر ان کی اسٹڈی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اندر آجاؤ۔"

وہ عورت انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آئی اور انہیں صوفے پر بٹھا کر چائے بنانے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرے لے کر آئی اور میز پر پیالیاں رکھتے ہوئے بولی۔"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں آنا پڑا۔ دراصل میں بہت کمزور ہوگئی ہوں اور باہر جانے سے تھک جاتی ہوں۔"

"کیا تم اپنے شوہر کے انتقال کے بعد سے یہاں اکیلی رہ رہی ہو؟" اکارو نے پوچھا۔

عورت اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔"ایک ملازمہ ہے جو ایک دن چھوڑ کر آتی ہے۔ باقی وقت میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔ ایک بیوہ کے لیے یہ مکان بہت بڑا ہے۔ اگر ہمارے بچے ہوتے۔۔۔"

ہونامی زور سے کھانستے ہوئے بولی۔"مسز سوگاتا، قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کام کی بات کرلینی چاہیے۔ ہم تمہارے شوہر کے عطیے کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔ میں تم سے صاف لفظوں میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کتابیں دینے سے انکار کیوں کیا؟"

"انکار کا لفظ کافی سخت ہے۔" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

"ہم نے اب تک کئی مرتبہ کوشش کی لیکن تم نے ہمیشہ مبہم جواب دیا لہٰذا ہم اسے انکار ہی سمجھیں گے۔ ہم تنقید نہیں کررہے لیکن ہم وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی خاص بات ہے تو ہمیں بتاؤ اور اگر تمہارے پاس کوئی معقول وجہ ہوئی تو ہم اس کا حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

وہ عورت ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔"میری وجہ سے اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن میں نے سوچا کہ اگر تمہیں بتاؤں گی تو تم یقین نہیں کرو گی لہٰذا میں خاموش رہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ آیا تھا۔"

"وہ؟"

"میرا شوہر۔" وہ دونوں پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ہونامی نے محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ تمہارے شوہر کا بھوت؟"

"ہاں۔" بیوہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔ نصف شب کے قریب مجھے اپنی ناک پر کسی کے بال محسوس ہوئے اور جب میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ میرا شوہر تکیے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں بالکل ساکت ہوگئی اور جسم کو حرکت نہ دے سکی اور میں نے جب اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بولا یوشیکو، جب میں سوچتا ہوں کہ کتنی ساری کتابیں چلی جائیں گی تو میری روح بے چین ہونے لگتی ہے کیونکہ یہ کتابیں میری زندگی تھیں۔ انہیں اسی گھر میں رہنا چاہیے۔ میں نے وہ وصیت لکھنے میں بہت جلدی کی اور کچھ نہیں سوچا جس کا مجھے افسوس ہے لیکن چاہتا ہوں کہ تم ان کتابوں کی حفاظت کرو اور جب تک تم یہاں پر ہو کسی کو یہ کتابیں مت دو۔ مجھ سے زندگی میں یہ واحد غلطی ہوئی۔ اس نے یہ بات کئی بار کہی اور سورج نکلتے ہی وہ غائب ہوگیا اور صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ اگلی صبح مجھے اپنے تکیے پر شوہر کے نام کی چٹ ملی جو وہ اپنی کتابوں پر چسپاں کیا کرتا تھا۔ تب میں سمجھ گئی کہ واقعی میرے شوہر کا بھوت آیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی مرتبہ آیا اور اپنی خواہش دہرائی۔ مجھے یقین نہیں کہ تم میری بات کا یقین کرو گی لیکن میں نے اسی وقت اپنا ذہن بنا لیا تھا اور کتابیں دینے میں ہچکچاہٹ کی وجہ یہی تھی کہ میں اپنے شوہر کی خواہش پر عمل کر رہی ہوں۔ کیا تم بھی میرے شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس عطیے کو بھول سکتی ہو؟"

ہونامی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرے۔ اگر وہ عورت کو جھوٹا قرار دیتی تو اس سے بات چیت میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اقارو کو بھی یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا، اس نے کہا۔ "میرے لیے بہتر ہوگا کہ یہاں سے چلا جاؤں۔ کیا میں ایک نظر وہ کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟"

"لائبریری دوسری منزل پر ہے۔" اس عورت نے کہا۔ "سیڑھیوں سے اوپر جاؤ اور تمہیں سامنے ہی ایک دروازہ نظر آئے گا جو مقفل نہیں ہے۔"

اقارو کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہونامی کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے پیغام دے دیا کہ وہ اس عورت کو باتوں میں لگائے رکھے۔ اتنی دیر میں وہ لائبریری کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہونامی اس کا پیغام سمجھ جائے گی۔

لائبریری مشرق حصے سے مکان کے وسط تک پھیلی ہوئی تھی اور اس نے دوسری منزل کا تہائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ وہ لائبریری نہیں بلکہ عجائب گھر تھا جہاں نادر و نایاب کتابیں ذخیرہ کی گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب تھی۔ اقارو نے اس ذخیرے کو غور سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جوش پر قابو پایا اور اپنے اندر موجود کتابی کیڑے کو مار ڈالا۔ اب وہ صرف ایک سراغ رساں تھا اور اسے فوری طور پر اپنا کام شروع کرنا تھا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو دونوں عورتوں کی باتیں ختم ہو چکی تھیں اور اب وہ چائے پی رہی تھیں لیکن ماحول میں کشیدگی برقرار تھی۔ اقارو نے کہا۔ "واقعی لاجواب ذخیرہ ہے۔ ایک گھنٹے میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ ان میں سے کئی کتابیں تو بالکل نایاب ہیں۔"

"یہ میرے شوہر کا شوق تھا۔"

"اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کتابوں سے مستفید ہو سکیں..."

ہونامی نے کہا لیکن اقارو نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے شوہر کی اسٹڈی میں ایک دروازہ ایسا بھی ہے جس پر سبز رنگ کیا گیا ہے؟" اس نے مسز سوگاتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور مسٹر سوگاتا نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ جب میں مروں گا تو سبز دروازہ دوبارہ کھل جائے گا۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ میں اس دروازے کو ایک نظر دیکھنا چاہوں گا۔"

اس عورت نے مشتبہ انداز میں اقارو کو دیکھا پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔ "میرے شوہر نے یہ بات مذاق میں کہہ دی ہوگی لہٰذا اس دروازے کو دیکھ کر تمہیں خاصی مایوسی ہوگی۔ مس سوادا کیا تم بھی وہ دروازہ دیکھنا چاہو گی؟"

"ہاں بالکل۔"

سوگاتا کی اسٹڈی گراؤنڈ فلور پر مشرقی کونے میں واقع تھی اور یہ بالکل اس لائبریری کے نیچے تھی جو تھوڑی دیر پہلے اقارو دیکھ کر آیا تھا۔ اس عورت نے پرانا دروازہ کھولا۔ اقارو نے غور کیا کہ اس کے قبضے نئے تھے گو کہ دوپہر تھی لیکن کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس عورت نے کمرے کی لائٹ جلائی۔ "یہ کمرا کافی گندا ہو رہا ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد میں نے ایک دفعہ بھی یہاں کی صفائی نہیں کروائی۔"

وہ کمرا واقعی بہت بے ترتیب لگ رہا تھا۔ وہاں ایک کاؤچ، ایک میز اور ایک ہیٹر تھا۔ کاؤچ پر کتابوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جبکہ کمرے کی شمالی اور جنوبی دیواریں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ بڑے بڑے بک شیلف کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں اور ہر جگہ رسالے اور

ریفرنس بک پھیلی ہوئی تھیں۔

"عقبی حصے میں ایک کھڑکی تھی جسے میرے شوہر نے بند کردیا اور وہاں ایک بک شیلف رکھ دیا اس لیے سورج کی روشنی اندر نہیں آتی۔ اسے اندھیرا اچھا لگتا تھا۔" اس عورت نے وضاحت کی۔ ہوتامی کو کتابوں کے ڈھیر کے نیچے ایک پیتل کا شمع دان ملا، وہ بولی۔

"اس میں موم کے نشان نظر آرہے ہیں؟ کیا وہ اسے استعمال کرسکتا تھا؟"

"ہاں، وہ موم بتی کی روشنی میں پڑھا کرتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار ایسا کرنے سے منع کیا کیونکہ مجھے آگ لگنے کا خطرہ تھا لیکن اس کے باوجود موم بتی کے جلنے کی بُو آتی تھی۔ وہ شخص کبھی کبھی بڑی عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا۔"

افنارو سبز دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ صرف مشرقی دیوار ہی ایسی تھی جہاں کوئی بک شیلف نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ اس دروازے کے سامنے تھی جو ہال کی طرف کھلتا تھا۔ اس نے دوبارہ سبز دروازے کی طرف دیکھا جب اس پر پہلی بار رنگ کیا گیا ہوگا تو وہ شوخ سبز ہوگا لیکن اب ہلکا سبز ہوگیا تھا۔

"کیا میں اسے چھو سکتا ہوں؟" اس نے مسز سوگاتا سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو افنارو نے دروازے کی ناب پکڑ کر گھمائی لیکن وہ نہیں کھلا۔

ہوتامی نے کہا "شاید یہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہو؟" اس پر افنارو نے اسے باہر کی طرف دھکیلا لیکن وہ ایک انچ بھی نہیں ہلا۔ ہوتامی بھی اس کی مدد کو آگئی اور دونوں مل کر زور لگانے لگے لیکن اب بھی وہی نتیجہ رہا۔

"یہ نہیں کھلے گا۔" وہ عورت بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔ "جب میرے شوہر نے خودکشی کی تو پولیس والوں نے کہا کہ وہ اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ پانچ پولیس والوں نے مل کر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن یہ ایک انچ بھی نہیں ہلا اگر ہم زیادہ زور لگاتے تو شاید پوری عمارت ہی گر جاتی۔"

"میں سمجھ گیا۔" افنارو اپنے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ کیوں نہیں کھل رہا؟ کیا مکان بننے کے وقت سے ہی ایسا ہے؟"

"ممکن ہے۔" اس عورت نے کہا۔ "میں ماضی کے بارے میں نہیں جانتی لیکن جب سے میری شادی ہوئی ہے، میں نے اسے بند حالت میں ہی دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ میرے شوہر نے اسے کیلوں سے اس طرح بند کردیا ہو کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔"

"لیکن تمہارے شوہر کی غیب دانی کا کیا بنا؟ اس کی خودکشی کے بعد بھی اس دروازے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی؟"

"میں نہیں سمجھتی کہ اس نے سنجیدگی سے یہ بات کہی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس کی خواہش ہو۔"

افنارو نے دوبارہ سبز دروازے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "دروازے کے دوسری جانب کیا ہے؟"

"باغ اور ایک چھوٹا سا پورچ بھی ہے۔ یہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہم اس دروازے سے گزر کر سیدھے باغ میں جاسکتے ہیں لیکن دروازہ نہ کھلنے سے اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔"

"کیا دروازے کے دوسری طرف بھی ایسا ہی رنگ ہے؟"

"نہیں، دوسری طرف اس کا اصلی رنگ ہے۔"

افنارو نے اپنا سر کھجایا اور لکھنے کی میز کے قریب چلا گیا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہارے شوہر کا انتقال اسی اسٹڈی میں ہوا تھا۔"

"ہاں، اس نے اپنی پیٹی چھت کے کنڈے سے باندھی اور اس کا پھندا گلے میں ڈال لیا۔"

"میں نے سنا ہے کہ جب اس کی لاش دریافت ہوئی تو کمرے کی چٹخنی اندر سے چڑھی ہوئی تھی؟"

"ہاں۔"

"کیا تم اس بارے میں مجھے مزید کچھ بتا سکتی ہو؟"

"تم مجھ سے بالکل پولیس والوں کی طرح سوالات کررہے ہو۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "وہ بائیس دسمبر کا دن تھا۔ میرے شوہر کو ہمیشہ دیر سے اٹھنے کی عادت تھی لیکن اس روز وہ دوپہر تک بھی نہیں اٹھا۔ میں اسے دیکھنے گئی۔ وہ اکثر رات گئے تک کام کرکے اسٹڈی میں ہی سو جاتا تھا لیکن دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی اس لیے میں اندر نہ جاسکی۔ میں نے کئی مرتبہ آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا، اس روز ملازمہ بھی نہیں آئی تھی اور میں تنہا یہ دروازہ نہیں توڑ سکتی تھی لہٰذا میں نے گھبرا کر ایمبولینس کو فون کردیا۔"

"ایمبولینس، وہ کس لیے؟" افنارو نے پوچھا۔

"میرا شوہر ڈپریشن کا شکار تھا اور پہلے بھی ایک مرتبہ خودکشی کی کوشش کرچکا تھا۔ اس لیے اس نے وصیت بھی تیار کردی تھی حالانکہ وہ اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ مجھے بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔ اسی لیے میں نے ایمبولینس بلائی۔ بالآخر میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔" یہ کہہ کر عورت

خاموش ہوگئی اور رونا شروع کر دیا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے۔ افتارو نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔
''گویا ایمبولینس کے عملے نے کمرے کا دروازہ توڑا؟''
''ہاں، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں لہٰذا ان کے پیچھے کھڑی رہی۔ چٹخنی بہت مضبوطی سے لگی ہوئی تھی لہٰذا انہیں قبضے توڑنا پڑے۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو مجھے اپنے شوہر کے پاؤں نظر آئے جو چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا اور میں فوراً ہی وہاں سے ہٹ گئی۔''
افتارو سوچنے لگا کہ اگر یہ عورت سچ کہہ رہی ہے تو اسے لاش دریافت ہوجانے کے بعد ثبوت ضائع کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ ضرور اس میں کوئی چال ہے۔ اسی وقت کمرے میں لگے گھڑیال نے چار بجائے تو افتارو چونکتے ہوئے بولا۔
''کافی دیر ہوگئی، اب مجھے چلنا چاہیے۔ تمہارا بہت شکریہ۔''
''ٹھہرو، مجھے ابھی کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' ہونامی نے کہا۔
''تمہیں ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔'' افتارو نے اسے یاد دلایا۔ ''لہٰذا اب ہمیں چلنا چاہیے۔ مسز سوگاتا آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''
''ٹھیک ہے، تم کسی وقت بھی آسکتے ہو۔''
افتارو نے ہونامی کا ہاتھ پکڑا اور باہر آگیا، وہ کافی غصے میں تھی۔ کار میں بیٹھتے ہی بولی۔ ''تم اچانک ہی کیوں چلے آئے؟ مجھے کوئی اور کام نہیں ہے۔ ہم یہاں اس عورت سے واضح جواب سننے آئے تھے۔ اب میں ڈائریکٹر کو کیا بتاؤں گی؟''
''میں اُسے سمجھادوں گا۔ اس عورت سے بات کرنے کی کوشش بے کار ہوگی۔ اس کی کتابیں دینے کی نیت نہیں ہے۔''
''لیکن کم از کم ہمیں وجہ تو معلوم ہونی چاہیے۔''
''وہ تمہیں کبھی نہیں بتائے گی۔''
وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہارے جانے کے بعد بھی میں اس سے کچھ معلوم نہ کرسکی۔ اس نے جو کہانی سنائی، اس پر کون یقین کرسکتا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ کوئی اور ان کتابوں کو خریدنا چاہ رہا ہے۔''
''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' افتارو نے پُرسکون انداز میں کہا۔
''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''
''اگر ان کتابوں کا کوئی خریدار ہوگا تو وہ سوگاتا کی

سرداریاں

ایک بحری جہاز ڈوب رہا تھا۔
انگریز: ''یہاں سے زمین کتنی دور ہے؟''
سردار: ''ایک کلومیٹر۔''
انگریز نے سمندر میں جمپ لگا کر پوچھا: ''کس طرف؟''
سردار: ''تھلےنوں، تھلےنوں۔''

☆☆☆

سردار کو جب شادی کے بعد پتا چلا کہ شادی سے پہلے اس کی بیوی کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا تو، اس نے اپنی بیوی کو یہ کہہ کر طلاق دے دی کہ، جو کسی اور کی نہیں بن سکی تو میری کیسے بنے گی۔

موت کے بعد ان کتابوں کی مالیت کا اندازہ کرنے کے لیے لائبریری میں ضرور جاتا لیکن مجھے وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے ورنہ کمرے میں جمی ہوئی گرد پر کوئی نشان ضرور ہوتا۔ لگتا یہی ہے کہ اس کے شوہر کے مرنے کے بعد میں ہی اس لائبریری میں داخل ہونے والا پہلا شخص ہوں۔''
''تم نے یقیناً لائبریری کا اچھی طرح جائزہ لیا ہوگا؟'' ہونامی نے کہا۔
''ہاں، اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کتابوں کے درمیان کوئی ایسی چیز رکھی ہو جسے وہ کھونا نہ چاہتی ہو لیکن اسے ابھی تک اس کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا۔ اسی لیے وہ ان کتابوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے بھی لائبریری میں نہ جانے دیتی کیونکہ میں بڑی آسانی سے ایک دو نایاب کتابیں چرا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ اسے ان کتابوں کی قیمت سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنے شوہر کے ذخیرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی بلکہ کتابیں نہ دینے کی اور کوئی وجہ ہے۔ میں نے اس سے ہر طرح کے سوال کرلیے لیکن وہ گول مول جواب دیتی رہی۔ میں نے اسی لیے وہاں سے آنے میں جلدی کی کہ کہیں وہ ہم پر شک کرنا شروع نہ کردے۔''
''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ہم پر شک کیوں کرے گی؟''
''مجھے یقین ہے کہ اسی نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور اسے خودکشی کا نام دے رہی ہے۔ کتابیں نہ دینے کی وجہ یہی ہے کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس جرم سے ہے۔''

ہوتا می حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''شوہر کو قتل کرنے کا کیا محرک ہوسکتا ہے؟''

''اب ہمیں اسی کی تحقیقات کرنی ہے۔''

''لیکن کمرا مقفل تھا۔ اگر اس نے قتل کیا ہوتا تو وہ جرم کرنے کے بعد باہر کیسے آئی اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ سبز دروازہ بھی بند ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ اس نے مقفل دروازہ کھولنے کے لیے کوئی ترکیب استعمال کی ہوگی کیونکہ وہ دروازہ تو ایمبولینس کے عملے نے قبضے توڑ کر کھولا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس نے ایک خاص مقصد کے تحت ایمبولینس بلائی تھی تاکہ بند کمرے کی گواہی ثابت ہوجائے۔ وہ اسٹڈی میں بھی اس لیے نہیں گئی تاکہ ظاہر ہوسکے کہ اس کے پاس ثبوت ضائع کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کتنی ہوشیاری سے جرم کا ارتکاب کیا۔''

ہوتا می کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن وہاں ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس کمرے میں اندر جانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ کھڑکی بند ہے اور وہاں کوئی چمنی یا روشن دان بھی نہیں ہے۔ میں اس کا دفاع نہیں کر رہی لیکن پولیس کو بھی اس پر شک نہیں ہے۔ اس کمرے میں جانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ سبز دروازے کو استعمال کیا جائے یا کمرے میں کہیں کوئی خلا موجود ہو۔''

افتارو نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم بہت قریب پہنچ گئی ہو۔''

اس رات گھر آنے کے بعد افتارو نے اپنے باپ سے سوگا تا کی پُراسرار موت پر طویل گفتگو کی۔ اس کا باپ میٹرو پولیٹن پولیس میں انسپکٹر تھا۔ اس نے اس کیس میں گہری دلچسپی ظاہر کی اور بیٹے کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ دوسرے دن وہ اپنے باپ کے ساتھ مساشیتو پولیس اسٹیشن گیا تاکہ اس کیس کے سراغ رساں انچارج سے معلومات کا تبادلہ کرسکے۔ پہلے تو اس نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی لیکن ان دونوں کے زور دینے پر وہ دوبارہ تحقیقات کے لیے تیار ہوگئے۔

تین دن بعد افتارو، ہوتا می سے ملنے لائبریری آیا اور رپورٹ دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت جھوٹی عورت ہے۔ میں نے پولیس کے تعاون سے مسز سوگا تا اور اس کے قریبی رشتے داروں سے تفتیش کی اور بہت کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سب سے پہلے ایک بچے کا ذکر کروں گا۔''

''لیکن ان کا تو کوئی بچہ نہیں ہے۔'' ہوتا می حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ بھی جھوٹ تھا جب ہم نے کاغذات چیک کیے تو معلوم ہوا کہ ان کی ایک سات سالہ بیٹی بھی ہے جو والدین کے ساتھ نہیں رہتی۔ وہ پیدائشی طور پر معذور ہے اور انہوں نے اسے کسی ادارے میں رکھا ہوا ہے، وہ کبھی اسے دیکھنے نہیں گئے البتہ اس کے اخراجات ادا کرتے رہتے ہیں۔ مسز سوگا تا نے ماں ہونے کے باوجود بھی اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔''

''آہ، بے چاری بچی۔'' ہوتا می ہمدردی سے بولی۔

''یہی نہیں بلکہ اس نے پڑوسیوں سے بھی جھوٹ بولا کہ ان کی بچی پیدائش کے وقت مرگئی تھی۔''

''لیکن ان باتوں کا سوگا تا کی موت سے کیا تعلق ہے؟''

''وہی بتا رہا ہوں۔ مسز سوگا تا صرف ماں ہی نہیں بلکہ بیوی کے طور پر بھی ناکام تھی۔ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی رہی اور اب بھی اس کا ہوتوشن جی نامی شخص سے افیئر چل رہا ہے جو ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ڈائریکٹر ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی اور مسز سوگا تا اس سے دو سال بڑی ہے۔ ان دونوں کے درمیان گزشتہ تین سال سے معاشقہ چل رہا ہے۔''

ہوتا می نے پوچھا۔ ''کیا سوگا تا کو اس کا علم ہوگیا تھا؟''

''ہاں، شاید وہ اپنے قتل سے چند روز پہلے اس بات سے واقف ہوگیا تھا اور یقیناً ان دونوں کے درمیان زبردست جھگڑا بھی ہوا ہوگا۔ وسط دسمبر کے بعد یہ دونوں تقریباً ہر روز لڑ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاید سوگا تا نے انہی دنوں دھمکی دی تھی کہ وہ اسے طلاق دینے والا ہے اور تبھی اس نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

افتارو نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''پیسا، تم نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر سوگا تا ایک امیر کبیر خاندان سے متعلق تھا۔ جب میں نے اس کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ جس کی عمر اس وقت ستر برس ہے، ہوٹلوں کی چین کا سب سے بڑا حصے دار ہے اور اس کی ذاتی دولت تقریباً پانچ بلین ین ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سوگا تا کو کبھی خاندان میں اہمیت نہیں دی گئی لیکن لامحالہ وہی اس عظیم الشان دولت کا وارث ہے۔''

''گویا اس عورت کی نظریں شروع سے ہی اپنے سسر کی دولت پر تھیں؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اس کی ساری دولت سوگا تا کو مل جائے لیکن جب سوگا تا کو اس کے معاشقے کا علم ہوا اور اس نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیا تو اسے اپنے خواب چکنا چور ہوتے محسوس ہوئے۔ اگر

سسر کی موت سے پہلے اسے طلاق ہو جاتی تو اس کے حصے میں کچھ بھی نہ آتا بلکہ الٹا اسے ہرجانہ ادا کرنا پڑتا کیونکہ طلاق کی وجہ اس کا معاشقہ تھا لہٰذا اس نے سسر کی دولت حاصل کرنے کے لیے شوہر کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح قانون کے مطابق اس کی بیٹی جائداد کی وارث بن جاتی اور چونکہ معذور ہونے کی وجہ سے وہ جائداد کا انتظام سنبھالنے سے قاصر ہے لہٰذا خود بخود اس کی ماں نگراں بن جاتی۔ یہی اس کا منصوبہ تھا لیکن میرا خیال ہے کہ ڈوریاں ہلانے والا اس کا محبوب فوجی ہو تو تھا۔"

ہونامی افسردہ لہجے میں بولی۔ "واقعی یہ بہت ہی افسوس ناک کہانی ہے۔"

"ہاں لیکن قتل کا محرک معلوم ہوجانے کے بعد اس کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ اب صرف بند کمرے کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ میں نے ایمبولینس کے ہر فرد سے بات کی اور مجھے اس کی کہانی میں کوئی جھوٹ نظر نہیں آیا۔ کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور وہ کمرے میں داخل نہیں ہوئی۔

"پولیس رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"اس میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ خودکشی کی اطلاع ملنے پر انہوں نے کمرے کا بغور معائنہ کیا لیکن وہاں اس دروازے کے سوا باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے پانچ آدمیوں کی مدد سے سبز دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے ہلا نہ سکے اور نہ ہی ایسی کوئی علامت نظر آئی جس سے پتا چلتا ہو کہ کسی نے اس دروازے کو زبردستی کھولنے کی کوشش کی ہوگی گویا وہاں کوئی خفیہ راستہ نہیں تھا۔"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ "پوسٹ مارٹم کے مطابق سوگا تا کی موت لاش ملنے سے ایک دن پہلے تقریباً نو بجے شب واقع ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر چمڑے کی پٹی کی نشانات سے یہی بظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔ ڈاکٹر نے غالباً شروع میں ہی یہ فرض کرلیا تھا کہ یہ خودکشی ہے اور اس نے ان تمام ثبوتوں کو نظرانداز کردیا جو قتل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ جب میں نے اس کی تصدیق کے لیے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کرلیا کہ شاید پوسٹ مارٹم غیر تسلی بخش ہے۔ اس طرح کے کیس میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کو چھت پر لٹکا دے۔ اس کے لیے وہ کافی بھاری ہوگا؟"

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ جرم اس نے خود کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے محبوب نے مدد کی ہوگی۔ ویسے بھی وہ اس رات جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں دے سکا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی کمپنی کے دوستوں کے ساتھ صبح تک شراب پیتا رہا لیکن اس بیان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی کمپنی کا ڈائریکٹر ہے اور اس کے ماتحت وہی بیان دیں گے جو وہ چاہے گا۔"

ہونامی کچھ نہیں بولی تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک بات اور پریشان کررہی ہے۔ وہ عورت مکان کی دوبارہ تعمیر کا منصوبہ بنا رہی تھی اور یہ کام مئی میں شروع ہونے والا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مکان کی حالت بہت خستہ تھی اور اس میں رہنا بہت مشکل ہوگیا تھا لیکن وہ صرف ثبوت مٹانا چاہ رہی تھی اور مکان کی دوبارہ تعمیر کا منصوبہ بنانے سے ہی ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ مجرم ہے۔"

"لیکن اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا جب تک تم بند کمرے کا معما حل نہیں کرلیتے، اسے قاتل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔"

افتارو نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں مانتا ہوں اور اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ دراصل میں تمہارے ڈائریکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے لائبریری کا تعاون چاہیے۔"

اس گفتگو کے دو دن بعد دوپہر کے وقت وہ اپنے باپ انسپکٹر کے ساتھ سوگا تا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے سامنے ایک ٹرک کھڑا ہوا ہے اور وردی میں ملبوس مزدور اس میں کتابوں کے بکس رکھ رہے تھے۔ اس نے ایک مزدور سے پوچھا کہ کتنا کام باقی ہے تو اس نے جواب دیا کہ آدھے گھنٹے میں کام ختم ہوجائے گا۔

افتارو مسکرا دیا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ عمارت کی طرف بڑھے تو انہوں نے ایک عورت کو چلاتے ہوئے دیکھا۔ ہونامی اور سوگا تا کی بیوی کے درمیان بحث ہو رہی تھی لیکن صرف وہ عورت ہی چلا رہی تھی اور ہونامی اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔

"تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ میں پولیس میں رپورٹ کردوں گی۔"

"براہ کرم خاموش ہوجاؤ۔" انسپکٹر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس انسپکٹر توری زوئی ہوں۔"

اس عورت کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن جب اس نے افتارو کو پولیس انسپکٹر کے ساتھ کھڑے دیکھا تو غصے سے بولی۔ "تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو۔"

افتارو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے سوگا تا کی غیب دانی کا معما حل کرلیا ہے اور میں اپنی تھیوری کی

تصدیق کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا تم ہمیں ایک بار اسٹڈی میں لے چلوگی۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا صرف باغ کو ایک نظر دیکھنا ہے۔"

وہ عورت دم بخود کھڑی رہی۔ سب لوگ بھی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئے۔ بالآخر اس نے گہری سانس لی اور اس کے کندھے ڈھلک گئے۔ وہ آہستہ آہستہ مکان کے مشرقی حصے کی طرف جانے لگی۔ باقی لوگ بھی اس کے پیچھے چل دیے۔ جیسا کہ اس نے بتایا کہ وہاں مشرقی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا پورچ تھا۔ اکارو نے اس کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھا اور دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا جو سیاہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کھینچا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سبز دروازہ کھل گیا۔

اکارو نے اپنے باپ انسپکٹر نوری زوئی کی طرف دیکھا تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اکارو بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمیں تمہارے شوہر کی موت کے سلسلے میں کچھ سوالات کرنے ہیں۔ کیا تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوگی؟"

دوسرے دن اکارو لائبریری آیا اور ہونامی سے کہنے لگا۔ "سوگاتا کی بیوہ نے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ قتل کا محرک اور طریقہ کار بالکل میری سوچ کے مطابق تھا۔ اس کے شریک مجرم ہوتو کے وارنٹ گرفتاری آج جاری ہوجائیں گے۔"

ہونامی اپنا کام روکتے ہوئے بولی۔ "اس نے ہمیں کتابیں دینے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ بند کمرے کا راز کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی، کیا واقعی یہی بات ہے؟"

"ہاں، اصل نکتہ کتابوں کی قیمت نہیں بلکہ ان کا وزن ہے اگر تم غور کرو تو سبز دروازے کا معاملہ سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ اس مکان کا نقشہ کچھ ایسا بنا ہوا ہے کہ لائبریری میں رکھی ہوئی کتابوں کا سارا وزن اس سبز دروازے پر آرہا تھا جو لائبریری کے عین نیچے ہے اور اسی وزن کی وجہ سے وہ دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ پانچ آدمی بھی اس دروازے کو ایک انچ نہیں کھسکا سکے۔"

ہونامی اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تمہاری بات سن کر مجھے ایک کہانی یاد آگئی۔ ایک یونیورسٹی ٹیچر اپنے اپارٹمنٹ کے ایک کمرے کو لائبریری کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک دن کتابوں کے وزن سے اس کے فرش میں دراڑ پڑ گئی۔ مجھے حیرت ہے کہ سوگاتا کی لاش چھت سے کیسے لٹکتی رہی اور تم کہتے ہو کہ اسے یہ پہلے سے معلوم تھا۔"

"ہاں، اس نے کہا تھا جب میں مروں گا تو یہ دروازہ کھل جائے گا۔ اگر یہ کتابیں لائبریری کو دے دی جاتیں تو دروازے پر سے وزن ختم ہوجاتا اور اسے دوبارہ کھولنا ممکن ہوسکتا تھا۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ روز وہ دروازہ کھولا۔ بدقسمتی سے یہی بات اس کی موت کا سبب بن گئی اور اس کی بیوی نے اسے قتل کرنے کے لیے یہی طریقہ آزمایا۔"

"وہ کس طرح؟" ہونامی نے پوچھا۔

"اس نے اپنے محبوب سے مدد لی۔ وہ ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو رات کے وقت لائبریری سے کتابیں نکالنے اور دوبارہ وہاں رکھنے پر لگا دیا۔ سوگاتا کو قتل کرنے اور اسے خودکشی کا رنگ دینے کے بعد انہوں نے لائبریری سے کتابیں نکال کر نچلی منزل کے فرش پر رکھیں پھر فوجی ہوتو ہال میں کھلنے والے دروازے کو اندر سے بند کرکے سبز دروازے کے.... ذریعے باغ میں آگیا اور کتابیں دوبارہ لائبریری میں رکھ دی گئیں۔ وہ سب اپنے کام میں ماہر تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی تیزی اور صفائی سے یہ کام کیا۔ فوجی ہوتو دولت کے لالچ میں یہ سب کچھ کررہا تھا کیونکہ بیوہ کے اعترافِ جرم کے مطابق اس نے اپنے سسر کی آدھی دولت اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کے لیے تم نے ہماری لائبریری کو کیوں استعمال کیا۔ تم نہیں جانتے کہ وہ عورت مجھ پر کس بری طرح چلا رہی تھی۔"

"سوگاتا کی بیوہ سے اعترافِ جرم کروانے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے سامنے ہی بند کمرے کا معاملہ حل کیا جائے تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ کھیل ختم ہوچکا ہے۔ اس لیے مجھے یہ انتظام کرنا پڑا۔ بہرحال میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے اپنے ساتھ سوگاتا کے گھر لے گئیں اور اس طرح مجھے اپنی کہانی کے لیے پلاٹ مل گیا۔ اب میں بہ آسانی اپنے ایڈیٹر کی فرمائش پوری کرسکوں گا۔"

"اب تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میرے ساتھ رہنے میں کتنا فائدہ ہے۔" ہونامی شرماتے ہوئے بولی۔

"اگر تم چاہو تو یہ ساتھ مستقل ہوسکتا ہے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔" یہ کہہ کر ہونامی نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

☆
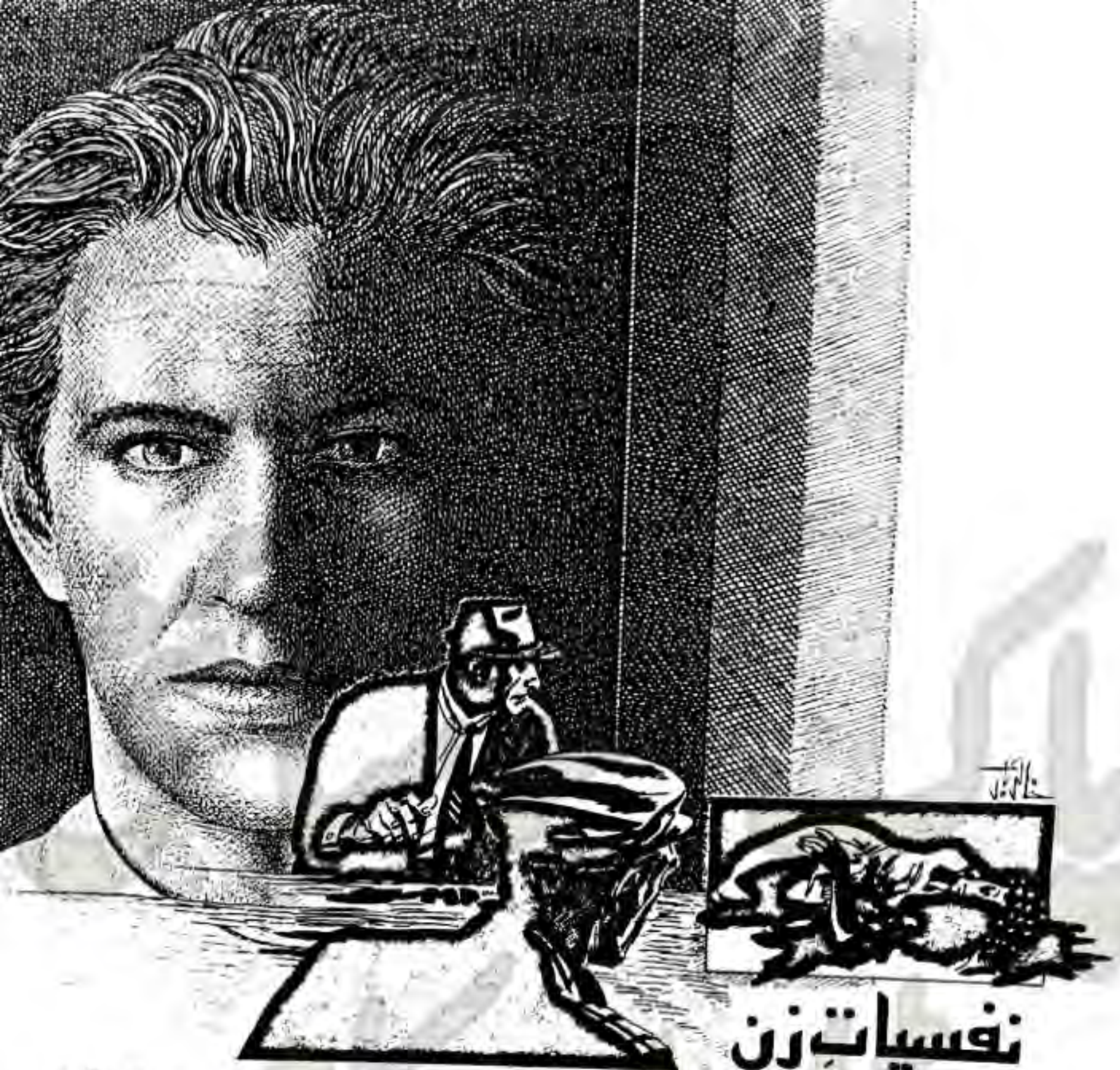
نفسیاتِ زن

میمونہ عزیز

تصویرِ کائنات میں رنگ بھر دینے والے وجودِ زن کو سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں... اور بہت مشکل بھی نہیں... اس کی ہستی میں جاگزیں ہزار پیراہن اپنی اپنی جگہ رنگ بھر دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ عورتوں کی نفسیات اور عادات و فطرت سے آگاہ شخص کی دلچسپ و ماہرانہ کارگزاری... اس کے تجربے نے الجھی گتھی کو سمجھنے کا سرا فراہم کر دیا تھا...

باریک بیں سراغرساں کا امتحان۔ نکتہ رس انجام کی کہانی

''تم تھوڑی سی نفسیات سے کام لینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے نوجوان جونسن سے کہا۔

میرے اس سوال پر وہ حقیقت میں پھٹ پڑا۔

''نفسیات؟'' اس نے کہا۔ ''میں تو ربر کا پائپ استعمال کرنے کی کوشش کرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر تم اسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھو کہ کتنا پُرسکون ہے اور اس بات پر ڈٹا ہوا ہے کہ یہ اس نے نہیں کیا جبکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ اسی نے کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس عورت کا شوہر بھی اسی کو موردِ الزام

قرار دے رہا ہے۔"

"ایک منٹ رک جاؤ۔" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "کون کس بات پر ڈٹا ہوا ہے کہ اس نے کیا نہیں کیا؟ اور کس عورت کا شوہر؟"

جونسن نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ "مجھ سے یہ مت کہو کہ تم اس کیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس کی میں بات کر رہا ہوں۔ پورے شہر کو اس کیس کا علم ہے اسی لیے تو چیف نے اتنا ہنگامہ مچایا ہوا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "آل رائٹ لیکن میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم خود اپنی زبان سے اس کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ تب شاید تم سمجھ سکو کہ میں تھوڑی سی نفسیات سے کام لینے کی کوشش کا مشورہ کیوں دے رہا ہوں۔"

"کیس کچھ یوں ہے۔" جونسن نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "شوہر کا نام ایڈورڈ راجرز ہے۔ وہ ایک رئیل اسٹیٹ کا مالک ہے۔ مقتولہ اس کی بیوی تھی۔ قتل کی رپورٹ شوہر نے کی تھی۔ کال میں نے وصول کی تھی۔ تب میں راجرز کی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ مسز راجرز لیونگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی پر کاری زخم موجود تھا۔ مجھے یہ جاننے کے لیے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مر چکی ہے۔"

"جب تم نے اسے وہاں فرش پر پڑا ہوا پایا تو اس وقت اس نے کیا لباس پہنا ہوا تھا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اس نے ایک پرانا ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور بالوں میں گھونگر ڈالنے کا آلہ لگایا ہوا تھا۔ کوئی بھی اسے ایک خوب صورت حسینہ قرار نہیں دے سکتا تھا جیسا کہ اس قسم کے قتل کے کیسوں میں کہا جاتا ہے۔"

"جب تم وہاں پہنچے تھے تو گھر میں کون کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مقتولہ کا شوہر اور اسٹیونز نامی وکیل جو ہمارا سب سے اہم مشکوک شخص ہے۔"

"میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خاصی شہرت رکھتا ہے۔"

یہ سن کر جونسن کے حلق سے ایک طنزیہ ہنسی کی آواز نکلی۔ "وہ ایک اچھی شہرت کا حامل ہوگا لیکن اس کا جائے واردات سے عدم موجودگی کا جواز نہایت کمزور ہے۔"

"میں اس بارے میں سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔" میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک وقت میں ایک کی بات۔ یہ بتاؤ کہ راجرز کی کہانی کیا ہے؟"

"مجھے راجرز کی کہانی کی پروا نہیں۔" جونسن نے جواب دیا۔ "یہ اسٹیونز کی کہانی ہے جسے رد کرنے میں، میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

"پہلے مجھے راجرز کی کہانی بتاؤ۔" میں نے اصرار کیا۔

"اس کی کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔" جونسن نے کہا۔ "وہ راست گوئی پر مبنی ایک پرفیکٹ کہانی ہے۔ وہ اپنے دفتر میں تھا کہ اس کی بیوی کا فون آ گیا۔ وہ بہ مشکل تمام الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اس نے راجرز کو بتایا کہ اسٹیونز اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے اس پر تشدد کیا ہے اور اسے مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ سیدھا گھر آ جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے ایسا ہی کیا اور جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی مر چکی تھی۔"

"ان تمام باتوں کی کوئی تصدیق؟"

"ہاں۔" جونسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "راجرز کی آپریٹر نے راجرز کے لیے اس وقت ایک کال کے آنے کی رپورٹ دی ہے۔"

"کیا وہ فون کال اس کی بیوی کی تھی؟"

"آپریٹر کا کہنا ہے کہ اس کے خیال میں وہ اس کی بیوی کی کال ہی تھی۔ وہ مسز راجرز کی آواز پہچانتی ہے۔ بہر حال وہ کسی عورت کی آواز ہی تھی۔"

"راجرز کی زندگی میں کوئی اور عورت بھی تھی؟"

"ہم اس بارے میں کچھ پتا نہیں لگا سکے ہیں۔"

"راجرز، اسٹیونز کا مسز راجرز کے پاس آنے کا کیا سبب بیان کرتا ہے؟"

"اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی بیوی کا وکیل کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ان کے تعلقات مہینوں سے قائم تھے۔" جونسن نے بتایا۔

"اس کی کوئی تصدیق؟"

میری اس بات پر جونسن جھنجلا سا گیا۔ "ابھی تک نہیں ہوئی۔ لگتا ہے کہ انہوں نے اس معاملے کو خاصا پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔"

"یہ معاملہ مہینوں سے چل رہا تھا اور راجرز کے علاوہ کسی کو بھی اس بارے میں پتا نہیں چلا۔ کیا یہ بات تمہیں عجیب نہیں لگتی؟" میں نے کہا۔

"اسٹیونز ایک وکیل ہے۔ اس نے سوچی سمجھی تدبیر سے کام لیا ہوگا۔" جونسن نے جواب دیا۔

''قانون اس قسم کے معاملات میں سوچی سمجھی تدبیر کا سبق نہیں دیتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، اب اسٹیونز کی کہانی سنتے ہیں۔''

''اس کی کہانی وہی ہے جس کی آپ توقع رکھ سکتے ہیں۔'' جونسن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ مسز راجرز سے ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ گیا تھا لیکن اس کا دعویٰ ہے کہ جب وہ وہاں پہنچا تو وہ مر چکی تھی اور راجرز وہاں پہلے سے اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے بیان کا پس منظر یہ ہے کہ مسز راجرز اپنے شوہر کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتی تھی اور اس کے قانونی پہلوؤں پر بات چیت کرنے کے لیے اسے بلایا تھا۔''

''اور تمہیں اس کی کہانی پسند نہیں آئی؟''

جونسن نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''رتی بھر بھی نہیں۔ یہ بہت زیادہ مشکوک ہے۔ یہ اس قسم کی کہانی ہے جو ایک وکیل ہی گھڑ سکتا ہے۔ اور یہ اس فون کال کا جواب بھی نہیں جو راجرز کو اپنے دفتر میں موصول ہوئی تھی۔''

''تو پھر تم آئندہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں کہ اسٹیونز پر اس وقت تک تشدد کرتا رہوں جب تک وہ اپنے جرم کا اقرار نہیں کر لیتا۔'' جونسن نے کہا۔ ''اس قسم کے کیسز میں یہی دشواری پیش آتی ہے۔ جب کسی کے خلاف کوئی عملی ثبوت موجود نہیں ہوتا، آپ کو متضاد کہانیوں کا سامنا ہوتا ہے اور آپ کو بس اس شخص سے اقرارِ جرم کرانا ہوتا ہے جو آپ کے خیال میں جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔ جب تک کورونر یا فنگر پرنٹس کے لوگ کوئی نئی چیز سامنے نہیں لاتے، میں بس یہی ایک کام کر سکتا ہوں۔''

''اوہ، لیکن میرا یہ خیال نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے پہلے مشورہ دیا تھا، تمہیں ہمیشہ تھوڑی سی نفسیات سے بھی کام لینا چاہیے۔ تمہیں اس کی کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''میں ان میں سے کس پر اسے آزمانے کی کوشش کروں؟'' جونسن نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

میں ہنس دیا۔ ''میرا مطلب تم سے ہے۔ اسے تم خود آزماؤ، لیکن شاید بہتر یہ ہوگا کہ تم اسے کسی قدر پہلے راجرز پر آزماؤ۔''

کترنیں

ماں بیٹے سے: ''ٹیپو سلطان کون ہے؟''
بیٹا: ''پتا نہیں۔''
ماں: ''پڑھائی پر دھیان دو۔''
بیٹا: ''نوشین آنٹی کون ہیں؟''
ماں: ''پتا نہیں۔''
بیٹا: ''پاپا پر دھیان دیں۔''

☆☆☆

شیخ صاحب کے گھر ڈاکو آ گئے۔ شیخ صاحب نے ڈاکو پر پستول تان لیا۔ ڈاکوؤں کو اندازہ ہو گیا کہ جس گھر میں ہم چوری کرنے جا رہے ہیں، وہ شیخ ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکو کو ترکیب سوجھی، اس نے شیخ صاحب سے کہا۔ ''پستول بیچو گے؟''

شیخ صاحب نے کہا۔ ''کتنے پیسے دو گے؟''
ڈاکو: ''ایک لاکھ۔''
شیخ صاحب نے پستول ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
''یہ لو پستول اور نکالو پیسے۔''

☆☆☆

علامہ اقبال کے ایک دوست سید وحیدالدین کے کچھ رشتے دار تھے۔ جنہیں کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز وہ لوگ کتوں کے ہمراہ علامہ سے ملنے چلے آئے۔ وہ لوگ تو اتر کر اندر جا بیٹھے اور کتے موٹر کار ہی میں رہے۔

اتنے میں علامہ کی ننھی بچی سغیرہ جس نے موٹر میں کتے دیکھ لیے تھے۔ دوڑتی ہوئی اندر آئی اور علامہ سے کہنے لگی۔ ''ابا، ابا موٹر میں کتے آئے ہیں۔''

علامہ نے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا۔
''نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں۔''

اسد عباس، سرگودھا

"راجرز پر۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تم جا کر اس سے کہو کہ آپریٹر کو اس فون کال کے بارے میں اب یاد آ گیا ہے۔ مسز راجرز نے فون پر یہ کہا تھا کہ اس نے اسٹیونز کو یہ کہا تھا کہ وہ ایک طلاق کے معاملے پر اس سے ملنا چاہتی ہے۔ لیکن پہلے وہ اس بارے میں اپنے شوہر سے بات کرنا چاہتی ہے کہ کیا ان کے مابین کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ مجھے خود کو بے وقوف بنانے کے مانند ہوگا۔" جونسن نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ سب تمہارے اندازے ہیں۔"

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ میری قیاس آرائی ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ تمہارا سسٹم کام نہیں کر رہا ہے تو پھر کیوں نہ میری قیاس آرائی کو آزما لیا جائے؟ اس میں کسی قسم کا نقصان تو نہیں ہے؟"

جونسن کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر شانے اچکا دیے اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

پھر پانچ منٹ بعد ہی کمرے میں لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ "جب تک چیف اس بارے میں سن نہیں لیتا، انتظار کرو۔" جونسن نے بلند آواز سے کہا۔ "میں نے اعتراف جرم کرالیا ہے۔" پھر جونسن سے بولا۔ "بے شک اس کے تمام تر کریڈٹ کے مستحق تم ہو۔" اس نے سرخ چہرے سے کہا۔

"مجھے کوئی کریڈٹ نہیں چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہوا کیا؟"

"میں راجرز کو ایک طرف لے گیا اور اسے آپریٹر کے متعلق تمہاری کہانی سنا دی۔ اس نے اس کہانی پر یقین نہیں کیا۔ تب میں نے کہا کہ میں اس آپریٹر لڑکی کو بلا لیتا ہوں تاکہ وہ خود اسے یہ بات بتا دے۔ یہ ایک جھانسا تھا لیکن اس نے کام کر دکھایا۔ راجرز کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

"اس نے یہ مان لیا کہ اس کی بیوی اور اسٹیونز کے درمیان کوئی معاشقہ نہیں تھا۔ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ نباہ نہیں ہو رہا تھا اور وہ اس سے طلاق لینے کا سوچ رہی تھی جیسا کہ تم نے اندازہ لگایا تھا۔ اس کے بعد اس کی بیوی نے اسٹیونز کو طلب کر لیا اور اپنے شوہر سے بھی کہا کہ وہ گھر آ جائے تاکہ اس معاملے پر گفت و شنید کر سکیں۔

"راجرز پہلے گھر پہنچ گیا اور دونوں کے درمیان بات چیت گرما گرمی تک جا پہنچی۔ پھر بات سے بات نکلتی گئی اور آخر کار غصے میں راجرز نے بھاری لیمپ اٹھایا اور اپنی بیوی کے سر پر دے مارا پھر اس لیمپ کو کہیں چھپا دیا۔ اسے یہ علم تھا کہ اسٹیونز بھی پہنچنے والا ہے، سو اس نے اپنی کہانی گھڑ لی۔"

جونسن تفصیل بیان کرنے کے بعد کھڑا ہو گیا اور فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے ووٹ آف تھینکس کا مقروض ہوں۔"

"اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ اپنا سر کھجانے لگا۔ "میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ تم نے مجھ سے اپنے آپ پر کچھ نفسیات آزمانے کے بارے میں کہا تھا۔ اس سے تمہارا کیا مطلب تھا؟"

میں مسکرا دیا۔ "میرا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر تم دو متضاد کہانیوں کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے حقائق پر قدرے نفسیات آزمانے کی زحمت اٹھا لیتے تو اپنا بہت سا وقت اور کوشش کو بچا لیتے۔"

"کون سے حقائق؟" جونسن نے پوچھا۔

"خاص طور پر یہ حقیقت کہ جب مسز راجرز مردہ حالت میں پڑی پائی گئی تھی تو اس نے پرانا ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس کے بالوں میں گھونگھر ڈالنے والے کرلرز لگے ہوئے تھے۔"

"ان چیزوں کا اس معاملے سے کیا تعلق بنتا ہے؟ بہت سی عورتیں عموماً اسی حلیے میں گھر میں پائی جاتی ہیں۔" جونسن نے کہا۔

"بے شک پائی جاتی ہیں۔" میں نے اتفاق کیا۔ "لیکن تمہارے پاس موجود ثبوت کے مطابق مسز راجرز یا تو اپنے شوہر یا پھر اپنے عاشق کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر تم عورتوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو میرے بچے تو حقیقت یہ تھی کہ اس نے ایک پرانا ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور بالوں میں کرلرز لگائے ہوئے تھے جو بلا کسی شک و شبے کے اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنے عاشق کا نہیں بلکہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر وہ اپنے عاشق کی منتظر ہوتی تو بناؤ سنگار کیے ہوئے ہوتی۔ کیا سمجھے؟"

عورتوں کے بارے میں اس کی معلومات صفر تھیں۔ اس لیے میں وہ نکتے پر سر ہلا کے رہ گیا۔

ترکہ

عکسِ فاطمہ

کوئی قریبی غمگسار اگر کسی مصیبت میں گھر جائے تو ایک دوست دوسرے دوست کے لیے مورچے کا کام دیتا ہے۔ ایسا دیرپا مورچا جو کبھی پسپا نہیں ہوتا... وہ انتہائی دگرگوں صورتِ حال سے دوچار تھا... ایک طرف زندگی کی کرن تھی، دوسری جانب موت کی تاریکی... وہ اسے اس زنداں سے نکالنا چاہتی تھی... مگر راستے میں قانون کی نظر نہ آنے والی بھاری اور سنگین رکاوٹیں ایستادہ تھیں...

دشمنوں کے کیمپ میں رہتے ہوئے کسی اپنے کے لیے

ایثار و قربانی کی لازوال اثر انگیز جذبات نگاری...

نیو ہیمپشائر پولیس کی کار برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی جس کے دونوں جانب جھاڑیاں اور صنوبر کے درخت تھے۔ رات گہری ہو چلی تھی اور گاڑی کی چھت پر لگی... روشنیوں کے عکس میں ان درختوں کے سائے ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ لیزا ٹرنر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ کبھی کبھی وہ نظریں اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی لیکن اسے گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا۔ کار کے ریڈیو پر مسلسل پیغامات آرہے تھے لیکن اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے دونوں سپاہی بالکل خاموش تھے۔

ایک مکان کے قریب پہنچ کر وہ سڑک کشادہ ہوگئی۔ وہ دومنزلہ مکان تھا جس کے ساتھ تین گیرج تھے۔ مکان کی روشنیاں گل تھیں اور گیرج کے باہر کئی پولیس گاڑیاں اور وین کھڑی ہوئی تھیں۔ پولیس کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مکان کے عقبی حصے کے پاس جاکر رک گئی جہاں برف سے ڈھکا ہوا لان تھا جو برف سے جمی ہوئی جھیل کے کنارے تک ڈھلوان کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ گاڑی رکتے ہی ایک سپاہی نے لپک کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ”مادام اس طرف آجاؤ۔“

اس نے قدم باہر نکالا تو اس کے پیر برف سے ڈھکی سطح سے ٹکرائے۔ قریب ہی کسی جنریٹر کے چلنے کی آواز آرہی تھی اور جھیل کے کنارے پر ایک بڑا سا چوکور خیمہ استادہ تھا۔ وہ سپاہی کے پیچھے پیچھے اس جانب چل دی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر چند چھوٹے چھوٹے خیمے بھی نصب تھے۔ خیمے کے گرد کئی پولیس والے وردی میں ملبوس، ہیلمٹ، جیکٹ اور سری تھیلوں سمیت موجود تھے اور ان

کے کندھوں پر بھی آٹو میٹک ہتھیار لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے چہروں پر نقاب تھے اور چند ایک کے ہاتھوں میں گرم کافی کی پیالیاں تھیں۔ ان میں سے دو اسٹولوں پر بیٹھے دوربین سے جھیل کی جانب دیکھ رہے تھے۔

لیزا کے قدم رک گئے۔ اس نے جھیل کی طرف دیکھا جو بہت بڑی اور چوڑی تھی۔ اس کی سطح برف سے جم گئی تھی اور آدھے چاند کی روشنی میں اس پر برف گاڑی کے چلنے کا راستہ نظر آرہا تھا۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر درختوں سے گھرے ہوئے جزیرے سیاہ دھبوں کی شکل میں نظر آرہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام سپاہیوں کی توجہ وسط میں واقع جزیرے پر مرکوز ہو۔ سخت سردی میں بھی لیزا کو پسینے آنے لگے۔ اس نے جھرجھری لی اور بوجھل قدموں سے خیمے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ چلنے والے سپاہی نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

وہ خیمہ اندر سے گرم اور روشن تھا۔ فرش پر نیلے رنگ کی ترپال بچھی ہوئی تھی اور کونوں میں دو ہیٹر رکھے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک بڑی سی میز کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں چھوٹا سا ٹی وی رکھا تھا جس پر ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹیج چل رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ وہ ایک جزیرے کا منظر تھا جس پر دو عدد گودیاں اور بہت سے درخت اور چٹانیں نظر آرہی تھیں۔ جزیرے کے وسط میں ایک کاٹیج نما عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ لیزا نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو اسے تصویر میں ایک اور تصویر نظر آئی۔

اس کے کانوں میں عقب سے ایک آواز آئی۔ ''چھوٹی تصویر کاٹیج میں موجود میکس کی ہے۔''

لیزا نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پولیس کیپٹن مکمل وردی میں وہاں کھڑا تھا۔ اس کے بال سرخ اور عمر پینتیس کے قریب ہوگی اور سینے پر اس کے نام کی تختی چمک رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''مارون۔''

''کیپٹن۔'' لیزا بولی۔ ''کیا صورت حال ہے؟''

وہ میز کی طرف بڑھا جہاں بہت سے نقشے اور تصویریں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نقشہ اٹھایا اور بولا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق میکس دو روز قبل اس چھوٹے جزیرے پر پہنچا ہے جہاں صرف ایک کاٹیج اور ایک گودی ہے۔ اس سے پہلے وہ بیروت میں تھا اور اس سے بھی پہلے وہ ہوچی منہ سٹی میں قیام پذیر رہا۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکا اور تقریباً آدھی دنیا کی پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کی تلاش میں ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''ایسے مجرموں کی لمحہ بہ لمحہ نگرانی کی جاتی ہے۔'' ایک عورت کی آواز ابھری۔ وہ خیمے کے ایک کونے سے نمودار ہوئی تھی۔ اس نے سلیٹی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے سینے پر ہوم سینٹر سیکیورٹی کا بیج آویزاں تھا۔ اپنے بھورے بالوں کو اس نے ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا۔

''تم کون ہو؟'' لیزا نے پوچھا۔

''ایک مہمان۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟''

''کیونکہ میں سرکاری ڈیوٹی پر نہیں ہوں اس لیے میں نہیں سمجھتی کہ تمہارے لیے میرا نام جاننا ضروری ہوگا۔'' اس عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر مارون نے مداخلت کی اور بولا۔ ''ہم میکس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ جب ہمیں اس جزیرے پر اس کی موجودگی کا علم ہوا تو ہم نے دو مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔''

''میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔''

پولیس کیپٹن منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے برفانی گاڑی پر دو پولیس والوں کو اس کے پاس بھیجا تھا لیکن اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد ہم اس سے براہِ راست رابطہ کرنے میں محتاط ہو گئے ہیں۔ البتہ اس نے ہمیں دو مرتبہ فون کیا۔ پہلے اس نے یہ کہا کہ دوبارہ اس تک پہنچنے کی کوشش نہ کی جائے اور دوسرا پیغام یہ تھا کہ تمہیں بلایا جائے۔ شاید وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اوہ۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟'' پھر اس نے نقشے پر نظریں جما دیں۔ وہ اس بارے میں مزید نہیں سوچنا چاہتی تھی البتہ اس کی خواہش تھی کہ وہ واپس اپنے گھر جا کر اگلے روز عدالت میں پیش ہونے کے لیے مقدمات کی تیاری کرے۔ یہی اس کا ذریعۂ روزگار تھا اور وہ کم سے کم وقت میں زیادہ پیسے کمانا چاہتی تھی۔

''کیا تم اس سے بات کرنے کے لیے وہاں جاؤ گی؟'' پولیس کیپٹن نے پوچھا۔

''میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟'' لیزا نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"شاید اس طرح اس کے جزیرے سے باہر آنے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"گویا تم مجھے مذاکرات کے لیے بھیجنا چاہتے ہو۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

ہوم سینٹر سیکیورٹی سے تعلق رکھنے والی عورت بے ہودہ انداز میں مسکرائی۔ لیزا نے محسوس کیا کہ خیمے میں موجود زیادہ تر مرد اور عورتیں پولیس کی وردی میں نہیں تھے اور یقیناً ان سب کا تعلق خفیہ ایجنسی سے تھا جو اس مفرور شخص کو پکڑنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہ رہے تھے۔

مارون بولا۔ "تم جو کچھ کر سکتی ہو وہ کم از کم ہمارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو بہتر ہوگا۔"

لیزا تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے تو بدلے میں تم اسے کیا پیشکش کر سکتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں؟" مارون نے کہا۔

"شاید تم نے میری بات غور سے نہیں سنی۔" لیزا بھناتے ہوئے بولی۔ "تم چاہتے ہو کہ میں ایک ایسے بھگوڑے کے پاس جا کر بات کروں جو لاکھوں کی نقدی لوٹ کر فرار ہوا ہے اور اس پر کچھ لوگوں کے قتل کا بھی الزام ہے۔ ایسے خطرناک مجرم کو قابو کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو دینا ہوگا۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ اس طرح اس کی زندگی بچ جائے گی ورنہ وہ پولیس مقابلے میں کتے کی موت بھی مارا جا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ پیشکش ناکافی ہے۔" لیزا نے کہا۔

مارون نے ٹیلی ویژن اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس فوٹیج کو دیکھو، یہ ایک ڈرون کی تصویر ہے۔ ضرورت پڑنے پر اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ابھی صورت حال ہمارے کنٹرول میں ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ خود کو ہمارے حوالے کر دے لیکن اگر معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اوپر والے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔"

"پھر؟" لیزا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"لہٰذا اسے کاٹیج اور جزیرے سے باہر نکالو۔ اس سے پہلے کہ نئے احکامات آ جائیں اور تم جانتی ہو کہ ایک بار ڈرون حملہ ہو گیا تو یہ جزیرہ پتھروں کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات اچھی طرح

ایک صاحب کا گدھا گم ہو گیا۔ ایک سردار جا کر گدھے کو تلاش کر کے لے آیا۔ کسی نے پوچھا۔

"سردار جی! آپ نے گدھا کیسے تلاش کیا؟"

سردار نے جواب دیا۔ "اس میں کون سی مشکل بات ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں گدھا ہوتا تو کہاں جاتا؟ بس اسی جگہ جا کر گدھے کو پکڑ کر لے آیا۔"

☆☆☆

سردار ڈاکٹر سے: "ڈاکٹر صاحب مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔"

ڈاکٹر: آپ رات کو 2 ہزار تک گنتی کیا کریں، نیند آ جائے گی۔"

دو دن بعد سردار پھر آیا۔

ڈاکٹر: "عمل کیا تھا؟"

سردار: "جی ہاں کیا تھا، کام تو مشکل تھا۔ ایک ہزار تک گنا تو نیند آنے لگی، پھر تیز پتی والی چائے پی اور جاگ کر 2 ہزار پورے کیے۔"

سرگودھا سے اسد عباس کی سوغاتیں

سمجھ گئی ہوگی۔"

"ہاں۔" لیزا کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔" مارون بولا۔

خیمے سے باہر نکلتے ہی سرد ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ وہ کیپٹن کے ساتھ چلتی ہوئی اس جگہ تک آئی جہاں کچھ برف گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کیپٹن نے اسے بلٹ پروف جیکٹ دی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے اپنی حفاظت کی فکر ہے۔ اس طرح ہمارے درمیان بھروسا بڑھ سکتا ہے۔"

"اسے پہن لینے کے بعد تم محفوظ ہو سکتی ہو۔" کیپٹن نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھ پر گولی نہیں چلائے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" یہ کہہ کر مارون نے ایک پلاسٹک کا ڈبا کھولا اور اس میں سے ایک سیل فون نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لو، ضرورت پڑنے پر تم مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔"

''اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''ضد نہ کرو، یہ بہت ضروری ہے۔'' مارون نے کہا۔

لیزا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ ٹیلی فون ہی ہے لیکن میں تھوڑی سی شکی مزاج بھی ہوں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ محض فون ہی نہیں بلکہ سننے والا آلہ بھی ہوسکتا ہے اس لیے تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔''

مارون کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میرے ساتھ آؤ۔''

وہ اسے لے کر جھیل کے کنارے تک گیا جہاں تین برف گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان میں کسی ایک کا انتخاب کرلو۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کبھی ایسی بے ہودہ گاڑی نہیں چلائی۔ مجھے تو اسے اسٹارٹ کرنا بھی نہیں آتا۔ تم مجھے صرف برف میں پہننے والے جوتے اور باکس دے دو۔ میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ برف کی سطح پر یہ فاصلہ طے کرسکو گی؟''

''بالکل۔'' لیزا نے کہا۔ ''اس طرح میکس کو بھی اندازہ لگانے میں آسانی رہے گی کہ واقعی میں ہی اس سے ملنے آئی ہوں اور اس طرح ہمارے درمیان اعتماد میں اضافہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' مارون نے کہا۔ ''اور کچھ؟''

''ہاں۔'' لیزا نے کہا۔ ''مجھے ایک لمبا گرم زیر جامہ بھی چاہیے۔ سردی سے میری ٹانگوں کا خون جم گیا ہے۔''

بیس منٹ بعد وہ دونوں ہاتھوں میں باکس تھامے کوہ پیماؤں کے انداز میں جھیل عبور کررہی تھی۔ اس کے جوتے برف میں دھنسے جارہے تھے لیکن سرد موسم کی وجہ سے برف کی سطح سخت ہوگئی تھی اور وہ مناسب رفتار سے جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہوا میں تیزی نہیں تھی جس کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہورہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا جزیرہ اب بھی کافی دور نظر آرہا تھا۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ میکس اس ویران جزیرے پر ہوگا اور اسے اپنے آپ پر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سرد رات میں برف سے جمی.... جھیل عبور کررہی ہے۔

بالآخر وہ جزیرے پر پہنچ ہی گئی۔ وہاں کوئی روشنی تھی اور نہ ہی اسے کوئی نقل وحرکت نظر آئی۔ اس نے رک کر اپنی سانس قابو میں کرنے کی کوشش کی اور پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اسے وہاں بہت سی روشنیاں نظر آئیں۔ اسے اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کی نگرانی کی جارہی تھی۔

اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا، کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی سوائے ایک مدھم سرگوشی کے اور جس کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا تھا کہ فضا میں کوئی ڈرون موجود ہے اگر وہ صبر سے کام لے کر آسمان پر دیر تک نظریں جمائے رکھتی تو اسے ڈرون کا سایہ نظر آسکتا تھا لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا لہٰذا اس نے اپنی نظریں نیچے کرلیں اور جزیرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دور سے اسے سرخ روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔

یہ کیا تھا کوئی چنگاری یا پتنگا؟ تھوڑی دیر بعد وہ روشنی دوبارہ نظر آئی۔ اس نے جھک کر اپنے سینے کی طرف دیکھا وہاں ایک چھوٹا سا سرخ دھبا نظر آرہا تھا جو کسی رائفل یا سیمی آٹو میٹک ہتھیار سے نکلنے والی لیزر شعاع بھی ہوسکتی تھی۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ اس نے اپنے جسم کا وزن ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کیا اور چلاتے ہوئے بولی۔

''اسے بند کردو ورنہ میں واپس جارہی ہوں۔''

اس نے چند لمحے انتظار کیا پھر وہ دھبا غائب ہوگیا۔ وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے جزیرے کا منظر واضح طور پر نظر آنے لگا۔ وہاں بڑے صنوبر کے درخت، ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ چھوٹا سا ساحل، بوٹ ہاؤس اور ایک گودی بھی نظر آرہی تھی اور ڈھلوان سطح پر وہ کاٹیج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھا لیکن کہیں کوئی روشنی نہ تھی۔ اس نے اپنی رفتار کم کردی اور سوچنے لگی کہ کاٹیج تک پہنچنے کا بہترین راستہ کون سا ہوسکتا ہے۔

جونہی وہ گودی کے قریب پہنچی ایک آواز نے چونکا دیا۔ ''لیزا، مجھے افسوس ہے میرا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں تھا۔''

''تمہارا جو بھی مقصد ہو لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' لیزا نے کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''چٹانوں کے پیچھے، تمہاری بائیں جانب۔ جہاں یہ گودی ختم ہوتی ہے، تم یہاں آجاؤ پھر میں تمہیں اندر لے جاؤں گا۔''

''برف کتنی گہری ہے؟'' لیزا نے پوچھا۔
''زیادہ گہری نہیں۔تم جھیل سے باہر آنے کے بعد اپنے جوتے اتار سکتی ہو۔''
''شکریہ، میں ایسا ہی کروں گی۔''
لیزا نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔وہ گودی پر سے گزرتے ہوئے ساحل پر آئی پھر اس نے جھک کر جوتوں کے تسمے کھولے اور انہیں اتار کر بانسوں سمیت ایک ابھرے ہوئے ٹیلے پر رکھ دیا۔ان فالتو چیزوں سے نجات حاصل کر کے اسے بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔
وہ چٹانوں کی جانب بڑھی اسی اثنا میں ایک سایہ نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔اس نے سفید پتلون، لمبا کرتہ اور سفید ٹوپی پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں پستول تھام رکھا تھا۔
''لیزا،تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' میکس نے کہا۔
''کاش میں بھی ایسا کہہ سکتی۔'' لیزا نے کہا۔
''اندر آ جاؤ۔'' وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔''یہ کاٹیج چھوٹا لیکن کافی آرام دہ ہے۔''
کاٹیج اندر سے گرم تھا۔میکس نے اپنی ٹوپی اتاری اور پستول میز پر رکھ دیا۔ایک آتش دان میں لکڑیاں دہک رہی تھیں۔لیزا نے بھی اپنا لمبا کوٹ، ہیٹ اور دستانے اتار کر میکس کے حوالے کر دیے۔جس نے انہیں ایک پرانی کاؤچ پر رکھ دیا۔کاٹیج کے وسط میں ایک چوکور لکڑی کی میز رکھی ہوئی تھی۔میکس اور لیزا آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔میز کے ایک طرف گیس لیمپ رکھا ہوا تھا جس کی روشنی میں کاٹیج کا اندرونی منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔
میکس کافی تھکا ہوا اور کمزور لگ رہا تھا۔اس کے چہرے پر لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں سوج رہی تھیں۔لیزا نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔''تمہارا وزن کافی کم ہو گیا ہے۔''
''ہاں، مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑا۔ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرتا رہا۔اسی وجہ سے اپنی خوراک پر بھی توجہ نہ دے سکا۔''
یہ کہہ کر میکس نے کاغذ کا ایک پیڈ اٹھایا اور پین سے اس پر کچھ لکھ کر لیزا کے حوالے کر دیا۔کاغذ کے اوپری حصے پر ایک پانے کی ڈرائنگ بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔''پال پلمبنگ اینڈ ہیٹنگ'' میکس نے اس کاغذ پر لکھا۔''دیواروں کے بھی کان اور آنکھیں ہوتی ہیں۔''
لیزا نے کاغذ کی پشت پر جواب میں لکھا۔''میں سمجھ سکتی ہوں۔''

میکس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور وہ دھیمی آواز میں بولا۔''مسز! تمہارے آنے کا شکریہ۔''
''تمہیں میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' لیزا نے جواب دیا اور پیڈ پر لکھا۔''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''
''بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔'' میکس نے جواب دیا۔
وہ اونچی آواز میں بولی۔''تمہیں معلوم ہے کہ کس صورتِ حال سے دوچار ہو۔''
''ہاں، بہت اچھی طرح۔'' اس نے کہا۔
لیزا نے دوبارہ کاغذ پر لکھا۔''لیکن تم یہاں کیوں آئے جبکہ جانتے ہو کہ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی بچاؤ کا کوئی راستہ۔''
میکس نے ٹھنڈی سانس بھری اور جواب میں لکھا۔''میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔بہت تھک چکا ہوں۔کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟''
لیزا نے جلدی سے لکھا۔''میں پوری کوشش کروں گی۔'' پھر بولی۔''تمہیں معلوم ہے کہ اس جزیرے کے باہر تمہارا کون انتظار کر رہا ہے؟''
''ہاں، قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی۔''
لیزا نے پیڈ پر لکھا۔''کیا تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے، پلیز اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔''
میکس نے جواب میں لکھا۔''میں تو مذاق کر رہا تھا۔مجھے یقین ہے کہ وہاں مقامی پولیس کے ساتھ ساتھ فیڈرل پولیس کے لوگ بھی ہیں۔''
''تمہارا خیال صحیح ہے۔''
''اب تمہارا کیا منصوبہ ہے؟'' میکس نے پوچھا۔
لیزا کرسی پہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔''تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ لے جا کر عدالت میں پیش کر دوں گی تاکہ تمہارے ساتھ انصاف ہو اور تمہاری جان بچ سکے۔''
اس نے برا سا منہ بنایا اور پیڈ پر کچھ لکھ کر لیزا کی طرف بڑھا دیا۔''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری زندگی کی کوئی ضمانت ہو سکتی ہے؟''
لیزا نے پیڈ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بولی۔''تمہارے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ تم پر بینک لوٹنے کے الزامات ہیں۔تم نے بے پناہ رقم چرائی ہے جسے ایسے بینک اکاؤنٹ میں رکھا گیا ہے جس تک رسائی ممکن نہیں۔''
''تم سرکاری وکیل ہو یا وکیلِ صفائی؟'' میکس نے

طنزاً کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔'' لیزا نے جواب دیا۔

''ہاں جانتا ہوں، تم ایک ایسی وکیل ہو جو غیر معروف لوگوں کے غیر معروف مقدمات لڑتی ہے اور پسے ہوئے مظلوم طبقات کے لیے آواز بلند کرتی ہے لیکن میں کوئی مظلوم یا چھوٹا آدمی نہیں ہوں۔''

لیزا نے کاٹیج کے اندرونی حصے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو تم اتنے بڑے بھی نظر نہیں آتے۔''

میکس نے قہقہہ لگایا اور پھر کھانسنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آرہا تھا۔ لیزا نے اس کی طرف دیکھا اور پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''پیرس.... میں ہمیشہ وہیں رہنا چاہتا ہوں۔''

میکس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن وہ قہقہہ لگانے سے ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر کھانسی کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''پیرس ایک شاندار شہر ہے جو شاندار عورتوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں کے لوگ مغرور ہو سکتے ہیں لیکن ان کے پاس اس کے کئی جواز ہیں اور وہاں کی غذا..... اوہ میرے خدا، میں نے زندگی میں بھی اتنا شاندار کھانا نہیں کھایا۔ تم پورے پیرس کا چکر لگا لو، وہاں کی سڑکیں خوب صورت عمارتوں اور پارکس کی بدولت اور بھی خوب صورت نظر آتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خوشی سے تمہاری چیخ نکل جائے گی۔''

''تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں میکس۔'' لیزا نے کہا۔ ''لیکن کیا ہم اصل موضوع کی طرف نہیں آسکتے؟''

''کیوں؟ کیا تم وہاں جانا نہیں چاہتیں؟''

لیزا نے غصے میں آکر پیڈ پر لکھا۔ ''تمہیں یہاں سے گئے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔''

اس نے جواب میں لکھا۔ ''یہاں کون میرا انتظار کر رہا تھا؟''

لیزا نے لکھا۔ ''میں، لیکن تم تو شروع سے ہی چور تھے، کیوں؟ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟''

میکس نے مزید چند لائنیں لکھیں۔ ''مجھے شروع سے ہی اس طرح کے کام اچھے لگتے تھے۔ غائب ہو جانا، چھپ جانا، جیبیں کاٹنا، چوریاں کرنا، یہ میری بھوک تھی جس پر میں قابو نہیں پا سکتا تھا۔''

''کیا تم اپنے آپ کو بدلنے کے بارے میں غور کرو گے؟'' لیزا نے پوچھا۔

''یہ ایک بڑا سوال ہے۔ تم نے مجھ پر لگنے والے الزامات کی پوری فہرست سنا دی ہے لیکن تم نے دو بڑے جرائم کو نظر انداز کر دیا۔''

''میں اس پر یقین نہیں کرنا چاہتی۔''

''واقعی! کیا تم یہ یقین کرنا نہیں چاہتیں کہ تمہارا پیارا بھائی کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔''

اس نے پیڈ اٹھایا اور کچھ لکھنے کے بعد اسے لیزا کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میں نے زندگی میں تین آدمیوں کا قتل کیا ہے اور یہ سب مجھے اپنے دفاع میں کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک ایرانی فوج کا افسر تھا دوسرا اسلحے کا تاجر اور تیسرا میکسیکو کا تاجر، ان میں سے کوئی نیکوکار نہیں تھا۔''

وہ چند لمحے رک کر بولا۔ ''میرا معاملہ پیچیدہ ہے۔ میں نے غیر ملکی سرزمین پر تین قتل کیے ہیں، وہ لوگ مجھے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔''

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' لیزا نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

وہ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رہنے دو لیزا، تم نے ہی بتایا ہے کہ میرے استقبال کے لیے جزیرے کے باہر مقامی اور ریاستی پولیس کے لوگ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایجنسیوں کے لوگ بھی ہوں گے جو مجھے بالکل پسند نہیں کرتے۔''

''تمہیں قانون پر بھروسا ہونا چاہیے۔'' لیزا نے کہا۔ ''تمہارے پاس اب بھی قانونی جنگ لڑنے کا حق ہے۔''

میکس منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تمہیں مزید پڑھنے اور مزید جاننے کی ضرورت ہے۔ قانون اور قانونی جنگ کیا ہوتی ہے، یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد مقامی پولیس مجھے گرفتار کرلے گی پھر اس کے بعد اعلیٰ افسران مجھے اپنی تحویل میں لے لیں گے اور مجھے کسی غیر ملکی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ حساب بے باق ہو جائے اور اس طرح میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاپتا کہلاؤں گا۔''

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' لیزا نے کہا۔

''وہ تمہیں بھی خاموش کر دیں گے۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر فضا میں کسی انجن کی آواز سنائی دی۔ لیزا نے پیڈ اٹھایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور میکس کی طرف بڑھا دیا۔ میکس نے وہ تحریر پڑھی۔ اس

میں لکھا تھا۔

''پولیس کا کہنا ہے کہ اگر تم نے خود کو ان کے حوالے نہ کیا تو ڈرون حملہ ہو سکتا ہے۔''

میکس نے اپنی بھویں چڑھائیں اور جواب میں لکھا۔''دیکھا جائے گا۔''

لیزا کا دل چاہا کہ وہ پیڈ اٹھا کر اپنے بھائی کے منہ پر مار دے۔ اس نے غصے سے دانت پیسے اور پیڈ پر لکھا۔''مذاق بند کرو۔ میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

میکس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے جواب میں لکھا۔''ہاں، اور تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ ایسے خراب بھائی سے واسطہ پڑ گیا۔''

لیزا نے دو مرتبہ وہ تحریر پڑھی اور اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔''خراب نہیں، بس تم غائب ہو گئے تھے۔''

میکس نے وہ پیڈ واپس لے لیا اور اس پر کچھ لکھنے کے بعد بولا۔''میں پیرس میں قیام کے دوران ہمیشہ تمہارے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ جاننا چاہتی ہو کیوں؟''

''بالکل۔'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''وہاں خوب صورت عمارتیں، پارک اور سڑکوں کے ساتھ ساتھ کئی جنگی یادگاریں بھی ہیں جب انقلاب آیا تو لوگوں نے اپنا فرنیچر نکال کر سڑکوں پر پھینک دیا تاکہ مورچے بنا سکیں۔''

یہ کہہ کر وہ لیزا کے قریب آیا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔''لیزا! تم نے بھی ہمیشہ میرے لیے مورچے کا کام کیا اور کبھی پسپا نہیں ہوئیں۔''

لیزا کا حلق خشک ہو گیا اور وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔''میں جو کچھ کر سکتی ہوں وہ کروں گی۔''

''تم نے بہت کچھ کیا اور شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتی ہو۔''

''میکس۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، سنجیدہ ہونے کا وقت آ گیا۔'' وہ میز پر ہلکے سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔''جانتا ہوں کہ میرے پاس زیادہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن میں گورنر کے دستخطوں سے ایک خط چاہتا ہوں کہ وہ مجھے ریاست میں رکھنے کے لیے وہ سب کرے گا جو اس کے اختیار میں ہے۔ مجھے فیڈرل پولیس کی تحویل میں جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن نیو ہیمپشائر میں بھی فیڈرل کورٹ ہیں۔ وہ یہاں بھی

علاج

ایک کارخانے میں ملازمت حاصل کرنے والوں سے انٹرویو لیا جا رہا تھا۔ آفس میں موجود منیجر نے ایک امیدوار سے سوال کیا۔

''تم محبت اور شادی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟''

ہوشیار امیدوار نے یہ جواب دے کر ملازمت حاصل کر لی کہ''محبت اندھی ہوتی ہے اور شادی اس اندھے پن کا بہترین علاج ہے۔''

تجمل حسین حیدری، پنڈ دادن خان

مجھ پر مقدمہ چلا سکتے ہیں لیکن میں لاپتا ہونا نہیں چاہتا۔''

''ایسا خط ملنے میں کچھ وقت لگے گا، اس کے لیے کام کرنا ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں، تم واپس جاؤ اور جو بھی انچارج ہے اس سے کہہ دو کہ جب تم وہ خط لے کر میرے پاس واپس آؤ گی تو میں اپنے آپ کو پُرامن طور پر ان کے حوالے کر دوں گا۔ میں صرف انڈرویئر اور جوتے پہن کر جھیل عبور کروں گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔''

لیزا نے اپنے آنسو پونچھے۔ یہ ایک مناسب حل تھا۔ گوکہ اسے کئی سال کی جیل ہو جاتی لیکن وہ کم از کم محفوظ تو رہ سکتا تھا۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔''مجھے منظور ہے۔''

میکس اس کا کوٹ اٹھا لایا اور کوٹ پہننے میں اس کی مدد کرنے لگا پھر حیرت انگیز طور پر اس نے اسے گلے لگا لیا پھر بولا۔''سسٹر! تمہارا شکریہ کہ مجھ سے ملنے یہاں آئیں۔''

''میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔'' وہ بولی۔ ''میں یہی کرنا چاہ رہی تھی۔''

اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''جھوٹی۔''

لیزا نے بھی جوابی قہقہہ لگایا اور بولی۔''چور۔''

پھر اس نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے۔ سر پر ہیٹ رکھا اور دستانے چڑھا لیے۔ میکس میز کے پیچھے چلا گیا اور بولا۔''میرا باہر نکلنا خطرناک ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم جوتے پہن کر نکل جاؤ اور واپسی کا راستہ خود ہی تلاش کر لو۔''

"میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں۔" لیزا بولی۔ "ہم وکیل لوگ ہمیشہ راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔"

"مسٹر اپنا خیال رکھنا۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

"تم بھی۔" لیزا نے کہا۔ "جتنی جلدی ممکن ہوسکا، میں واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

دس منٹ بعد وہ واپس جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ سب سے پہلے اس نے میکس کے مطالبے کے بارے میں سوچا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ریاستی پولیس اور گورنر کو اسے ماننے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ وہ صرف ایک دستخط شدہ کاغذ اور ہیمپشائر سے باہر نہ بھیجے جانے کی ضمانت ہی تو مانگ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ مطالبہ ناگوار گزرے لیکن وہ ایسا معاہدہ کروا سکتی تھی۔

وہ اچانک ہی چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے برف پر ایک سرخ دھبا رقص کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ لیزر کی شعاع ہے۔ اس نے مڑ کر جزیرے کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں دوبارہ برف پر جم گئیں۔ وہ دھبا ساحلی پٹی کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں پولیس والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ زور سے چلائی۔

"نہیں۔" لیکن اس سے پہلے کنارے پر کھڑے پولیس والوں نے فائر کھول دیا۔

اسے لگا جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ وہ نہ جانے کس طرح گرتی پڑتی خیمے تک پہنچی اور اب ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی جس کی اسے بالکل بھی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف وردی اور بغیر وردی والے پولیس افسر کھڑے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک اس کے دماغ کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر دیکھا لیکن اس کی توجہ کسی ایک چیز پر مرکوز نہیں تھی۔

"مس ٹرنر۔"

وہ اس آواز کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ اس نے کچھ دیر پہلے گولیاں چلنے اور دھماکوں کی آواز سنی تھی۔ وہ اس منظر کو بھی بھلا دینا چاہتی تھی جب برف پر چلنے والی گاڑیاں جزیرے کی جانب جا رہی تھیں تاکہ مرنے والے کی لاش حاصل کر سکیں۔

"مس ٹرنر۔"

وہ اس آواز پر پلٹی۔ کیپٹن مارون اس کے قریب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ لیزا کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہونے لگا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہیں اسے نہیں مارنا چاہیے تھا۔"

"وہ لیزر شعاعوں کی مدد سے ہمارے سپاہیوں کو تلاش کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے کسی آدمی کو نشانہ بناتا ہم نے اسے ختم کر دیا۔"

"وہ ہتھیار ڈالنے پر تیار ہوگیا تھا۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو لیکن اس سلسلے میں ہمارے اصول بالکل واضح ہیں۔ اگر ہمارے کسی آدمی کو بھی خطرہ ہو تو ہم طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔"

"تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے۔" وہ غصے سے بولی۔ "وہ ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔"

مارون گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "واقعی اگر ایسا ہے تو وہ کاٹیج کے باہر اسلحہ ہاتھ میں لیے کیوں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے لیزر سے نشانہ لے کر ہمارے آدمیوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کیوں کی؟"

لیزا نے اپنا منہ بند کر لیا۔ مارون نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کا مطالبہ مان لیا جاتا اور گورنر تمہارے بھائی کی شرط مان لیتا۔ جو بین الاقوامی مجرم ہے اور جس کے اوپر قتل و غارت گری اور بینک ڈکیتی جیسے سنگین الزامات ہیں۔"

لیزا نے اپنا سر ہلایا اور افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تمہیں معلوم تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ تم جان چکے تھے کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اب مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کیونکہ میں پہلی بار تمہارے منہ سے گورنر کا نام سن رہی ہوں جبکہ میں نے تمہیں اس کے مطالبے کے بارے میں ابھی تک نہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے ہماری سب باتیں سن لیں۔"

مارون چند لمحے خاموش کھڑا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ مزید کیا بات کرے پھر وہ بولا۔ "ہمیں اس کے قبضے سے کوئی رقم، کاغذات یا کمپیوٹر فائل نہیں ملی جس سے معلوم ہوسکے کہ اس نے لوٹی ہوئی کروڑوں کی رقم کہاں رکھی ہوئی ہے لیکن تم یہ ضرور جاننا چاہو گی کہ ہمیں اس کے سامان سے کیا ملا؟"

"تم بتاؤ، میں سن رہی ہوں۔"

مارون نے کہا۔ "نشہ آور دوائیں۔"

لیزا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "یہ محض ایک الزام

ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا اور اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے تم اس پر کیچڑ اچھال رہے ہو کیونکہ کچھ لوگ اسے موجودہ دور کا رابن ہڈ سمجھتے ہیں۔ اس لیے تم اس کی کردار کشی کر رہے ہو۔ یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے۔ میرا بھائی منشیات فروش نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کوئی نشہ آور دوا استعمال کی۔''

''معاف کرنا۔'' مارون نے کہا۔ ''وہ ان کا عادی تھا۔ ابتدائی طبی معائنے کے دوران اس کے بازوؤں اور رانوں پر انجکشن کے نشانات نظر آئے ہیں۔''

''یہ بکواس ہے۔''

''نہیں، یہ سچ ہے۔ ہمیں اس کا میچ سے تین طرح کی دوائیں ملی ہیں جو لبلبہ کے سرطان کے علاج میں استعمال کی جاتی ہیں۔''

''کیا۔۔۔؟'' وہ چلاتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیمار تھا؟'' مارون نے کہا۔

لیزا کے سامنے میکس کا چہرہ آگیا۔ شاید اسی لیے وہ اتنا کمزور لگ رہا تھا لیکن وہ دل پر جبر کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی۔''

مارون نے کہا۔ ''ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ تمہارا بھائی قریب المرگ تھا اور اسے یہ بات معلوم تھی۔ شاید وہ اسی لیے یہاں آیا تھا کہ تم سے مل سکے اور مارا جائے۔ وہ ہمارے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا لیکن میں اسے خودکشی ہی کہوں گا۔''

لیزا نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ مارون نے اپنے لہجے کو مزید نرم بناتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں گھر بھیجنے کے لیے گاڑی کا انتظام کرتا ہوں۔''

خیمے سے باہر بہت سردی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی خیموں اور گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ان میں سے کسی ایک خیمے میں چادر میں لپٹی ہوئی اس کے بھائی کی لاش رکھی ہوگی۔ اگر وہ مضبوط عورت ہوتی تو ان سے مطالبہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کا آخری دیدار کرنا چاہتی ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ میکس کا چہرہ دیکھ سکے۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ایک پولیس کار اس کے پاس آکر رک گئی۔ جو اسے ہنگامی طور پر یہاں سے لے جانے کے لیے آئی تھی۔ اس میں سے ایک خاتون پولیس افسر اتر کر اس کے پاس آئی اور بولی۔ ''مس ٹرنر!''

''ہاں، میں ہی مس ٹرنر ہوں۔''

''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ تم اگلی نشست پر بیٹھنا چاہوگی یا پیچھے؟''

لیزا نے گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا مطلب تھا کہ اسے راستے میں ڈرائیور سے کچھ باتیں بھی کرنا پڑتیں جبکہ وہ تنہائی چاہ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عقبی نشست ٹھیک رہے گی۔''

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور دروازہ بند ہوگیا۔ خاتون افسر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے ریڈیو اٹھایا اور وائرلیس پر کچھ بولنے لگی۔ سردی سے لیزا کی ناک بہہ رہی تھی۔ اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں تاکہ کوئی رومال یا ٹشو پیپر مل جائے۔ تبھی اس کی انگلیاں ایک کاغذ سے ٹکرائیں۔ اس نے وہ مڑا ہوا کاغذ باہر نکالا اور سیدھا کر کے اسے پڑھنے لگی۔ اس کے اوپری کونے پر لکھا ہوا تھا۔

''پال پینٹ پلمبنگ اینڈ ہیٹنگ۔''

اسے یاد آگیا۔ یہ وہ آخری تحریر تھی جو میکس نے لکھی اور گلے لگانے کے دوران اس کی جیب میں ڈال دی۔ کمپنی کے نام کے نیچے جزیرہ کیمین کے ایک بینک کا پتا لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی بہت سارے نمبرز اور پاس ورڈ لکھے ہوئے تھے۔ نیچے ایک مختصر جملہ تھا۔

''سسٹر، تمہارے لیے ایک تحفہ۔''

اس نے احتیاط سے وہ کاغذ کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ان مواقع کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کاغذ کے ملنے کے بعد اس کے لیے پیدا ہو گئے تھے۔ لمحہ بھر میں اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ وہ جان گئی کہ میکس اس جزیرے پر کیوں آیا تھا اور اس نے لیزا سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی تھی۔

اس کے کانوں میں خاتون پولیس افسر کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''پیرس۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں پیرس جانا چاہتی ہوں۔''

اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ میکس کو یاد کر کے رونے لگی۔ اس کا بھائی جاتے جاتے ایک بہت بڑی دولت اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

★

آخری قسط

جواری

احمد اقبال

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردِّعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش رُبا داستان

وہ شخص مریدوں کے درمیان تھا لیکن مجھے صورت آشنا لگ رہا تھا۔ ”کون ہے یہ؟“ میں نے ایک گارڈ سے پوچھا۔

اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ آگے آیا اور میرے قریب پہنچ کر قدم بوسی کے لیے جھک گیا۔ میں نے اسے روک دیا۔ ”ابھی کس کو پکار رہے تھے تم؟ کیا تم جانتے نہیں کہ میرا نام ملک سلیم اختر ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”دراصل آپ کو دیکھ کے مجھے ایک بندے کی یاد آ گئی تھی لیکن وہ تو کب کا پھانسی چڑھ چکا۔“

”کوئی دوست یار شتے دار تھا تمہارا؟“

”نہیں پیر سائیں، میرے ساتھ جیل میں تھا۔ سکھر کی جیل میں، میں چھٹ گیا تھا اس کو اسی ہفتے پھانسی ہونا تھی، قتل کے جرم میں۔“

میں نے اسے تھوڑا سا اور کریدا۔ ”تم نے کیا جرم کیا تھا؟“

”کوئی نہیں پیر بادشاہ، تھانے دار نے چوری کا جرم ڈال دیا تھا، قتل اس نے بھی نہیں کیا تھا۔“

روبی نے اندر سے کہا۔ ”کہاں رک گئے؟“

میں پلٹا اور دروازے کے خلا سے گزر کر اندر چلا گیا۔ یہ پہلے پچھلے حصے کا چھوٹا سا صحن تھا جس میں روبی کی ماں نے نماز کے لیے اپنا تخت بچھا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کونے سے وہ دیوار شروع ہوتی تھی جسے میں نے شاہینہ کے ساتھ عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں کامیاب رہا تھا اور وہ کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی کی راہ میں آ گئی تھی۔ وہ دیوار پرے جہاں گری تھی، وہ جگہ میرے ذہن میں نقش تھی۔ گو اب وہاں اس کے سینے سے ابلتے لہو کا کوئی نشان نہ تھا لیکن مجھے وہ مٹی سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو اَب صاف تھے لیکن اس وقت شاہینہ کے خون سے لال ہو گئے تھے۔ اس بے رحم وقت کا وہ لمحہ میری یادوں میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا تھا۔

روبی میرے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اب کیا ہے دیکھنے کو یہاں... لیکن یہی وہ جگہ ہے جہاں شاہینہ نے میری بانہوں میں دم توڑا تھا۔ وہ میرے ساتھ زندگی کے خواب لیے یہاں سے نکل رہی تھی کہ موت نے اسے اچک لیا۔“

روبی سپاٹ زمین کو دیکھتی رہی۔ ”اماں یہاں صبح شام نماز میں بہت وقت گزارتی تھیں۔“ اداسی کے سائے روبی کے چہرے پر گہرے ہو گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسو کو انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔

میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو۔“

وہ میکانکی انداز میں پلٹ کر میرے ساتھ چند قدم چلی اور آخری گوشے میں بنی قبر پر رک گئی۔ یہ کچی قبر تھی جس کے گرد ایک اینٹ کی منڈیر بنا دی گئی تھی تاکہ مٹی نہ بہے مگر بعد میں عقیدت مندوں نے زبردستی کی اور وہاں پوری قبر سنگ مرمر جیسے سفید ٹائلوں سے ڈھک دی۔ اس کے سرہانے کی طرف کتبے پر تمام القاب و آداب کے ساتھ پیر سائیں کا نام لکھا ہوا تھا اور اوپر قرآنی آیات تھیں تو نیچے ان کی تاریخ وفات... ابھی تک کسی کو اس پر عقیدت کی چادر ڈالنے نہیں دی گئی تھی لیکن اس پر مرجھائے ہوئے اور خشک پھولوں کے ساتھ بالکل تازہ پھول بھی پڑے ہوئے تھے۔

میں نے لوگوں کے اونچا بولنے کی آواز پر پلٹ کے دیکھا۔ کچھ لوگ ہار لیے گارڈ سے اندر داخل ہونے کے لیے بحث کر رہے تھے اور وہ انہیں مجھ سے زیادہ روبی کی وجہ سے روکنے پر مجبور تھا۔ ”دیکھتے نہیں پیر سائیں کی بیٹی آئی ہے۔“

میں نے اسے اشارے سے کہا کہ انہیں آنے دو اور روبی سے کہا۔ ”تم چلو اندر، میں آتا ہوں۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ وہ بولی۔

”بس دیوار کے پیچھے رکو، دو منٹ۔“ میں نے کہا۔

روبی کے جاتے ہی چھ سات مرید بے تابی سے آگے بڑھے۔ وہ نعرے بھی لگا رہے تھے اور رسم کے مطابق میرے قدم بھی چومنا چاہتے تھے مگر میں نے انہیں روک دیا۔ ”تم کو فاتحہ خوانی کی اجازت ہے۔“

ایک بڈھے نے رقت سے کہا۔ ”اب تو آپ ہی ہمارا آسرا ہو۔ پیر سائیں نے آپ کو جانشین ایسے ہی تو نہیں بنایا تھا؟“

”میرا تمہارا سب کا آسرا ایک رب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو مانگنا ہے اس سے مانگو۔“

”رب نے وسیلہ رکھا ہے جی... اولیا اور پیر و مرشد آتے ہیں راہ دکھانے اور دستگیری کرنے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟“

”میں جناب اسکول ماسٹر، سب کی طرف سے عرض کرنا چاہتا تھا کہ درگاہ پر حاضری سے نہ روکا جائے۔ لوگ

حاجت مند ہیں کہاں جائیں؟''

میں سمجھ گیا کہ ان ضعیف الاعتقاد لوگوں کو راہِ راست پر لانا آسان نہیں جو صدیوں سے دنیاوی سہاروں کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھنے کے عادی ہیں اور دعا کے لیے بھی خود ہاتھ اٹھانا بھول گئے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے مجمع بڑھ گیا۔ ان سب کی خواہش صرف فاتحہ خوانی کی ہوتی تو وہ جہاں تھے وہیں سے ہاتھ اٹھا کے دعا کرتے اور چلے جاتے مگر ان کی خواہش مرقد تک رسائی کے علاوہ میرا ہاتھ چومنے اور میری قدم بوسی کی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے زیادہ پُرجوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔

اس وقت میں نے اپنے پلان کے مطابق ایک چال چلی۔ میں نے سیکیورٹی گارڈز سے کہا کہ درگاہ کے راستے سے ہٹ جائیں۔ وہ کچھ حیران ہوئے پھر ایک طرف ہو گئے۔ سو سوا سو افراد کا ایک ریلا آیا۔ وہ قبر کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کے آنکھوں سے لگانا شروع کیے اور میرے پیروں کو چھونے لگے۔ میں پیچھے ہٹا گیا اور گارڈز نے بھی میری مدد کی۔ انہوں نے لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور میں اندر چلا گیا جہاں روبی اکیلی کھڑی سب سن رہی تھی اور دیوار کی اوٹ سے دیکھ بھی رہی تھی۔

''یہ کیا کھیل شروع کر دیا تم نے؟'' وہ خفگی سے بولی۔ ''ہم اس لیے تو نہیں آئے تھے۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''ہاں لیکن مجھے ایک موقع ملا اپنے پلان کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے کا، چلو۔''

وہ میرے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ''تم واقعی یہ سب کرو گے؟''

''اس کے بغیر چارہ نہیں روبی۔ میں نادر شاہ کے ساتھ تعاون پر مجبور ہوں۔ سب کو اور سب سے زیادہ تمہیں بچانے کے لیے۔ لیکن میں اس کے حکم کا غلام بھی نہیں بننا چاہتا۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میری بھی کچھ حیثیت ہے اور طاقت ہے۔ میری جگہ وہ کسی اور کو نہیں لا سکتا اور لائے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

روبی چلتے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں والی دیواروں کے سامنے رک کر دیکھتی تھی۔ کہاں کیا تھا جو اَب نہیں تھا۔ اس کے تصور میں سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ نہیں تھا۔ اس کا اداس اور آبدیدہ ہونا قدرتی بات تھی۔ وہ مجھے یاد دلاتی رہی کہ کون سا کس کا کمرا تھا۔ وہاں کیا سامان تھا جو اَب نہیں ہے۔ خود مجھے سب یاد تھا۔ اندر اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ روبی جتنی زیادہ یہاں ٹھہرے گی، اتنی ہی زیادہ مغموم ہوگی۔ چودھریوں کی حویلی کی طرح یہاں بھی چور اچکے ہر چیز پر ہاتھ صاف کر چکے تھے۔

میں اسے ایک دیوار کے شکستہ حصے سے باہر نکال لایا۔ میں نے جو پلان بنایا تھا، وہی دانش مندی تھی۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے روبی خاموشی سے روتی رہی اور میں نے اسے رونے دیا تھا۔ ان آنسوؤں میں دکھ کے ساتھ پچھتاوے بھی تھے۔ انسان کا ذہن ایسے ہی گردشِ حالات کا شکار ہوتا ہے۔ نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔ یہی روبی سوچ رہی تھی۔

واپسی تک اس نے خود ہی جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ احساسِ جرم اور ناقابلِ تلافی نقصان کا جذباتی دباؤ اسے ہسٹریا میں مبتلا نہ کر دے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم... اس نے مراد کے ساتھ فرار ہو کے بدنامی اور والدین کی رسوائی اور ناراضی پہلے مول لی۔ پھر مراد کو بھی کھو دیا اور معافی مانگنے کا موقع بھی گنوا دیا۔

''تقدیر کتنی بے رحمی سے فیصلے کرتی جاتی ہے سلیم۔'' اس نے اچانک کہا۔

''بے رحم انہیں حالات بناتے ہیں۔'' میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔

''کیسے واقعات کی ایک کڑی دوسرے سے ملی ہوئی ہے۔ پہلے تقدیر نے ایک فیصلہ الٹ دیا۔ ورنہ میری شادی اکبر سے ہو جاتی اور شاہینہ آج انور کے ساتھ خوش ہوتی۔ پھر میں نے انور کو مسترد کر کے مراد کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ تقدیر نے وہ بھی الٹ دیا۔ آج میں پھر وہیں ہوں جہاں سے چلی تھی مگر اپنا سب کچھ گنوانے کے بعد... سارے رشتوں کو ہار جانے کے بعد خالی ہاتھ اور تنہا۔''

''اس کے باوجود تم زندگی کے ساتھ ہو۔ یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''جینا تو پڑتا ہے سلیم۔''

''لیکن تم اب بھی امید کے ساتھ زندہ ہو۔ مایوس نہیں ہو۔ یہ بڑی بات ہے۔''

''مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی خود غرض ہوں۔ میں نے صرف اپنی خوشی کے لیے ماں باپ کو دکھی کیا۔ نہ مجھے خوشی ملی اور نہ اب یہ ممکن ہے کہ ماں باپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اسی طرح پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہوں گی۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''یہ نہ سمجھو کہ تمہارے نصیب کی ساری خوشیاں ختم ہو

گئیں۔ نئی خوشیاں ملیں گی تمہیں۔'' میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے سلیم... ایک ایک کر کے سب مجھے چھوڑ گئے۔ ایک دن تم بھی چھوڑ جاؤ گے، انور بھی، ریشم بھی۔''

میں ہنس پڑا۔ ''پھر تم نہ چھوڑنا ہمیں... کمبل ہو جانا۔''

''میری ایک بات مانو گے؟''

''صرف ایک؟ اس کے بعد پھر کبھی کوئی بات نہیں منواؤ گی، زندگی بھر۔''

''نادر شاہ کو کرنے دو جو وہ چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسے انکار کون کرسکتا ہے۔''

''میرا مطلب تھا... یہ جو تم سوچ رہے ہو کہ...''

''شاید ٹائر فلیٹ ہوگیا۔'' میں نے اس کی بات کاٹنے کے لیے گاڑی روک دی اور نیچے اتر گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ وہ کھڑکی سے باہر مجھے چاروں ٹائروں کا معائنہ کرتا دیکھتی رہی۔ ''کیا ہوا؟''

میں پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔ ''کچھ نہیں۔ یہ بتاؤ اس زمین، جائداد کے کاغذات کہاں ہیں، تمہارے پاس؟''

''میرے پاس کیسے ہو سکتے ہیں؟'' وہ بولی۔ ''لیکن محفوظ ہوں گے۔''

''کسی وکیل کے پاس؟''

''نہیں، ابا کے کمرے میں زیرِ زمین ایک لوہے کی تجوری تھی۔ جیسی انور نے نکالی تھی۔ ملبا ہٹانے کے بعد فرش توڑ کے نکالنی پڑے گی۔'' وہ بولی۔ پھر کچھ وقفے سے سوچ کے بولی۔ ''کیسی عجیب بات ہے۔ جائداد والے بھی زمین کے اندر... اس کی ملکیت کا غرور بھی زمین کے اندر...''

''ابھی تم تو تلی ہو رہی ہو۔'' اور گاڑی کو احاطے میں موڑ لیا۔ ریشم اور انور وسیع باغ کے لان میں ٹہل رہے تھے اور نہ جانے کیا ڈسکس کر رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ ہلایا اور اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ میں نے بھی ان کی خلوت میں مخل نہ ہونا بہتر سمجھا۔

روبی کے ساتھ تباہ شدہ درگاہ پر حاضری سے میں نے ایک مقصد حاصل کرلیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ خبر اب تک نادر شاہ تک پہنچ گئی ہوگی اور اپنی ایک پُرغرور فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ خود سے کہا ہوگا... مجھے معلوم تھا، وہ انکار نہیں کرسکتا۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے ایک بند گلی میں پہنچا دیا تھا۔ ایک طرف لالچ اور مالی منفعت کی دیوار تھی۔ دوسری طرف ان رشتوں کی جن سے میں اب بندھا ہوا تھا اور سامنے وہی جیل کی دیوار جسے توڑ کے میں ایک بار فرار ہوگیا تھا مگر اس کے پیچھے رسن و دار آج بھی میرے منتظر تھے۔

اس بار میں نے بالآخر اپنے پلان کی فائنل منظوری حاصل کرلی۔ انور پوری طرح میرے ساتھ تھا۔ ریشم نصف شوہر کے ساتھ تھی تو نصف بھائی کے ساتھ۔ صرف روبی مجھ سے متفق نہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے سب کے ساتھ مراد نگر ٹو کی ہاؤسنگ اسکیم میں شامل رہنا چاہیے اور نادر شاہ کے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ وہ جانے اس کا کام۔

''کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''مشکل تم اسے بنا رہے ہو۔''

''مشکل اس نے بنا دیا تھا زندہ رہنا۔ کسی وجہ کے بغیر اس نے کتنی سفاکی سے میرے بھائی کی جان لی تھی اور پھر مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اب تم کہتی ہو کہ میں سب بھول جاؤں۔ چلو فرض کرو، میں بھول جاتا ہوں۔''

''اس نے تو کہہ دیا ہے کہ وہ بات ختم ہوئی۔'' روبی بولی۔

میں نے تلخی سے کہا۔ ''اور میں اعتبار کرلوں؟ اتنا بے وقوف تو چوہا بھی نہیں ہوتا کہ سانپ سے دوستی کرلے۔ تم دیکھو کس طرح اس نے بلاوجہ انور کے گھر کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس کی یا ماں جی کی کون سی دشمنی تھی نادر شاہ کے ساتھ... اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو تم میں سے کوئی محفوظ نہیں رہے گا نہ وہ کچھ بھول سکتا ہے نہ میں۔''

انور نے میری تائید کی۔ ''سلیم کی مجبوری زیادہ ہے۔ مجبوری کا علاج یہ نہیں کہ اسے قبول کرلیا جائے۔''

''درگاہ کی دوبارہ تعمیر سے پہلے ملبا صاف کرنا ضروری تھا۔ یہ آپریشن بالکل ویسا ہی تھا جیسا چند دن پہلے چودھریوں کی حویلی کی جگہ ہوا تھا۔ میں خود لوگوں کا ردِعمل دیکھنے کے لیے وہاں موجود رہا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی کہ مزار مبارک کی نئی تعمیر خود گدی نشین کرا رہے ہیں۔ عقیدت مندوں اور مزدوروں نے بڑھ چڑھ کر اس کام میں حصہ لیا مگر مجھے کسی اور کا انتظار تھا۔

ایک پورا دن گزر گیا۔ ملبا ایک وسیع علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ درگاہ کے واضح طور پر تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں تقریباً دس فٹ اونچا چبوترا تھا جس پر تین طرف لمبائی کے

رخ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

درمیان کے حصے میں وہ گنبد والی عمارت تھی جس کے وسط میں درجنوں سبز رنگ کی گوٹا لگی چادروں سے ڈھکی ایک قبر تھی۔ جس کے کتبے پر نام کسی کا نہیں تھا مگر عربی کی آیات سے بھری سنگ مرمر کی لوح مزار ضرور ایستادہ تھی۔ عام جاہل دیہاتی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ سوائے اس کے جو مشہور کیا گیا تھا۔ غالباً وہ اس میں کسی پہنچے ہوئے بزرگ کو مدفون سمجھتے تھے۔ جبکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ خالی قبر ہے جس میں خود پیر سائیں دفن ہوں گے۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ وقت آیا تو ان کے حصے میں گھر کے صحن کی دو گز زمین آئی۔ چبوترے کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا تھا۔ درمیان والا حصہ بھی صحیح سلامت تھا۔ صرف اس کے دروازے جل گئے تھے اور ان کی جگہ خلا رہ گیا تھا۔ بیچ میں آویزاں فانوس تباہ ہو گیا تھا۔ اس کا ڈھانچا سا لٹک رہا تھا۔

تیسرا... پیچھے والا رہائشی حصہ تھا جو آتش زنی اور تخریبی کارروائی سے تقریباً تباہ و مسمار ہو گیا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ صرف اسی حصے کا ملبا صاف کرا دوں۔ باقی حصے کی صفائی وہ خود کرا لیں گے جو تعمیر نو کریں گے۔

وہاں میرے لیے ایک خیمہ لگا دیا گیا تھا جس میں استراحت کے لیے بیڈ بھی تھا۔ دن بھر میں شاید سو دو سو افراد جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، اندر آکے دست بوسی کر چکے تھے۔ میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ سہ پہر کے قریب ایک کار اس خیمے کے قریب آ کے رکی تو میں سمجھا کہ انور ہوگا مگر اس میں سے چادر پوش خاتون برآمد ہوئی۔ یہ روبی تھی جو میرے لیے لنچ لے کر آئی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کے ٹفن کیریئر کھولنا شروع کیا۔

''یہ کیا نامعقولیت ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہم اسے انگلش میں لنچ کہتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''یہاں میں نے سختی سے کہا تھا کہ مجھے دوپہر کا کھانا ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ میں جھوٹا بنوں گا۔''

''کوئی مضائقہ نہیں اس میں بھی... مگر تم کہہ سکتے ہو کہ پرہیزی کھانا تھا۔''

''یہ جو تم لائی ہو؟''

''ہاں ڈاکٹر نے دال روٹی کا پرہیز بتایا ہے۔ سادہ غذا منع ہے اور تم ویسے بھی مجھے بہت کمزور لگ رہے ہو۔ صبح سے اتنی مشقت جو کر رہے ہو، کھاؤ۔'' اس نے کہا اور پھر ڈانٹ کے کہا۔ ''میں نے کہا ہے، کھاؤ۔''

اب میں نے خیمے کے سامنے چادر لٹکائی اور ایک مزدور کو دربان بنا دیا۔ ''کسی کو اندر آنے مت دینا خواہ وہ پٹواری ہو۔''

دیہاتی کے نزدیک کمشنر یا گورنر سے بڑی چیز پٹواری ہی ہوتا ہے۔ ''دراصل انور نے بھی کہا اور خود مجھے اندازہ تھا کہ عقیدت مندوں کی میزبانی کیا ہوتی ہے۔ اتنا حلوہ تم ایک سال میں نہیں کھا سکتے جتنا وہ ایک وقت میں کھلانے کی کوشش کرتے۔''

''مجھے حلوہ زیادہ سے زیادہ کھانے کی مشق ہونی چاہیے۔ آخر میں بہت جلد پیر ہونے والا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر خود تمہیں کیا ضرورت تھی آنے کی، انور کہاں ہے؟''

''اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ... یہ اس کا آئینی حق ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ دیکھوں کیا پروگریس ہے۔ ابھی کرین وہ جگہ صاف کر رہی تھی جس کے نیچے سے تجوری برآمد ہوگی ویسی ہی جیسی چچا کے کمرے میں دفن تھی۔''

''اور اس میں وہی سب ہوگا۔ مال و زر۔ جائداد، زمین کی ملکیت کے کاغذات۔'' میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ ''اب وہ زیر زمین ہیں جو مالک تھے۔ مجھے پتا چلا کہ جس نے چودھری صاحب کی تجوری اٹھائی، اس نے پہلے مشہور کیا کہ وہ تجوری خرید چکا ہے۔ چالیس من لوہا تھا۔ گاؤں کا لوہار اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو شہر سے کوئی آیا جس نے اسے کاٹ کے ٹکڑے کیے۔''

''تم کہہ دو کہ یہ مقدس لوہا مریدوں میں ایک ایک سیر بانٹ دیا جائے۔''

''روبی یہ بہت مشکل کام ہوگا۔ بہت سخت سزا ہوگی میرے لیے۔ میں پیر کیسے بنوں گا یہ سارا دن کی آزمائش ہوگی۔''

''کس نے کہا ہے تم سے کہ بنو... نہ بنو۔'' وہ بولی۔

''پھر کیا کروں؟ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں؟'' میں نے کہا۔

''بھاگ جاؤ۔'' وہ مزے سے کھانا کھاتی رہی۔

''تم سب کو چھوڑ کے؟ تمہیں افسوس نہیں ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''افسوس کیسا۔ ہمیں تو بتا کے جاؤ گے نا کہ کہاں ہو... اب انور کا اور مسز انور کا تو مجھے پتا نہیں، میں آجاؤں گی۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''یہ سب کچھ چھوڑ دو گی؟''

''یہ سب کیا؟ کون سے محلات کھڑے ہیں

میرے... کون سے رشتے باقی ہیں۔ یہ زمین ہے جس پر اس وقت تم اور میں بیٹھے ہیں، صرف مٹی۔''

''تم صدیوں کے اس رشتے کو توڑ دو گی؟ جو مٹی سے ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''میری عمر اب چوبیس سال ہو گئی ہے۔ کیا میں تمہیں صدیوں پرانی روح لگتی ہوں۔ مجھ سے پہلے لاکھوں لوگ سب رشتے توڑ کے گئے۔ امریکا، کینیڈا، دنیا کے ہر حصے میں اور بس گئے۔ یہ ایک زندگی کہیں بھی گزاری جاسکتی ہے۔''

''کہتے ہیں کہ رشتوں کے بغیر یا تو خدا رہ سکتا ہے یا شیطان... ورنہ جانور۔''

''آدمی رشتے استوار کرلیتا ہے جہاں رہے جن کے ساتھ رہے۔'' اس نے برتن سمیٹے۔

میں نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ جیسے میں نے کیے۔''

''کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟'' اس نے روانگی کے ارادے سے چادر لپیٹی۔

''ہاں، تجوری اٹھاتے وقت پڑے گی۔'' میں نے ہنس کے کہا۔ ''میں اکیلا کیسے اتنا بوجھ اٹھاؤں گا۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ مگر تجوری میں سے جو خزانہ برآمد ہوگا، وہی نقد، سونا، چاندی اور زروجواہر جوانور کو ملے تھے۔''

''میری طرف سے اجازت ہے۔ سب بانٹ دینا۔'' وہ بے نیازی سے بولی اور پھر پردہ ہٹا کے باہر نکل گئی۔

وہ بلاشبہ عجیب لڑکی تھی۔ ان سب سے مختلف جو ایسی حویلیوں کے ماحول میں پرورش پاتی ہیں۔ خود اس کی بہن شاہینہ نے اس ماحول سے بغاوت ہی کی تھی۔ دولت مندی کے ساتھ اس حویلی میں زندگی کسی سونے کے پنجرے میں قید جیسی تھی جہاں اپنی مرضی سے سانس لینے کی اجازت دینا بڑوں کی مجبوری تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرا اس خبر کا دائرہ پھیلتا گیا کہ پیر سائیں کے گدی نشین روحانی فیوض و برکات کا سلسلہ پھر شروع کرنے تشریف لے آئے ہیں۔ مجھ سے شرف ملاقات حاصل کرنے والوں کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔ وہ عقیدت مندی میں سرشار لوگ واقعی یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہت کی طرح روحانی امامت بھی ورثہ ہے اور جیسے ایک بادشاہ کے بعد دوسرا تخت نشیں ہو تو رعایا میں کیا خواص اور کیا عوام سب اس کی حاکمیت کو دل و جان سے تسلیم کرتے تھے ایسے ہی یہ سادہ لوح یہ یقین رکھتے تھے کہ روحانی فضیلت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کسی شخص نے ... یہ مقام عبادت و ریاضت سے حاصل کیا ہوگا۔

اب میں تقدس بھی حاصل کر چکا تھا اور جو میرے ہاتھ چومتے تھے وہ درحقیقت بیعت کرتے تھے کہ اب میں ہی ان کا پیرو مرشد ہوں۔ میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جس کام کو میں نے آسان سمجھ لیا تھا وہ بہت بڑی مشکل ہے۔ ان چند گھنٹوں کے سوا جو مجھے خلوت میں گھر کے اندر یا رات کو سوتے وقت میسر آئیں گے میرا تمام وقت ریاکاری اور مکروفریب سے خود کو سچ مچ دوسروں کے مقابلے میں تقدس کے بلند تر مقام پر فائز ثابت کرتے ہوئے گزرے گا۔ مجھے ہر وقت پوز کرنا ہوگا کہ میں بڑی پہنچی ہوئی چیز ہوں۔ یاخدا! یہ مسلسل فریب دہی اور ضمیر فروشی کی قید میں کیسے کاٹوں گا۔

لیکن آگے بڑھایا ہوا قدم پیچھے بھی نہیں ہٹایا جاسکتا تھا۔ سہ پہر کے بعد کچھ ایسے لوگ اپنی عقیدت مندی کا اعتراف کرنے آئے جو اہم تھے۔ ان میں نمبردار، پٹواری اور ہیڈ ماسٹر کے علاوہ امام صاحب بھی تھے اور مقامی پولیس چوکی کا نگراں بھی۔ وہ اکیلا نہیں آیا۔ اس کے ساتھ دس میل دور واقع تھانہ کا انچارج ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ اس وقت میرے خیمے کے گرد اچھا خاصا مجمع تھا۔ اس نے میرے قدم تو نہیں پکڑے مگر ہاتھ ضرور چومے۔

ناتجربہ کاری کے باعث میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے تھانے دار...؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اب حضور کا ورود مسعود ہو گیا ہے تو سب خیریت ہی رہے گی۔''

میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو، کب سے پوسٹنگ ہے یہاں؟''

وہ اس عزت افزائی سے بے حد خوش ہوا۔ ''جناب ہمیشہ سے... میرا گھر ہے اِدھر۔''

''لیکن پولیس میں تو پوسٹنگ ہوتی رہتی ہے اِدھر سے اُدھر؟''

''جی سرکار، لیکن آپ سے پہلے پیر سائیں مہربان تھے۔ انہی کی مرضی سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ ان کا ہاتھ ہمیشہ میرے سر پر رہا۔ بدخواہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ دو تین سال بعد آس پاس کے کسی تھانے میں جاتا تھا اور دو چار دن میں لوٹ آتا تھا۔''

وہ جوان آدمی تھا۔ شہداد پور سے براہِ راست سب انسپکٹر آیا تھا اور بلاشبہ صورت سے ہوشیار ہی نہیں عیار بھی لگتا

تھا۔ دیہی علاقوں میں جو سپر پاورز مل کے خلقِ خدا پر حاکمیت کا عذاب مسلط رکھتی ہیں ان میں وہ پہلے نمبر پر ہوتا ہے۔

شرفِ ملاقات حاصل کرنے والوں میں پٹواری مجھے سب سے عیار لگا جو مجھ سے بے تکلف ہو کے فوراً مستقبل کے کاروباری معاملات چھیڑنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے ٹوک دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہیڈ ماسٹر کو میری پیری دل سے قبول نہیں اور وہ کچھ شکوک کا شکار ہے لیکن رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور تھا۔ تاہم دبے الفاظ میں اس نے مجھے ایک مشورہ دیا کہ میں کچھ بزرگانہ حلیہ اختیار کروں۔ داڑھی تو عرصہ دراز سے ایک ضرورت کی وجہ سے میرے چہرے کی زینت تھی۔ کلین شیو حلیے میں فریدالدین کی شناخت ہو کے گرفتار ہونے کے خطرات پچاس فیصد یا اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ اس کی وضع قطع میں تبدیلی آتی رہتی تھی لیکن زیادہ نہیں۔ اب یہ میری شخصیت کا حصہ تھی۔ ابتدا میں داڑھی کی تراش خراش سے اس کا سائز زیادہ اہم تھا تاکہ چہرے کے اصل نقوش کو چھپالے۔ اب بھی یہ ایک مشت سے کم مگر ہموار تراشی ہوئی تھی۔ اس کی مراد غالباً یہ تھی کہ میں داڑھی کو شرع کے مطابق بناؤں فیشن کے مطابق نہیں۔ پیر سائیں جیسی... آخر میں انہی کا جانشیں ہوں۔ اس کی بات میں نے پلّے سے باندھ لی۔

غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے چودھریوں کی حویلی کا ایکشن ری پلے ہوا۔ فرش کے نیچے سے تجوری نکالی گئی اور جو چابیاں مجھے روبی دے گئی تھی، اس کی مدد سے میں نے سارا خزانہ دو بوریوں میں منتقل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری بار وہی منظر دیکھنے سے مجھے اس سونے چاندی کے ڈھیر، زیورات اور سونے کی اینٹوں (دس تولہ کے بسکٹ کہلانے والی) اور نوٹوں کے کاغذی بنڈلوں سے عجیب سی کراہیت اور نفرت ہوگئی۔ آخر کیا ہے یہ متاعِ دنیا جو کسی کے کام کی نہیں تھی یوں پھیل رہی تھی جیسے سرطان کی رسولی۔ کیا تھا اس کا مصرف اور کب آتا وہ وقت جب اسے خرچ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس سے پہلے تو وقتِ آخر آگیا۔ دنیا میں ایک سے ایک دولت مند ہے حکمران کے پاس اس کا مصرف بھی ہے۔ غلط ہو یا صحیح... وہ محل بناتے ہیں۔ جزیرے خریدتے ہیں۔ ذاتی بحری جہاز رکھتے ہیں جن پر دنیا کی ہر لگژری ہو۔ شراب اور کسی حسینہ عالم کا شباب تو ان کے لیے کوڑیوں کا مال ہے۔ وہ عیش کرتے ہیں۔ ساری دنیا گھومتے ہیں، مانٹی کارلو کے جوئے خانوں میں لاکھوں کروڑوں ہار کے لطف لیتے ہیں۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ دونوں چودھری اپنے دنیاوی مال کی حفاظت میں کس حد تک چوکس تھے اور چور ان کی آنکھوں میں کہاں تک دھول جھونکتے تھے۔ انور کے باپ کا مزاج مختلف تھا۔ وہ شوقین مزاج تھا اور خود پر بھی خرچ کرتا تھا اور اپنے خاندان پر بھی۔ پیر سائیں قدرے مختلف تھے۔ سوائے دوسری شادی کے جو وہ ریشم پر فریفتہ ہو کے کرنا چاہتے تھے، ان کے گھر میں فراوانی نہ تھی۔ انور نے سات سال باہر گزارنے میں بہت پیسا اڑایا۔ اکبر کم عیاش نہ تھا گھر میں نوکر چاکر تک عیش کرتے تھے۔ گاڑیاں کم نہ تھیں۔ مہمان خانہ آباد رہتا تھا۔ یہاں خرچ سے زیادہ آمدنی تھی۔

میں نے کاغذات کو گاڑی میں رکھوالیا۔ انور کے خزانے میں ٹرافیاں اور میڈل سرٹیفکیٹ اور تصاویر بہت تھیں۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی تو زمین جائداد کی فائلوں کا ایک پلندا تھا۔ باقی خزانے کو میں نے ایک ٹرک میں لدوایا اور خود اس کے پیچھے رہا۔ گن میرے پاس بھی تھی اور میری گاڑی بھی ایک مسلح ڈرائیور چلا رہا تھا۔ مریدوں سے تو نہیں مگر گرد و نواح میں وارداتیں کرنے والے ڈاکوؤں سے خطرہ ضرور تھا کہ وہ لوٹ کے نہ لے جائیں۔ مغرب کے فوراً بعد جب سیاہی پھیلنے لگی تھی مراد نگر کے گیٹ سے اندر پہنچ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

انور اپنی دلہنیا کے ساتھ باغ میں سرگشت کو انجوائے کر رہا تھا جو نئی نویلی تو نہیں تھی مگر اب ایک اہم جذباتی پوزیشن حاصل کر چکی تھی۔ وہ دونوں دانت نکالتے میرے طرف آئے۔ ”لگتا ہے آج تو نے بہت کام کیا۔“

”نہیں، میں بھی اسی طرح کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں ٹہلتا رہا۔“ میں نے بھنا کے کہا۔ ”یہ سنبھال اپنا کوڑا کرکٹ جو گٹر سے نکلا۔“ میں وہیں ایک کرسی پر گر گیا۔

”بھائی تم منہ دھو کے یہ مٹی دھول صاف کرو گے یا میں چائے لاؤں؟“ ریشم بولی اور جواب سنے بغیر چائے لینے چلی گئی۔

انور نے ٹرک کا اسباب اتروا کے اندر پہنچایا اور خود بھی اندر چلا گیا پھر انور کے ساتھ روبی اور ریشم ایک ساتھ ہی باہر آئے۔ ”مجھے پتا چلا کہ آج بہت مریدوں نے تیرے دستِ مبارک پر بیعت کی۔“

”ہاں، ان میں تھانے دار بھی تھا۔“

”اچھا پہنچ گیا وہ مہا کمینہ... وہ دوغلا تو خیر ہے مگر تو اس کی وفاداری خرید سکتا ہے۔ لالچی آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ''اس نے کہا کہ درگاہ مکمل ہونے تک آپ ملحقہ مسجد کو آستانہ بنائیں۔ معمولی نہیں یہ بات۔ ہم میں سے کسی کو کیوں نہیں سوجھی۔''

''روبی نے بتایا کہ تو ڈر رہا ہے۔''

''یار! یہ کام اتنا آسان نہیں۔ جتنا میں سمجھتا تھا اور اس سے اتنی جلدی میری جان بھی نہیں چھٹے گی۔ یہ دلدل ہے لیکن میں کیا کروں۔ میرے پاس چوائس نہیں۔ میں انکار کر سکتا تو کیا مسئلہ تھا۔ میں نادر شاہ کا قیدی ہوں۔''

''حوصلہ رکھ نوجوان۔ اس موقع پر بہت سی باتیں ہیں۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ گیدڑ تو سمجھ لے نادر شاہ کو اور شہر مان لے اس گاؤں کو۔ فرعونے راموشے... سکندر اعظم نے آدھی دنیا فتح کر لی اور مارا کس نے اسے؟ ایک مچھر نے۔ یہ نادر شاہ خود کو سکندر اعظم سمجھتا ہے تو مان لے کہ تو ہی ہے وہ مچھر... پہلے وہ پیچھے پیچھے تھا اور تو آگے آگے... اب ہم یہاں اسے گھیر کر ماریں گے۔'' انور نے کہا۔

میرا بجھا ہوا حوصلہ روشن ہو گیا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے نا؟''

''بالکل ہو سکتا ہے اور ہو گا۔ درگاہ رہے مگر وہاں درپردہ ہونے والے سب کاروبار نہیں رہیں گے۔ یہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ہم سے مراد ہے ہم دو۔'' روبی بولی۔ ''مسٹر اینڈ مسز انور۔''

''کیا مطلب؟ تم اس فیصلے میں شامل نہیں؟''

وہ ہنسی۔ ''ساتھ تم نے دیا ہے میرا پہلے سے فیصلہ تھا کہ درگاہ نہیں بنے گی۔ نادر شاہ بیچ میں نہ پڑتا تو کچھ اور بات ہوتی مگر اب ایک طرح سے اس نے تمہارے ساتھ سب کو چیلنج کر دیا ہے۔ تو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟ تم نہیں یا ہم نہیں۔'' روبی نے کہا۔ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے ہمارا تعلق نہیں۔ مگر یہاں اب اس کے سارے دھندے جاری نہیں رہیں گے، یہ طے ہے۔''

''میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ آج مجھے امید تھی کہ نادر شاہ کی طرف سے کوئی پیغام ملے گا یا مجھے بلوایا جائے گا۔ رپورٹ تو پوری مل چکی ہو گی اسے کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایک بات تو بھول ہی گیا میں۔ آج تیرے لیے ایک پیغام آیا تھا۔'' انور بولا۔

''اچھا؟ پھر تم سب نے مل کر بات پکی کر دی۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ تمہیں اجر دے۔''

''دیکھا دھیان اُدھر ہی گیا نا۔'' انور بولا۔ ''ابے پیغام فون پر ملا تھا، پوچھ کس کا؟''

''تمہارے دوست مہربان ملک غلام محمد کا۔'' روبی نے میری مشکل آسان کی۔

میں اچھل پڑا۔ ''گامارستم کا؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''اس نے بتایا نہیں۔'' انور بولا۔ ''شادی کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ہاں کب کی ہو گئی۔ ماشاء اللہ بچے ہیں تو ہنسنے لگا اور بولا کہ میں آؤں گا کسی وقت۔''

''اس میں میرے لیے کیا پیغام ہوا؟'' میں نے کہا۔

''پوچھا تجھے ہی تھا اس نے۔'' انور بولا۔

''اپنا پتا یا فون کچھ نہیں دیا؟''

انور نے کہا۔ ''نہیں، اب سنا ہے ٹیلی فون سیٹ آ گئے ہیں جس میں کال کرنے والے کا نمبر آ جاتا ہے۔''

''یہ تو کام کی چیز ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب پہلے میں نہا دھو کے کپڑے بدل لوں۔''

بہت دیر تک میں گامارستم کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا نام ہی ایک مدت کے بعد سنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وابستہ یادوں نے یلغار کی تو میں یاد ماضی میں الجھ کے رہ گیا۔ کیا وقت تھا جو اَب کسی اور کی زندگی کا حصہ لگتا تھا۔ جب میں نے سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے سکھر جیل میں قدم رکھا تھا جس انداز سے سیشن کورٹ میں میرا کیس چلا تھا، اس سے ہونے والے فیصلے کا پتا چل جاتا تھا، نہ جانے کہاں کہاں سے کیسے کیسے چشم دید گواہ آ گئے تھے۔

اس وقت دستِ غیب کی صورت میں گامارستم نمودار ہوا۔ میرے مقابلے میں حقیقی مجرم۔ چور، ڈاکو اور نہ جانے کتنے لوگوں کے قتل کا الزام رکھنے والا۔ اب یہ اوپر والے کی مرضی کہ وہ جسے چاہے بچا لے اور جسے چاہے اٹھا لے۔ اس کا انصاف اور اس کا فیصلہ وہی جانے۔ اس ڈاکو کے ساتھ میں نکلا اور آج اتنے عرصے بعد بھی آزاد پھر رہا تھا تو خدا کی مرضی۔ اس وقت جب مجھے یہ اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ اب میری زندگی کو خطرہ نہیں اور میں موت کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ نادر شاہ پھر فرشتۂ اجل کی صورت میں نمودار ہو گیا اور قدرت کے کھیل دیکھو کہ گامارستم بھی اس سے پیچھے نہیں رہا۔

گامارستم سے تعلق پرانا سہی جب سے وہ روپوش ہوا تھا، میرے ذہن سے اس کے خیال کا گزر بھی نہیں تھا اور وجہ صرف یہ تھی کہ میرے اپنے دماغ میں سکون نہ تھا۔ میری

زندگی میں فراغت نہ تھی۔ ہر دن نئے مسائل کے چیلنج کے ساتھ طلوع ہوتا تھا اور یہ سلسلۂ روز و شب یوں جاری تھا جیسے کسی گھڑی کی سوئیوں کو متحرک رکھنے والی مشینری جس کا ہر پرزہ مسلسل اپنی اپنی حرکت میں مگن ہو۔ آج اچانک گاما رستم کا نام آیا تو جیسے یادوں کے البم میں لگی ہر تصویر باہر نکل کے بکھر گئی۔ میں نے ان سب کو سمیٹا اور ابھی اپنے کمرے میں ہی تھا کہ مجھے انور کا پیغام ملا۔ اس نے مجھے آفس میں طلب کیا تھا۔

میں کچھ حیران ہوا اور نیچے اترا تو میرا سامنا روبی سے ہوگیا۔ ”ایسے کہاں بھاگے جارہے ہو؟“

”انور نے بلایا ہے آفس میں، کیوں خیریت ہے نا؟“

”نہیں، آج میں نے ڈاکٹر محسن کو فون کیا تھا۔ ماماجی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ اس نے بتایا کہ ان کے دوروں میں شدت آگئی ہے لیکن فکر کی بات نہیں۔ اس قسم کے امراض میں واضح بہتری دیر سے آتی ہے۔“

میں نے دروازے کا رخ کیا۔ ”کل دیکھ آئیں گے انہیں۔“

وہ میرے ساتھ ہولی۔ ”کل سے وہ مراد نگر کے پرانے نقشے اور فائلیں کھولے بیٹھا ہے۔“

فائلیں انور کے سامنے وسیع میز پر ڈھیر تھیں اور وہ ایک نقشے پر جھکا اتنا مگن تھا کہ اسے ہمارے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ آفس مدت سے بند تھا۔ دیگر کمرے مقفل اور تاریک تھے۔ یہ سکندر شاہ کا کمرا تھا۔ وسیع و عریض اور شاندار طریقے پر آراستہ، اب یہ انور کی تحویل میں تھا۔ تمام اہم دستاویزات اسی کمرے میں رہتی تھیں۔

ہم سامنے بیٹھ گئے تو وہ چونکا۔ ”چیئرمین صاحبہ بھی تشریف لائی ہیں۔“

روبی نے برا مان کے کہا۔ ”کہو تو چلی جاؤں؟“

”ایسی گستاخی کرسکتا ہوں؟ ابھی کھڑے کھڑے نکال باہر کرو گی۔ یہ مراد نگر کے نقشے اور بلیو پرنٹس ہیں اس کے جو مکمل ہوچکا۔ آرکیٹکٹ کون تھا۔ نام تو دیکھا ہے میں نے ہر فائل میں اور نقشے پر کچھ غیر معروف سا ہے۔“

”کیا اس کی پلاننگ اچھی نہیں تھی؟“

”یہ میں نے کب کہا۔ وہ کوئی جینئس تھا۔ باہر کی تعلیم بھی نہیں تھی مگر ذہین تھا اور ایسا پرفیکٹ پلان بنایا تھا اس نے... میں نے اسے تفصیل سے دیکھا۔ حالانکہ جو میں نے پڑھا وہ یقیناً بہت ایڈوانس لیول کا تھا مگر ایک تو عملی تجربہ ہمیشہ کتابی علم کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ہوتا ہے پھر یہ تجربہ ہوتا ہے مقامی حالات اور ضرورت کے مطابق... تو میں نے سوچا کہ اسے مدد کے لیے بلالوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بہت اچھا سوچا تونے۔“

”مگر اچھا ہوا نہیں۔ یہ ڈر تھا کہ وہ معروف ہوا دوسرے پروجیکٹ میں تو انکار کردے گا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ باہر چلا گیا ہو لیکن وہ مرچکا ہے۔“

مجھے وقتی شاک لگا۔ ”اوہ، کوئی بوڑھا آدمی تھا؟“

”نہیں یار، وہ ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ فون کیا تو اس کی بیوہ نے بتایا۔“

”آرکیٹکٹ تو بہت ہیں۔“ روبی بولی۔

”ہاں، لیکن اب میں کسی کو معاون بناؤں تو ہر قدم پر اسے سمجھاؤں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ نہ کروں۔ بس یہی پروجیکٹ وہاں بھی بنادوں۔ زمینی حالات ایک سے ہیں۔ بیس کلومیٹر میں کچھ نہیں بدلتا۔“

”اگر تو سمجھتا ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے تو ہم کون ہیں اختلاف کرنے والے... بسم اللہ کر۔“ میں نے کہا۔

”بسم اللہ کل ہوگی۔ میرا کام تو بہت آسان ہوگیا۔ مکھی پر مکھی مارنی ہے۔ کیا حرج ہے اگر انہی سول انجینئرز، معمار اور مزدور، الیکٹریشن، پلمبر سب کو بلالیا جائے۔“

”بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ سب تجربہ کار لوگ ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”کل کے مقامی اخبارات میں کوارٹر پیج کا اشتہار ہو گا۔ اردو اخبارات میں۔ مراد نگرون کی تکمیل میں شریک تمام کارکن، انجینئر مراد نگر ٹو کے لیے فوری رابطہ کریں۔ مجھے امید ہے کہ دو چار دن میں جو آسکتے ہیں ضرور آجائیں گے جو اِدھر اُدھر کسی کام میں معروف ہوں گے، انہیں مہلت دے دی جائے گی ورنہ تیس فیصد زیادہ پر سب آجائیں گے۔ کل سے سائٹ پر بل بورڈ لگ جائے گا۔ مطلب یہ کہ لگانے کا کام شروع ہوگا۔ وہیں ساٹھ فٹ بائی چالیس فٹ کا بورڈ بنا کے نصب کیا جائے گا اور پھر وہیں پینٹ بھی ہوگا۔“

”ویری گڈ، مگر صرف ایک سائن بورڈ؟“ میں نے کہا۔

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسے دس بل بورڈ ہوں گے۔ دو یہاں... ہائی وے سے اندر آنے والی سڑک پر چار... اور چار ہائی وے پر... دو دائیں طرف دو بائیں طرف... ٹھیک ہے نا؟“

”یو آر دی باس۔“ روبی نے کہا اور پھر اداس سی ہو

گئی۔ ''یہ مراد کہا کرتا تھا مجھ سے۔''
انور نے چند سیکنڈ کے توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اعلان تو ہو جائے گا کل... دنیا کو پتا چل جائے گا۔ وہاں دوسرا امراؤ ہاؤس بنانے کا خیال میں نے ڈراپ کر دیا ہے۔ روبی کے مشورے سے۔''
''وہ واقعی غیر ضروری تھا۔'' روبی نے اس کی تائید کی۔
''گویا تم سب اسی گھر میں رہو گے۔'' میں نے کہا۔
''فی الحال، میں اپنی خاندانی حویلی کی تعمیر بھی ساتھ ہی شروع کراؤں گا۔ میں اس کو ماڈرن ٹچ دینا چاہتا تھا مگر ریشم مُصر ہے کہ سب کچھ ویسا ہی ہونا چاہیے، کہیں فرق محسوس نہ ہو۔''
میں نے کہا۔ ''اس سے میں بھی اتفاق کروں گا۔ تاریخ کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ حویلی ایک خاندانی ورثہ بھی ہے۔''
روبی مسکرائی۔ ''کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ریشم کا حکم کافی ہے۔''
''مگر میں نے اس کی نہیں مانی۔'' انور بہادری سے بولا۔ ''فرق صاف نظر آئے گا۔ اس کی پیشانی پر اب لکھا جائے گا ''ریشم محل'' کیا سمجھے۔''
''یہی کہ خاندانی تاریخ ہار گئی۔ ریشم جیت گئی۔ تو نے زن مریدی کی سند حاصل کر لی۔'' میں نے کہا۔
''جب تیرا وقت آئے گا تو پوچھیں گے برخوردار... ابھی تو میں وہ خوشی دیکھ رہا ہوں جو ریشم کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بن کے نمودار ہوگی۔ اب اگلا مرحلہ تھا فنانس کا۔ ہم لون بھی لے سکتے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''مگر اس کی ضرورت کیا ہے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ دو بھائیوں کی دو تجوریوں میں سے جو خزانہ مجھے ملا، اس کی مالیت کیا تھی اور اس پروجیکٹ کی لاگت کیا ہے۔''
اس نے مجھے کاغذ پین کی مدد سے سمجھانا شروع کیا۔ ''دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم منافع بہت زیادہ لیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس پروجیکٹ کا ایک رفاہی پہلو ہو۔ دولت مند جہاں چاہیں آباد ہو سکتے ہیں۔ سہولت ان کو ملے جن کے لیے گھر بنانے کا خواب اپنی محدود آمدنی اور مہنگائی کے ساتھ بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے پورا نہیں ہوتا۔ یوں، شادی کے بعد ایک دو بچے ہونے تک آدمی یا تو والد بن کے گھر میں رہ لیتا ہے یا کرائے کے چھوٹے سے گھر میں۔ جب دوسرے بھائیوں کی بھی شادی ہو جائے تو وہی گھر تنگ ہوتا ہے۔ ایسے کچھ لوگوں کی زندگی آسان ہو سکتی ہے اگر انہیں کرائے سے کم رقم کی قسط دے کر مکان مل جائے جو بالآخر ان کا ہو جائے۔''
''یہ تو بڑا نیک خیال ہے۔''
انور کے پروجیکٹ کی باتوں میں کتنا وقت گزر گیا، پتا ہی نہیں چلا اور میں نے تنگ آ کے کہا۔ ''میں آپ کی بقیہ بکواس بھی سنتا مگر آج سارا دن میں نے دھکے کھائے ہیں، مٹی دھول کھائی ہے۔''
''ارے خدا کا کچھ خوف کرو۔ اتنی دور سے میں لنچ لے کر گئی تھی اور خود کھلایا تھا۔''
میں نے دماغ پر زور دے کے کہا۔ ''خود کھلایا تھا؟ کچھ یاد نہیں آ رہا... چمچے سے یا ہاتھوں سے؟''
ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی مہمان کے آنے کی اطلاع ملی۔ گارڈ نے کہا۔ ''سر میں نے بہت کہا کہ انتظار کرو۔ میں پوچھ لوں۔ مگر اس نے... ایک دم ریوالور نکال لیا...'' اس کی آواز انٹرکام پر سنائی دے رہی تھی۔
''ایسا کون آ گیا اور تم کس لیے ہو وہاں...؟'' انور بگڑا۔
''سر! میں اکیلا تھا۔ دوسرا نماز پڑھنے گیا تھا۔ یہ بہت خطرناک آدمی لگتا ہے سر... میرے بچے چھوٹے ہیں... وہ بیوہ ہو جائیں گے... بیوی یتیم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ عورت بھی ہے ایک۔''
''عورت بھی ہے؟ اچھا میری بات کراؤ... تمہاری تو لگتا ہے پتلون گیلی ہو رہی ہے۔ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟''
''عورت کہتی ہے کہ دلہا دلہن کو سلامی دے کر چلے جائیں گے۔''
اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ ''تم میری بات کراؤ۔''
میرا خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری طرف سے گامارستم بولا۔ ''اب یہ عزت رہ گئی ہے ہماری بیٹے؟''
میں اٹھ کے باہر دوڑا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ ریشم اور انور نے باہر آ کے ان کے سامنے سر جھکائے۔ گامارستم نے انور کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی بیوی نے ریشم کو پیار کیا۔
''بڑا ڈراما کیا تم نے استاد۔'' میں نے کہا۔
وہ دونوں میز کے گرد دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ''بتا تو دیا تھا کہ ہم آئیں گے۔''
''مگر ایسے... اور آئے کیسے ہو؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' میں نے کہا۔

''بتاؤں گا سب... جلدی کیا ہے۔ پہلے آتا جاتا تھا میں اور گاڑی میں... تجھے بھی میں ہی لایا تھا... لیکن...''
اس کی بیوی نے ٹوکا۔ ''یہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور پہلے ان کا حال پوچھ لو۔''
کھانا ختم ہوا تو ہم لاؤنج کے ایک گوشے میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ''سکندر کہاں ہے؟''
میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''استاد! یہ اتنی دیر بعد پوچھا تم نے؟''
وہ نظر چرا کے بولا۔ ''میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کیا بتاتے ہو؟''
''یعنی تمہیں معلوم تھا کہ وہ نفسیاتی علاج گاہ میں زیرِ علاج ہے۔''
وہ ہنس پڑا۔ ''ابے سیدھی بات کر کہ پاگل خانے میں ہے۔ وہ ہوتا تو میں کیسے آتا یہاں؟''
روبی کے چہرے پر ناگواری کے آثار عیاں ہوئے اور وہ احتجاجی انداز میں اٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ''استاد تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ وہ روبی کا سسر اور ماما ہے۔''
''اور بھی بہت کچھ ہے وہ فرید... میرا مطلب ہے ملک... تو بھی سب نہیں جانتا۔ روبی کو کتنی محبت ہے اس سے... یہ بھی منہ دیکھے کی ہے... جب اسے حقیقت معلوم ہو جائے گی نا تو وہ بھی کہے گی کہ یہ سب کیے کی سزا ہے۔''
''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' انور بولا۔
''چودھری صاحب! صرف میں کہہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے۔''
''کیا معلوم ہے؟''
''یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ آج جس محل اور کاروبار کے ہوتے وہ پاگل خانے میں بند ہے، یہ سب اس نے شرافت سے نہیں بنایا تھا۔ بزنس میں حق حلال کیا مگر کاروبار یا بدمعاشی کے ہوتے ہیں جیسے نادر شاہ کا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔
''میرا خیال ہے کہ میں روبی کے پاس جاؤں، چلو ریشم۔'' بھابی اٹھ کھڑی ہوئی۔
اسی وقت روبی واپس آ گئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ پُرسکون تھی اور اپنے بھڑک اٹھنے والے جذبات پر قابو پانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ ''ابھی آپ نے جو کہا...''
''آئی ایم سوری... مجھے تمہارے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر میں اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکا۔''

استاد نے کہا۔

''مجھے بہت صدمہ پہنچا لیکن اب میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔'' روبی نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''یہ لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں۔ سب ایسے ہیں جیسے آندھی میں اُڑ کے تنکے اِدھر اُدھر سے آ گئیں اور دریا میں ایک ساتھ بہتے بہتے کہیں رک جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''استاد تم تو شاعری کرنے لگے ہو۔''

''ابے نہیں یار، ہم ان پڑھ لوگ ہیں۔ جو بیتی وہی بتاتے ہیں۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا... بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ تو اور میں، تیری بھابی یا ریشم... کیسے اکٹھے ہو گئے، یہ انور کیسے یہاں روبی کے گھر میں پہنچ گیا۔ میں سلیم سے کیسے ملا۔ سلیم یہاں کیسے پہنچا۔ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ جو بات میں نے کی تھی اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک میں اپنے بارے میں نہ بتاؤں۔ ایک وقت تھا جب اپنی زندگی پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ بہت پرانی بات ہو گئی۔ جیسے خوش حالی کا آرام نصیب میں نہ تھا۔ ایسے ہی تعلیم نہ تھی اور مجھے اپنی بدقسمتی کے احساس نے سب سے باغی کر دیا۔ گھر سے کہ میرا باپ چپراسی کیوں ہے افسر کیوں نہیں۔ اتنے تھوڑے سے پیسوں کے لیے نوکری کیوں کرتا ہے۔ سائیکل پر آتا جاتا تھا وہ چوری ہو گئی تو پیدل آنے جانے لگا۔ گرمی، سردی، بارش، بیماری اس کے لیے رعایت نہ تھی۔ مجھے غصہ تھا کہ ہم اس ایک کمرے میں کیوں رہتے ہیں جو پنجرہ ہے۔ کابک ہے، جیل کی کوٹھری تب تک میں نے نہیں دیکھی تھی۔ وہ کسی ہندو کی پراپرٹی تھی۔ انڈیا سے آنے والوں نے اس میں ڈیرے ڈال لیے جس کے ہاتھ جتنی جگہ لگی، اس نے قبضہ کر لیا۔ میں ایک ہی اولاد تھا۔ باپ سے لڑتا تھا کہ اس نے اتنی کم جگہ پر کیوں قبضہ کیا تھا۔ اور ایسی ذلت کی نوکری سے تو بہتر ہے کہ وہ بھیک مانگے، وہیں رہنے والا ایک فقیر اس کے مقابلے میں بہت امیر تھا۔ اس کی ایک دن کی کمائی میرے باپ کی مہینا بھر کی تنخواہ سے زیادہ تھی۔ باپ نے مجھے مارا کہ مجھے بے عزت بن کے ہاتھ پھیلانے کو کہتا ہے۔ ایک دن وہ بس کے نیچے آ گیا اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ پھر اس فقیر کے کہنے پر وہ بھیک مانگنے لگا۔ لیکن جگہ ٹھیکے دار کی تھی۔ وہ نشہ بھی کرنے لگا تھا۔ حالات زیادہ خراب ہو گئے۔ ماں ایک گھر میں کام کرنے لگی۔ میں سارا دن آوارہ پھرتا۔ ماں پر گھر والوں نے چوری کا الزام لگایا اور پولیس نے اسے اتنا مارا کہ وہ مر گئی۔ اس کے بعد میں نے دنیا سے بدلہ لیا۔ میں جرم کی راہ پر چل نکلا اور جیب تراشی سے چوری تک پہنچا اور بالآخر ڈاکو بن گیا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ ساری رات میں ختم نہیں ہو گی۔ بتانا یہ تھا کہ میں جب پیدا ہوا تھا تو میری تقدیر میں یہ سب لکھا جا چکا تھا۔ ورنہ میں اس چپراسی کے گھر میں کیوں پیدا ہوتا۔ اللہ معاف کرے۔ میں تو خدا سے بھی باغی ہو گیا تھا جس نے انسانوں کی تقدیر لکھنے میں انصاف سے کام نہیں لیا تھا۔''

وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوا اور کچھ سوچتا رہا۔ ''انجام وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنا گروہ بنا لیا اور میرے نام کی دہشت بیٹھ گئی۔ بہت ڈاکے ڈالے۔ بہت مال ہاتھ آیا مگر اس وقت مجھ پر پاگل پن سوار تھا۔ میں دولت مندوں سے انتقام لے رہا تھا جیسے مجھے ڈاکو بنانے والے اور میری بدقسمتی کے ذمے دار وہی ہیں اور جب تک دنیا سے ہر دولت مند کا خاتمہ نہیں کر دوں گا، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا۔ اگر عقل سے کام لیتا تو اس دولت سے بہت کچھ کر سکتا تھا جو میں نے لوٹی۔ میرے ساتھی پکڑے گئے۔ مارے گئے۔ میں بھاگتا رہا اور اس خیال میں جتلا رہا کہ اب میں نے قسمت کو قابو کر لیا ہے، مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔

''پھر ایک دن میں پکڑا گیا اور اس کے بعد یہ زندگی بھی میری نہ رہی۔ مجھے پولیس نے استعمال کیا اور سندھ پہنچا دیا۔ جہاں ایک وڈیرا میرا سرپرست بن گیا وہ بڑی عیاشی کا زمانہ تھا۔ میں محفوظ تھا اور میری بڑی ٹور تھی۔ میرے تعلقات اوپر تک تھے۔ میں وڈیرے کا خاص آدمی تھا۔ وہ بعد میں وزیر بنا۔ میں اس کے ساتھ رہتا تو جھنڈے والی گاڑی میں پھرتا مگر قسمت پھر دغا دے گئی۔ اس نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کو کالج لانے لے جانے کی ذمے داری مجھے سونپ دی۔ کالج مشکل سے دو میل تھا مگر منہ کے بل گرنا ہو تو دو قدم بھی بہت ہوتے ہیں۔ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ ہاں اب چھپانا کیسا۔ میں ایسا ہی تھا لیکن وہ عام لڑکی نہ تھی۔ میں نے بہت بچنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے گھیر لیا اور جب عورت ہی مرد کو گھیر لے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ تھی بھی خوب صورت اور اس کی عمر بھی کم نہ تھی۔ ہم پلہ اور خاندانی رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شادی رکی ہوئی تھی۔ اس سے بڑی کسی کی دوسری بیوی بن کے گزارا کر رہی تھی اور اس کی پہلی بیوی کے بچے پال رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم شادی کر کے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ وہ لاکھوں نقد اور زیور لائے گی۔ آج کل لاہور جیسے کسی بڑے شہر میں چھپ کے رہنا کیا

مشکل ہے اور ہم باہر بھی جاسکتے ہیں۔ میں پھر بھی انکار کرتا رہا تو اس نے مجھے کہا کہ وہ خودکشی کرلے گی اور اس کا خون میری گردن پر ہوگا اور ایک دن اس نے کیڑے مارنے والی کوئی دوا پی لی۔ اس کی جان ڈاکٹروں نے بچالی پھر بھی کسی کو شک نہیں ہوا۔ اسپتال کے کسی ڈاکٹر نے مدد کی اور اسے ہاضمے کی خرابی میں دی جانے والی کسی دوا کا ری ایکشن بتادیا جو اس نے کھائی تھی۔ جب وہ ٹھیک ہو کے آئی تو پھر میرے پیچھے پڑگئی اور اس نے کہا کہ اب کی بار وہ تیزاب پی لے گی۔ اس نے کہا کہ میں عورت ہو کے نہیں ڈرتی، تم کیسے مرد ہو کہ مرنے سے ڈرتے ہو۔ عقل تو میری بھی خبط ہو گئی تھی۔ ہم نے سارا پروگرام بنالیا لیکن نہ جانے کیسے راز فاش ہوگیا۔ وڈیرے نے بڑی سیاست سے کام لیا۔ بہن کو کاری قرار دیتا تو اس کی عزت پر حرف آتا۔ اس نے خود بہن کو قتل کیا اور مجرم مجھے بنا کے قانون کے حوالے کردیا۔ کسی دشواری کے بغیر مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچادیا گیا۔ اس وقت پرانے ساتھی کام آئے اور مجھے نکال لے گئے۔ پورا ایک سال میں نے روپوشی میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا مگر ایک تو میرے دماغ پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ میں اس وڈیرے کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مجھے گروہ کی طاقت کی ضرورت تھی۔ میرے ساتھی اس کے خلاف تھے اور کہتے تھے کہ بس اب پچھلی زندگی کو بھول جاؤ۔ ایسا نہ ہو انتقام کے چکر میں خود مارے جاؤ۔ لیکن انہی دنوں ایک پولیس مقابلے میں گروہ کے چھ میں سے تین بندے مارے گئے۔ ان میں مجھے چھڑا کے لانے والا دوست بھی شامل تھا۔ گروہ نے مجھے لیڈر بنالیا اور ہمیں جنوبی پنجاب کے ایک سیاست داں پیر خاندان کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اس کی ایک خاندانی ملازمہ تھی جس نے اسے بچپن سے پالا تھا اور وہ خادمہ کو ماں جیسی عزت دیتا تھا۔ اس خادمہ کی بیٹی یہ ہے۔" گامارستم نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

بے اختیار ہم سب کے سر گامارستم کی بیوی کی طرف گھوم گئے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "یہ سب بتانا بھی ضروری تھا۔ اس شادی نے میری زندگی کے راستے بدل دیے۔ اس خادمہ کے کہنے پر سیاست داں پیر نے مجھے اجازت دی کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جیسے چاہوں زندگی گزاروں۔ میں نے اپنا نام اور شناخت سب بدل لیے تھے اور ابھی سوچ رہا تھا کہ شرافت کی زندگی کہاں اور کیسے گزاروں کہ مجھے سکندر بخت کا بلاوا آگیا۔"

روبی سب سے زیادہ چونکی۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"تم یہاں نہیں تھیں۔ شادی کرچکی تھیں اور مراد کے ساتھ تھیں۔" گامارستم بولا۔

"وہ تمہیں کیسے جانتے تھے؟ اور کب سے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔ "میری ایک شہرت تھی جیسے شیطان کی ہے۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں کرائے کا قاتل بدمعاش تھا۔ ایک خاص طبقہ تھا جو میری خدمات سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ میرے جیسے اور بھی ہیں۔ وہ حاکموں کے ایک خاص طبقے کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں۔ ان کی دہشت قائم رکھتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی آواز اٹھے تو دبا دیتے ہیں۔ وہ خود قانون کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں۔"

"تم سکندر شاہ کو پہلے سے جانتے تھے؟" انور نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا بھی... اس جیسے بلڈر تو ہر شہر میں ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوگیا اس نے خود بھی بتادیا تھا۔"

"پھر تم اس سے ملنے گئے؟"

"ہاں، میں نے پوچھا تھا کہ وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتا ہے مگر اس نے کہا کہ آؤ گے تو بتاؤں گا۔ اگلے دن اس نے گاڑی بھیج دی تو میں چلا گیا۔ اس نے مجھے باہر ہی بٹھایا۔ مجھے اس کا مغرور انداز پسند نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ "ایسی کیا بات تھی شاہ جی؟"

اس نے کہا۔ "ملک غلام محمد، تم پیر اظہر علی شاہ کو جانتے ہو؟"

"ہاں، نام سنا ہے اس کا یہاں آکے... وہ پیر ہے۔"

"پیر نہیں وہ فراڈ ہے۔ پیری مریدی کی آڑ میں سارے غیر قانونی کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کرتا ہوگا، مجھے کیا۔"

وہ بولا۔ "اس کے منشیات فروشوں سے کاروباری مراسم ہیں۔ وہ اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔ اس کے شراب کے ٹھیکے ہیں اور وہ بردہ فروشی میں ملوث ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے جو لڑکیاں اور جوان عورتیں غائب ہوتی ہیں، باہر جاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کہتے ہو تو میں سب مان لیتا ہوں اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو پولیس کو بتائیں۔"

وہ چلایا۔ "پولیس، تم کیا بے وقوف اور پاگل سمجھتے ہو

مجھے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ سارے دھندے پولیس کی مدد سے ہوتے ہیں، پولیس کراتی ہے۔"

"پھر مجھے بتانے کا فائدہ؟ میں کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسے تباہ کر سکتے ہو۔ ختم کر سکتے ہو۔" وہ کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد بولا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نشے میں ایسا کہہ رہے ہیں یا کسی نے غلط بتایا ہے آپ کو۔"

"بیٹھ جاؤ۔" وہ دہاڑا۔ "ڈراما مت کرو میرے سامنے گامارستم... میں نشے میں بھی غلط بات نہیں کرتا اور کوئی الو کا پٹھا مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں ملک غلام محمد۔"

میں نے کہا۔ "نہیں، آپ کو کچھ نہیں معلوم۔ اب میں گامارستم نہیں ہوں۔ میں نے اس زندگی سے توبہ کرلی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "توبہ... نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ دنیا دیکھی ہے میں نے گامارستم... جس آدم خور شیر کے منہ کو خون لگ جائے وہ سبزی خور نہیں بن سکتا۔"

میں پھر کھڑا ہوگیا۔ "تم چاہو جو سمجھو، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

وہ بھڑک اٹھا۔ "مدد، کون حرام زادہ تمہاری مدد کا محتاج ہے۔ میں ایک کام تمہارے سپرد کررہا ہوں۔"

"مگر میں وہ کام نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے بھی چلا کے کہا۔

وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھایا۔ "ارے ملک صاحب! غصہ کیسا۔ ہم بزنس کی بات کررہے ہیں۔ میں ہوں ٹھیکے دار... تم کو ایک کام کا ٹھیکا دینا چاہتا ہوں، جو تم کرسکتے ہو۔"

"مگر میں نے چھوڑ دیا ہے وہ کام۔"

"کوئی بات نہیں پھر شروع کردو۔ بھولے تو نہیں ہو گے کچھ بھی؟"

میں نے برہمی سے کہا۔ "آخر تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی میری بات۔"

"سمجھ میں تمہاری نہیں آرہی ہے یہ بات کہ میں پیسا دوں گا۔ نقد۔ جتنا تم کہو گے... پانچ لاکھ... دس لاکھ..."

"نہیں چاہیے مجھے تمہارا پیسا... پانچ لاکھ دس لاکھ تو کیا ایک کروڑ بھی نہیں۔" میں نے چلا کے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ "دیکھو میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں، پورا ایک ہفتہ۔"

"ایک سال بعد بھی میرا جواب یہی ہوگا۔ جب میں نے یہ کام چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا۔"

"ملک صاحب! سمجھ لو کہ مجبوری میں آخری بار کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "آخری بار کر چکا۔ اب کوئی مجبوری نہیں۔"

"مجبوری بن جاتی ہے بعض اوقات۔" وہ مجھے گھورتا رہا۔ "آدمی کو دوسروں کے لیے بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے اصول اور عہد و پیمان... زندگی ایسی ہی چیز ہے۔"

"تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟" میں پھر جانے کے ارادے سے اٹھا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "دھمکی ہی سمجھ لو اور یہ بھی کہ آئے تم اپنی مرضی سے تھے، جاؤ گے میری اجازت سے... اگر تم چاہو تو اپنے پرانے آقاؤں سے بات کرلو۔ وہ تمہیں بچا نہیں سکتے۔ بیس لاکھ فائنل۔"

میں نے غصے کے بجائے ڈپلومیسی اختیار کی۔ "شاہ جی! تمہارے پاس دولت بھی ہے اثر رسوخ بھی۔ آخر تم مجھے ہی کیوں مجبور کررہے ہو اور بہت مل سکتے ہیں تمہیں بیس لاکھ میں۔"

"ہاں لیکن میں نے تم سے کہا ہے تو یہ کام تم ہی کرو گے۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں۔"

میں محتاط ہوگیا۔ میرا واسطہ ایک پاگل آدمی سے پڑ گیا تھا۔ شراب کے ساتھ وہ طاقت کے نشے میں مدہوش تھا ورنہ ٹھیکے داری کے سارے کام وہ سمجھ بوجھ سے کرتا ہوگا۔ میں نے غلطی کی کہ فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ "اوکے، مگر مجھے کچھ وقت چاہیے کہ میں اپنی فورس جمع کرلوں۔"

"ٹھیک ہے کتنا وقت ایک ہفتہ... دو ہفتے...؟"

"ایک ہفتہ... مگر شاہ جی... ہم شریف لوگ نہیں ہیں جو قول دے کر پھر جاتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "بیس لاکھ ایڈوانس ملیں گے جب کہو گے تمہارے گھر پہنچا دیے جائیں گے۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہ واقعی آخری بار ہوگی۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "شریفانہ نہیں۔ بدمعاشی کا عہد... لیکن اس پیر کا نام و نشان باقی نہ رہے، اس کا گھر بار... کاروبار سب خاک میں ملا دو۔ کسی کو رعایت نہیں۔ سب کو جلا کے راکھ کردو۔"

میں نے کہا۔ ”آخر اس کے ساتھ یہ دشمنی کس لیے... کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟“

وہ طیش میں آکے اسے گالیاں بکنے لگا۔ ”اس نے سکندر شاہ کی درخواست ٹھکرا دی۔ ایک بار نہیں دو بار... آخر کیا سمجھتا ہے وہ خود کو۔ میں نے اس کی بیٹی کا رشتہ ہی تو مانگا تھا۔ ہر لحاظ سے میں اس کا ہم پلہ تھا۔ اس نے مجھے ذلیل کر کے گھر سے نکالا اور میرا داخلہ بند کر دیا اپنی ہی بہن کے گھر میں... اس نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان لینے کی کوشش کی۔ اپنے جرائم پیشہ پاگل مریدوں سے مجھ پر حملہ کرایا۔ میں ایسی عبرت ناک سزا دوں گا اُسے...“

”ٹھیک ہے شاہ جی... میں سمجھ گیا۔ اب آپ دیکھتے جائیں میں یہ کام کیسے کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میرا مقصد پہلے اس پاگل کے چنگل سے نکلنا تھا۔ گھر آکے میں نے اپنی بیوی کو سب بتایا اور ہم سوچتے رہے کہ کیا کریں، ایک راستہ یہ تھا کہ ہم روپوش ہو جائیں۔ دوسرا یہ کہ پیر سائیں کو سب بتا دیں۔ فکر میں ہم رات بھر جاگتے رہے۔ صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تو میری بیوی میرے ساتھ نہیں تھی۔ میں سمجھا کہ معمول کے مطابق اٹھ کے کچن میں ناشتا بنا رہی ہوگی۔ لیکن آواز دینے پر جواب نہ ملا تو میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ وہ گھر میں نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ دوپہر تک میں پریشان رہا پھر سکندر شاہ کو فون کیا۔

اس نے کہا۔ ”ملک صاحب! ملکانی ہماری مہمان ہے اور جب تک تم ہمارا کام نہیں کرو گے، واپس نہیں آئے گی۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ ”لیکن میں نے تو ہامی بھر لی تھی۔“

وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ ”ہامی کے بچے... تو سکندر شاہ کو پاگل بنا سکتا ہے؟ پاگل تو خود ہے کہ ایک دم مان گیا تھا۔ تو نے سوچا تھا کہ پہلے یہاں سے نکلوں پھر دیکھی جائے گی۔ تیری نیت میں فتور تھا۔ تو یہ کام کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یاد ہے نا میں نے کیا کہا تھا کہ بعض اوقات مجبوری بن جاتی ہے تو اب مجبور ہے۔ ہمت ہے تو چھوڑ جا بیوی کو میرے پاس دوسری کر لینا۔ مگر دو باتیں سمجھ لینا ایک تو تیری بیوی کا وہ حشر ہوگا کہ وہ مرے گی نہ جیے گی۔ دوسرے بھی نہ کبھی میں تجھے تلاش کرا لوں گا۔ زیادہ دن نہیں لگیں گے۔

بس اس کے بعد میں کیا کرتا۔ میں نے اس سے بیس لاکھ وصول کیے اور چند پرانے ساتھیوں کو بلایا۔ میں نے وہ ساری رقم ان میں بانٹ دی اور اپنی بیوی واپس لے لی۔ جب میں اس کو اپنے ساتھ لے کر واپس آیا تو اسی طرح گھر میں موجود تھی جیسے کہیں بھی نہیں گئی تھی۔ اس کے سامنے ہم

نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔“

خاموشی کا ایک خاصا طویل وقفہ آیا جس میں روبی کے آنسو بہتے رہے۔ گامارستم نظر جھکائے بیٹھا رہا اور اس کی بیوی روبی کے ساتھ بیٹھی روتی رہی۔ میں اور انور خلا میں دیکھتے رہے۔ بہت دور چھانگا مانگا کے جنگل میں ایک دیوانہ اپنی قید تنہائی کی رات کاٹ رہا۔

اس خاموشی کو میں نے توڑا۔ ”یہ تم نے بتایا تھا مجھے کہ سکندر شاہ کے انڈر گراؤنڈ بڑے مضبوط تعلقات ہیں۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ایسا ہی تھا۔“

”کون تھے یہ طاقتور لوگ... اگر پولیس پیر سائیں کے کاروبار کو پروٹیکشن دیتی تھی۔“

”پروٹیکشن کیا، پولیس اس کی شریک تھی۔ پولیس ہر جگہ غیر قانونی اور ناجائز کام میں اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔ ورنہ اس کے افسرانِ بالا شریک ہوتے ہیں، انہیں منافع پہنچتا ہے ہر جگہ نہیں اور سب نہیں۔ عام طور پر تھانے تک رہتی ہے بات اور تھانے والے اوپر کے افسروں سے خود ڈیل کرتے ہیں۔ سکندر شاہ کا معاملہ اور تھا۔ وہ پیر سائیں والے کاروبار میں نہیں تھا۔ اس نے تو کوشش کی تھی کہ بہنوئی کو اپنے بزنس کی طرف لے آئے۔“

”تمہارے خیال میں پیر صاحب.... اس انڈر گراؤنڈ مافیا سے واقف تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”واقف تو ہوگا۔ جب ان کے بزنس میں شریک تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے اس مافیا میں کون لوگ ہیں۔ اس کے لنک کہاں تک ہیں اور اس کا ڈان کون ہے؟“

استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، ہو سکتا ہے وہ جانتا ہو۔“

”اس نے کبھی نادر شاہ کا حوالہ دیا؟“

استاد نے کہا۔ ”سالے بہنوئی ایک دوسرے کے بارے میں کتنا جانتے تھے اور کیا باتیں کرتے تھے، یہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے بیٹے کو بتایا ہوگا۔ سارے خطرات سے خبردار کیا ہوگا تو شاید یہ بھی بتایا ہو کہ پیر کے کاروباری مراسم کس کس سے ہیں۔ لیکن بیٹے پر محبت کا بھوت سوار تھا۔“ اس نے روبی کی طرف دیکھ کر معذرت کی۔ ”معاف کرنا، میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ ویسے وہ بیٹے کی بہت تعریف کرتا تھا کہ میرے مقابلے میں بہت سمجھ دار

ہے۔ وہ رشتہ مانگنے بعد میں گیا پہلے اس نے بہنوئی کو اپنے کاروبار میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔"

"یہ مجھے معلوم ہے؟" روبی بولی۔

"اس نے کہا کہ میرے تعلقات ہیں اور اپنی زمین پر تم مرادنگر سے بڑا پروجیکٹ بنا سکتے ہو۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انور نے کہا۔ "شاید اب یہی ہوگا۔"

استاد افسوس سے سر ہلانے لگا۔ "اتنی خرابی کے بعد؟ اگر اس وقت وہ مان جاتا تو آج وہاں مرادنگر سے دگنے سائز کی آبادی ہوتی۔ اور پیر اظہر علی شاہ کروڑپتی بن جاتا لیکن اس کام میں پیسا پہلے لگانا پڑتا ہے اور واپس آتا ہے دیر سے۔ لہٰذا ٹھنڈا کر کے... آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ الٹا یہ سمجھا کہ سالا اس کی زمین ہتھیانا چاہتا ہے۔ بعد میں اس نے رشتے سے بھی انکار کیا اور ان کے درمیان دشمنی ہو گئی۔"

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟"

"مجھے خود اکبر نے بتایا اور مجھے دوسروں سے بھی پتا چلا اور دیکھ انجام کیا ہوا۔" استاد بولا۔

"استاد ایک بات بتاؤ۔ سکندر شاہ اپنے بہنوئی کو کنسٹرکشن کے بزنس میں تو لا سکتا تھا لیکن جس کاروبار میں وہ تھا، اس سے کیسے نکالتا۔ یہ ممکن نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اسے نکلنے کون دیتا ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔ ایک تو پیچھے والے خطرناک اور طاقتور لوگ ہوتے ہیں پھر ان کے ساتھ ہوتی ہے پولیس... اور شاید اسی لیے بھی پیر سائیں کو انکار کرنا پڑا ہو۔ لیکن سکندر شاہ ٹھیکے دار تھا۔ اس نے کئی چھاؤنیوں میں کام کیا تھا اور میں نے سنا ہے کہ اس نے چند اعلیٰ افسروں کی کوٹھیاں بنائی تھیں۔ ڈیفنس سوسائٹی لاہور میں۔ جو جنرل ضیاالحق کے قریبی تھے۔ ایک شاید آئی ایس آئی کا تھا۔ وہ کرا سکتا تھا یہ کام... شاید اسے یقین ہو کہ بہنوئی کو اس دلدل سے نکالا جا سکتا ہے اور نکالنا ضروری ہے اگر وہ سمدھی بن رہا ہو۔ پہلے بہن کی فکر تھی اب بیٹے کا معاملہ بھی آ گیا تھا اور بیٹا بھی اکلوتا مگر بات نہیں بنی اور اسے وہ کرنا پڑا جو وہ نہیں چاہتا ہوگا۔"

"اس نے اپنے وعدے کا پاس رکھا، بعد میں تم سے کوئی کام نہیں کہا اور جب تم میرے ساتھ آئے تھے تو ایک طرح سے اس نے خود ہی کہا تھا کہ تم جہاں چاہو رہو۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔ میں روپوش تھا اسی لیے۔" وہ بولا۔

"تم نے مجھ سے بھی رابطہ نہیں رکھا۔" میں نے گلہ کیا۔

"میں ڈرتا تھا کہ سکندر کے ہاتھ میری کمزوری آ گئی ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ بار بار مجھے استعمال کرے گا اور وہ زندگی جس کا میں نے خواب دیکھا ہے خواب ہی رہے گی۔ لیکن میں اس علاقے سے بہت دور نہیں گیا تھا۔ ورنہ جانے کا کیا تھا جیسے اور لوگ شہر ہی نہیں ملک بھی چھوڑ جاتے ہیں، میں بھی نکل جاتا امریکا، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا۔ اتنا تھا میرے پاس کہ شہریت بھی خرید لیتا جہاں بھی سرمایہ کاری کرتا، سیٹل ہو جاتا۔"

انور بولا۔ "پھر گئے کیوں نہیں؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "ایک تھا خوف اور دوسری تھی مجبوری۔"

"ڈر کس کا؟ اور مجبوری کیسی؟"

"ڈر یہ کہ جاتا تو میں اپنی اصل شناخت چھپا کے اور بدل کے... یہ خطرہ ہمیشہ رہتا کہ اس فریب کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔ ساری زندگی یہاں گزری، سیکڑوں نہیں، ہزاروں سے واسطہ پڑا۔ کیا پتا کس کی نظر میں کوئی اچھی بری یاد رہ گئی۔ ہزاروں تصویروں میں سے ایک بچ گئی، برا وقت بتا کے تو نہیں آتا۔ اپنے لوگ دنیا بھر میں پھیلے پڑے ہیں۔ انسانوں کی بھیڑ میں کون دیکھ لے اور مجھے پتا بھی نہ چلے، باہر والے ایک پر سے پرندے کو تلاش کر لیتے ہیں۔ یہاں میرا شجرہ نسب، اعمال نامہ اور شناخت کے لیے پیر کی چھوٹی انگلی کے ناخن سے سر کے بال تک کی ساری تفصیل موجود ہے۔ مجھے تو اس وقت پتا چلتا کہ مسٹر ہم نے سب معلوم کر لیا ہے کہ تم کون ہو اور کیا ہو اور میں خود کو پھر وہیں پاتا جہاں سے چلا تھا۔ دنیا گول ہے... ساری زمین کا چکر لگا کے نکلا کہاں... اسی سکھر جیل میں۔"

میں اور انور ہنسنے لگے۔ "استاد! اتنا ڈرنے لگے ہو اب تم۔"

وہ خفت سے مسکرایا۔ "میں خود حیران ہوتا ہوں کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، کہاں میں ہر طرف سے ہونے والی پولیس کی فائرنگ میں سے اس یقین کے ساتھ گزر جاتا تھا کہ مجھے کوئی گولی نہیں لگے گی اور نہیں لگتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ساری عمر کا خوف تمہارے اندر تھوڑا تھوڑا جمع ہوتا رہا اور اب ایک دیوار بن گیا۔"

"اس کی وجہ بھی معلوم ہے مجھے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اب میں ذمّے دار ہو گیا ہوں۔ اکیلا نہیں رہا۔" اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ "جنگل کا شیر نہیں رہا۔ چڑیا گھر کا شیر بن گیا ہوں، یہ ہے میری مجبوری۔ میں ڈرپوک اور بوڑھا بھی تو ہو گیا ہوں۔" وہ خود ہی اپنی بات پر ہنسا۔

"کیسی بات کرتے ہو استاد۔" میں نے کہا۔

"جیل میں ایک سالا فلسفی تھا۔ اس کی باتیں عجیب ہوتی تھیں مگر غلط نہیں۔ ایک بار کہنے لگا کہ تم ندی کے پانی میں دو بار پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ میں نے کہا کہ پاگل کے بچے... ابھی دریا ہوتا تو میں تجھے دکھا دیتا۔ وہ ہنسنے لگا کہ ایک بار جب پاؤں ڈالو گے اور نکالو گے تو کیا دریا رکا رہے گا؟ نہیں، اس کا پانی بہتا رہے گا۔ دوسری بار وہ پانی نہیں ہو گا۔ ایک سیکنڈ بعد بھی نہیں ہو گا۔ جس میں پہلی مرتبہ پیر رکھا تھا۔ میں تو حیران رہ گیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا تو ایسے ہی ہم بوڑھے ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی جو میری یا تمہاری عمر ہے ایک منٹ ایک گھنٹے یا ایک دن سے ایک سال میں بدل جائے گی مگر وقت کی بات نہیں کر رہا تھا میں... جذبے کی بات کر رہا تھا۔ میرے جذبات بوڑھے ہو گئے ہیں۔ دل بوڑھا ہو گیا، میں نے ستّر سال کے بندے کو پہاڑ کی چوٹی سر کرتے دیکھا، وہ میرے مقابلے میں جوان تھا۔"

"تم فلسفی ہو گئے ہو۔" میں نے کہا۔

"وقت نے بنا دیا ہے۔ میں اسی علاقے میں گھومتا پھرتا رہا۔ یہاں ساری زندگی گزاری ہے۔ لوگوں سے زیادہ یہ جگہ مجھے جانتی ہے۔ گزارا خیر اچھا ہو رہا تھا مگر کام کیے بنا بھی چارہ نہیں۔ بیکار کون بیٹھ سکتا ہے۔ مجھے بھی عادت نہیں رہی۔ یہاں ملک غلام محمد کچھ نیکی اور فلاح کے کاموں میں مصروف رہا اس سے دل کو تسلی ملتی تھی کہ اب تک گناہوں کا پلڑا ہی بھاری ہوتا گیا۔ اب کچھ نیکیاں دوسرے پلڑے میں پڑ رہی ہیں۔ مگر پھر سکندر شاہ نے یہ خوشی بھی چھین لی۔ اس کے بعد کوئی کام کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ تیری خبر رکھی میں نے... تیری بھابی کہتی تھی کہ اسے لے آؤ، وہ تو انور کو بھی بہت یاد کرتی تھی اور ریشم کو بھی۔ روتی تھی کہ ان کی شادی نہ کرا سکی۔ دھوم دھام کا شوق تھا۔"

"یعنی حالات سے پوری طرح باخبر رہے تم؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بے خبر کیسے رہتا میں پھر ہم چلے گئے عمرہ کرنے اور واپس آئے تو... پتا چلا کہ انور کے ساتھ کیا ہوا اور مراد کے ساتھ... اور ابھی چند روز پہلے کسی نے بتایا کہ باپ پر بیٹے کی موت کا کتنا اثر ہوا۔ تو میں روک نہ سکا خود کو۔"

"تمہیں اب کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔" روبی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہ بدبختی ہمیشہ رہتی ہے اور نہ خوش قسمتی... یہ کتابوں میں بھی لکھا ہے لیکن جب زندگی سمجھاتی ہے تب یقین آتا ہے۔ ہم سب جو اس وقت یہاں بیٹھے ہیں، سب بھگت چکے ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "اچھا استاد آگے کا کیا سوچا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے سوچنے سے... تقدیر میں جو ہے وہی ہو گا۔" استاد واقعی قنوطی ہو گیا تھا۔

"اچھا پھر سنو کہ میں نے کیا سوچا ہے۔ ہم نے کیا سوچا ہے۔ اب یہاں آ گئے ہو تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "تیرا گھر ہوتا تو میں سکون سے بیٹھ پاتا۔ آخر تو بھی تو بیٹوں جیسا ہی ہے میرے لیے۔ میں ایسے ہی جذبات رکھتا ہوں تیرے لیے، تو جانتا ہے۔"

میرے بولنے سے پہلے روبی نے کہا۔ "استاد! یہ سلیم ہی کا گھر ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تو گھر بسائے گا نا..."

روبی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "استاد! مجھے معلوم ہے تم نے میری بات کا برا منایا تھا۔ مگر مجھے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ آئی ایم سوری... سلیم یا انور میں میرے لیے کوئی فرق نہیں۔"

"میں نے غصے میں غلط الفاظ بولے تھے جس نے گھر بنایا تھا وہ تو سب سے زیادہ مظلوم ہو گیا ہے۔ ہم میں سے کون سمجھ سکتا ہے اس کا دکھ جس کا ایک ہی جوان بیٹا نہ رہے۔"

انور نے کہا۔ "بس تو پھر بات ختم۔" تم اور تمہاری بیوی اب اسی فیملی میں شامل ہو جاؤ۔"

استاد نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جیسے اس سے اجازت طلب کر رہا ہو یا، اس کی مرضی جاننا چاہتا ہو۔

میں نے کہا۔ "بھابی سے مت ڈرو، وہ میرے ساتھ بھی ہے اور انور کے ساتھ بھی۔"

معلوم نہیں کیوں بھابی اب تک سپاٹ چہرے کے ساتھ منہ بند کیے بیٹھی تھی۔ شاید استاد یہ سمجھا کے لایا تھا کہ وہاں جذباتی مت ہونا اور چپ بیٹھنا، اس نے پابندی کا برا

مانا تھا یا اور کوئی بات تھی کہ وہ ریشم کے ساتھ لگی ہوئی چپ چاپ سپاٹ چہرے کے ساتھ ساری گفتگو سنتی رہی۔ اب پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں اب یہیں رہوں گی۔''

انور ہنسا۔ ''مطلب یہ کہ تم جانا چاہو تو مرضی تمہاری...''

استاد بھی مسکرایا۔ ''اب تک سنا تھا کہ بیٹے جوان ہوں تو بیویاں شوہر سے زیادہ اُن کی ہو جاتی ہیں۔ آج دیکھ لیا۔ ارے ابھی اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا میں۔''

''ابھی تو رات بہت ہو گئی ہے ورنہ ابھی گاڑی بھیج کے تمہارا سامان اٹھوا لیتے جہاں بھی ہے تمہارا گھر۔'' انور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں آپ کا کمرا کھول دوں؟'' روبی نے کہا۔

گھر میں پانچ بیڈ روم تھے۔ ان میں سے تین جو استعمال ہو رہے تھے، اوپر کی منزل پر تھے۔ ماسٹر بیڈ کے علاوہ گیسٹ بیڈ بھی نچلی منزل پر تھا۔ میرا خیال تھا کہ روبی وہی کھولے گی مگر وہ اندر گئی اور واپس آئی تو اس نے ماسٹر بیڈ کھول دیا۔ یہ وہی کمرا تھا جو سکندر شاہ اور اس کی بیوی کے زیرِ استعمال تھا۔ وہی گھر کے مالک تھے مگر مالکن دنیا چھوڑ گئی تھی اور مالک کا ٹھکانا بدل گیا تھا۔ اس کی ایک خاص اہمیت تھی اور میری طرح انور بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ روبی یہ کمرا استاد کو دے گی۔ یہ روبی کا ایک اور جذباتی ردِعمل تھا۔ میں اسے کیا کہتا، وہ مالک تھی۔ ابتدا میں جذبات کچھ اور تھے۔ آخر میں میری اور استاد کی گفتگو نے ماحول بدل دیا تو روبی نے نہ صرف زبانی افسوس کیا بلکہ اب عملاً اس کا ثبوت دیا۔ استاد کو اس وقت کیسے اندازہ ہوتا کہ روبی کی ایک جذباتی حرکت نے اسے گھر میں کیا اہمیت عطا کر دی ہے۔ یہ میں نے محسوس کیا کہ اس نے جو کہا تھا، وہ ثابت کر دکھایا کہ گھر سلیم کا بھی اور انور کا بھی۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کے گرتے ہی سو گیا اور صبح ہونے کا پتا مجھے تب چلا جب دروازے پر دستک سے آنکھ کھلی۔ عادت کے مطابق گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ ہوئے تھے۔ میں آنکھیں ملتا دروازے تک گیا تو ایک دم جیسے سورج نکل آیا۔ بہار کا پہلا سرخ گلاب سرسوں کے کھیت میں کھلا تھا، وہ ہلکے زرد رنگ کے ملبوس میں تھی۔ پھول اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے آگے بڑھا رکھا تھا۔ اس نے شاید ہلکا سا میک اپ کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے چہرے کی فطری شگفتگی تھی جس میں مجھے ایک نیا پن محسوس ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر صبح کی پہلی کرن جیسی اجلی مسکراہٹ تھی اور وہ تصویر بنی دروازے کے فریم میں کھڑی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا؟'' اور میرے سامنے چٹکی بجائی۔

میں سخت شرمندہ ہو کے چونکا۔ ''کچھ نہیں۔'' اور محسوس کیا جیسے مجھے پسینا آ گیا ہو۔ میں نے پھول لے لیا اور خود کو خفت سے بچانے کے لیے کہا۔ ''کیا کروں اِسے؟'' پھر میں پیچھے ہٹ گیا۔

وہ ہنسی۔ ''تمہیں نہیں معلوم پھول کا کیا کرتے ہیں؟''

اس کے سوال کا جواب آسان تھا اور الفاظ کا محتاج نہیں تھا۔ یہ پھول مجھے اس کے بالوں میں لگا دینا چاہیے تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ خود وہ بھی اس کے علاوہ کچھ توقع رکھتی تھی۔ یہ ایٹی کیٹس کی بات تھی۔ آدابِ مردانگی کا تقاضا تھا لیکن مصلحت کو سمجھتے ہوئے میں نے ہنس کے بات مذاق میں ٹال دی۔ ''پھول کو کچھ لوگ گل دان میں سجا دیتے ہیں، کچھ اس کا گل قند بنا کے کھا لیتے ہیں۔''

وہ پلٹ گئی۔ ''اچھا جلدی سے تیار ہو کے نیچے آ جاؤ، ناشتے کے لیے۔''

میں واش روم میں گھس گیا لیکن مجھے سخت شرمندگی کا احساس تھا۔ یہ آخر مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کیا سمجھا ہو گا اس نے، عورت تو مرد کی آنکھ میں اس کے دل کی بات پڑھ لیتی ہے مگر میرے لیے بھی تو یہ منظر نیا تھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ غسل کرتے اور کپڑے بدلتے ہوئے مجھے بے ساختہ سودا کا ایک شعر یاد آتا رہا۔

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

تو بات دراصل یہی تھی۔ وہ پہلے میرے سامنے ایسے کب آئی تھی۔ صبح سے رات تک ہر وقت ہر جگہ میرا اس کا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتی تھی۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ مجھے اس کا گزشتہ رات کا روپ یاد آیا۔ وہی سنجیدہ اور بے رونق چہرہ، تھکا ہوا، مرجھایا ہوا، میک اپ سے عاری... اور اس کا لباس جو میں نے عدت کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی دیکھا تھا۔ بے شک وہ بیواؤں والا سفید لباس نہیں پہنتی تھی مگر شوخ رنگوں سے بہرحال اجتناب کرتی تھی، گھر کے لباس میں فیشن کیسا... وہ تو استری کا بھی خیال نہیں رکھتی تھی اور کام کاج میں عام طور پر دو تین دن سوتے جاگتے ایک ہی لباس میں نظر آتی تھی جو

کبھی شکن آلود اور میلا بھی نظر آتا تھا۔

لیکن آج سب یکسر بدل گیا تھا۔ اس نے بڑی نرم روشنی دینے والا رنگ منتخب کیا تھا۔ خزاں کی چاندنی جیسا، خزاں رسیدہ برگِ گل جیسا، مگر اس میں نفاست تھی، سلیقہ اور حسن تھا اور یقیناً آج اس نے ہر گھریلو عورت کی طرح ہاتھ منہ دھو کے لبوں پر ہلکی سی لالی سجائی تھی۔ شاید رخساروں پر غازے کا ہلکا سا غبار بھی تھا اور بالوں کو سلیقے سے سلجھا کے اس نے ایک ادائے بے نیازی سے شانوں پر پھیلا دیا تھا۔ اس میں کسی اہتمام کو دخل نہ تھا۔ مگر دل کے تو بہار کے آسمان کا رنگ بھی نکھر آتا ہے۔

جب میں نیچے پہنچا تو وہ کھانے کے کمرے میں نہیں تھی۔ گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ناشتا میز پر لگا ہوا ہوگا اور سب لوگ میرے منتظر ہوں گے۔ اب اتنی صبح بھی نہ تھی۔ کم سے کم استاد کو اور بھائی کو ہونا چاہیے تھا جو سحر خیز تھے۔ میں نے باہر دیکھا کہ وہ باغ میں نہ پھر رہے ہوں اور ناشتا وہیں کرنے والے اب وہ پرانے لوگ رہ گئے تھے۔ عورت گھر کے اندر کھانے پکانے کا کام کرتی تھی۔ مرد اوپر کے کام نمٹاتا تھا۔ باہر کے ملازموں کی تعداد بھی بہت کم کر دی گئی تھی دو ڈرائیور تھے، دو مالی اور صرف گیٹ کھولنے بند کرنے کے لیے دو گارڈ رہ گئے تھے۔

وسیع کچن میں چار افراد کے لیے ایک گول میز تھی جس پر جلدی میں کوئی بھی ناشتے یا کھانے کے لیے بیٹھ جاتا تھا۔ اس پر اکیلی روبی سامنے پورا ناشتا سجائے بیٹھی تھی۔

''حد کرتے ہو تم بھی، اتنی محنت سے ناشتا بنایا میں نے اور تم نے ٹھنڈا کرا دیا۔ کون سے سولہ سنگھار میں لگ گئے تھے؟'' وہ بولی۔

''سوری... مگر ناشتا بنانے کی زحمت آپ نے کیوں فرمائی؟'' میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیونکہ تم نہیں بنا سکتے تھے۔''

''میرا مطلب تھا کچن میں جو روز ناشتا بناتے ہیں...''

''وہ آج نہیں ہیں۔ خالہ کی طبیعت کل رات بگڑ گئی تھی۔ کچھ سانس کا مسئلہ ہے ان کو، ان کا اکلوتا شوہر انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہے گاڑی میں، دو تین گھنٹے لگ جاتے ہیں ان کے استھما کے اٹیک کو کنٹرول کرنے میں، شروع کرو۔''

''اور باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''کون باقی... دولہا دلہن تو نہار منہ اٹھنے سے رہے۔'' وہ بولی۔

''کل رات جن کو تم نے ماسٹر بیڈ میں جگہ دی تھی، وہ کہاں ہیں؟'' میں نے کہا۔

''وہ دوسری گاڑی لے کر اپنے گھر گئے ہیں۔ رات تک لوٹیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اور پھر یہیں رہیں گے، تم نے منا لیا انہیں... تھینک یو۔''

''اس گھر پر تمہارا بھی پورا حق ہے اور میں کیا غیر ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر جھوٹ کیوں بولتی ہو مجھ سے...'' میں نے کہا۔

اس کا چہرہ جیسے بجھ گیا۔ ''جھوٹ؟''

''ہاں، تم نے ابھی کہا تھا کہ ناشتا تم نے بنایا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بگڑ گئی۔ ''اس میں کیا جھوٹ ہے جی؟''

''یہ آملیٹ تجربہ کار باورچی بنا سکتے ہیں اور یہ پراٹھے...''

اس کا چہرہ یوں روشن ہوا جیسے ٹمٹماتا بلب پوری وولٹیج پر ہوتا ہے۔ ''جناب آپ کو کیا پتا... میں کیسی ایکسپرٹ کک ہوں اور اپنے گھر میں بھی ناشتا میں بناتی تھی۔ آملیٹ میری خصوصیت تھی۔ خود مراد کہتا تھا کہ مجھے سکھا دو مگر تمہارے ہاتھ کا مزہ تو پھر بھی نہیں ہوگا، آج بہت عرصے بعد دل چاہا۔''

''آج بہت کچھ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔

اس کی حیران سوالیہ نظر اٹھی۔ ''بہت کچھ کیا؟''

''مثلاً ایک مختلف روبی...'' میں نے کہا۔

وہ انجان بن گئی مگر اس کے رخساروں پر جھلکنے والی لالی نے میری تائید کر دی۔ ''میں کچھ نہیں۔''

''میں تمہارا یہ انداز دیکھنے کا عادی نہیں تھا اس لیے جب صبح تم میرے سامنے آئیں تو...'' میں اس سے نظر ملائے بغیر کھانے میں مصروف رہا۔

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''تو...؟ اچھا نہیں لگا تمہیں؟''

''بہت اچھا لگا۔ میری بات کا غلط مطلب نہ لینا... کوئی ایک کباڑ خانے جیسے گھر کے ماحول میں رہتا ہو جو بے ترتیب ہو گندا ہو، جس کی ہر چیز میلی اور فرسودہ ہو، اندر اندھیرا ہو اور جو ہو... اور اچانک کسی دن وہ گھر میں قدم رکھے تو لگے کہ میں غلط گھر میں آ گیا، دیواروں پر نیا رنگ ہو،

قالین، پردے، فرنیچر سب بدل گئے ہوں۔ روشنی ہو، اور ہوا میں فرحت بخش مہک ہو تو وہ بے یقینی سے دم بخود رہ جائے گا تو ایسا ہی صبح میرے ساتھ ہوا تھا۔ جب میری نظر تم پر پڑی۔"

خوشی نے جو اس کے لبوں کی مسکراہٹ، اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کے دل کی گہرائی سے نکلی تھی، اس کو ایک جدا شانِ محبوبی عطا کردی۔ "تم بھی کمال کرتے ہو، سیدھی بات کو کیا شاعرانہ خیال بنادیا۔" وہ ہنستے ہنستے بولی۔ "ایسا کیا کیا تھا میں نے، کپڑے ہی تو بدلے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کپڑے تم پہلے بھی بدلتی تھیں۔ روپ نہیں بدلتی تھیں۔ آج مجھے لباس میں آرائشِ حسن کا اہتمام نظر آیا۔"

وہ کچھ سنجیدہ ہوئی۔ "کیا اس کا حق چھن گیا ہے مجھ سے، ہمیشہ کے لیے... میری عمر کہاں رہی ایسا نظر آنے کی؟ میک اپ اور فیشن کرنے کی... کیونکہ تقدیر کے ایک فیصلے نے، ایک حادثے نے مجھ سے محبت چھین لی ہے۔ میرا سہاگ چھین لیا ہے۔ خوش رہنے کا حق چھین لیا ہے ہمیشہ کے لیے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"روبی پلیز... ایسا کیوں سمجھتی ہو تم...؟"

"میں نہیں سمجھتی، یہ دنیا سمجھتی ہے اور یہی مجھے سمجھانا چاہتی ہے زبردستی... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سب لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ محبت کی تھی میں نے تو بڑا جرم کیا تھا، گناہ کیا تھا۔ ماں باپ کی عزت کا خون کرنے والی لڑکی ہوں میں اور یہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے جو مجھے تمام عمر بھگتنی چاہیے۔"

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری ایک بات بارود میں چنگاری بن جائے گی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف گیا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ "خدا کے لیے خود کو سنبھالو روبی۔" میں نے اسے باہر لاؤنج میں لا کے صوفے پر بٹھایا۔

"تمہیں تم بتاؤ مجھے... اس عمر میں دنیا تج دوں، جوگن بن جاؤں... میں کیا بتاؤں کسی کو کہ مجھے مراد سے کتنی محبت تھی۔ سچ سچ جان کی بازی لگائی تھی میں نے۔ کتنا ظلم کیا قسمت نے میرے ساتھ... لیکن اس کے بغیر جینا پڑ رہا ہے تو میں اپنی زندگی کو سزا بنالوں، خوشی کو ہمیشہ کے لیے خود پر حرام کرلوں... ایک پوری عمر رو رو کے کاٹوں، لوگوں کی لعنت برساتی نظروں کا سامنا کرتے، دکھ اٹھاتے، روتے، اس سے بہتر نہیں کہ میں بھی مر جاؤں، جینے کا گناہ ہی نہ کروں۔"

میں نے اسے ایک گھونٹ پانی پلایا اور وہ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتی گئی۔ "کیوں خود کو اذیت دیتی ہو روبی؟" میں نے کہا۔

"کیسے نکلوں میں اس اذیت کے احساس سے، مجھے تو خوش ہونا، ہنسنا مسکرانا بھی جرم لگتا ہے اپنا۔"

"ایسا نہیں ہے۔ تم بڑی باہمت لڑکی ہو اور تمہیں اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہے۔ یہ تو ہندو تھے جو بیوہ کو شوہر کے ساتھ جل مرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ورنہ خود جلا دیتے تھے۔ آج بھی بیوہ کا دوسری شادی کرنا جرم ہے۔ اسلام کی تعلیمات تو اس کے برعکس ہیں... کم آن... اپنے دل سے یہ خیال نکال دو کہ تم نے کوئی غلطی کی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی بھی نہیں جو تمہیں سپورٹ نہ کرے... انور بہت روشن خیال پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

آہستہ آہستہ میری باتوں نے اثر کیا اور اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ "تھینک یو... مجھے بڑا حوصلہ ملا۔"

"تو پھر جلدی سے اٹھو اور فریش ہو جاؤ۔ ویسی ہی جیسی کچھ دیر پہلے تھیں ورنہ ابھی دولہا دلہن آگئے تو سمجھیں گے کہ میں نے رُلایا ہے تمہیں..."

وہ مسکراتی اٹھی۔ "رُلایا تو تم نے ہی تھا۔"

"میں تو ہمیشہ ہنستا دیکھنا چاہتا ہوں تمہیں... اچھا ہوا جو آنسو جمع تھے، نکل گئے۔"

اس کے جانے کے بعد میں صوفے پر نیم دراز خلا میں دیکھتا رہا اور اس نئی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بے شک اچھا نظر آنے کی خواہش رکھنا ہر عورت کی جبلت میں شامل ہے اور اس کا حق ہے اور عورت اگر روبی جیسی بائیس برس کی نوجوان لڑکی ہو، جو خوب جانتی ہو کہ اسے حسن کی دولت سے مالا مال کرنے میں قدرت نے کیسی فیاضی سے کام لیا ہے جو ہر آنکھ کے آئینے میں اپنے حسن و شباب کی قوتِ تسخیر دیکھ لیتی ہو، وہ کیوں نہ چاہے گی کہ اس جادو سے ساری دنیا کو اپنے قدموں میں جھکا دے اور دلکش ملبوس... میک اپ اور زیور کو اپنا اسلحہ بنانے کو وہ اپنا حق سمجھتی ہے نقلی موتیوں سے، ہیرے جواہرات تک جدید ترین فیشن... جوتے، ہینڈ بیگ، کاسمیٹکس، سترہ سال سے ستر سال تک کی عورت کی ضرورت ہیں۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ آخر میں خود کو دلائل کیوں دے رہا ہوں۔ جب روبی میرے سامنے تھی تو وہ سب کہتا

ایک ضرورت بن گیا تھا جو میں نے کہا۔ یہ اعتراف کرنے میں کوئی خرابی نہ تھی کہ وہ حسین تھی تو مجھے بھی حسین لگتی تھی۔ مگر میں اپنے آپ سے ڈر گیا جب اچانک ایک سوال نے سانپ کی طرح میرے دماغ میں سر اٹھایا کہ کیا روبی نے جانتے بوجھتے یا لاشعوری طور پر... یہ سب مجھے متوجہ کرنے کے لیے کیا تھا؟ یہ سادگی میں پُرکاری کا انداز... صبح دم مجھے جلوۂ حسن کے نئے انداز سے مبہوت کر دینا۔ مجھے سرخ گلاب کے ساتھ زندگی کے ایک نئے دن، ایک نئے جذبے، ایک نئے احساس سے حیران کرنا... کیا یہ کچھ بتانے کی کوشش تھی؟ خود میرے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنانا، مجھے شریکِ راز کرنا کہ وہ لوٹ کے اس زندگی کی طرف آنا چاہتی ہے جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ میں اس کی مدد کروں، اسے سپورٹ کروں، اس کا ساتھ دوں۔

اوہ مائی گاڈ، میں نے خود کو احساسِ جرم و گناہ کے حصار میں دیکھا۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں؟ ابھی تو مراد کی موت کو ایک سال بھی نہیں گزرا، وہ مراد سے محبت کرتی تھی۔ اس حد تک کہ مراد کے لیے اس نے اپنا گھر، گھر کی عزت آبرو، اپنی جان سب کچھ داؤ پر لگایا تھا۔ کسی کے جذبات اتنی جلدی کیسے بدل سکتے ہیں؟ میں کتنا غلط سوچ رہا ہوں۔

روبی کے لوٹ کر آنے سے پہلے انور نمودار ہوا۔ ”حد ہوگئی یار، دس بج گئے... سوا دس... رات اتنی دیر ہوگئی تھی سوتے سوتے... اتنا کام تھا آج...“

”میں خود بہت پہلے نکل جاتا۔ استاد اور بھابی نکل گئے اپنا اسباب لانے اور ملازم آئے نہیں تو ناشتا روبی کو بنانا پڑا۔ اب گاڑی بھی ایک ہی ہے۔“ میں نے کہا۔

انور نے افراتفری میں ناشتا کیا جو اس کی بیوی نے بنایا۔ اس دوران انور نے ڈاکٹر محسن کو کال کی اور سکندر شاہ کی خیریت لی۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی جب ان دونوں نے روبی کے بدلے ہوئے انداز پر نہ توجہ دی نہ اس پر تبصرہ کیا۔ وہ خود بھی ایسے پھرتی رہی جیسے گزرے ہوئے ایک گھنٹے میں کچھ بھی خلافِ معمول نہیں ہوا تھا۔ یہ ہر روز جیسی ایک صبح تھی جس میں ہم وہی باتیں کرتے رہے جو ہماری زندگی کے معمولات اور مسائل کی باتیں تھیں۔ میں پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس کا رویّہ ایسا کیوں تھا؟ صرف ایک بار اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اس کے اور میرے درمیان ایک معاہدہ طے پا چکا ہے کہ ہم آپس کی بات کو کسی کے سامنے نہیں کریں گے۔ اسے مجھ پر بھروسا ہے کہ میں اس کا بھرم رکھوں گا۔ اس نے اپنی کمزوری کا اظہار مجھ پر جس اعتماد کے ساتھ کیا تھا، وہ اعتماد مجروح نہیں ہوگا۔ لوٹ کر خوشی کی خوب صورت زندگی کی طرف جانے کی خواہش اس کا جرم نہ بن جائے جس کا اظہار اس نے میرے سامنے کر دیا تھا۔

میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ روبی کے ساتھ میں بھی مجرم بن رہا ہوں۔ اگر روبی اپنی خواہش میں غلط نہ تھی تو پھر ریشم اور انور سے چھپانا کیسا۔ اب تک جو اعتماد کی دیوار تھی اب اس کی جگہ آزادی آ گئی ہے۔ میں روبی کے ساتھ ایک طرف ہوں اور یہ بات ابھی تک ریشم اور انور کو نہیں معلوم... نہیں، میں نے طے کیا میں انور کو بھی بتا دوں گا کہ روبی نے آج صبح کیسے بی ہیو کیا تھا۔ وہ نہ اسے غلط کہہ سکتا ہے نہ مجھے... اگر یہ روبی کا جذباتی مسئلہ ہے تو دیگر مسائل کی طرح ہم اسے بھی حل کر سکتے ہیں۔

انور نے گاڑی روک کے کہا۔ ”کس چکر میں ہے تو، کیا سوچ رہا ہے؟“

میں چونکا۔ ”کوئی بات نہیں ایسی تو...“

”یعنی ہے، ورنہ تو انکار نہ کرتا، تو نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا، کان تو ٹھیک ہیں تیرے؟“

میں نے کہا۔ ”انور! نادر شاہ کی دی ہوئی مہلت تمام ہو رہی ہے۔ ابھی تک اس نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”وہ اصولی آدمی لگتا ہے۔“ انور تلخی سے بولا۔ ”تین دن بعد پھر اٹھوا لے گا ہمیں۔“

”اس کے بعد ہماری زندگی کے راستے الگ ہو جائیں گے؟“

”ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہی کہانی دہرائی جائے گی۔ ایک پیر صاحب اور ایک بلڈر کی۔ نام بدل جائیں گے، پیر اظہر کی جگہ ملک سلیم اختر، سکندر شاہ کی جگہ انور شاہ...“ وہ گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔

اگلے دو دن میری اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے تعمیراتی منصوبے کا آغاز کر چکا تھا۔ یہ اس کی مرضی اور پسند کا کام تھا۔ میں نے گھوم پھر کے سائن بورڈ لگانے والوں کے کام کی نگرانی کی اور انہیں ہدایات دیتا رہا پھر مراد نگر کے آفس میں بیٹھ کے سارا دن راج مزدور سے انجینئرز تک کے انٹرویو لیے... اس کی خواہش کے مطابق اسے زیادہ تر پرانے لوگ مل گئے جو مراد نگر کے پروجیکٹ میں شریک تھے۔ ان کا انتخاب بھی مشکل نہ تھا اور انہیں اپنے اپنے فرائض کی نوعیت سمجھانا بھی... آنے والے دنوں میں انور

کی مصروفیت میں کئی گنا اضافہ یقینی تھا۔

میرا دوسرا دن زیادہ کڑی آزمائش ثابت ہوا۔ مرید اور عقیدت مند مجھے جلوس کی صورت میں نعرے لگاتے ہوئے درگاہ سے ملحق مسجد تک لے گئے اور تخت نشیں کر دیا۔ یہ تخت نہ جانے کون کہاں سے لایا تھا۔ اس پر قالین بچھا کے ایک گاؤ تکیہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ اگر مجھے ایک مقصد میں کامیابی عزیز ہے تو یہ رول نبھانا ضروری ہوگا۔ مستقبل کے بارے میں اچھی قیاس آرائی بھی ناممکن تھی۔ مجھے تو نادر شاہ کو اور اس کے مذموم کاروبار کو ختم کرنے کا منصوبہ ہمالیہ پہاڑ کو سر کرنے سے زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب میں دریا میں اتر چکا تھا تو موجوں کا سامنا بھی کرنا تھا یا پار اترنا تھا یا ڈوب جانا تھا۔

رفتہ رفتہ گرد و نواح کے دیہات سے عورتوں، مردوں نے حاضری دینا شروع کی۔ رواج کے مطابق وہ قدم بوسی کرتے مگر میں نے انہیں روک دیا اور ہاتھ چومنے کی اجازت بھی مجبوراً دی۔ وہ سب حاجت مند تھے اور ان کے مسائل بھی پرانے تھے۔ سرفہرست اولاد کی خواہش تھی اور اس میں بھی اولاد نرینہ کی خواہش کسی شرط کی طرح نظر آتی تھی۔ باقی گھریلو جھگڑے تھے۔ شوہر کی بدسلوکی، ساس کے مظالم، اولاد کی نافرمانی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کام کتنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ میں تو ہر ایک کے لیے صدقِ دل سے دعا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دم درود یا نقش تعویذ کیسے دیتا۔

مجھے تمام دن پیر اکبر شاہ کے خاص معاونوں کا انتظار رہا لیکن ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا، یا آیا تو میں اسے شناخت کرنے سے قاصر رہا۔ میرے سامنے پرانے نوٹوں، چاندی کے زیورات اور سکوں کا ایک ڈھیر جمع ہوتا گیا۔ میں نے یہ مسجد کے پیش امام کے حوالے کیا کہ اسے چندے کے باکس میں ڈال دیں۔ وہ ان سے زیادہ خوش ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ عام لوگ مجھ سے کچھ مایوس تھے اور کیوں نہ ہوتے پیر اکبر علی شاہ کے مقابلے میں میری پرفارمنس صفر تھی۔ میں نے درگاہ میں روبی کے والد کو ایک مکمل کامیاب پیر کا بہترین کردار ادا کرتے دیکھا تھا جو میرے لیے کتنا ہی قابلِ نفرت کیوں نہ ہو عام لوگوں کے لیے مثالی تھا۔ ویسا بننے کے لیے مجھے طویل تجربے اور راہنمائی کی ضرورت تھی۔ راہنمائی مجھے وہی فراہم کر سکتے تھے جو اس کاروبار میں پیر سائیں کے معاون تھے۔

آخر وہ سب ابھی تک سامنے کیوں نہیں آئے جو اس منافع بخش کاروبار میں پیر سائیں کے پارٹنر تھے؟ یہ سوال میرے لیے پریشانی کا سبب بن رہا تھا۔ ایک مکمل کامیاب درگاہ کو چلانے کے لیے انہی ماہرین کا تعاون ضروری تھا۔ وہ ایک بہت بڑے بزنس میں اپنے اپنے شعبے کے ماہر تھے اور درگاہ کسی فیکٹری کی طرح چلتی تھی۔ فیکٹری کا مالک نہ رہے تو کاروبار ختم نہیں ہوتا، عارضی طور پر بند ہو جائے تو پھر شروع ہو جاتا ہے۔ وارث یا نئے مالک کی جگہ ضرور بدلتی ہے۔ باقی سب کچھ وہی رہتا ہے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔

میرے اندازے غلط ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ نادر شاہ تک خبر پہنچے گی تو پرانے پارٹنرز آ جائیں گے یا وہ مجھے بلا لے گا۔ مجھے پورا بھروسا تھا کہ گدی نشین کی حیثیت سے وہ میرا بہترین استعمال کرے گا اور میں نے قدم جما لیے اور اس کا اعتماد حاصل کر لیا تو نادر شاہ کو اس کے مذموم کاروبار سمیت تباہ کرنے کا خواب پورا ہو جائے گا۔

ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ سب دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ نادر شاہ بھی، رانا بھی اور اس کے دیگر شریک بھی۔ ان کو یقین ہوگا کہ میرا ڈراما چند روز میں ہی فلاپ ہو جائے گا اور اس کے بعد سب اسی طرح ہوگا جیسے تھا۔ مگر پہلے سے زیادہ اختیارات کے ساتھ... مجھے نہ اندازہ تھا نہ علم کہ پیر سائیں کے ساتھ نادر شاہ کا الحاق کب سے تھا، ان کے درمیان کس قسم کی پارٹنرشپ تھی اور کیسے چل رہی تھی۔ مجھے اس کے اسرار اور موز وہی لوگ سمجھا سکتے تھے جو عملی طور پر پیر سائیں کے معاون تھے۔ میرا ٹارگٹ نادر شاہ تھا۔ گزشتہ رات استاد گامارستم کی آمد نے مجھے بہت پُرامید کر دیا تھا کہ اب مجھے اس کے پرانے وفاداروں کی طاقت بھی حاصل ہو جائے گی۔ بے وقوفی میری خوش فہمی تھی۔ جنگ کی حکمتِ عملی میں کوئی منصوبہ بناتے وقت دشمن کی جوابی کارروائی کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ میں نادر شاہ کے ذہن کی سوچ کا اندازہ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ کسی خرابی کے بغیر محض دھمکی سے درگاہ کی تعمیر تو میں روبی کی رضامندی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہتی اور انکار کرتی تو نادر شاہ خاموشی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پیری مریدی کا اڈا کسی دشواری کے بغیر حاصل ہو گیا ہے وہ اپنے پلان پر چل رہا تھا جس میں میرا عمل دخل کہیں نہ تھا۔

روبی کے گھر میں قیام کے دوران میں نے مریدوں کی باریابی کے اوقات ظہر سے مغرب تک دیکھے تھے۔ باقی وقت وہ حساب کتاب میں، دیگر انتظامی امور کی نگرانی اور ذاتی مصروفیت میں گھر کے اندر گزارتے تھے۔ اندھیرا

پھیلنے سے پہلے ہی انور نمودار ہو گیا۔ میں نمازِ مغرب پڑھ چکا تھا۔ ہارن کی آواز پر باہر آ کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کیسا رہا آج کا دن پیر سائیں؟'' وہ بولا۔

''بہت بُرا۔''

''کیوں؟ مرید نہیں آئے یا نذرانے کم ملے؟'' وہ ہنسا۔

''میرا شو فلاپ رہا۔ میری پرفارمنس نے لوگوں کو مایوس کیا۔ پیری فقیری میں روبی کے ابا پی ایچ ڈی تھے۔ میں میٹرک پاس بھی نہیں۔''

''یہ پہلے نہیں سوچا تھا نورِ چشم... کام کوئی آسان نہیں ہوتا۔''

''دراصل مجھے امید تھی کہ پرانے معاونین خصوصی میرے گرد جمع ہو جائیں گے اور کاروبار کو سنبھال لیں گے۔ ان کی تعداد بارہ تھی اور ان میں رانا بھی شامل تھا۔ مجھے ان میں سے کسی کی شکل نظر نہیں آئی۔ ان کے بغیر یہ سیٹ اپ نہیں چل سکتا۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے پیر سائیں کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ وہ تجھے گدی نشیں تسلیم کرنے پر تیار نہیں، اس وقت مجبوری میں خاموش رہے تھے۔''

''اب نادر شاہ میری حمایت کرے تو پرانا سیٹ اپ بحال ہو سکتا ہے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ میں اس کا اعتماد حاصل کر لوں گا۔ خیر تو چھوڑ، تو نے سارا دن اپنے پروجیکٹ کو کتنا آگے بڑھایا؟''

وہ بہت پُرجوش تھا۔ ''زبردست رسپانس آیا اشتہار کا۔ زیادہ تر پرانے لوگ آ گئے اور انہوں نے کہا کہ پریشانی کی بات ہی نہیں۔ جو وہ سب کر چکے ہیں پھر کریں گے۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے لیے سب کے معاوضے دگنے کر دیے۔ کل سے وہ مراد نگر والے پروجیکٹ آفس میں اپنی اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں گے۔''

''تجھے کسی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا؟''

''ملک صاحب! دنیا کے بازار میں وفاداریاں بھی خریدی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی طاقت ہے سکہ رائج الوقت کی۔ پھر اعتماد ملتا ہے اچھے سلوک سے۔ سکندر شاہ کے مقابلے میں وہ میرے زیادہ وفادار ہوں گے جس کا ساتھ وہ خوف اور دباؤ سے دیتے تھے۔'' اس نے کئی جگہ گاڑی روک کے مجھے وہ کام دکھایا جو کسی حد تک شروع ہو گیا تھا۔ یہ سائن بورڈز کے لیے منتخب ہونے والی سائٹس تھیں۔

''کیا مقامِ عبرت ہے کہ جس نے پروجیکٹ کی گڈول بنائی، وہ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا سے لاتعلق ہے۔ حالانکہ اس کامیابی میں اس کی ہمت اور طاقت کے ساتھ ذہانت بھی شامل تھی۔'' میں نے کہا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے اسے... مکافاتِ عمل کے سوا مگر مجھے بھی افسوس ضرور ہے کہ اتنی محنت اور کامیابی کے بعد جب خوشیاں سمیٹنے کا وقت آیا تو قدرت نے سب کچھ چھین لیا۔''

میں نے کہا۔ ''خدا کرے، وہ صحت یاب ہو کے اس گھر میں لوٹ آئے جو کبھی اس کا تھا۔''

مراد ہاؤس کی رونقیں بحال ہو گئی تھیں لیکن اس کے مکین بدل گئے تھے۔ مجھے یہ تقدیر کا بڑا بے رحم فیصلہ لگا کہ جس سکندر شاہ کی طاقت سے خوف زدہ ہو کے گاما جیسا شخص روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا آج وہ بے خوفی سے اسی کے گھر میں مقیم تھا۔ ہم سب کی طرح وہ اکیلا تھا۔ ریشم یا میں، انور یا روبی اکیلے رہ گئے تھے اور گردشِ حالات نے ہمیں ایک مرکز پر اکٹھا کر دیا تھا۔ استاد نے گھر تو بنایا تھا مگر رشتوں سے محرومی کا احساس برقرار تھا۔ ہمارے تھوڑے سے اصرار پر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

مجھے گھر کے اندر غیر معمولی چہل پہل محسوس ہوئی۔ پہلی رات گھر کے ماسٹر بیڈ روم میں گزار لینے کے بعد استاد نے اس کمرے کو مستقل رہائش کے لیے استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر کی مالکن اب روبی تھی۔ مراد ہوتا تو ماسٹر بیڈ پر ان کا حق ہوتا۔ وہ اکیلی نیچے رہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ گیسٹ بیڈ روم پہلے انور کے پاس تھا۔ وہ اب ریشم کے ساتھ اوپر شفٹ کر گیا تھا۔ اوپر کا دوسرا بیڈ روم روبی کے اور تیسرا میرے پاس تھا۔ ایک نئے انتظامی عمل کے نتیجے میں سکندر شاہ والا ماسٹر بیڈ روم انور کو قبول کرنا پڑا۔ وہ ریشم کے ساتھ نیچے شفٹ ہوا تو اوپر کے بیڈ روم کو استاد نے قبول کر لیا۔

ایک طرف ضرورت کے مطابق اسباب کی منتقلی جاری تھی۔ یہ کام روبی اپنی نگرانی میں کرا رہی تھی اور اس کے لیے وہی ملازم طلب کیے گئے تھے جو دستیاب تھے۔ یعنی دو ڈرائیور اور دو گارڈ۔ کچن چلانے والی خالہ اور ان کے میاں صحت یاب ہو چکے تھے مگر انہیں فی الحال پیچھے کی طرف اپنے کوارٹر میں محدود کر دیا گیا تھا۔ کچن ایڈمنسٹریشن کو بھابی کی سربراہی میں ریشم نے سنبھالا تھا کیونکہ یہ اخلاقی طور

پر اب ریشم ہی کی ذمے داری تھی۔ بھابی اپنی عمر اور تجربے کی بدولت سربراہی پر فائز کردی گئی تھی اور بہت خوش تھی۔ کچن میں روزمرہ سے زیادہ ایکٹیویٹی ظاہر کرتی تھی کہ رات کا عام کھانا نہیں ہوگا خصوصی دعوت کا اہتمام ہوگا۔

استاد انتہائی پُرسکون لاتعلقی کے انداز میں اکیلا لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں وہ اجنبی نہیں اور اپنے معمول پر کاربند ہے۔ چائے کا ایک مگ اس کے سامنے دھرا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ٹی وی بند کردیا۔

''آجا مُنّا... چائے پیے گا؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے یہ اس پر واجب تھا اور پھر میری رضامندی سے بغیر پیچھے کھڑی روبی سے بولا۔ ''بھئی اس غریب کو بھی پوچھ لو چائے کا۔''

روبی مسکرائی۔ ''غریب کافی پیتا ہے، ابھی آجاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''استاد! مجھے یہ خواب جیسا سین لگتا ہے۔ اس گھر کا یوں آباد ہونا۔''

''یقین مجھے بھی نہیں آیا ابھی تک۔ گھر تو بسا لیا تھا گھر والی بھی تھی مگر اور کچھ نہیں تھا۔'' وہ بولا۔ ''مجھے یاد ہے کہ سب کی طرح ایک خاندان میرا بھی تھا۔ جیسے تیرا تھا، سب کا ہوتا ہے لیکن اس کے بعد سے آج تک میں صرف خواب ہی دیکھتا رہا۔''

''خاندان ایسے تو بن جاتے... ایک عمر لگتی ہے۔''

''مگر میری تو خواب سے آنکھ کھلی ایک دن... تو گھر ہی نہیں خاندان بھی تھا۔ وہ خواب جاری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فکر مت کرو استاد! یہ خواب نہیں اس کی تعبیر ہے۔''

''یہ سب تو نے دیا مجھے... میں تو تیرے سوا کسی سے واقف نہیں تھا۔ تو نے مجھے سب رشتوں سے جوڑ دیا۔''

روبی نے کافی کا مگ میرے سامنے رکھا اور پھر کسی کام سے اوپر چلی گئی۔ میں نے کہا۔ ''اب میں کہوں کہ نہیں... یہ سب جسے تم میرا کہہ رہے ہو، دراصل تم نے ہی مجھے دیا تھا۔ سب اس زندگی کے ساتھ ملا جو تم نے بچائی تھی۔ ورنہ میں تو مٹی میں مل کے مٹی ہوگیا ہوتا۔''

اس نے کانوں کو توبہ کے انداز میں ہاتھ لگائے۔ ''کیسی باتیں کرتا ہے تو... زندگی خدا کو منظور نہ ہوتی تو میں اور تو اس رات محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے جس رات جیل سے فرار ہوئے تھے اور بھی تو تھے ہمارے ساتھ نکلنے والے... کتنے مارے گئے اُن میں سے... کتنے پھر پکڑے گئے اور دو کا مجھے پتا ہے۔ ان کو پھانسی ہوچکی مگر ہم زندہ ہیں اور محفوظ بیٹھے ہیں یہاں... یہ میری تیری مرضی یا چالاکی نہیں، بس اوپر والا نہ جانے کیوں مجھ گنہگار پر مہربان ہے ابھی تک۔''

''تمہیں یاد ہے وہ رات؟ دیکھو وقت نے ہمیں کہاں لا کے اکٹھا کردیا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا سکندر نے مجھے احساس دلایا تھا کہ میرے ماضی کا آسیب ابھی تک میرا پیچھا کررہا ہے اور میرے نام یا کام بدل لینے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ تو نے میری مدد کی اور میں پھر روپوش ہوگیا۔''

''تمہاری جگہ ہوتا میں تو بہت دور بھاگ جاتا۔ جہاں اس کا خیال بھی مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''اب میں سچ بتاؤں تجھے... یہ تو بہت آسان تھا لیکن میرا دماغ وہ نہیں ہے جو تیرا دماغ... یہاں سے نکل جانے کے بعد مجھے غصہ تھا کہ سکندر نے میری مجبوری نے فائدہ اٹھایا آخر وہ کیا سمجھتا ہے مجھے، اس کی وجہ سے میں یہ شہر یا ملک چھوڑ کے بھاگ جاؤں... اس ڈر سے کہ کہیں وہ پھر مجھے استعمال نہ کرے۔''

''تم نے کہا کہ تم جانا نہیں چاہتے تھے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ میری گھر والی بھی ڈرتی تھی کہ نئی جگہ جا کے ہم کیسے رہیں گے۔ تو میں نے سوچا کہ ایسی کی تیسی سکندر کی... کیا میں اتنا بزدل ہوگیا ہوں پھر میں نے طے کیا تھا کہ...''

''کیا طے کیا تھا؟'' میں نے اس کو خاموش پا کے پوچھا۔

''یہی... کہ میں خطرے سے کیوں بھاگوں، گھر میں سانپ ہو تو کیا آدمی گھر چھوڑ جاتا ہے نہیں، وہ سانپ کو مار دیتا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تم نے سکندر کو ختم کرنے کا سوچا تھا؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''یہ بات کوئی نہیں جانتا... میری بیوی بھی نہیں۔ میں نے سوچا کہ سکندر نے آخری بار کی بات کی اور میں اتنی بڑی واردات کرنے پر راضی ہوگیا۔ مجھے ہونا پڑا تھا۔ آخری واردات کا فیصلہ میں بہت پہلے کرچکا تھا اور اس پر قائم بھی تھا۔ اب میں اپنے آپ سے اور خدا سے کیے عہد پر قائم نہ رہ سکا تو قصور میرا نہیں، سکندر شاہ کا تھا۔ سزا اسے ملنی ہی چاہیے۔ اس کے ڈر سے میں کیوں بھاگوں، اس جیسے بڑے بڑے پاٹے خاں کے سالے میرے نام سے کانپتے تھے۔ کیا میں اتنا بزدل ہو گیا ہوں۔ بس یہ خیال آنے کے بعد میں نے سوچا کہ آخری

واردات کا فیصلہ میں کرتا ہوں۔ میں خطرے سے نہیں بھاگتا خطرے کو مٹا دیتا ہوں۔"

"تم نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اے آہستہ... ورنہ گھر والی کہے گی کہ مجھ سے بھی چھپایا... اسے بتاتا تو وہ کہتی کہ نہیں... قاتل بننے سے بہتر ہے تم بزدل بن جاؤ۔ وہ مجھے اس جگہ سے بہت دور لے جاتی۔ میں اس سے بھی سخت خفا تھا اور خود سے بھی۔ لیکن پہلے مجھے پتا چلا کہ اس کا بیٹا حادثے میں مر گیا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے تجھے اور انور کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس سے مجھے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ دوبارہ مجھے بلیک میل نہیں کرسکتا پھر جیسا میں نے بتایا ہم عمرہ ادا کرنے چلے گئے اور چالیس دن وہاں رہے۔ واپس آئے تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ انور کی حویلی بھی جل گئی تھی اور سکندر شاہ کی بیوی کو بیٹے کی موت کا غم لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اللہ معاف کرے، مجھے لگا کہ وہ خود قدرت کے انتقام کا شکار ہو رہا ہے۔ بیوی کے مرنے کے بعد خود اس کا دماغ چل گیا۔"

"تم سارے حالات سے باخبر تھے؟"

"یہ ضروری تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ پاگل خانے پہنچ گیا ہے اور اب اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تو میں نے انور سے فون پر بات کی۔ تیری بھابی اس کی شادی طے کرانے کے بعد چلی گئی تھی۔ اسے جانا پڑا ورنہ وہ اپنے ارمان نکالتی۔ اس نے بار بار کہا کہ پوچھو ریشم کہاں ہے اور جب معلوم ہوا تو اس نے دیر نہیں لگائی۔ یہاں آئے تو معاملہ الٹا ہو گیا۔ ہم واپس نہ جا سکے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ میں تیری وجہ سے اور تیری بھابی ریشم کی وجہ سے... آگے کا اللہ مالک ہے۔"

اس رات کھانے کی میز پر ہم سب جمع تھے۔ میں نے گھر کی تینوں خواتین کو پورے اہتمام کے ساتھ کھانے کی میز پر دیکھا۔ انہوں نے بہترین فیشن کے بیش قیمت لباس زیب تن کیے تھے۔ کسی شادی جیسی تقریب کا میک اپ کیا تھا اور خود کو بیش قیمت زیورات سے سجایا تھا اور وہ اس دعوت میں جو عام کھانا تھا، بڑے اہتمام سے شریک تھیں۔ ریشم یا استاد کی بیوی کے لیے خوشی منانے اور خوش ہونے کا جواز تھا۔ حیرانی مجھے روبی پر تھی جو زندگی کے سب سے بڑے حادثے کا غم بھولی ہوئی تھی۔ یہ میرے لیے انوکھا تجربہ تھا۔ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور تھا۔ کیا اتنی جلدی وہ اپنے محبوب شوہر سے جدائی کے صدمے کو بھلا چکی ہے؟ ایسا نہ فلموں یا کہانیوں میں ہوتا ہے اور نہ حقیقی زندگی میں... بے شک وقت سارے زخم مندمل کر دیتا ہے لیکن اس میں کبھی ایک عمر بھی گزر جاتی ہے۔

پھر یہ کیا رویہ تھا جس کا مظاہرہ روبی سب کے سامنے برملا کر رہی تھی؟ پہلے اس نے بیوگی کا ڈراما اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس پر ذمے داری کا بوجھ تھا جو غم کے بوجھ سے زیادہ تھا۔ کیا اب وہ دل کے زخم چھپا کے ہونٹوں پر ہنسی سجانے کی شعوری کوشش کر رہی تھی؟ اب کیا مجبوری تھی؟ اگر وہ اداس رہتی اور نظر آتی تو وہ زیادہ فطری نظر آتا، یقیناً یہ سوالات دوسروں کے ذہن میں بھی جاگ رہے ہوں گے کہ وہ مراد کو اتنی جلدی کیسے فراموش کر بیٹھی؟ کیا اس کی محبت ایسی ہی سطحی تھی؟ وہ اب پچھتاوے کا شکار تھی کہ اس نے محبت کے کھیل میں اپنا خاندان کھو دیا۔ ان کی عزت و آبرو کو نیلام کر دیا۔ کیا یہ اس کا پچھتاوا تھا؟

"پیر سائیں کس سوچ میں گم ہیں؟" روبی نے ہنس کے کہا۔

میں چونکا۔ "میں سب کی سن رہا تھا۔ سارا دن لوگ میری سنتے ہیں۔"

"انور نے پوچھا تھا کہ نئے منصوبے کا نام بدل کے کیا رکھا جائے؟" روبی نے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ کس کی تجویز ہے؟"

"دیکھو میری تو صرف انویسٹمنٹ ہے اور وہ بھی زمین کی حد تک... اس کے لیے تمام فنانسنگ انور کی ہے اور پروفیشنل مہارت بھی انور کی۔ نگرانی اور محنت بھی انور کی۔" روبی نے وضاحت کی۔

"میں بھی ایک پارٹنر ہوں سب کی طرح۔" انور بولا۔ "مجھے اپنا نام لگانا بالکل منظور نہیں۔"

"اچھا چلو ریشم کا نام آجائے۔ مثلاً ریشم کی بستی۔" روبی نے کہا۔

ریشم کا چہرہ خوشی کو چھپانے میں ناکام تھا مگر اس نے کہا۔ "نام کسی کا بھی نہ ہو، ہم میں سے کسی کا بھی نہیں۔"

انور کا مراد کے نام سے کیا جذباتی رشتہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت اگر ریشم کے تصور میں اس کے نام کی کوئی بستی تھی تو انور کی بیوی کے ساتھ ہونا قدرتی بات تھی۔ اس طرح دیکھا جاتا تو نہ گاما کا نہ اس کی بیوی کا اور نہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق تھا۔ جگہ فراہم کرنے والی روبی، تعمیرات کے لیے اخراجات کی فراہمی کرنے والا اور پروجیکٹ کی نگرانی کرنے والا انور، میں صرف معاون اور مشیر۔ وہ دونوں جو

چاہیں کریں۔ منصوبے میں کمی بیشی کریں یا ردوبدل... یا اسے ختم کردیں۔ نام تو مسئلہ ہی نہیں تھا اور تھا تو ان کا۔ مجھ سے پوچھا جاتا تو میرا فیصلہ یہ ہوتا کہ روبی کی مرضی مقدم ہے۔ مراد سے اسی کا جذباتی رشتہ تھا اور مراد نگر اسی کی یاد سے منسوب ہے جیسے مراد ہاؤس... لیکن روبی لاتعلق تھی اور غیر جانبدار... یہ اچنبھے کی بات تھی۔

کھانے کے بعد انتظامی نوعیت کی ایک میٹنگ تھی لیکن روبی نے پھر عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ ''بھئی یہ مالی اور تکنیکی معاملات ہیں مجھے نہ سمجھ آئیں گے اور نہ مجھے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے ہر فیصلے پر میں انگوٹھا لگادوں گی۔''

''ہم چیئرمین کی عدم دلچسپی پر مذمت کی قرارداد منظور کرتے ہیں۔''

''کام کرو کام... جس کے لیے تمہیں ملازم رکھا گیا ہے۔'' وہ بولی اور کچن میں چلی گئی جہاں سے تینوں کے ہنسنے بولنے کی آواز آتی رہی۔ انور نے مجھے بینک رپورٹس دکھائیں۔ اس کے اور روبی کے اکاؤنٹ میں نسلوں کی دولت جمع تھی۔ اس کے بارے میں گزر جانے والی نسل کا محض اندازہ ہوگا۔ یہ زمین میں دفن خزانے اس جھیل جیسے تھے جس میں ہر سال کی بارش کا تھوڑا بہت پانی جمع ہوتا رہے۔ نہ کسی کو اندازہ ہو کہ اس میں سے کتنا نکلا اور اس کی جگہ کتنا بڑھ گیا۔ پرانے وقتوں کے دفینے ایسے ہی اندھے کنوئیں تھے کہ خون پسینے کی کمائی تھی تو دوسروں کی جو خون چوسنے والوں نے ان کی خاندانی غلامی کے نتیجے میں حاصل کی۔ ان کو زمین کھاگئی اور دولت آقاؤں کے مدفون خزانے میں شامل ہوتی گئی۔ ایک دن مال وزر کو عالی شان عمارات کے پروجیکٹس میں ڈھالنے والے جائیں گے تو اس کا حجم کئی گنا بڑھ چکا ہوگا۔ اور یوم حساب ان کا جواب مختصر ہوگا۔ ہم نے کروڑوں کو اربوں میں بدلا۔ جیسے ہمارے بعد والوں نے اربوں کے کھربوں بنائے۔ بس یہی کام تھا۔ دنیا میں جو ہم نے کیا۔

انور نے فائل بند کردی۔ ''میں بکواس کیے جارہا ہوں تو نہ جانے کس کے خیال میں کھویا ہوا ہے۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''میں سب سن رہا تھا۔''

''ابھی میں سناؤں گا ایسی...''

میں نے کہا۔ ''انور! دیکھ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں... تو جو کہے گا وہ کروں گا جو معاملات واقعی ٹیکنیکل ہیں اور اس میں یو آر دی باس... کسی اور کو کیا معلوم کہ اینٹ سیدھی الٹی کس طرف سے ہوتی ہے۔''

''تیری کوئی ذمے داری نہیں؟'' وہ خفگی سے بولا۔

''میری ذمے داری اتنی ہی ہے جتنی مجھے دی جائے۔ انتظامی، مالی، اخلاقی۔''

''نہیں۔ تو اپنے چکر میں ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ نورین کے بارے میں مصدقہ اطلاع مل گئی ورنہ تیرا دماغ ٹھکانے نہ آتا' سوتے جاگتے اس کے خواب دیکھتا اور دورے پڑتے رہتے اس کی تلاش میں دنیا کی خاک چھاننے کے۔''

''اس بات کو چھوڑ جو تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔''

''اب نادر شاہ سے انتقام کا جنون ہے اور اس کے لیے تو جو راستہ اختیار کررہا ہے وہ چڑیا کے شکار والا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کون سی چڑیا کا شکار...؟''

''والد صاحب شکاری تھے نا... میں ضد کرتا تھا کہ ساتھ جاؤں گا اور شیر کو ماروں گا۔ میرے خیال میں شیر کو مارنا ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی ملازم کو مارتے تھے یا ایک بار مجھے بھی مارا تھا جب میں نے الماری پر چڑھ کے اور نشانہ لے کر پیشاب کیا تو سیدھا ان کے حقے کی چلم میں... سونے کی چلم تھی آگ بجھ گئی پھر انگارے پڑ جاتے مگر چلم ناپاک ہوگئی اور دوسری بنوانا پڑی۔ تو میرے نزدیک نشانہ لینا بھی یہ تھا۔ ان کے ایک شکاری دوست نے جو کوئی پولیس افسر تھے یا ڈی سی وغیرہ... میری بات سنی تو کہنے لگے کہ اچھا آج تم چڑیا کا شکار کرلو گے تو کل تمہیں بھی شیر کا شکار کرنے لے جائیں گے۔'' وہ بات کرتے کرتے ہنستا رہا۔

''پھر... کیا تھا ان کا طریقہ...''

''انہوں نے کہا کہ یہ لو موم بتی... جب چڑیا صحن میں آئے اور دانہ چگ رہی ہو تو دبے پاؤں پیچھے سے جاؤ اور اس کے پروں پر موم رکھ دو۔ دھوپ میں موم پگھل کے چڑیا کے پروں پر پھیلے گی وہ اڑنے کی کوشش کرے گی تو دھڑام سے گرے گی... بس شکار کرلو اس کا۔''

مجھے بھی ہنسی آئی۔ ''میں بھی ایسا ہی کررہا ہوں کیا؟''

''اس سے بھی بڑی بے وقوفی... میں حیران ہوں کہ تیری عقل ٹخنوں میں جاتے جاتے راستے میں کہیں اور سے نکل گئی۔''

میں نے کہا۔ ''عقل تھی کہاں میرے پاس۔''

''تھی، ماری گئی۔ پہلے نورین کے لیے... اس کے بعد اب نادر شاہ کے پیچھے... دیکھ پاگل مت بن، دو دن میں پتا چل گیا نا کہ پیری مریدی مذاق نہیں۔ لندن میں ایک

لکھنو کا بانکا تھا جو کسی گوری کے عشق میں چرچا ہو گیا تھا۔ خود کالا سوکھا... وہ گوری چٹی لمبی چوڑی... میں مذاق اڑاتا تھا کہ یہ تیرے بس کی بات نہیں۔ میں پھنساتا ہوں اسے کالے جادو سے کیونکہ تو خود کالو ہے۔ وہ آہ بھر کے ایک شعر پڑھتا تھا کہ انور میاں عاشقی کھیل نہیں ہے جسے بچّے کھیلیں... پھٹ جاتی ہے صدمات کے سہتے سہتے... اور میں نے واقعی اسے پھنسا لیا یوں۔'' انور نے چٹکی بجائی۔

انور بہت اچھے موڈ میں تھا اور اس نے مجھے بھی ایزی کر دیا۔ ''انور! یہ نادر شاہ یہاں نظر نہ آتا تو اور بات تھی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے ہر طرف سے مجھے محصور کر لیا۔''

''میں نے بعد میں غور کیا تو اس کی باتوں میں مبالغہ محسوس ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا اپنا بھی نیٹ ورک ہے اور یہ لوگ آپس میں مکڑی کے جالے کی طرح ملے ہوتے ہیں۔ شہر سے شہر... ملک سے ملک... وہ ہوگا ڈان بھی مافیا کا اور اس کے بھی پولیس سے رشتے ہوں گے۔ کاروباری رشتے... اس نے کیسے تیرا پتا چلایا، مجھے نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے کہ یہ کسی باقاعدہ تلاش کا نتیجہ نہیں تھا اتفاق سے اس نے تجھے دیکھا اور حلیہ نام سب بدلا ہونے کے باوجود پہچان لیا۔ نظر اس کی کمزور نہیں ہو سکتی۔ یہاں اس کے اپنے کاروبار کو پھر سے جمانے کا مسئلہ درپیش تھا یا وہ تجھے پکڑ کے پولیس کے حوالے کرتا کہ اسے فافٹ پھانسی دو ورنہ یہ پھر بھاگ جائے گا۔ یا تجھے استعمال کرتا... تیری مدد سے کاروباری نقصان پورا کرتا... وہ بزنس مین ہے، اس نے آج کا فائدہ دیکھا۔ تیرے ساتھ مجھے بھی بلا لیا۔ امپریس کرنے کے لیے... دباؤ ڈالنے کے لیے، وہ بڑا ڈرامے باز ہے میرے خیال میں۔''

''دباؤ میں اس کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار کی اجازت دینے پر کوئی تیار نہ تھا۔''

''اجازت تو مل گئی اُسے... لیکن تو نے اپنے انتقام کے ساتھ اس علاقے کو پاک صاف کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی بلاشبہ درگاہ پر منشیات کا دھندا ہوتا تھا کئی جگہ ہوتا ہے۔ چرس، بھنگ، سردائی عام ہیں۔ اب نئے منافع بخش نشے ہیں... ایل ایس ڈی، راکٹ، ہیروئن، ایکس ٹیسی، نیویارک لندن کیا اب یہاں کی ایک کلاس کا فیشن ہیں۔ لڑکیاں، عورتیں بھی ایسی ہی جنس ہیں اِدھر سے اُدھر عیاشی کے اسباب کے طور پر فراہم ہونے والی۔ اٹھائی تو وہی جاتی ہے نا جو آسانی سے مل جائے یا خریدی جا سکے۔ میرے تیرے اور عام آدمی کے گھر کی عورت کا رکھوالا کوئی مرد بیٹھا ہو تو کس کی مجال؟''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''تیرا مطلب ہے یہ ہوتا رہے کیونکہ دنیا میں ہو رہا ہے؟''

''تو کیا دنیا کی اصلاح کا ٹھیکے دار بنے گا؟ سارے غیر اخلاقی دھندے ختم کرے گا؟''

''میں صرف اپنے بھائی کے قاتل کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے چلّا کے کہا۔

''او کے، او کے... پھر وہی بات کہ آسان کام کو مشکل طریقے سے کرنے میں کون سی عقل مندی ہے۔ ہم اسے مار دیتے ہیں۔''

''مار دیتے ہیں؟ کیا مطلب، یہ اتنا آسان ہے؟''

''ناممکن بھی نہیں۔ تو ذرا ٹھنڈے دماغ سے میری بات سن۔ مراد نگر ایک پروجیکٹ تھا۔ پلاننگ سے پورا ہوا۔ اب ہم نے دوسرا شروع کیا ہے۔ اس میں بہتر پلاننگ سامنے آئے گی۔ تیسرا پروجیکٹ بنا لیتے ہیں۔ نادر شاہ کا خاتمہ... اس کی تباہی... آپریشن ایکس وائی زیڈ۔''

''انور تو سمجھتا کیوں نہیں، وہ مجھے چھوڑے گا نہیں۔ میری پوزیشن شیر کے کھلے منہ میں بیٹھے چوہے جیسی ہوگی۔''

وہ اٹھ کے گیا اور دو منٹ میں واپس لوٹ آیا۔

''بیوی کو ڈانٹنا بھی چاہیے کبھی... کافی چاہیے شوہر نامدار کو... اس کا ہوش نہیں... زبان چل رہی ہے قینچی کی طرح... خیر، مجھے لگتا ہے کہ تیرے دماغ پر نادر شاہ کی دہشت ضرورت سے زیادہ سوار ہے۔ اس لیے کہ تیرے بڑے بھائی کو اس نے بڑی سفاکی سے ہلاک کیا۔ محض شک کی بنا پر... کہ وہ اب بھی اس کی بیوی پر نظر رکھتا ہے جیسے کالج کے زمانے میں تھا۔ اس جیسے لوگ یہی کرتے ہیں، رحم دلی سے یا آسان طریقے سے نہیں مارتے، وہ دہشت کے دیوتا بن کر رہتے ہیں۔''

''یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے؟''

''اس نے جو بکواس کی تھی، میرے سامنے کہ مراد نگر ایک قید خانہ ہے جس میں سارے پہرے دار نمک حرام ہیں اور اس کے حکم کے غلام... ہر طرف کیمرے ہیں اور مائیکرو فون... یہ سب بکواس تھی۔ محض ڈرانے اور دباؤ ڈالنے کے حربے... میں نے خاموشی سے تحقیقات کرائیں۔ چند لوگ اس نے اندر داخل کیے تھے۔ وہ سب نئے تھے جیسے وہ بے حیا ملازمہ... کیا اب ان میں سے کوئی نظر آتا ہے؟''

''تو نے سب کو نکال دیا؟''

''میں نے نہیں، روبی نے۔'' وہ بولا۔ ''پھر میں نے کچھ خاص آدمی درگاہ پر ہونے والے کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے لگائے۔ تو نے ایک جگہ کا ذکر کیا تھا جہاں تو نے کچھ لوگوں کو زمین سے نکل کر باغ میں جاتا دیکھا تھا۔ باغ میں ایک مزار تھا۔ میں نے اس کا بھی پتا چلایا۔ تیرا شک درست تھا۔ وہاں افغانستان سے کچھ لوگ اسلحہ لاتے ہیں اور پاکستان میں تخریب کاروں کو فراہم کرتے ہیں جو لوگ سراغ لگانے گئے تھے، وہ چوبیس گھنٹے ایک پیڑ پر چھپ کے بیٹھے رہے۔''

میں نے حیران ہو کے اور تشویش سے کہا۔ ''پھر؟ معلومات حاصل کرنا ہی مقصد تھا؟''

''ہمیں نہیں معلوم کہ یہ غیر قانونی کام کب سے ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ لیکن اتنا عرصہ چلا تو کچھ دن اور سہی۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ دن بعد کیا ہوگا؟''

ریشم آئی اور ہمارے لیے کافی رکھ کے انور کو گھورتی چلی گئی۔ ''دیکھوں گی تم سے بچو۔''

انور نے چلا کے کہا۔ ''یہ بچو کس کو کہا ہے؟ بچو یعنی ایک بچہ کہنے سے نکاح کریک ہو جاتا ہے۔''

''تم خود کریک ہو۔'' اس نے باہر سے سر گھما کے کہا۔

انور ہنس پڑا۔ ''ہاں، وہ تو میں ہوں۔ اس مسئلے پر روبی سے بھی بات ہوئی ہے میری... اور استاد سے بھی کل... وہ مجھ سے پوری طرح متفق ہیں۔''

''کیا متفق ہیں، کچھ مجھے بھی پتا چلے؟'' میں نے بھنا کے کہا۔

''اس بات پر کہ تو شرافت سے نہ مانے تو ہم تجھے اسی طرح زنجیروں میں جکڑ کے تہ خانے میں ڈال دیں جیسے میں رہا تھا۔ تو ہماری مرضی پر چلے گا۔ ہم تیری مرضی پر نہیں چلیں گے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا مجھے اچانک بیوی کا بلاوا آ گیا ہے... تو نے کچھ نہیں سنا ہوگا یہ دل کی آواز ہے جو صرف میرے جیسے زن مرید سن سکتے ہیں' شب بخیر... آرام سے سو... تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

مجھے بیک وقت غصہ، حیرانی اور پریشانی تھی کہ وہ سب میرے ارادے کی راہ میں دیوار بن گئے ہیں لیکن ایک عجیب طرح کا اعتماد اور یقین تھا کہ شاید ان سب نے مل کر ٹھیک ہی سوچا ہو۔ ان سے زیادہ میرا مخلص کون ہو سکتا تھا اور مجھے بھی بہر حال سب کی سلامتی کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ ان سب نے مل کے کیا حل تلاش کیا ہے اس کا پتا چل جائے گا۔ ایک سے بھلے دو اور دو سے بھلے چار۔

میں ذہنی الجھن اور بے یقینی میں مبتلا سونے کے لیے اپنے کمرے میں پہنچا تو رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ استاد نے ہماری گفتگو میں بالکل دخل اندازی نہیں کی تھی۔ وہ لاؤنج میں اکیلا بیٹھا ٹی وی دیکھتا رہا اور کسی وقت اوپر جا کے اپنے کمرے میں سو گیا تھا۔ کچن میں خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ ریشم بھی اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے روبی سے بات کرنے کا سوچا۔ صبح سے میرے دماغ میں بہت سے سوالات گردش کر رہے تھے لیکن مجھے اس کے کمرے میں جانا مناسب نہ لگا۔ میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور ٹھٹک کے رک گیا۔ روبی صوفے پر بیٹھی ایک رسالے میں تصویریں دیکھ رہی تھی۔

''تم؟'' میں نے کہا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''تمہارا ذوق و شوق دیکھ رہی تھی۔ کھڑے کیوں ہو' بیٹھو۔'' اس نے یوں کہا جیسے میں اس کے کمرے میں ہوں۔

''یہ تمہارے دیکھنے کا رسالہ نہیں ہے۔'' میں نے رسالہ چھین کر دور پھینک دیا۔

''کیوں؟ خواتین کی تصویریں زنانہ رسالوں میں ہوتی ہیں۔ پھر تم کیوں پڑھتے ہو ملک صاحب؟''

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''اندر آنے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ تم سے بات کروں۔''

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مجھے پتا چل گیا تھا تم کچھ پریشان ہو؟''

''کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی انور نے میری کلاس لی۔ مجھے پتا چلا کہ میرے بارے میں فیصلے سب مل کے کر رہے ہیں... مجھ سے پوچھے بغیر...''

''سب سمجھتے ہیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انور سے تمہاری کیا بات ہوئی، اچھا چھوڑو... اس پر کل سب کے سامنے بات کریں گے، ابھی میں بات کرنا چاہتا ہوں تمہارے بارے میں۔ تم برا تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں۔'' اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا۔

''تم کو مراد سے بہت محبت تھی۔ اتنی کہ اس کے لیے تم نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ جان کی بازی لگا دی تھی۔''

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں، سب جانتے ہیں۔''

''اس کی موت کا صدمہ تم نے جھیلا... بڑے صبر

سے اور ہمت سے۔ میں نے بھی دیکھا اور تم نے کہا کہ مراد کے ماں باپ کو سنبھالنا تمہاری ذمے داری تھی اس لیے تم نے خود کو بھی سنبھالا۔"

"اور میں کیا کہتی... کیا کرتی... مجھے بھی زندہ رہنا تھا۔" اس نے کہا۔

"تم نے عدت کے چار ماہ دس دن ضرور کاٹے... لیکن میری بات کا برا مت ماننا... ہوسکتا ہے کہ میں نے غلط دیکھا ہو، غلط سمجھا ہو، مجھے یوں لگا جیسے دکھ سے زیادہ یہ مجبوری تھی۔"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ "مجبوری تو تھی اور دکھ بھی تھا لیکن دکھ کسی اور بات کا تھا۔"

میں چونکا۔ "اور کیا بات تھی؟"

"جو کسی کو معلوم نہیں، ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی تصدیق استاد نے کی۔"

"کس بات کی تصدیق؟"

"کیا تم نے سنا نہیں، سکندر شاہ نے میرے ماں باپ کو سزا دی تھی۔"

"ہاں، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سکندر ایسا کینہ پرور ہے۔"

"مجھے بھی بیٹے کے بارے میں یہ اندازہ نہیں تھا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ "اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"بیٹے نے مجھے سزا دی تھی۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

میں چونکا۔ "کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا آخر؟"

"میں نے فارسی تو نہیں بولی اور پہلی بار یہ اعتراف میں تمہارے سامنے کر رہی ہوں۔ بیٹے نے محبت ضرور کی ہو گی مجھ سے... کیونکہ میں خوب صورت تھی لیکن اس سے بڑھ کر جائداد کی مالک تھی۔ جو اس کے باپ کے پاس بھی نہ تھی۔" روبی کی آنکھوں کا تاثر بدل گیا۔ "کیا تم یہ بات جانتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ ایک معمولی حیثیت کا کاشت کار تھا جس کی تھوڑی سی زمین تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہاں پڑتا ہے۔ زمین ہی یہاں سب کچھ ہے۔ زمین عزت ہے، غیرت ہے۔ یہاں تک کہ محبت ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی تو تم کیسے سمجھ سکتے ہو لیکن ایسا ہی ہے۔ وہ ہمارا دور پار کا رشتے دار تھا۔ اس کا باپ عید بقرعید ہم سے ملنے آتا تھا۔ یہ مجھے میرے باپ نے بتایا تھا۔ ہماری طرح ذات کا وہ بھی چودھری تھا لیکن ان کی زمین مراد کے دادا کی شوقین مزاجی کی نذر ہو گئی تھی۔ جو باقی بچی تھی وہ مقدمے بازی میں لگ گئی تھی۔ اس نے شہر میں کسی طوائف کا قتل کر دیا تھا۔ میرے والد نے اسے بچایا تھا۔ سکندر شاہ کی بہن میری ماں تھی۔ وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔"

"میں نے دیکھا تھا انہیں... جوانی میں تم جیسی ہی ہوں گی۔"

"میرے والد نے انہیں پسند کر لیا اور وہ شادی ہو کے چودھریوں کی حویلی میں پہنچ گئیں۔ جب میں بڑی ہوئی تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مراد کا باپ زمینداری چھوڑ کر ٹھیکے داری کرنے لگا تھا۔ مراد نے مجھے ایک خاندانی شادی میں دیکھا۔ میں اس وقت انیس سال کی تھی اور شاید اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ بے وقوف تھی۔ میں اس صدمے سے بھی دوچار تھی جو مجھے انور کے انکار سے پہنچا تھا۔ اس کی شادی مجھ سے طے تھی۔ شاہینہ بڑی تھی اور انور انکار نہ کرتا تو اس کی شادی پہلے ہوتی۔ انور کے بعد میں اکبر کی بیوی بنتی۔ جب انور باہر چلا گیا تو گھر کے بڑوں کا فیصلہ بدل گیا۔ شاہینہ کو اکبر سے بیاہ دیا گیا اور تم جانتے ہو اس کی زندگی کیسے تباہ ہوئی۔ میں بیٹھی رہ گئی۔ مراد نے اظہار محبت کیا تو میں جذبات کے جال میں بری طرح الجھ گئی۔ وہ گبرو جوان تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور باتیں بھی ایسی کرتا تھا جو میں نے پہلے نہیں سنی تھیں۔ دراصل وہ اپنے باپ کے مشورے پر چل رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟ باپ نے کہا تھا مراد سے کہ تم سے محبت کرے؟"

"پسند اس نے خود کیا تھا۔ جب باپ کو پتا چلا تو اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اسے احساس دلایا کہ چودھری اظہر علی کی بیٹی کی کتنی زمین ہے جو وہ ساتھ لائے گی۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کے دماغ میں زمین کا خیال پہلے سے نہ ہو۔ سکندر نے پہلے میرے والد کو کنسٹرکشن کے بزنس کی طرف راغب کیا۔ اس وقت تک وہ خاصا کامیاب ہو چکا تھا۔ میرے والد نے انکار کر دیا تو وہ رشتہ لے کر آ گیا۔ اسے یقین تھا کہ رشتے داری تو پہلے سے ہے اب اس کے مالی حالات بھی بہتر ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خاندان

میں میرے لائق کوئی نہیں۔ لڑکی خاندان سے باہر جائے اس سے بہتر ہے گھر بیٹھی رہے۔ مگر والد کو شک ہو گیا تھا کہ مراد کے باپ کی نظر زمین پر ہے۔ انہوں نے انکار کر دیا مگر مراد کے باپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے مراد کو میرے پیچھے لگائے رکھا اور خود بہن کے ذریعے دباؤ بڑھاتا رہا۔ جب بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے مراد کو پٹی پڑھائی کہ لڑکی کو نکال لو... میں تو اندھی اور پاگل ہو چکی تھی، مراد کی مجھ سے ملاقات کا بندوبست اس کا باپ کرتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیا کرتا تھا؟"

"مراد کی حفاظت کرتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ مراد مارا نہ جائے۔ سکندر اپنے گارڈ ساتھ بھیجتا تھا جن کے بارے میں مشہور اس نے یہ کیا کہ میرے دوست ہیں۔ اس نے مجھے باپ کے خلاف بھی ورغلایا کہ کیسا ظالم باپ ہے تمہیں ساری عمر گھر بٹھانا چاہتا ہے۔ آخر کیا خرابی ہے مجھ میں... کسی لڑکی سے پوچھ کے دیکھو، میں کیا پوچھتی... مجھے تو وہ دنیا کا سب سے حسین مرد لگتا تھا۔ بس ایک دن یہ ہوا کہ بڑے خون خرابے میں سے اس نے مجھے نکال لیا۔"

"وہ سب میں نے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"بعد میں جھوٹی سچی خوب مقدمے بازی ہوئی۔"

"اس سے پہلے تمہارا ایک نکاح انور سے بھی پڑھایا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں نے صاف انکار کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ زبردستی کی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ ماں بہت روئی پیٹی کہ کیا باپ کو پھانسی چڑھانا چاہتی ہے۔ انور کو بھی میں نے دھمکی دے دی تھی کہ غلط فہمی میں نہ رہے۔ میں خودکشی کرلوں گی اگر اس نے ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی... پھر میں مراد کے ساتھ نکل گئی اور یہاں دونوں طرف سے جھوٹ بولا گیا۔ میرے والد نے کہا کہ مراد مارا گیا۔ مراد کے باپ نے تردید کی۔ معاملہ تو دب گیا مگر پیر سائیں کی عزت کا جنازہ نکل گیا۔ ہمیں تلاش کرنے کی بہت کوشش ہوئی جو ناکام ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مراد کی محبت کا دوسرا روپ میرے سامنے آیا۔"

میں پھر چونکا۔ "وہ بھی بدل گیا؟"

وہ کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ "تم کہو گے کیسی بے شرم ہوں میں لیکن اچھا ہے ایک ہی بار ساری حقیقت تمہارے سامنے آجائے۔ پہلے سب ٹھیک تھا اور ٹھیک ہی رہتا۔ لیکن درمیان میں جو میری شادی کا جھوٹ بولا گیا۔ کہا گیا کہ لڑکی تو رخصت ہو کے سسرال میں بیٹھی ہے۔ اس نے ساری خرابی پیدا کی۔ اس نے مراد کے دل میں شک کا زہریلا بیج بو دیا۔ جب اس نے پہلی بار پوچھا تو میں حیران رہ گئی۔ میں نے کہا کہ کیا تمہیں میری زبان پر اعتبار نہیں۔ وہ چپ ہو گیا مگر مجھ پر یقین نہیں کیا۔ بعد میں یہ بات ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ اس نے تمہیں ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ بس اس کے بعد شک بڑھتا گیا۔ میرا رونا دھونا حلف اٹھانا کسی کام نہ آیا۔ میں خود اپنی نظر سے گر گئی۔ دونوں طرف میں ہی بے عزت ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مجھے بے حیا اور بے غیرت.... کہنے لگا۔ اس نے کہا کہ تیرے باپ کو میں چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے مجھے جھوٹا کھلایا۔" روبی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے رونے لگی۔

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ سب مجھے روبی بتا رہی ہے۔ محبت کی ایسی تذلیل کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور روبی کے ساتھ جا بیٹھا۔ "اتنے زخم چھپائے پھر رہی تھیں تم اپنے دل میں؟" میں نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم سے یہ پوچھا۔"

وہ کچھ دیر سسکیاں لیتی رہی پھر میں نے اسے پانی پلایا اور اس کے آنسو صاف کیے۔ اس کا نازک جسم پھر بھی جھٹکے لیتا رہا۔ روبی کا رویہ اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "خدا کرے یہ میرے اعتماد کی دوسری غلطی نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "تم سب کو مراد نہ سمجھو۔"

"میں یہ سب کسی سے کیسے کہتی... تم نے پوچھا کیونکہ تم سب دیکھ رہے تھے۔ اور میں تمہاری نظر کو دیکھ رہی تھی۔ سب کے سامنے میں استاد پر غصہ ہوئی تھی۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔ مراد نے جو کہا تھا، وہی کیا۔ اس کے باپ نے کہا۔ وہ دونوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں نے اپنی توہین محسوس کی تھی۔ اس نے کبھی باپ سے نہیں کہا کہ اب رشتہ ہو گیا ہے تو پرانی باتیں بھول جائے۔ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ میری زندگی اس گھر میں کیسے گزرے گی جہاں میری دو کوڑی کی عزت نہیں۔ زمین کا لالچ پہلے بھی تھا۔ اب زمین ملتے ہی مجھے زمین میں دبا دیا جائے گا۔"

"او مائی گاڈ، اتنی جلدی یہ سب ہو گیا؟"

"سچ تو یہ ہے کہ میں بہت ڈر گئی تھی۔ محبت کے نام پر

میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہوا اور اس کے بعد میری زندگی کا بھروسا نہیں رہا۔ مراد مجھے برداشت کر رہا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ مجھے قتل کرا دیتا.... یہ یہاں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ واپس آجانے کے بعد میرے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آتا۔ مجھے ہیضہ ہو جاتا، سانپ کاٹ لیتا، میں نے سب ہوتے سنا تھا۔ وہی میرے ساتھ ہوگا۔ غلطی میرے باپ کی تھی جو کام راضی خوشی ہو جاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ وہ انور سے شادی کے ڈرامے سے میری سزا بن گیا۔ اور خود اس کے لیے بھی۔ یہ خیال آنے کے بعد میں محتاط ہو گئی۔ پھر بھی خوف میرے اعصاب پر سوار تھا۔ وہ مجھے مار کے یہاں پھینک جاتا تو اسے کون پوچھتا۔ بس اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس زندگی سے کیا فائدہ... مرنا کل بھی ہے اور آج بھی تو ذلت کیوں اٹھاتی... اب مزید کیا جینا۔ میری نظریں اپنے قاتل کو دیکھ رہی ہیں تو میں کیوں انکار کروں۔ خود بھی مر جاؤں اور اسے بھی مار دوں۔“

میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ ”صحیح فیصلہ کیا تم نے... تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔“

”وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیا فیصلہ کر چکی ہوں۔ لڑکیاں بے وقوف، بزدل اور بے عزت ہوتی ہیں نا، غیرت تو صرف مردوں میں ہوتی ہے، بس اسی میں وہ مارا گیا۔“

”تم نے اُسے مار دیا؟ کیسے؟“

وہ کچھ دیر چپ رہی جیسے کچھ یاد کر رہی ہو۔ ”یہ مشکل فیصلہ تھا۔ ایک بار خیال آگیا تو دل میں جم گیا اور میں قتل کے طریقے سوچنے لگی۔ پستول کی گولی۔ خنجر۔ زہر۔ پھانسی کا پھندا۔ یہ سب میرے بس میں کہاں تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے حادثے کے وقت پہاڑ کے اوپر کسی داڑھی والے کی موجودگی کا ذکر کیا تھا جس نے گاڑی کے سامنے پتھر لڑھکا دیا تھا۔“

اس کی نظر جھک گئی۔ ”جھوٹ بولا تھا میں نے... وہ میرے مقابلے میں طاقتور تھا اور ویسے بھی میں ایسے مرنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں پکڑی جاؤں گی اور پھر مزید ذلت کا سامنا ہوگا۔ خواہش تو یہی تھی میری کہ اس دغاباز کو سزا دوں جس نے مجھے اور میرے خاندان کو تباہ کر دیا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ واپس آنے تک اس کا رویہ اتنا سفاک اور تذلیل والا آمیز ہو گیا کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے سوچا کہ ابھی یا کبھی نہیں۔ اگر ہم واپس مراد نگر پہنچ گئے تو یہ جو میرا محبوب تھا، میرا قاتل بنے گا۔ میں اپنی ہی زمین کے دو گز ٹکڑے میں پڑی سڑتی رہوں گی قیامت تک... اور یہ دنیا میں عیش کرے گا۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو ہمارے پاس کرائے کی گاڑی تھی جو ہم نے راولپنڈی سے لی تھی اور ملتان میں واپس کرنا تھی۔ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان اب صرف نفرت تھی۔ وہ بات بھی کرتا تھا تو گالی دیتا تھا۔ اس کی بات گالی ہی لگتی تھی۔ ایک جگہ وہ گاڑی روک کے اترا اور سڑک سے ذرا نیچے پیشاب کرنے چلا گیا۔ میں نے باہر دیکھا تو میری طرف والے دروازے کے پاس ایک اچھا خاصا بڑا پتھر پڑا تھا میں نے وہ پتھر اٹھا کے سائڈ میں رکھ لیا۔ وہ واپس آکے پھر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس وقت تک مجھ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ ایک موڑ آیا جس پر گاڑی گھوم گئی۔ بس اس وقت میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور میں نے پتھر پوری قوت سے اس کے سر پر مارا۔ اس کے بعد میں نے گاڑی کو اچھلتا اور گرتا اور نیچے کی طرف جاتا ضرور دیکھا پھر گاڑی الٹی اور میرے سر میں چوٹ آئی۔ ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔“

کچھ دیر بعد میں نے سوال کیا۔ ”وہ مر چکا تھا؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ڈاکٹروں نے فوراً مجھے نہیں بتایا۔ ان کا خیال تھا کہ صدمے سے مجھ پر برا اثر ہو گا۔ جب انہوں نے بتایا تو ظاہر میں نے یہی کیا جیسے سکتے میں ہوں۔ لیکن اندر سے مجھے بڑا سکون تھا۔ ڈاکٹر میرے بچ جانے کو ایک معجزہ قرار دے رہے تھے۔ میری چوٹیں بہت معمولی تھیں۔ البتہ بچہ ضائع ہو گیا تھا۔ کون ماں اس خبر سے خوش ہوگی لیکن میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیک وقت میری جان دونوں سے چھوٹ گئی ورنہ میں ساری عمر عذاب پالتی... مجھے بچ جانے کی ذرا امید نہ تھی مگر میں بچ گئی تو میں نے اسے تائیدِ ایزدی سمجھا۔ خدا مظلوم کے ساتھ تھا انجام کو وہی پہنچا جو اس کا مستحق تھا۔ اب سمجھ میں آگیا کہ بیوہ ہونے پر میرا رویہ مختلف کیوں رہا؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”مشکل حالات میں تم نے ایک مشکل فیصلہ کیا جس پر عمل کرنا زیادہ مشکل تھا۔“

”یہ سب جان کر تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگو گے۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو، تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا... تھینک یو کہ تم نے مجھے اعتماد کے قابل سمجھا۔“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”تم پر تو سب ہی اعتماد کرتے ہیں۔“

میں نے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ ”باتیں تو بہت کرنی تھیں تم سے... لیکن رات بہت ہو گئی ہے۔“
وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے تک جا کے رکی۔ ”کیا میں ایک وعدہ لے سکتی ہوں تم سے؟“
میں محتاط ہو گیا۔ ”کیسا وعدہ؟“
”تم بھی مجھے... اس گھر کو چھوڑ کے نہیں جاؤ گے؟“
میں نے نظر ملائے بغیر کہا۔ ”میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ کوشش کروں گا۔ کل کا کسے پتا ہے؟“
اس کے ہونٹوں کی خفیف سی مسکراہٹ بجھ گئی۔ ”ہاں، ویسے تو زندگی تمہاری اپنی ہے۔“
”ایک درخواست میں بھی کروں۔“ وہ رک گئی۔
”تم حکم بھی دے سکتے ہو۔“
میں نے کہا۔ ”تمہارے دواخانے میں نیند کی کوئی بچی کھچی گولی پڑی ہو تو مجھے لا دو۔“
وہ مسکرائی۔ ”تو... ہے مگر تمہارے لیے نہیں... تم جاگتے رہو رات بھر... صبح بخیر۔“ وہ لہرا کے باہر نکل گئی۔
اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی دروازہ آہستہ سے بند ہوا تھا۔ کیا کسی نے روبی کو میرے کمرے سے نکلتا دیکھا تھا۔ ہم دونوں کے علاوہ اوپر صرف استاد اور اس کی بیوی تھے لیکن ان کے دروازے کے پیچھے روشنی کی کوئی لکیر نہ تھی۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی نیند وقت گزر جانے کے بعد ویسے بھی روٹھ چکی تھی اور رہی سہی کسر روبی کی باتوں نے پوری کر دی تھی۔ میں نے سارے ٹوٹکے آزمائے۔ تاریکی میں کودنے والی بھیڑیں گنتا رہا۔ ون شیپ... ٹو شیپ... سارا گلہ کود گیا۔ پھر میں آیت الکرسی پڑھتا رہا اور ایک اوٹ پٹانگ منتر کے بول دہراتا رہا لیکن خیال کے پس منظر میں روبی کی آواز گونجتی رہی اور میں کروٹیں بدل بدل کے تھک گیا۔ اس سے مجھے نیند آگئی۔
صبح بھی دیر تک سونا نصیب نہ ہوا۔ میری آنکھ استاد کے پکارنے سے کھلی۔ ”منّا... اے منّا! چل اٹھ۔“
میں نے دیکھا تو وہ سر پر سوار تھا۔ کیا آفت آگئی استاد؟“ میں اٹھ بیٹھا۔ ”آدھی رات کو جگا دیا۔“
وہ صوفے پر بیٹھ کے چائے پینے لگا۔ ”آفت کا نام ہے نادر شاہ، سنا تو ہو گا۔“
میں چونکا۔ ”صبح صبح کوئی اچھا نام لو۔“
”اب اس کا یہی نام ہے تو میں کیا کروں۔ فٹافٹ منہ دھو لو۔ میں نے کہا ہے تیری بھابی سے کہ ناشتا یہاں لا دے۔ وہ تیرے انتظار میں بیٹھا ہے۔ انور سے بات

کررہا ہے۔"

"وہ اس طرح بن بلائے بغیر بتائے...."

استاد نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی۔"کیا فرق پڑتا اگر وہ بتا کے آتا... یا بتائے بغیر تجھے اٹھوا لیتا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے.... یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ یہاں بھی آسکتا ہے اور اسے کوئی ڈر نہیں۔"

میں نے چڑ کے کہا۔"پھر میں کیا کروں؟"

"تو اس کی بدمعاشی کے سامنے سر جھکا دے۔ جیسے انور نے کیا ہے۔ اس سے جان کی امان مانگ اور جو وہ کہے مانتا جا۔ ہم نے کل ایک جال پھیلایا ہے، اس میں وہ آسانی سے پھنس جائے گا۔ ہم اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اپنا کچھ علاقہ دشمن کے حوالے کررہے ہیں کہ وہ بے خوف و خطر اپنی بادشاہت کا جھنڈا لہرائے۔ ہم اس کے زیرِ سایہ اپنا کام کرتے رہیں... وہ اجازت دے تو اس کی بڑی مہربانی۔"

میں حیرانی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔"یہ تم کیا کہہ رہے ہو استاد؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں... تجھے بعد میں سمجھا دیں گے۔ ابھی تو جا۔ اپنی ماضی کی ہر غلطی پر اس سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ، آئندہ کے لیے اس کے پاؤں پکڑ... اس کا احسان مان کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہتے ہوئے تجھے معاف کررہا ہے اور واپس وہیں نہیں پہنچا رہا ہے۔"

میں نے بگڑ کے کہا۔"اگر میں یہ سب نہ کروں استاد...؟"

"وہ تیری مرضی... نہ کر، انور نے تجھے بتا دیا ہوگا کہ اس کے بعد تو کسی کو نظر نہیں آئے گا جیسے انور ایک سال نظر نہیں آیا تھا۔ تہ خانہ تو یہاں بھی ہے۔ جب تک نادر شاہ کا خطرہ ہے تیری حفاظت ہم کریں گے۔" استاد اٹھا اور باہر چلا گیا۔ بھابی ناشتا لے کر آئی تو میں بیڈ پر مہاتما بدھ بنا بیٹھا تھا۔ غصے اور بے بسی کے احساس سے میرا برا حال تھا۔ استاد نے ثابت کردیا تھا کہ گزشتہ رات انور کی جو بات مذاق لگی تھی وہ اصل دھمکی تھی۔ بھابی نے جاتے ہوئے کہا۔"وقت ضائع مت کرنا، ناشتا کرو۔"

میں نے بھنا کے کہا۔"میں خود کو ضائع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ ناشتا گیا بھاڑ میں۔"

وہ دروازے میں رک کے معنی خیز طریقے پر مسکرائی۔"روبی کی بات تو مانو گے؟" اور باہر چلی گئی۔

روبی کا حوالہ ترپ کا پتا ثابت ہوا۔ حیرت، خفت اور چوری پکڑے جانے کی دھمکی نے میری مزاحمت کی آگ پر سے سیلاب کے پانی کا ریلا گزار دیا۔ ناشتا تو میں نے نہیں کیا لیکن مزید تاخیر کیے بغیر نیچے پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں نادر شاہ کے ساتھ رانا براجمان تھا اور اس کے تیور انتہائی جارحانہ تھے۔ وہ بھی چیلنج دیتا محسوس ہوتا تھا کہ بڑا پاٹے خان کا سالا بنا ہوا تھا اس رات۔ اب بول۔ اس کے مقابلے میں نادر شاہ کسی بہت بڑے بدمعاش کے جاہ و جلال کا پیکر نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"آ بھئی فرید! اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟" نادر شاہ بولا۔

رانا نے حقارت سے کہا۔"بڑا سورما بنا پھرتا تھا۔ چودھری نے بتایا کہ سامنے آتے ہوئے پتلون گیلی ہورہی ہے۔"

میں اس تذلیل کے لیے تیار نہ تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا مجھے ان دونوں کے پیچھے اور اپنے مقابل ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں روبی کی جھلک دکھائی دی جو اپنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور فوراً ہی غائب بھی ہوگئی۔

انور نے کہا۔"نادر شاہ جی! اس کی جگہ آپ ہوتے تو خوف زدہ نہ ہوتے۔"

جواب رانا نے دیا۔"شاہ جی کسی نامرد کی اولاد نہیں ہیں۔ پھانسی کے تختے پر بھی پھندا اپنی گردن میں خود ڈالتے۔"

میں نے چند لمبے لمبے سانس لیے اور سامنے بیٹھ گیا۔ میں ایک ایسے ڈرامے میں اداکاری کرنے پر مجبور تھا جس کے پلاٹ کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ بیک وقت میں ہر طرف سے محصور ہوگیا تھا۔ انور کے بعد استاد کی دوٹوک دھمکی اور پھر روبی کی التجا نے مجھے بے بس کردیا تھا۔

رانا مزید بولا۔"اس رات جو تو نے کیا تھا میرے ساتھ..."

انور نے درخواست کے انداز میں کہا۔"نادر شاہ جی! آگے بات کریں۔"

نادر شاہ نے رانا کو گھور کے خاموش کردیا۔"فرید! میرا مطلب ہے ملک سلیم... دو دن کیسے گزرے پیری مریدی کے تجربے میں؟"

میں نے کہا۔"شاہ جی! مجھے پیر سائیں نے گدی نشین مقرر کیا تھا۔ اگر میں آپ کی خدمت کرسکتا..."

اس نے نفی میں سر ہلایا۔"یہ تمہارے بس کی بات

نہیں۔ راناسب سنبھال لے گا۔ تم اپنا کام کرو۔"

انور نے ایک فائل کھول کے نقشہ میز پر پھیلا دیا۔

"یہ مرادنگرتو کے بلیو پرنٹ ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔" نادر شاہ بولا۔

"درگاہ کی تحویل میں پہلے جتنی زمین تھی، سب رہے گی۔ اتنی ہی زمین اضافی شامل کر دی گئی ہے۔ یہ دیکھیں، یہاں سے جو سڑک آتی تھی۔ وہ الگ ہو جائے گی۔ درمیان میں درختوں کی قطار کے پیچھے مرادنگر کی حد میں نئی سڑک تعمیر ہو گی۔ مرادنگرتو.... تک آنے جانے کا راستہ بھی الگ ہو گا۔"

رانا نخوت سے بولا۔ "دیوار کون بنوائے گا؟"

انور نے عاجزی سے کہا۔ "ہم، جب پوری درگاہ کی تعمیر کے اخراجات کی ذمے داری لی ہے تو یہ بھی ہو گا۔"

رانا بولا۔ "تم انجینئر ہو۔ اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہو تو بتا سکتے ہو۔"

روبی اس وقت ذرا سی دیر کے لیے آئی جب تمام معاملات تقریباً طے ہو چکے تھے۔ رانا احترام سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لیے وہ پیرزادی تھی۔ رانا صاحب! کیا آپ مطمئن ہیں؟"

"بس جناب آپ کی اجازت درکار تھی۔" رانا بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ شرپسندوں کی وجہ سے درگاہ کو نقصان پہنچا اور پیر سائیں کی شہادت ہوئی۔" روبی نے کہا۔ "اب ان کے چشمۂ فیض کو پھر سے جاری کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔"

"انشاء اللہ سب کچھ حسبِ سابق ہو گا۔ صرف آپ کی رضا درکار تھی۔" وہ بولا۔

"اپنی زندگی میں والد نے ملک صاحب کو جانشین مقرر کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی کہ اولادِ نرینہ نہ ہونے کے سبب وہ انہیں اپنی فرزندی میں قبول کر چکے تھے۔ لیکن اب یہ سعادت آپ کے حصے میں آ گئی ہے۔ آپ اس چشمۂ فیض کو جاری رکھ سکتے ہیں۔"

میں حیرانی سے سب سنتا رہا کیونکہ میرا اس معاملے میں کوئی کردار نہیں تھا۔ گزشتہ رات انور نے میرے کان میں بات ضرور ڈالی تھی لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ مجھ سے مشورہ ضروری سمجھے بغیر تمام معاملات طے کر لیے گئے ہیں۔ یہ ذمے داری انور کی اور میری تھی کہ ہم روبی کو درگاہ کے معاملات حسبِ سابق چلانے کی اجازت دینے پر آمادہ کریں۔ ہم نے نادر شاہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ روبی نے سامنے آ کے رضامندی دے دی تھی۔ نادر شاہ کا اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کے جانا جائز تھا کہ یہ اس کی دھمکی اور اس کے دباؤ سے ہوا تھا اور میری کوشش سے ہوا تھا۔ چودھریوں کے دونوں وارث میری مانتے تھے اور اپنی زندگی خطرے میں دیکھ کے میں نے انہیں منانے میں عافیت دیکھی تھی۔

وہ مطمئن ہو کے چلے گئے تو روبی نے سب سے پہلے کہا۔ "تھینک یو سلیم، تم نے ہماری مان لی۔"

پھر انور نے کہا۔ "اس کی وجہ سے تمام معاملات ہماری مرضی کے مطابق طے ہو گئے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "جب مجھے ہر طرف سے محصور کر لیا گیا۔ ایک دوست سامنے تھا ایک محسن اور..." میں نے روبی کی طرف دیکھا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔ "تو انکار میں کیسے کر سکتا تھا۔ لیکن مجھے یوں ہتھیار ڈالنا اچھا نہیں لگا۔"

"یہ مصلحت کا تقاضا تھا بیٹے۔" انور بولا۔

"کیسی مصلحت... ہم میں سے کوئی اس کاروبار کو جائز نہیں سمجھتا تھا جو وہاں ہو رہا تھا اور پھر ہو گا۔ ہم نے یہ اجازت ذاتی مفاد میں دی ہے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا تجھے نظر آ رہا ہے۔ ہم نے ایک جُوا کھیلا تھا اور نادر شاہ جو اتنا بڑا جواری بنتا ہے، بازی ہار کے گیا ہے۔ اگر وہ اصرار کرتا کہ زمین درگاہ کے نام پر منتقل کر دی جائے تو مشکل ہو جاتی۔ تجھے اسی لیے مذاکرات میں ڈھال بنا کے سامنے رکھا تھا۔ یہ ہماری کمزوری تھی جو اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے وہ اس کو ایکسپلائٹ کر سکتا تھا اور اس نے کیا۔ ہمارے پاس دو راستے تھے یا بیک فٹ پر کھیلیں۔ اس کی ہر بات مانتے جائیں یا ٹائم لیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹائم لینے سے کیا ہوتا؟"

"جواب ہو گا۔ وہ مطمئن ہے کہ ہم نے دھمکی میں آ کے اس کی ہر بات مان لی ہے۔ ہم ڈر گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ تیرے آنے سے پہلے میں نے محسوس کیا کہ نادر شاہ اوور ایکٹنگ کر رہا ہے وہ اپنی دہشت کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ شک مجھے پہلے بھی تھا کہ اس نے بہت مبالغے سے کام لیا۔ اس نے تیرے بارے میں معلومات ضرور حاصل کر لی تھیں۔ باقی ڈراما تھا کہ اس نے ہمیں اندر باہر سے محصور کر لیا ہے؟ ہم چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے سے زیادہ بے بس ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ سکندر شاہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کے سارے وفاداروں، جاں نثاروں کی جگہ نمک حرام آ گئے اندر اسے پتا نہیں چلا؟

اب صدمات سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ اور بات ہے۔ پہلے وہ انتہائی چالاک، عیار اور چوکس آدمی تھا۔ کوئی اس کے قلعے میں سرنگ بنالے۔ دیواریں کھوکھلی کردے۔ محافظوں کی جگہ قاتل کھڑے کردے اور اسے پتا نہ چلے۔ ناممکن۔ اور جب میں نے تصدیق کرائی تو میرا خیال سو فیصد درست ثابت ہوا۔ بس اس کے بعد نادر شاہ میرے لیے ایک چھوٹا تیمی خور آدمی رہ گیا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

میں نے تردید میں سر ہلایا۔ ''انور! ایسے نتائج نہ نکال۔۔۔ تو نہیں جانتا اُسے، میں جانتا ہوں۔''

''پہلے تو جانتا تھا مگر یہ بہت پرانی بات ہے۔ نادر شاہ کے ساتھ کیا رہا کیا نہیں۔ خدا جانے مگر اب وہ پرانے بھرم پر چل رہا ہے۔ اس کے کاروبار یا ساکھ کو نقصان پہنچا ہے۔ ابھی تیرے آنے سے پہلے اس نے ایک بات ایسی کی کہ میرے شک کی تصدیق ہوگئی۔ وہ جانتا ہے کہ میرے والد کے تعلقات کہاں تک تھے۔ ایک زمانہ تھا جو میں نے بھی دیکھا ہے کہ ان کا مہمان خانہ آباد رہتا تھا اور ضلعی حکام ان کے پاس شکار کھیلنے آتے تھے۔ میں نے پولیس کے اعلیٰ افسران اور ڈپٹی کمشنر، کمشنر کو خود دیکھا ہے مگر وہ فخر سے بتاتے تھے کہ ایک بار گورنر پنجاب بھی اس مہمان خانے میں قیام کرچکے تھے اور والد نے ان کے لیے ہرنوں کے شکار کا بندوبست کیا تھا۔ چھوٹے لاٹ صاحب۔۔۔ پہلے صوبائی چیف سیکریٹری کو چھوٹے لاٹ صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اپنی میم کے ساتھ آئے تھے۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ آج بھی مہمانوں کی کتاب سے سارے نام دیکھے جاسکتے ہیں اور اگر میں ان سے ملوں تو وہ مجھے پرانے وضع دار لوگوں کی طرح ملیں گے۔ سب نہ سہی۔۔۔ ان میں کچھ اب بھی سروس میں ہوں گے تو بہت اوپر ہوں گے۔ نادر شاہ کو یہاں رہ کے یہ باتیں سننے کو ملی ہوں گی، اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ جسے وہ فریدالدین کہتا تھا، وہ اب بڑے مضبوط حصار میں ہے اور اس لیے مجھ سے والد صاحب کی بات کی کہ برٹش دور کے آئی سی ایس افسران سے تو ان کے قریبی مراسم تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔''

''اس سوال کا مقصد؟'' میں نے کہا۔

''میں بتاتا ہوں۔ یہ جرائم ہر کاروبار کی بنیاد رکھنے والے سرکاری سرپرستی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کے حق میں کس حد تک فائدہ مند یا نقصان دہ ہوسکتا ہوں۔ دوسری بات اس نے بڑی عجیب کی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس علاقے میں ڈاکو بہت سرگرم ہیں۔ میں نے کہا کہ یہاں سے زیادہ تو سندھ کا کچے کا علاقہ ان کا گڑھ ہے۔ کبھی کوئی اِدھر بھی کارروائی کر جاتا ہے لیکن اس سے تو کوئی علاقہ محفوظ نہیں۔ پھر اس نے درگاہ پر حملے کا ذکر کیا کہ وہ کوئی ڈاکو تھا گامارستم اس کی بڑی دہشت تھی۔ سنا ہے پھانسی ہونے سے پہلے اسے ساتھیوں نے چھڑا لیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ اس نے اور کوئی واردات کی؟ اب تو اندازہ کرلے کہ اس کے دل میں ابھی تک دہشت ہے کہ کہیں وہ پھر حملہ نہ کردے۔ اور اس کی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع کتنے ناقص ہیں۔ قسم خدا کی۔۔۔ اسے پتا چل جاتا کہ گامارستم اس گھر میں دیوار کے پیچھے موجود ہے تو اس کا ہارٹ فیل ہوجاتا۔'' انور نے قہقہہ مارا اور کھڑا ہوگیا۔ ''میں چلتا ہوں۔ بہت دیر ہوگئی ہے پہلے ہی۔۔۔ سب لوگ میری جان کو رو رہے ہوں گے۔''

اس کے جانے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے خوف اور بے یقینی کی دھند ہٹ گئی ہے اور میں دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ انور نے مجھے بتائے بغیر نادر شاہ کے بارے میں تمام معلومات اکٹھی کرلی تھیں اور اس کے اندازے بظاہر درست ہی لگتے تھے۔ آخری وقت میں اس نے روبی اور استاد گامارستم کے ساتھ مل کے اپنا گیم پلان فائنل کرلیا تھا اور اب مجھے شک نہیں رہا تھا کہ یہ پلان ناکام ہونے کا اندیشہ ہوتا تو وہ مجھے غائب کردیتے۔ تہ خانے کی قید میں پابہ زنجیر رکھنا تو ایک اشارہ تھا۔ وہ مجھے کہیں بھی بھیج دیتے خواہ میری مرضی ہو نہ ہو اور پھر نادر شاہ سے نمٹتے رہتے۔ اب بھی میرے ذہن میں بہت کچھ کلیئر نہ تھا۔

میں نے بہت جلد اندازہ کرلیا کہ میرے گھر سے باہر جانے پر پابندی ہے۔ گھر کے اندر انتقامی اکھاڑ پچھاڑ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا اور استاد کو بیوی نے ٹی وی کے سامنے سے اٹھالیا تھا۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا کہ گھر کے اصل مالک کو آج کے مکین یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ مراد ہاؤس جس کے نام پر تھا وہ ایک ''حادثے'' میں منظر سے غائب ہوگیا تھا اور اب یوم حشر تک ہونٹوں پر فریاد لیے پڑا تھا کہ مجھے تو منظر سے ہٹایا گیا تھا۔ پانچ ارب انسانوں کی اس دنیا میں کل اس راز سے آشنا ہونے والا میں دوسرا شخص تھا۔ مراد ہاؤس کا معمار ہوش و حواس سے بیگانہ ایک گوشۂ تنہائی میں بند تھا اور اسے ذرا فکر نہ تھی کہ کسی کو اس کا خیال نہیں۔ دنیا جائے عبرت سرائے فانی ہے۔

میں نے بہتر سمجھا کہ انور کے ساتھ رہ کے اس کے کام

میں ہاتھ بٹاؤں۔ آج تو ان سب نے مل کے میری راہ میں دیوار کھڑی کر دی۔ کل کے بارے میں کنفیوژن باقی تھا۔ اس میں نے روبی کو اوپر جاتا دیکھا اور اس کے پیچھے گیا۔ اس نے پھر روپ بہروپ بدلا تھا۔ اور خزاں پر بہار کے رنگ بڑی نمایاں تبدیلی لگتے تھے۔ کل وہ ہلکے زرد رنگ کے دھانی ملبوس میں تھی آج گلابی لباس کا عکس اس کے رخساروں میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ میرے قدموں کی آواز پر اس نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"تمہارے گال خفگی یا کسی بچے کی طرح پھولے ہوئے ہیں۔" وہ بولی۔ "اندر آجاؤ اور اطمینان سے بیٹھ کے بولو۔"

میں اس کے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "یہ کیا حرکت تھی آخر ہاتھ جوڑنے کی۔ یہ بلیک میلنگ تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ "آج کل سب کرتے ہیں۔"

"اگر میں تمہاری بات نہ مانتا۔"

وہ آنکھیں گھما کے بولی۔ "یعنی یہ بھی ہوسکتا تھا؟ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"تم خوب صورت لڑکیوں کو بڑا غرور ہوتا ہے اپنی قوتِ تسخیر پر کہ ہم کچھ بھی کرا سکتے ہیں کسی بھی الو کے پٹھے سے..."

اس نے مسکرا کے کہا۔ "تھینک یو، اگر یہ میری تعریف تھی۔ اپناؤ کر آپ نے جن الفاظ میں کیا..." وہ ہنس پڑی۔

"روبی، تم مجھ پر اعتماد کرتی ہونا، مجھے بتاؤ یہ چکر کیا ہے؟"

"کوئی چکر نہیں بلکہ چکر ختم کر دیا گیا ہے۔ ایک مسئلہ تھا حل ہوگیا اور اس کا سارا کریڈٹ جاتا ہے استاد محترم غلام محمد صاحب کو... انور بھی بہت متفکر تھا اور فکر ہمیں بھی تھی۔ ریشم کو اور مجھے... اس نے کہا کہ فکر مت کرو، ایک بار اس کو بہت بڑی مشکل سے نکالا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے پھر خطرہ ہو تو میں دیکھتا رہوں کہ ہر بار میں ہی بچاؤں... اتنا وقت گزر گیا اس نے اپنی احسان مندی بھی ثابت کی اور سعادت مندی بھی۔ آج اس کی ضرورت تم سب کو ہے۔ جتنی ایک دوسرے کی ہے اتنی ہی... اور میں بھی ہوں یہاں تو تمہاری مشکل میری مشکل ہے۔ فکر مت کرو، نہ اسے کچھ ہوگا نہ تمہیں... نہ کسی اور کو... بس اس کو باہر مت نکلنے دینا۔"

"یہ استاد نے کہا؟ کیوں؟ اور کب تک؟"

"انور نے تمہیں نہیں بتایا، اکیلے باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ فرمائیں جناب۔"

"تم بھی جانتی ہو، کب تک قید میں رکھا جائے گا مجھے؟"

وہ شرارت سے مسکرائی۔ "قید کہنا زیادتی ہے۔ یہ حفاظتی تحویل ہے۔ جب تک خطرہ ہے، لو چاکلیٹ کھاؤ امپورٹڈ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "بھاڑ میں گئی چاکلیٹ... میں استاد سے پوچھتا ہوں۔"

استاد پر عجیب کاہلی سوار تھی۔ ہر وقت ٹی وی کے سامنے صوفے پر نیم دراز چائے پیتے رہتے تھے۔ میں نے ٹی وی آف کر کے کہا۔ "استاد! مجھے بات کرنی ہے تم سے... یہاں نہیں باہر چلو۔"

"ارے یہ ڈراما ختم ہونے والا تھا بیٹا۔ دس منٹ۔"

میں نے کہا۔ "ایک منٹ بھی نہیں۔ صبح سے تماشا بنا رکھا ہے مجھے۔ نہ انور کچھ بتاتا ہے نہ روبی... کہتے ہیں تم کو معلوم ہے۔"

استاد کو میرے ساتھ باہر آنا پڑا۔ ایک درختوں کے جھنڈ میں گھنی چھاؤں کے نیچے پرندے بے خوفی سے پھر رہے تھے انہوں نے ہمیں زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ "دیکھ منّا! ایسا نہیں کہ میں بوڑھا یا کم ہمت ہوگیا ہوں۔ میں... ہوگیا ہوں" استاد نے اپنی شان میں ایک عام فہم لفظ استعمال کیا۔ "کیونکہ میں نے شادی کرلی۔ اور اب میں عام شادی شدہ آدمی کی طرح سوچتا ہوں، کب بچے ہوں گے۔"

"کب ہوں گے؟" میں نے اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے سوال کیا۔

"بہت جلد... بہت جلدی... ذرا اپنی بھابی سے کہنا کاہلی نہ کرے۔ تو شادی کے بعد میں نے بھی بہادری سے توبہ کرلی اور زن مریدی اختیار کی۔ بڑی مشکل سے اپنے گزرے وقت سے جان چھڑائی جو آسیب کی طرح پیچھے لگا ہوا تھا۔ تو جانتا ہے سب... اور استاد چلتا رہتا صراطِ مستقیم پر تو شیطان سے ولی بنتا۔ پیسا بہت تھا۔ کوئی بزنس کرتا کسی کارِ خیر میں لگاتا۔ لیکن بیچ میں کود پڑا شیطان۔ اب دیکھ کس حال میں پڑا ہے۔"

"تم سکندر شاہ کی بات کررہے ہو؟"

"میرا سب ریت کا محل سمندر کی ایک لہر میں بہہ گیا۔

مجھے پھر وہ کام کرنا پڑا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا اور پھر بھاگ پڑا۔ روپوشی میں رہنا پڑا۔ یہاں آ کے سوچا تھا کہ تم سب نے اتنی محبت سے روکا ہے تو اپنی زندگی میں سکون آگیا ہے۔ ابھی تو میں کچھ نہیں کروں گا۔ پھر مراد نگر لوٹ میں میرے کرنے کو کچھ نہ ہوا تو اس کی مسجد کی امامت کروں گا۔ کام بہتیرے ہیں لیکن اس سے پہلے نادر شاہ آگیا۔"

"نادر شاہ، وہ تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔"

"میں تو جان گیا ہوں اسے اور اس سے مجھے کیا۔ اس جیسے نہ جانے سیکڑوں ہزاروں دنیا میں شیطان کے چیلے بنے پھر رہے ہیں مگر وہ آگیا میری جان کا دشمن ہو کے... یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے انور نے بتایا اور ہم نے لمبی بات کی اور میں نے بہت سوچ کے فیصلہ کیا کہ مسئلے کا ایک ہی حل ہے وہ یہ کہ مسئلہ ختم کر دیا جائے۔ مسئلہ ہے نادر شاہ... تو نادر شاہ کو ختم کر دیا جائے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "ختم کر دیا جائے، کیا مطلب؟ تم پھر..."

اس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہیں جیسے انور اپنے تعلقات کو استعمال کرے گا جو اس کے باپ کے تعلقات تھے۔ اس درگاہ کو محکمۂ اوقاف والے اپنی تحویل میں لے لیں گے۔"

"کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟"

"ابھی نہیں ہے۔ ہو جائے گا۔ جیسے تو میرے لیے بیٹوں کی طرح ہے، ایک شاگرد ہے میرا۔ خود کو شاگرد سمجھتا ہے کسی سے قرض واپس مانگنا یا احسان کا بدلہ طلب کرنا اچھی بات تو نہیں ہے مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں نے اسے پیغام بھجوا دیا کہ ایک کام آپڑا ہے تجھ سے... تو ہمیشہ کہتا تھا کہ استاد خدمت کا موقع دو... میری مشکل آسان کر... اس کا جواب بھی آگیا کہ استاد سمجھو کام ہو گیا۔"

"میں سمجھا نہیں، تم کس کام کی بات کر رہے ہو؟"

"یہی نادر شاہ کو ختم کرنے کا۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔

میں اچھل پڑا۔ "ختم کرنے کا کیا مطلب؟"

وہ مسکرایا۔ "اب ختم کرنا نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ کہ تجھے خطرہ نادر شاہ سے ہے نا، تو یہ خطرہ ختم ہو جائے گا بہت جلد۔"

میں رک کر اسے دیکھتا رہا۔ "کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟"

"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا منا، مگر اب تو بے فکر ہو جا۔"

دروازہ کھول کے اس کی بیوی نے چلانا شروع کر دیا۔ "کہاں سیر سپاٹے میں لگے ہوئے ہو کام چھوڑ کے۔"

"دیکھا، ایسی ہوتی ہیں بیویاں... مگر بھائی ان کے بغیر دنیا نہیں چلتی۔" وہ مجھے چھوڑ کے چل پڑا۔ کچھ دور گیا اور واپس آیا۔

"واقعی کیسے نکیل ڈالی ہے تمہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے میری آنکھوں میں دیکھا۔ "روبی اچھی لڑکی ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہ بتانے واپس آئے تھے؟"

"تیرے لیے اچھی ہے۔" وہ بولا اور میرا کندھا ہلایا۔

میں بے حس و حرکت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا استاد؟"

وہ ہنسا۔ "مطلب کی بات اچھی طرح سمجھ لی ہے تو نے اور تیری بھابی نے تو پرسوں رات دیکھ بھی لیا تھا جب وہ تیرے کمرے سے نکلی تھی۔"

☆☆☆

"روبی! کیا مصیبت ہے آخر تمہاری تیاری..." میں نے ٹیرس سے چلا کے کہا جہاں میرے سامنے شہر کا پاٹ کسی برساتی ندی کی طرح پھیلا ہوا تھا اور اس پر دو سفید آبی بگلے ابھی ابھی اُترے تھے۔

"پھر بیڈ پر اپنا کباڑ خانہ پھیلا کے باہر کھڑے چلا رہے ہو۔" اس نے اندر سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ... اتنے سگھڑ سلیقہ مند شوہر کو پھوہڑ کہہ رہی ہو۔" میں نے اندر جا کے دیکھا۔

اس نے تھوڑا سا زرد ہو جانے والا ایک اخبار لہرایا۔ "یہ کیا ہے۔ نکالا تھا تو واپس الماری میں کیوں نہیں رکھا۔ اور آخر کب تک سنبھال کے رکھو گے اسے؟"

میں نے تہ کیے ہوئے اخبار کو پلٹ کر دیکھا۔ اس پر نادر شاہ کی دھندلی پڑ جانے والی تصویر ایک سال پرانی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے واپس ایک فائل میں رکھ دیا۔ "دراصل آج ایک سال ہو گیا اس کے مارے جانے کی خبر کو۔"

"کوئی اور تاریخ نہیں رکھ سکتے تھے تم شادی کی؟"

"تاریخ میں نے نہیں، باقی سب نے مل کر طے کی تھی۔ تم سے بھی پوچھا تھا۔"

"اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی دن تمہارا ماما نادر

شاہ بھی جہنم رسید ہوگا۔'' اس نے آخری بار خود کو آئینے میں دیکھا۔

''مجھ سے پوچھو تم کتنی حسین لگ رہی ہو۔'' میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''اب چلو۔''

وہ آبادی ہمارے پیچھے تھی جس کو لوگ اب مراد نگر تو نہیں ''ریشم کی بستی'' کے نام سے جانتے ہیں۔ نصف سے زیادہ مکانات مکمل ہو چکے ہیں اور باقی زیرِ تکمیل ہیں۔ ہم نے اپنا ایک کنال کے باغ والا گھر نہر کے کنارے تھوڑی سی بلندی پر تعمیر کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ہم پرائمری اسکول کے سامنے سے گزرے۔ یہ روبی نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے تعمیر کیا ہے اور وہی اس کو چلاتی ہے۔ یہ ایک کمیونٹی ویلفیئر اسکول ہے۔ آج اس کو رنگین کاغذی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی سینٹر ہے۔ اس کو استاد کی بیوی ریشم کے ساتھ مل کر چلاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ اسے اندر ہی رہائش فراہم کر دی گئی ہے یہاں آنے والوں میں گرد و نواح کے مریض بھی شامل ہیں ان سب کو ہر قسم کی مفت ادویات فراہم کرنے کی ساری ذمے داری ملک غلام محمد صاحب نے اٹھا رکھی ہے۔

گاڑی اس درگاہ کا طواف کر کے سڑک پر آگئی جو اب محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ اس سے دو فرلانگ کے بعد وہ پل آگیا جو نہر پر نہ جانے کب تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک سے گزرتے ہوئے قسمت نے ریلوے لائن کا کانٹا بدلنے والے کی طرح میری زندگی کے سفر کی منزل بدل دی تھی۔ یہاں پہنچ کے سکھر سے میرے ساتھ شریکِ سفر ہونے والی نورین کی زندگی کا آخری اسٹیشن اچانک آگیا تھا۔

میں نے گاڑی کو نیچے اتارا اور سڑک کے کنارے نہر پر روک لیا۔ ''یہ کہاں رک گئے؟'' روبی نے کہا۔ ''ہمیں تو انور بھائی اور ریشم کے گھر جانا تھا۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے اتار لیا۔ ''چلتے ہیں وہاں بھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے میری گاڑی نیچے پانی میں گری تھی۔''

روبی نے دلچسپی سے دیکھا۔ ''بڑی مضبوط ہڈیاں ہیں تمہاری... پانی تو ہوگا اس وقت بھی؟''

''ہاں، گاڑی پانی میں ڈوب گئی تھی۔ بعد میں ریشم ایک رات میرے ساتھ آئی اور میں نے کچھ سامان نکالا۔ پانی میں غوطہ مار کے اصل میں تو دس لاکھ روپے نکالے تھے۔''

''دس لاکھ۔ کہیں سے لوٹے تھے؟'' وہ ہنسی۔

میں نے سلمان خان کو یاد کر کے کہا۔ ''تحفہ تھے کسی کا۔'' اور اس کے ساتھ آگے چل پڑا۔

''تم کو ریشم نے ڈوبنے سے بھی بچایا تھا؟'' وہ خراماں خراماں چلتی رہی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، اسی جگہ وہ دو لڑکیوں کے ساتھ کچھ کر رہی تھی۔ غالباً کپڑے دھو رہی تھی۔ آج یہ کتنی پرانی بات لگتی ہے۔''

''میں اسے نہیں جانتی تھی۔ اب کدھر جانا ہے۔''

''ادھر آؤ، اس کے پیچھے والا گھر ریشم کا تھا جہاں وہ مجھے اٹھا کے لے گئی تھی اور میں ڈیڑھ مہینا رہا تھا۔''

میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک داڑھی والا تہبند پوش برآمد ہوا۔ ''سلام حضور۔''

میں روبی کے ساتھ اندر گیا۔ یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی تھا۔ سامنے والے کمرے میں وہ چارپائی بھی موجود تھی جس پر میں نے ریشم کے باپ کا خون آلودہ لاشہ دیکھا تھا۔ پیچھے والا کمرا ابھی اصل حالت میں موجود تھا۔ بڈھا وہی تھا جس کی نیت ریشم کے باپ کی زمین پر قابض ہونے کی تھی۔ بعد میں انور نے اس کو حویلی کے صحن میں بٹھا کے اچھی جوتا کاری کی تھی۔ اب وہ زمین بھی اسے مل گئی تھی اور وہ یہاں رہتا بھی تھا لیکن اپنی رہائش کے لیے اس نے صحن کے دوسرے کنارے پر دو کمرے تعمیر کیے تھے۔ اب سورج غروب ہونے کو تھا اور اندر اندھیرا پھیل رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آج جمعرات ہے۔ تم نے چراغ نہیں جلایا؟''

''ابھی جلاتا ہوں حضور۔'' وہ بولا۔ ''ریشم بی بی اور چودھری انور بھی ابھی ہو کے گئے ہیں۔''

روبی نے آہستہ سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا خیال ہے، چلیں؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ہماری شادی کی سالگرہ منانے کا انہوں نے بڑا اہتمام کیا ہے۔''

گاڑی آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ نئے راستے سے گزرتی چودھریوں کی نئی حویلی کی طرف بڑھنے لگی جو انور نے پرانے نقشے کے عین مطابق بنوائی تھی۔

میں وہ جواری تھا جو زندگی ہارتے ہارتے سب کچھ جیت گیا تھا۔

اوباش

سلیم انور

آزادی نعمت ہے تو زحمت بھی ہے... ایسی زحمت جسے بھگتتے ہوئے کتنی جانیں فنا ہو جاتی ہیں... مغرب کی آزاد پرستی نے عورتوں کی زندگی کو زنگ زدہ کر ڈالا ہے... وہ چاہنے کے باوجود ناپسندیدہ عوامل سے نجات حاصل نہیں کر پاتیں... ایسی ہی لڑکی کی دل دوز کتھا... جس کی آنکھوں میں باعزت زندگی گزارنے کے خواب سجے تھے...

ایک تیر سے کئی شکار کر لینے والے شاطر کا ماہرانہ جال

ڈیوڈسن ونڈو ڈسپلے میں لگے ہوئے مردانہ اوور کوٹس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کسی طور پر ہیڈ کوارٹر کا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں ایک کامیاب وکیل یا شاید ڈاکٹر تصور کیا جا سکتا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک سراغ رساں تھا۔

بارش مسلسل پھوار کی شکل میں ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھی۔ اس وقت رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔

اتنے میں ایک لڑکی چپکے سے ڈیوڈسن کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ بظاہر وہ بھی ڈسپلے ونڈو میں لگے مردانہ اوور کوٹس دیکھنے میں مگن تھی لیکن درحقیقت وہ ڈیوڈسن کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر وہ گویا ہوئی۔ ''خاصی بھیگی رات ہے... ہے نا؟''

ڈیوڈسن نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی کا لباس بھڑکیلا لیکن شکن آلودہ تھا۔ اس نے شوخ رنگ کا ایک ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر موجود پتلا سا ٹاپ کوٹ بارش میں بھیگ چکا تھا۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں ایک دعوت عیاں تھی۔ سرخ لپ اسٹک سے سجے چمکدار ہونٹوں پر ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی دعوت کا ساتھ دے رہی تھی۔

''ہاں، خاصی بھیگی رات ہے۔'' ڈیوڈسن نے کہا۔ ''کاش میں اس وقت گھر کے اندر ہوتا۔ لیکن ایسے موسم میں گھر کے اندر تنہائی کاٹتی ہے۔''

''میرے پاس کارنر پر ہی ایک کمرا موجود ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''تو پھر دیر کس بات کی۔'' ڈیوڈسن نے کہا۔ ''آؤ، وہیں چلتے ہیں۔''

وہ دونوں چلتے ہوئے کارنر کے ایک دو منزلہ فریم ہاؤس پہنچ گئے جو موسموں کے اثر سے خاصا بدرنگ ہو چکا تھا۔ لڑکی اسے اوپری منزل پر لے آئی اور ایک بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی لائٹ کا سوئچ بھی آن کر دیا۔ کمرا روشنی میں نہا گیا۔

ڈیوڈسن نے اپنا ہیٹ اور اوور کوٹ اتار دیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ لڑکی کو دیکھنے لگا۔

لڑکی نے اپنا بھیگا ہوا ٹاپ کوٹ اتار کر ایک ہینگر پر لٹکا دیا اور اپنا ہیٹ الماری کے خانے میں رکھ دیا۔ اس کی زلفیں تانبے کی رنگت کی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں کئی مرتبہ بلیچ کیا جا چکا ہے۔

پھر اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے ڈیوڈسن کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں تمہیں کیسی لگی، بگ بوائے؟''

ڈیوڈسن نے ستائشی انداز میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''یقیناً تم مجھے اچھی لگی ہو۔ لیکن میں چاہوں گا کہ بہتر ہوگا تم بے لباس ہو جاؤ۔''

''اوہ گاڈ!'' لڑکی نے کہا۔ ''تم تو خاصے بے صبرے ہو۔''

پھر وہ اپنا لباس اتارنے لگی۔ اس کا جسم اکہرا تھا اور وہ چہرے کے مقابلے میں جسمانی طور پر کم عمر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بدن پر اب صرف زیر جامہ رہ گیا تھا۔ تب اس نے ڈیوڈسن کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کچھ رقم کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ڈیوڈسن نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند مڑے تڑے نوٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنی رقم؟''

''اسٹینڈرڈ معاوضہ دو سو ڈالر ہے۔''

''یہ پانچ سو لے لو۔ میں رات یہیں قیام کروں گا۔'' ڈیوڈسن نے رقم دیتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے اپنے زنانہ لمبے موزے اتار دیے اور اپنے جوتے پہن لیے۔ پھر ڈیوڈسن کے دیے ہوئے سو ڈالر کے پانچوں نوٹ تہ کر کے اپنے بائیں پیر کے جوتے کے اندر دبا لیے۔ پھر اٹھ کر ڈیوڈسن کے برابر صوفے پر آن بیٹھی۔

ڈیوڈسن اس کے نیم عریاں بدن کا جائزہ لینے لگا پھر بولا۔ ''یہ جسم تین سال پہلے کہیں زیادہ دلکش تھا جب تم ہائی ڈی ہو نامی رنگا رنگ پروگرام میں ہیجان انگیز رقص پیش کیا کرتی تھیں۔''

یہ سنتے ہی وہ لڑکی صوفے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی اور کرخت لہجے میں بولی۔ ''تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی؟''

ڈیوڈسن نے دانت نکال دیے اور سکون کے ساتھ گویا ہوا۔ ''تم مجھے یاد ہو۔ تم میری نورس ہو۔ تم نے اس شو سے اس وقت کنارہ کشی اختیار کر لی تھی جب سلک وائٹ مین سے تمہارے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ اس نے تمہیں آوارہ گرد بنا دیا ہے۔''

''تم مجھے بڑی بے باکی سے آوارہ گرد کہہ رہے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں آوارہ گرد ہوں تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں تم سے سلک وائٹ مین کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔'' ڈیوڈسن نے کہا۔

''مجھے سلک وائٹ مین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' ڈیوڈسن نے کہا۔ ''وہ تین سال تک تمہارا بوائے فرینڈ رہا ہے۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' لڑکی نے چیخ کر کہا۔

''ہاں۔'' ڈیوڈسن نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اور یہ پوچھنا میرا معاملہ ہے کہ تم نے آج سہ پہر اسے قتل کیوں کیا ہے؟''

یہ سنتے ہی لڑکی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''سلک... قتل ہو گیا ہے؟'' اس نے گھٹی ہوئی سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''یہ حقیقت ہے۔'' ڈیوڈسن نے کہا۔ ''ہمیں اس کی

لاش ایک گلی میں پڑی ملی ہے۔ اس کی کھوپڑی میں ایک سوراخ تھا۔ یہ سوراخ گولی لگنے سے پیدا ہوا تھا۔"

لڑکی یہ سن کر اپنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "سلک... مرچکا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"بے شک وہ مرچکا ہے اور اسے تم نے قتل کیا ہے۔ اس نے تمہیں آوارہ بنا دیا تھا اور تمہاری کمائی پر زندگی بسر کررہا تھا۔ تم سے جہاں تک برداشت ہوسکتا تھا، تم برداشت کرتی رہیں۔ لیکن جب گزشتہ شب وہ تین فلپائنی طوائفوں کو لے آیا تو تم نے فیصلہ کرلیا کہ اب برداشت کی انتہا ہوگئی ہے۔ پارک ایونیو کی دوسو ڈالر فی شب کی بے بی سے بیس ڈالر کی فلپائنی طوائف بننا بہت زیادہ تنزلی تھی۔ سو تم نے سلک وائٹ مین کو قتل کردیا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" لڑکی نے کہا۔

"نہیں۔" ڈیوڈسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں اور تم یہ خود بھی جانتی ہو۔"

"تم آخر ہو کون؟" لڑکی نے پوچھا۔

"میں سراغ رساں ڈیوڈسن ہوں اور میرا تعلق ہیڈ کوارٹر سے ہے۔"

لڑکی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سینے پر دل کے مقام پر چلا گیا۔ "تم میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتے، آفیسر۔"

"میرے پاس تمہارے خلاف بہت سا مواد موجود ہے۔" ڈیوڈسن نے کہا۔ "میں نے تمہیں پانچ سو ڈالر کے جو نوٹ دیے ہیں وہ تمام کے تمام نشان زدہ ہیں۔ تم لوگوں کو گناہ کی ترغیب دینے کے جرم میں دو تین مرتبہ گرفتار بھی ہو چکی ہو۔ اس مرتبہ تم پر ایک پیشہ ورانہ اور عادی طوائف کا جرم عائد ہوگا۔ اس کا مطلب ایک سخت سزا ہے۔"

"یہ قتل کے جھوٹے الزام میں بجلی کی کرسی تک پہنچنے کی سزا کے مقابلے میں ایک بہتر سزا ہوگی۔" لڑکی نے کہا۔

"سلک وائٹ مین کے قتل کا اعتراف کرلو تو تب تمہیں بجلی کی کرسی تک نہیں جانا پڑے گا۔ تم آزاد ہوجاؤ گی۔ سلک وائٹ مین دغاباز اور بھگوڑا تھا۔ اس کے نہ ہونے سے اب دنیا بہتر ہوگئی ہے۔ جب جیوری تمہاری داستان سنے گی تو اس بات سے اتفاق کرے گی کہ سلک وائٹ مین کو ٹھکانے لگانے میں تم حق بہ جانب تھیں۔"

"میں کسی ایسی بات کا اعتراف نہیں کروں گی جو میں نے نہیں کی۔" لڑکی نے جواب دیا۔

ڈیوڈسن نے یہ سن کر شانے اچکا دیے۔ "تو پھر بازاری طوائف کی سزا پانچ سال ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا۔ "بات بالکل سیدھی ہے، بے بی۔ سلک وائٹ مین کو قتل کرنے کا اعتراف کرلو تو تم آزاد ہوگی۔ انکار کیا تو اس دوسرے الزام میں تمہیں جیل جانا پڑے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس کا انتخاب کرتی ہو۔"

"مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم یہ سب کچھ ایمانداری سے کہہ رہے ہو، آفیسر؟ فرض کرو کہ میں اس قتل کا اعتراف کرلیتی ہوں... جو کہ میں نے نہیں کیا؟ فرض کرو کہ میں آزاد ہوجاتی ہوں۔ تم اپنی بات سے پلٹ سکتے ہو اور پھر مجھ پر بازاری ہونے کا الزام عائد کرسکتے ہو۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" ڈیوڈسن نے کہا۔
لڑکی غور سے ڈیوڈسن کا جائزہ لینے لگی پھر بولی۔
"پولیس والے نہایت گھٹیا اور کمینے ہوتے ہیں۔"
ڈیوڈسن یہ سن کر ہنس دیا۔ پھر وہ صوفے سے اٹھا اور لڑکی کے برابر بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لڑکی کے شانے پر رکھ دیا۔
لڑکی تنک کر بولی۔ "اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے پرے رکھو دو غلے آدمی۔"
"میں ان قلپائی طوائفوں سے بدتر تو نہیں ہوں، ہے نا؟" ڈیوڈسن نے کہا۔
لڑکی یہ سن کر شرماسی گئی۔ "میرا خیال ہے تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ جیسی لڑکی کے کوئی احساسات نہیں ہوتے ہیں؟"
"یقیناً ہوتے ہیں۔" ڈیوڈسن نے کہا۔ "مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے۔ تم ایک مشکل دھندے میں پڑی ہوئی ہو۔ مجھے تمہاری مشکل کا احساس ہے۔"
"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لڑکی نے درشتی سے کہا۔
"یہ بہت بُرا ہوا کہ تم نے اس بینک کلرک سے شادی نہیں کی۔ کیا نام تھا اس کا؟"
"تمہارا مطلب... بین گورڈن سے ہے؟ لگ رہا ہے کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو، آفیسر۔"
ڈیوڈسن نے شانے اچکا دیے۔ "بین گورڈن تمہارے لیے ایک اچھا شوہر ثابت ہو سکتا تھا، بے بی۔"
"میرا خیال بھی یہی ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "لیکن... ویل! سلک وائٹ مین اس سے کہیں زیادہ چوکس اور ہوشیار تھا۔ میں اس پر ریجھ گئی تھی۔"
"کبھی بین گورڈن نے تم سے کوئی رابطہ کیا؟"
لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
ڈیوڈسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "ویل ہنی۔" اس نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم اب طے کرلو کہ کیا کرنا ہے۔ تمہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے... سلک وائٹ مین کے قتل کا اعتراف یا سڑکوں پر آوارہ گردی اور لوگوں کو گناہ کی طرف مائل کرنے کے جرم میں پانچ سال کی قید؟"
"کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے رہائی مل جائے گی؟" لڑکی نے پوچھا۔
"یقینِ کامل ہے۔"
"تب... میں اقرار کرتی ہوں۔ میں نے سلک وائٹ مین کو قتل کیا ہے۔"
"کس طرح؟"
"میں نے... اُسے گولی ماری ہے۔"
"تم نے اسے گولی نہیں ماری۔ تم نے اسے خنجر سے قتل کیا ہے۔" ڈیوڈسن نے کہا۔
"آل رائٹ۔ میں نے اسے خنجر سے قتل کیا ہے۔"
ڈیوڈسن ہنس دیا۔ "او کے، مکروہ آوارہ گرد عورت! مجھے بس یہی چاہیے تھا۔ میں نے اس کمرے میں ایک ڈکٹا فون لگا رکھا ہے... اور دو گواہ دروازے کے باہر سب کچھ سن رہے ہیں۔ اب تمہیں سلک وائٹ مین کے قتل کے الزام میں بجلی کی کرسی پر بیٹھنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کو جکڑ لیا۔
لڑکی نے چلانا شروع کر دیا اور خود کو ڈیوڈسن کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔
اور تب ایک الماری کا پٹ دھڑ سے کھلا اور اس میں چھپا ہوا ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ اس نے ڈیوڈسن کی جانب کر دیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "تم پر خدا کی لعنت ہو گھٹیا سراغ رساں۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو۔"
لڑکی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "بین... بین گورڈن! تم؟"
بڑھی ہوئی شیو والے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ہاں، بین گورڈن ہی ہوں۔ میں نے تمام باتیں سن لی ہیں۔ میں نے یہ بھی سن لیا ہے کہ اس مرکھنے بیل نے کس طرح تم سے سلک وائٹ مین کے قتل کا اقرارِ جرم کرایا ہے، میری۔ لیکن یہ اب بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اور نہ ہی تمہارے اقرارِ جرم کو تمہارے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ سلک وائٹ مین کو تم نے قتل نہیں کیا ہے۔ اسے میں نے قتل کیا ہے۔"
"تم... تم نے اُسے قتل کیا ہے؟"
"ہاں، تین سال قبل جب تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا تو بینک کو پتا چل گیا کہ میں حساب میں خرد برد کر رہا تھا۔ مجھے سزا ہو گئی اور میں جیل چلا گیا۔ گزشتہ ہفتے میں نے ایک گارڈ کو مار ڈالا اور جیل سے فرار ہو گیا۔ پھر میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا۔ مجھے پتا چل گیا کہ تم پر اس دوران میں کیا گزری ہے۔ سلک وائٹ مین نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے پاداش میں، میں نے اسے قتل کر دیا۔ اس نے تمہیں کیا بنا دیا ہے۔"
"لیکن... لیکن... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" لڑکی

نے پوچھا۔

''میں آج رات چپکے سے یہاں تمہارے کمرے میں آگیا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں اس کے ہمراہ یہاں آتے دیکھا تو الماری میں چھپ گیا۔ میں وہ سب سنتا رہا جو یہ کہہ رہا تھا۔ یہ کم بخت سراغ رساں ہمیشہ ڈبل کراس کر جاتے ہیں۔ اس نے اپنی پیچھے دار باتوں سے تمہیں اس بات پر قائل کرلیا کہ تم سلک وائٹ مین کے قتل کا اعتراف کرلو جبکہ حقیقت میں تم معصوم اور بے گناہ ہو۔ اس نے زبردستی تم سے جرم کا اقرار کرا کے تمہیں بجلی کی کرسی تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔''

''سو تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ تم نے سلک وائٹ مین کو قتل کیا ہے... تم اقرار کرتے ہو بین گورڈن؟'' ڈیوڈسن نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' بین گورڈن نے کہا۔ ''لیکن تم اس الزام میں مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ میں اور میری یہاں سے جارہے ہیں... تم اپنا لباس پہن لو۔''

لڑکی نے اپنا پورا لباس پہن لیا۔ اس دوران بین گورڈن ڈیوڈسن کو اپنے ریوالور کی زد میں لیے رہا۔

جب لڑکی پوری طرح تیار ہوگئی تو بین گورڈن نے الٹے قدموں سے کمرے کے دروازے کی جانب بڑھنا شروع کردیا۔

لیکن ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو باوردی پولیس افسر دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی آمد اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ بین گورڈن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ انہوں نے بین گورڈن کے دونوں بازو سختی سے جکڑ لیے اور اس کا ریوالور چھین کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنادیں۔

پھر سراغ رساں ڈیوڈسن کے اشارے پر وہ اسے اپنے ہمراہ کمرے سے باہر لے گئے۔

ان کے جانے کے بعد ڈیوڈسن لڑکی کی جانب متوجہ ہوگیا جو شش و پنج کے عالم میں کھڑی تھی۔ وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ وہ یہاں بہت دیر سے چھپا ہوا ہے۔ میرے آدمی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تمہارے کمرے تک آگئے تھے۔''

''تو پھر انہوں نے اسی وقت اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟'' لڑکی نے حیرانی سے کہا۔

''ہم اس کے منہ سے اعتراف جرم سننا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے یہ ڈراما رچایا تھا۔'' ڈیوڈسن نے بتایا۔

''تمہارا مطلب ہے... تم نے دھوکے سے اس سے اس بات کا اقرار کرالیا کہ اس نے سلک وائٹ مین کو قتل کیا ہے؟'' لڑکی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، ہم نے چالبازی سے اس سے یہ اعتراف کرالیا ہے کہ اس نے ریاست کے اصلاحی جیل کے گارڈ کو قتل کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس اصلاحی جیل سے کئی ایک قیدی فرار ہوئے تھے۔ ان مفرور قیدیوں میں سے کسی ایک نے اس گارڈ کو قتل کیا تھا۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ قاتل کون سا مفرور قیدی ہے۔ سو ہم نے اس کی تلاش کے لیے یہ طریقہ کار اختیار کیا تھا۔''

''لیکن اس نے سلک وائٹ مین کے قتل کا اعتراف بھی تو کیا ہے...'' لڑکی نے کہا۔

ڈیوڈسن ہنس دیا۔ ''بین گورڈن نے اعتراف تمہیں بچانے کے لیے کیا تھا۔ اس نے سلک وائٹ مین کو بالکل اسی طرح قتل کیا تھا جیسے تم نے اسے قتل کیا تھا۔ اس لیے کہ سلک وائٹ مین قتل نہیں ہوا ہے۔ ہم نے اسے منشیات کا کاروبار چلانے کے جرم میں ہیڈکوارٹر میں حراست میں رکھا ہوا ہے۔''

یہ سن کر لڑکی بیڈ پر دھم سے بیٹھ گئی۔ ''تمہارا... تمہارا مطلب ہے کہ سلک وائٹ مین ابھی زندہ ہے؟''

ڈیوڈسن نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ''لیکن اب وہ تمہیں بالکل بھی تنگ نہیں کرے گا، بے بی۔ منشیات کا غلیظ کاروبار چلانے کے جرم میں اسے ایک لمبی سزا بھگتنا پڑے گی۔''

''لیکن... لیکن پھر میرا کیا بنے گا؟'' لڑکی نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

ڈیوڈسن نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر لڑکی کی گود میں اچھال دی۔

لڑکی نے چونک کر ڈیوڈسن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات عیاں تھے۔

''یہ تمہارا انعام ہے جو ریاست نے اصلاحی جیل کے گارڈ کے قاتل کو پکڑوانے کے لیے مقرر کیا ہوا تھا۔''

''اوہ۔'' لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر وہ پُرخلوص لہجے میں بولی۔ ''اب میں اس پیشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں گی۔ میں دور دراز کسی نئی جگہ چلی جاؤں گی اور ایک باعزت نئی زندگی کا آغاز کروں گی۔ میرے لیے دعا کرنا، آفیسر۔''

''گڈلک، لڑکی۔'' ڈیوڈسن نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

آخری مات

اقبال کاظمی

اعتبار و اعتماد کے سہارے بڑے سے بڑے محاذ پر لڑا جا سکتا ہے... اعتماد کی ایسی ہی رسی تھامے ایک دیوانے کی ہلچل مچا دینے والی فتنہ انگیزیاں... وہ منصوبہ ساز تھا مگر سب کی نظروں سے اوجھل صرف مظلومیت کی تصویر تھا... ایک مالدار عورت کے قتل سے شروع ہونے والی سنسنی خیز داستان... حسن و خوب صورتی کی بجلیاں گراتیں نازک اندام دوشیزاؤں کی دہکتی چنگاریاں... مال و متاع کی چاہ میں منزل سے قریب تر اور زندگی سے دور ہو جانے والوں کا خوفناک کھیل...

اقبال کاظمی کی تادیر یاد رہ جانے والی بے مثال تحریر

جون اوسکر کو تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن یاٹ کلب کی دعوت کو وہ مسترد نہ کر سکا۔ دعوت نامے پر اگرچہ بھیجنے والے کا نام نہیں تھا لیکن نیچے بائیں جانب پنسل سے ''ضرور آنا'' کے الفاظ درج تھے، اور اس کے ساتھ ہی سو، سو ڈالر کے کڑکڑاتے ہوئے پانچ نوٹ بھی لفافے میں موجود تھے۔ نوٹوں سے دلچسپی اور تجسس ہی اسے اس استقبالیہ تقریب میں کھینچ لانے کا باعث بنا تھا لیکن اب یہاں آ کر وہ پچھتا رہا تھا۔ اتنے مہمانوں میں کوئی بھی شناسا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اجنبیوں کی طرح الگ تھلگ کھڑا لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہجوم میں راستہ بناتا ہوا بار کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ بوربن کا گلاس اٹھا کر واپس مڑا ہی تھا کہ اس کی کہنی کو زور سے ایک جھٹکا لگا اور گلاس سے شراب چھلک کر اس کے قیمتی سوٹ پر گر گئی۔ اس نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا مگر اتنے ہجوم میں پتا نہ چل سکا کہ اس سے ٹکرانے والا کون تھا۔ وہ ایک طرف ہٹ کر رومال سے کپڑوں پر گری... شراب جھٹک رہا تھا کہ کان کے قریب نسوانی سرگوشی ہوئی۔

''مجھے افسوس ہو رہا ہے، کسی کی معمولی سی غفلت سے تمہارے سوٹ کا ستیاناس ہو گیا۔''

''اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اونچی سوسائٹی کے بعض لوگ بھی ایسی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ خون کھول کر رہ جاتا ہے۔'' اوسکر نے یہ کہتے ہوئے اس مخاطب کرنے والی کی طرف دیکھا جس نے اس کا سوٹ خراب ہونے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔

لڑکی کیا ایک قیامت تھی۔ ہونٹوں پر جگمگاتی مسکراہٹ، سرو قد، متناسب جسم، جھیل جیسی گہری نیلی آنکھیں، سرخ بال اور مخصوص تراش کا لباس جو اس کی کشش میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔

''پسند آئی یہ تقریب؟ تمہیں اس میں اپنی دلچسپی کی کوئی چیز نظر آئی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''نہایت بور!'' اوسکر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن لوگ جیسے، جیسے حلق میں شراب انڈیلتے جائیں گے، اس تقریب میں دلچسپی کا سامان پیدا ہوتا جائے گا لیکن اس تقریب کا اہتمام کس کی طرف سے ہے اور...؟''

''دوستوں کے اعزاز میں یہ استقبالیہ میری طرف سے ہے۔'' لڑکی نے اوسکر کی بات کاٹی۔ ''میری بہن نے اس کی پلاننگ میں میری مدد کی تھی لیکن تم اس قدر بوریت کا شکار ہو تو یہاں آئے کیوں تھے؟''

''یہاں میرے آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے لیکن... میں لوگوں کو دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ چہروں کا جائزہ لینا میرا مشغلہ ہے۔''

''گویا تمہیں کسی خاص فرد کا انتظار ہے، وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ تم بھی ہو سکتی ہو۔'' اوسکر نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بہت پُراسرار لگ رہے ہو۔''

''میرے بارے میں میرے دوستوں کا بھی یہی خیال ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تک تمہارا دوست نہیں آ جاتا، اس وقت تک میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ چلو، پورچ پر چلتے ہیں۔ وہاں کھڑے کھڑے لانچوں کا نظارہ کریں گے۔''

اوسکر اس کی دعوت کو مسترد نہ کر سکا۔ دونوں پورچ پر آ گئے جہاں نیچے پتھریلی دیوار سے ہلکی ہلکی لہریں ٹکرا رہی تھیں۔ چند فٹ نیچے ایک چھ فٹ چوڑی جیٹی تھی جو پانی میں دور تک چلی گئی تھی۔ جیٹی پر صرف دو لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ البتہ گہرے پانی میں تیرتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں مختلف

لانچوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ وہ دونوں ریلنگ کے قریب کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اوسکر نے اپنے گلاس کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا گلاس بھی خالی ہو چکا تھا۔

''تمہارا گلاس خالی ہو چکا ہے، لاؤ میں اسے دوبارہ بھر لاؤں۔'' اوسکر نے یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور مہمانوں سے بھرے ہوئے ہال میں داخل ہو گیا۔

اسے واپس آنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا مگر اس دوران میں لڑکی وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ اوسکر چند لمحے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس نے گلاس ہال کے دروازے کے قریب رکھی میز پر رکھ دیا اور اپنے گلاس سے ہلکی، ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے جیٹی کے قریب

لنگر انداز ایک لانچ کی طرف دیکھنے لگا۔

اوسکر کو وہاں کھڑے چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنا گلاس بھی خالی کر چکا تھا اور اَن جلا سگریٹ ہونٹوں میں دبائے لانچ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ دائیں جانب کی جیٹی سے شور کی آواز سن کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ''جلدی آؤ، کوئی پانی میں گر گیا ہے، اسے نکالنے میں ہماری مدد کرو۔''

اوسکر نے ریلنگ سے جھک کر نیچے دیکھا۔ ڈنر سوٹ میں ملبوس تین چار آدمی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور جیٹی پر گھٹنوں کے بل جھکے پانی میں سے کسی کو اوپر کھینچ رہے تھے۔ وہ کوئی عورت تھی۔ ایک لمحے کو اوسکر کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ سرخ بالوں والی میزبان لڑکی تو نہیں جو ریلنگ سے گر گئی ہو! لیکن اس کا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ وہ ادھیڑ عمر کی قدرے بھاری بھر کم عورت تھی جس کا گلابی رنگ کا لباس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے بال بھی اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہہ رہا تھا، جبکہ دوسرا آدمی اپنے طور پر اس عورت کی سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اوسکر نے ماچس نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چونک گیا۔ اس کی انگلیاں ماچس کے بجائے کسی اور چیز سے ٹکرائی تھیں۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا۔ وہ ایک خوب صورت نیکلس تھا جس میں کئی چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ درمیان میں انگور کے دانے کے برابر ہیرا تھا جو پورچ کی چھت پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اوسکر نے جلدی سے نیکلس جیب میں ڈالا اور محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کسی نے نیکلس اس کے ہاتھ میں دیکھا تو نہیں؟ آس پاس موجود ہر شخص کی توجہ اس جیٹی کی طرف تھی جہاں پانی سے نکالی جانے والی عورت کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اوسکر دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ نیکلس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی تھیں جن میں ایک انگوٹھی تھی اور دوسری چیز غالباً بریسلیٹ تھا۔ اس نے ماچس نکال کر سگریٹ کو سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لگاتا ہوا غیر محسوس انداز میں پورچ میں موجود لوگوں سے دور ہٹتا چلا گیا۔ وہ ریلنگ کے آخری سرے پر رک کر اس طرح جھک گیا جیسے جیٹی پر موجود لوگوں کی طرف دیکھ رہا ہو، لیکن کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی طرف کوئی متوجہ تو نہیں۔۔۔ پھر اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر نیکلس، انگوٹھی اور بریسلیٹ مٹھی میں دبا لیا اور ریلنگ پر کہنی ٹکا کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کی بند مٹھی پانی کی جانب تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ مسل کر پانی میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی بند مٹھی کھول دی۔ تینوں زیور پانی کی تہ میں پہنچ چکے تھے۔

وہ کچھ دیر اور ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے۔۔۔ متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سرخ بالوں والی وہ لڑکی اس طرح غائب ہو چکی تھی جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ دعوت نامے کے ساتھ پانچ سو ڈالر ملنا بھی ایک معما ہی رہا۔ راستے میں وہ سرخ بالوں والی اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ کون تھی۔ اس کے کوٹ کی جیب میں زیورات اس نے ڈالے تھے یا وہ محض اس کی توجہ بٹانے کے لیے اس سے ٹکرائی تھی، اور موقع سے فائدہ اٹھا کر زیورات کسی اور نے اس کی جیب میں ڈال دیے تھے؟

☆☆☆

رات اگرچہ وہ دیر سے سویا تھا مگر صبح اس کی آنکھ بہت جلد کھل گئی۔ دن کا اجالا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ دوبارہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب اپارٹمنٹ کے بیرونی ہال کے دروازے میں اخبار پھینکے جانے کی آواز سن کر وہ اٹھ گیا۔ اخبار کے صفحۂ اول پر ہی یاٹ کلب میں اس عورت کی موت کی خبر نمایاں سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ وہ بیڈفورڈ اینسلی تھی۔ بوسٹن کے ایک دولت مند شخص کی بیوی۔ اینسلی کو اونچی سوسائٹی کی جان سمجھا جاتا تھا۔ اخبار کے مطابق اینسلی تقریباً چالیس لاکھ ڈالر نقد اور جائداد کی مالک تھی اور یہ مال و دولت اسے پہلے شوہر کی موت کے بعد وراثت میں ملی تھی۔

اوسکر نے دو تین مرتبہ اس خبر کو پڑھا۔ وہ اینسلی کی موت کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا پھر یہ کہ اس کی جیب میں زیورات کس نے اور کس مقصد کے تحت ڈالے تھے؟ وہ جیسے جیسے سوچتا گیا، اس کا ذہن الجھتا رہا۔

☆☆☆

جمعے کی صبح اوسکر اپنے دفتر میں بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ اس نے جماہی لی اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف بیڈفورڈ تھا۔ اس کے لہجے سے حواس باختگی نمایاں تھی۔

''مسٹر اوسکر! میں ایک انتہائی اہم معاملے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ابھی ابھی اخبار کی ایک خبر سے پتا چلا ہے کہ یاٹ کلب کی تقریب میں شرکت کے لیے تمہیں جو دعوت نامہ بھیجا گیا تھا، اس پر پنسل سے 'ضرور آنا' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق وہ ہینڈ رائٹنگ میری بیوی کی تھی۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' اوسکر نے جواب دیا۔ ''میں تمہاری مدد ضرور کروں گا مگر اس قتل کے بارے میں، میں بھی اتنا ہی کچھ جانتا ہوں جو اخبارات میں چھپا ہے۔ مجھے تو اس تقریب میں تمہاری بیوی سے بات کرنے کا موقع تک نہیں مل سکا۔ اگر میرے دعوت نامے پر وہ تحریر اسی کی تھی تو مجھے یہ بھی علم نہیں ہو سکا کہ اس نے مجھے اس تقریب میں کیوں بُلایا تھا؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں ذاتی طور پر تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ پولیس کا خیال ہے کہ اپنی بیوی کو میں نے قتل کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح پولیس کو قائل کرو کہ قاتل میں نہیں ہوں۔''

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمہارے دفتر آجاؤں تاکہ ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکیں؟''

''میں دفتر میں نہیں، گھر پر ہوں۔ ٹھیک ہے، کل آجاؤ۔ ہم بات کرلیں گے۔'' ہیڈ فورڈ نے جواب دیا۔

اوسکر نے میں ملاقات کا پروگرام طے کر کے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن اوسکر صبح نو بجے ماربل ہیڈ پہنچ گیا۔ ہیڈ فورڈ اس وقت سوئمنگ پول کے کنارے ایک ایزی چیئر پر نیم دراز اُبلے ہوئے انڈے کھا رہا تھا۔ چہرے سے وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ اوسکر کو دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ ملانے میں ایسی گرم جوشی تھی جیسے وہ اوسکر کا بازو کندھے سے اکھاڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ پھر اس نے قریب کھڑی ایک سیاہ فام لڑکی کو کافی لانے کے لیے کہا۔

''اب بتاؤ میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟'' اوسکر نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک سے کچھ نہیں بتا سکتا۔'' ہیڈ فورڈ نے ایک اور انڈا چھیلتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات میں نے پولیس کو نہیں بتائی لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے پر ذرا سنجیدگی سے سوچو۔ میں تمہیں کسی بات سے لاعلم نہیں رکھنا چاہتا۔ تم نے اخبارات میں بھی پڑھا ہوگا کہ میری بیوی کو گرے ہاؤنڈ پالنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس اعلیٰ نسل کے کتے تھے جو اس علاقے میں ہونے والی ہر ریس جیتتے رہے لیکن تقریباً چھ سات ماہ ہوئے اس کے کتے برق رفتاری بھول کر کچھوے کی چال چلنے لگے۔ اس طرح لوگ ان پر لگائی جانے والی شرطیں ہارنے لگے۔ اس کے برعکس وہ کتے ریس جیتنے لگے جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ایک عام افواہ یہ تھی کہ میری بیوی کے کتوں کو کوئی نشہ آور چیز کھلائی جارہی تھی جس سے وہ دوڑنے کی صلاحیت کھو رہے تھے۔ ریس کلب کے ایک ماہر ڈاکٹر نے کتوں کا معائنہ کیا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی۔ میرا خیال ہے کہ میری بیوی نے تمہیں یاٹ کلب کی تقریب میں اسی لیے بُلایا تھا کہ وہ اس سلسلے میں تحقیقات کے لیے تمہاری خدمات حاصل کر سکے لیکن اسے تم تک پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیا گیا۔''

''پولیس کے بجائے یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' اوسکر نے اُلجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کی وجہ ہے۔'' ہیڈ فورڈ نے قدرے ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ میرا سالا اس میں ملوث ہو سکتا ہے لیکن میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے اس لیے میں یہ بات پولیس تک نہیں پہنچانا چاہتا اور لوگوں کو کسی قسم کا اسکینڈل گھڑنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا۔''

''جہاں اتنی باتیں ہیں وہاں ایک اور اسکینڈل سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' ان کی پشت سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ ''اسے ایسی باتوں کی پروا بھی کیا ہو سکتی ہے؟''

اوسکر نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دراز قامت، سنہری بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بیضوی شکل کی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کافی کے تین کپ نظر آرہے تھے۔

''کافی ڈورا ہی بنا رہی تھی۔ سوچا کہ میں ہی لے چلوں۔ میں تم لوگوں کی باتوں میں مخل تو نہیں ہوئی؟'' لڑکی نے کافی کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے مسکراتی نگاہوں سے باری، باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''میری سیکریٹری مس لیلا!'' ہیڈ فورڈ نے اس کا تعارف کرایا۔ ''حالات بہتر ہونے تک میں نے اسے یہیں روک لیا ہے۔''

لیلا نے ایک بار پھر مسکراتی نگاہوں سے اوسکر کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کا بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں پر گاگلز تھے۔ اوسکر کو ہیڈ فورڈ کے انتخاب کی داد دینی پڑی۔ اخبارات میں لیلا کا بھی تذکرہ تھا۔ بعض اخبارات نے اسے فورڈ کی محبوبہ قرار دیا تھا۔

''میرے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں ہے جس سے

ثابت ہو سکے کہ میرا سالا کتوں کو کسی قسم کی نشہ آور ادویات کھلانے کے معاملے میں ملوث ہے۔ یہ محض میرا شبہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔" بیڈ فورڈ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک کھلنڈرا آدمی ہے۔ عورتوں اور جوئے کے علاوہ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ ایک ٹرسٹ سے اسے کچھ ماہانہ وظیفہ ملتا ہے لیکن جب بھی اسے رقم کی ضرورت پڑتی، وہ میری بیوی کی منت ساجت کر کے حاصل کر لیتا لیکن گزشتہ موسمِ خزاں میں میری بیوی نے اس کی یہ امداد بھی بند کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح اس کا بھائی سدھر جائے اور کوئی کام دھندا کرنے لگے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس نے ڈیوڈ فیئر نامی ایک بدمعاش سے دوستی کر رکھی ہے۔ ڈیوڈ فیئر بھی اس رات یاٹ کلب کی تقریب میں موجود تھا۔"

"میں نے اسے بار کاؤنٹر پر دیکھا تھا۔" لیلا اس کے خاموش ہونے پر بولی۔ "اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔"

"لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس قتل میں ملوث ہو سکتا ہے؟" اوسکر نے کہا۔

"شاید!" بیڈ فورڈ بولا۔ "میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ میرا سالا اس قتل میں ملوث ہے یا نہیں۔ یہی معلوم کرنے کے لیے میں تمہیں فیس ادا کر رہا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں مجھے اپنی تحقیقات کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے؟ کوئی پوائنٹ؟" اوسکر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سب سے پہلے میں تمہیں کتوں کے رہنے کی جگہ دکھانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر تم چاہو تو ڈیوڈ سے ملاقات کر سکتے ہو۔"

"اگر میں تمہارے سالے سے ملاقات کو ترجیح دوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" فورڈ نے کندھے اچکائے۔ "اس کا نام بف بینڈٹ ہے۔"

وہ اٹھ کر کتا خانے کی طرف چل دیے۔ فورڈ آگے تھا۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے تیز تیز چل رہا تھا جس سے اس کی بدحواسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ کتا خانہ اوسکر کی توقع سے کہیں چھوٹا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو کمروں کے برابر رہا ہوگا۔ کتوں کا ٹرینر ایک پستہ قامت، بھاری بھرکم آدمی تھا۔ وہ اس وقت کسی خاص محلول سے ایک کتے کی مالش کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق 'ڈی ایم ایس او' نامی اس محلول سے رگوں اور پٹھوں کا کھنچاؤ ختم ہو جاتا ہے اور مالش سے یہ محلول کھال کے اندر پہنچ کر ساری تھکن اور ہر قسم کے درد کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اوسکر نے اس محلول کے چند قطرے اپنی ہتھیلی پر ڈالے۔ اسے ہتھیلی پر جلن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے فوراً ایک میلے کپڑے سے ہاتھ صاف کر لیا، لیکن اس کے بعد بھی بہت دیر تک ہتھیلی پر ہلکی سی جلن محسوس ہوتی رہی۔ کتوں کے ٹرینر کونارڈ نے بتایا کہ اگر یہ محلول انسان کی ہتھیلیوں کے علاوہ جسم کے کسی اور حصے پر لگایا جائے تو فوراً ہی جذب ہو جاتا ہے، جو انسانی جسم کے لیے اذیت کا باعث بن سکتا ہے۔ اوسکر نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے دریافت کیا کہ کتوں کو دیکھنے کے لیے کون کون لوگ آتے رہے ہیں اور آیا مسز فورڈ کا بھائی بف بینڈٹ بھی ان میں شامل تھا یا نہیں؟

"وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔" کونارڈ نے جواب دیا۔ "لیکن اسے کتوں کی تربیت سے زیادہ ان پر شرطیں لگانے سے دلچسپی ہے۔"

"کیا اس کے ساتھ ڈیوڈ فیئر نامی کوئی شخص بھی کبھی یہاں آیا ہے؟" اوسکر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ڈیوڈ فیئر!" کونارڈ نام دہراتے ہوئے بولا۔ "وہ صرف دو تین مرتبہ یہاں آیا تھا البتہ ڈاکٹر رائز اکثر بینڈٹ کے ساتھ یہاں آتا رہا ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور؟"

"مسز فورڈ کی بہن بھی کبھی کبھار اس طرف آ جاتی تھی مگر اب کئی روز سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔" کونارڈ نے جواب دیا۔

"اس کا نام دیون ہے۔" فورڈ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مکان یہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگر تم چاہو تو اس سے بھی مل سکتے ہو۔"

☆☆☆

عمارت کی تیسری منزل پر دستک کے جواب میں فلیٹ کا دروازہ بینڈٹ ہی نے کھولا۔ وہ قد میں اوسکر سے دو تین انچ نکلتا ہوا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ چہرے پر کرختگی کے آثار تھے اور آنکھوں میں کینہ توزی نمایاں تھی۔

"میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔" اوسکر نے اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "مسٹر فورڈ نے اپنی بیوی کے قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں میری خدمات حاصل کی ہیں۔ چونکہ تم بھی یاٹ کلب کی دعوت میں موجود تھے، ممکن ہے تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو۔"

"گویا تم میری بہن کی بات کر رہے ہو؟" بینڈٹ کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "میں اس کے قتل کے بارے

میں اتنا ہی کچھ جانتا ہوں جتنا پولیس کو بتا چکا ہوں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے کوئی بات چھپائی ہوگی تو تمہارا خیال غلط ہے۔'' وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آگئے۔ بینڈٹ نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اگر تم اس قتل کے بارے میں واقعی کوئی نئی بات جاننا چاہتے ہو تو تمہیں فورڈ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میری بہن کے قتل میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

''وہ ایسا نہیں سمجھتا اس لیے تحقیقات کے لیے اس نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ بہر حال، کیا تم ڈیوڈ فیتر نامی کسی شخص سے واقف ہو؟'' اوسکر نے دریافت کیا۔

بینڈٹ ایک لمحے کو تو جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں سے گرتے گرتے بچا۔ ''یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی بدحواسی تھی۔ ''اور اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا، تم جا سکتے ہو۔'' اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''ڈیوڈ ریس کا رسیا ہے۔'' اوسکر نے اس کے رویے پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کا گزارہ ہی کتوں کی ریس پر ہے۔''

بینڈٹ نے اس کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا دروازے سے باہر لے گیا۔ اوسکر نے اس کی اس بداخلاقی کا برا نہیں مانا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''میری اطلاع کے مطابق تم ڈیوڈ کے مقروض ہو۔ تمہارا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے اور تمہاری مالی حالت ایسی نہیں کہ اس کا قرض اتار سکو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا قرض چکانے کے لیے تم نے کوئی اور طریقہ اختیار کرلیا ہو؟''

بینڈٹ کا جواب اس گھونسے کی صورت میں تھا جو پوری قوت سے اوسکر کے پیٹ میں لگا۔ اوسکر تکلیف کی شدت سے کراہتا ہوا دہرا ہوگیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے بینڈٹ نے اس پر ٹھڈوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ اوسکر نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی کلائی کو پکڑنا چاہا مگر بینڈٹ کا گھونسا اس کی ناک پر لگا اور اوسکر بلبلاتا ہوا راہ داری میں ڈھیر ہوگیا۔ گرتے ہوئے اس کا سر پچھلی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ اسی اثنا میں بینڈٹ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرچکا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد اوسکر اپنے دفتر پہنچا۔ کچھ دیر تک وہ ناک اور جسم کے دوسرے حصوں کو سہلاتا رہا، پھر ڈائریکٹری سے ڈاکٹر رائز کا نمبر تلاش کرکے فون پر اس سے رابطہ کیا اور ملاقات کا وقت لے کر فون بند کردیا۔

ڈاکٹر رائز کا ویٹنگ روم خاصا کشادہ تھا۔ اس میں بہ یک وقت بیس، پچیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اتفاق سے اس وقت ایک چھوٹی میز کے پیچھے بیٹھی نرس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اوسکر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''کیا تم کسی کتے کے سلسلے میں ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہو؟'' نرس نے کارڈ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک نہیں، بہت سے کتوں کے سلسلے میں۔'' اوسکر نے زہرخند سے جواب دیا۔ نرس کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے اندرونی دروازے میں غائب ہوگئی۔ اس کی واپسی ایک منٹ بعد ہوئی۔

''بیٹھیے مسٹر اوسکر! ڈاکٹر صاحب چند منٹ بعد آپ سے ملاقات کریں گے۔'' نرس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

اتنے میں ایک عورت گود میں ایک کتے کو اٹھائے ویٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے نرس سے کوئی بات کی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد اندرونی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رائز برآمد ہوا۔ پستہ قامت ہونے کے ساتھ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اوسکر کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتالیس سے کم کسی طرح نہیں تھی مگر چہرے سے کھلنڈرا پن نمایاں تھا۔ اس نے کتے والی عورت کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اوسکر کی طرف مڑا۔ ''چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے مسٹر اوسکر! میں فارغ ہوکر آپ سے بات کرتا ہوں۔''

اسی دوران میں چند اور عورتیں آگئیں۔ ہر ایک کی گود میں ایک عدد کتا تھا۔ ہر ایک نے پہلے سے ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت لے رکھا تھا۔ وہ باری باری اندر جاتی رہیں۔ ہر عورت پانچ سے دس منٹ تک لے رہی تھی۔ اوسکر میز پر رکھے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا، پھر اٹھ کر سامنے والی دیوار پر آویزاں ایک فریم کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ڈاکٹر رائز کا سرٹیفکیٹ تھا جس کے مطابق اس نے 48ء میں کورنل ویٹرنری یونیورسٹی سے امتحان پاس کیا تھا۔ اوسکر وہاں سے ہٹ کر اپنی سیٹ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اس کی باری آگئی۔

''تمہیں انتظار کی جو زحمت اٹھانا پڑی، مجھے اس کا افسوس ہے۔'' ڈاکٹر نے کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نرس نے بتایا تھا کہ تم کسی کتے کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا چاہتے ہو؟''

''کوئی ایک کتا نہیں، میں پورے کتا خانے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اوسکر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کتا خانہ مسز فورڈ کی ملکیت تھا۔ تم نے اس کے قتل کی خبر اخبارات میں ضرور پڑھی ہوگی۔ اس کے شوہر کا دعویٰ ہے کہ ان کے تیز رفتار کتوں نے اچانک دوڑنا چھوڑ دیا تھا اور ایسے کتے ریس جیتنے لگے جو ہمیشہ پھسڈی رہے تھے۔ اس معاملے کی تحقیقات کے لیے اس نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔''

اوسکر بات کرتا رہا اور ڈاکٹر میز پر رکھے ہوئے ایک اوزار سے کھیلتا رہا۔

اوسکر کے خاموش ہونے پر وہ بولا۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر اوسکر! گرے ہاؤنڈ کتے میری لائن میں شامل نہیں ہیں۔ میں ہارلے ڈاگ ریس کلب میں کتوں کا معالج ضرور رہا ہوں مگر کسی گرے ہاؤنڈ سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں تمہیں ڈاکٹر کے بجائے کتوں کے ٹرینر سے رجوع کرنا چاہیے۔''

اوسکر نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اطمینان سے ایک بھرپور کش لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو۔ دراصل میرے اور تمہارے ایک مشترکہ دوست مسٹر بف بینڈٹ نے مجھے بتایا تھا کہ تم گرے ہاؤنڈز کے ماہر ہو۔''

''شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''مسز فورڈ کے کتا خانے کے انچارج کونارڈ کے کہنے کے مطابق تم بینڈٹ کے ساتھ اکثر وہاں جاتے رہے ہو۔ کیا واقعی تم بینڈٹ کو نہیں جانتے؟ وہ لمبے قد کا بھاری بھرکم آدمی ہے اور ڈیوڈ فیز کا بھی دوست ہے۔''

''میرا خیال ہے اب تمہیں رخصت ہو جانا چاہیے۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں ناگواری آگئی۔

اوسکر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ ویٹنگ روم میں اب کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آرہی تھی۔ عورتیں اپنے اپنے کتوں کو دبوچے ہوئے بیٹھی تھیں۔ اوسکر نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ڈاکٹر دروازے میں کھڑا تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اوسکر اس کی سمت میں انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے، اسے ذہن میں رکھنا ڈاکٹر! ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔''

ڈاکٹر کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اوسکر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ فیز کا مکان سڑک سے قدرے ہٹ کر واقع تھا۔ مکان کے اردگرد اونچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور بجری کی ایک روش سڑک سے مکان کے برآمدے تک چلی گئی تھی۔ اوسکر گاڑی سے اتر کر برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم والے اس شخص کو نہیں دیکھ سکا تھا جو برآمدے میں دروازے سے قدرے ہٹ کر بیٹھا گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر اوسکر نے جیسے ہی کال بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس شخص کی آواز سن کر وہ اس طرف گھوم گیا۔

''اگر میں غلطی پر نہیں تو تم اوسکر ہو؟''

''ہاں، ٹھیک سمجھے۔ مسٹر ڈیوڈ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' اوسکر نے جواب دیا۔

وہ شخص اٹھ کر اوسکر کے قریب آگیا اور اس طرح اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے یہ اطمینان کر لینا چاہتا ہو کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو نہیں ہے۔

''اگر تم دربان ہو تو واقعی فرض شناس ہو۔'' اوسکر نے نیم مسکراہٹ سے کہا۔

''دربان ہی نہیں، میں اور بھی بہت کچھ ہوں۔ تم جیسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے ایسے ایسے طریقے جانتا ہوں کہ موت بھی پناہ مانگتی ہوئی نظر آئے گی۔'' اس شخص نے یہ کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور اندر کی طرف دیوار پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک آدمی راہداری میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ اور منہ کے دہانے کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ اس طرح اوسکر کا جائزہ لینے لگا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ وہ شخص تو وہیں رک گیا اور پہلا آدمی اوسکر کو چلنے کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہال کی دیواروں پر لکڑی کے خوب صورت پینل بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دروازے پر رک کر دستک دی اور پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ ''اوسکر آیا ہے مسٹر ڈیوڈ! کیا آپ اس سے ملنا پسند کریں گے؟''

''اوہ، کیوں نہیں! اسے اندر بھیج دو۔'' کمرے سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

اوسکر اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڈ چمڑے کے کشن والی ایک کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی گود میں ایک کتاب کھلی

ہوئی تھی۔

''خوش آمدید، مسٹر اوسکر! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ڈیوڈ کسی طرح بھی بدمعاش نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو قد میں اوسکر سے تین چار انچ چھوٹا تھا۔ چہرے پر نرمی تھی۔

''میرا خیال ہے مسز فورڈ تمہارے لیے اجنبی نہیں تھی؟'' اوسکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بدقسمتی ہے کہ اس خاتون سے میری کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ اس کے بھائی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''میرا خیال تھا چونکہ تم بھی گرے ہاؤنڈز کے شوقین ہو، اس لیے ہو سکتا ہے ریس کلب میں کبھی تم دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا ہو۔''

''گرے ہاؤنڈز!'' ڈیوڈ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ مجھے گرے ہاؤنڈز سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے انہیں ریس میں دوڑتے ہوئے تو دیکھا ہے مگر انہیں پالنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔''

''کیا تم بف بینیڈٹ کے ساتھ کبھی ریس کلب گئے ہو؟''

''نہیں... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' ڈیوڈ نے اسے گھورا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم اکثر اس کے ساتھ لوگوں کے کتوں کا معائنہ کرنے جاتے رہے ہو؟''

''تمہاری اطلاع غلط ہے۔ میں ریس سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں کو فنانس کرتا ہوں لیکن مجھے خود ریس یا کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ڈیوڈ نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا لیکن اس میں کھوکھلا پن نمایاں تھا۔ پھر وہ اوسکر کو لانے والے شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے گریڈی کے بارے میں بوس سے ایک کام کہا تھا۔ جاؤ دیکھو، اس نے وہ کام کیا یا نہیں؟'' اس شخص نے پہلے حیرانی سے ڈیوڈ کو دیکھا، پھر معنی خیز انداز میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کہا جاتا ہے کہ مسز فورڈ کے کتے دوڑنا بھول گئے تھے اور پھسڈی قسم کے کتوں سے ریس ہارنے لگے تھے؟'' اوسکر پھر اصل موضوع پر آ گیا۔

''حیرت انگیز بات ہے۔'' ڈیوڈ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بھی غنیمت ہے کہ میں کتوں پر شرطیں لگانے کا عادی نہیں ہوں، ورنہ شاید میں بھی اس جوئے میں بڑی بڑی رقمیں ہارنے لگتا۔''

''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم...''

''تمہاری تمام اطلاعات غلط ہیں، اوسکر!'' ڈیوڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لگتا ہے تم ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لینے کے عادی ہو۔ مجھے تو اب تمہاری ذہنی کیفیت پر شبہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بات سنجیدگی اختیار کر لے، میں تمہیں یہاں سے رخصت ہو جانے کا مشورہ دوں گا۔'' اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اوسکر بھی اس کے ساتھ ہی ہال میں نکل آیا۔ وہ ڈیوڈ سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ڈیوڈ یا اس کے گرگوں سے الجھنا اس کے خیال میں اس وقت خاصا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

''کوئی چیز جلنے کی بو آ رہی ہے۔'' ڈیوڈ نے بیرونی دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ ''شاید خشک جھاڑیاں جلائی جا رہی ہیں۔''

اوسکر جیسے ہی باہر نکلا، بُری طرح چونک گیا۔ ڈرائیو وے پر کھڑی اس کی واکس ویگن کی چھت سے شعلے اٹھ رہے تھے اور ایک آدمی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا دلچسپ نگاہوں سے جلتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا بوس، آگ کیسے لگی؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' بوس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''گریڈی پانی لینے گیا ہے۔''

''یہ یقیناً بچوں کی شرارت ہو گی۔'' ڈیوڈ بولا۔

''بچے ہی تھے۔'' بوس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ ''میں نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھاگ نکلے۔''

''گریڈی! جلدی پانی لے کر آؤ۔'' ڈیوڈ ایک طرف دیکھ کر چیخا اور اوسکر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مجھے افسوس ہے اوسکر! لیکن تم جانتے ہو کہ آج کل کے بچے کس قدر شریر واقع ہوئے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ والدین کے کنٹرول میں بھی نہیں رہے۔''

گریڈی رول کیا ہوا پائپ کندھے پر لادے ٹہلتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے رول نیچے پھینک کر پائپ کے بل کھولے اور پھر اس کا ایک سرا نل سے لگا کر جلتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے نل کھول دیا اور پائپ کا دوسرا سرا اٹھائے اطمینان سے چلتا ہوا گاڑی کے قریب گیا اور پانی کی دھار جلتی ہوئی چھت پر ڈالنے لگا۔ چند سیکنڈ میں آگ بجھ گئی۔

''تم خوش نصیب ہو کہ بچوں نے گاڑی کے نچلے حصے میں آگ نہیں لگائی۔'' ڈیوڈ نے اوسکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے جیب سے پرس نکالا اور چند نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو سو ڈالر رکھ لو۔ نیا رنگ ہو جانے سے گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''شکریہ... میں یہ نقصان برداشت کر سکتا ہوں۔ میں تم جیسے لوگوں سے ایک سینٹ لینا بھی گوارا نہیں کروں گا۔'' اوسکر کے لہجے میں ناگواری تھی۔

بوس نے ڈیوڈ کے ہاتھ سے نوٹ لے لیے۔ چند لمحے نوٹوں کو دیکھتا رہا، پھر انہیں مٹھی میں دباتے ہوئے اوسکر سے مخاطب ہوا۔ ''ان نوٹوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں لے لینے چاہئیں۔'' وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے نوٹ اوسکر کے حوالے کرنا چاہتا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا بھرپور گھونسا اوسکر کے سینے پر لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کار سے ٹکرا گیا۔ اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی اور نہایت پھرتی سے آگے بڑھ کر بوس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ شاید بوس پر ان گھونسوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اوسکر کے سینے اور پیٹ پر گھونسے برسانا شروع کر دیے۔ اوسکر کی پشت گاڑی سے لگ گئی تھی وہ آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹنے لگا۔ جیسے ہی گاڑی سے دور ہٹا، دوسری طرف کھڑے ہوئے گریڈی نے نہایت پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازو پیچھے سے گرفت میں لے لیے۔ اوسکر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن بوس اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے تابڑ توڑ گھونسے اوسکر کی پسلیوں اور چہرے پر پڑ رہے تھے۔ اوسکر کا دماغ گھوم گیا۔ وہ اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کرنے لگا۔

''ذرا احتیاط سے بوس! اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔'' ڈیوڈ کی آواز اوسکر کی سماعت سے ٹکرائی۔ بوس نے نہایت عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو چار گھونسے اس کے پیٹ پر جما دیے۔

''آرام سے۔'' ڈیوڈ نے پھر کہا۔ ''خیال رہے کہ یہ ہمارا مہمان ہے۔''

اگلے گھونسے نے اوسکر کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تو گریڈی اس وقت بھی اسے گرفت میں لیے ہوئے تھا۔

''مسٹر اوسکر پر نقاہت طاری ہو رہی ہے۔ اس کی شاید طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ڈیوڈ کی آواز سنائی دی۔ ''بوس! اندر اسٹوو پر کچھ کافی رکھی ہے۔ مسٹر اوسکر کو کافی پلاؤ۔''

بوس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا مکان میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڈ آگے بڑھ کر اوسکر کے قریب پہنچا۔ اوسکر پر گریڈی کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی۔ ''تم بلاوجہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کے عادی ہو۔'' ڈیوڈ نے اوسکر کے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارا یہ تجسس ہی اس سیانی بلی کی موت کا باعث بنا ہے۔'' وہ ہر جملے کے ساتھ اوسکر کے منہ پر تھپڑ مارتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اوسکر اگرچہ ہوش میں تھا لیکن اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا... بوس ایک کپ میں کھولتی ہوئی کافی لے کر آیا۔

''اس کا منہ کھولو گریڈی!'' ڈیوڈ غرایا اور بوس سے مخاطب ہوا۔ ''کافی اس کے حلق میں انڈیل دو۔''

گریڈی نے ایک ہاتھ سے اوسکر کے بال پکڑ کر اس کا سر پیچھے کھینچ لیا۔ بوس نے ایک ہاتھ سے اوسکر کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے کپ اس کے منہ سے لگا دیا۔ اوسکر نے جھٹکے سے منہ ایک طرف ہٹا لیا اور گرم گرم کافی اس کی گردن اور سینے پر گری۔ اوسکر کو یوں محسوس ہوا جیسے پگھلا ہوا سیسہ اس پر انڈیل دیا گیا ہو لیکن اس تکلیف کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ اس نے پوری قوت سے سامنے کھڑے ہوئے بوس کی ران پر لات ماری۔ بوس لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اس نے سنبھلتے ہی اوسکر پر گھونسے برسانا شروع کر دیے۔ آخری گھونسا اوسکر کی کنپٹی پر لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تو کار کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور بوس نے ایک ہاتھ سے اس کے سینے کو اس طرح دبا رکھا تھا کہ وہ گر نہ سکے۔

معاً ڈیوڈ کی آواز اوسکر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''رقم اس کی جیب میں ڈال کر اسے گاڑی میں ٹھونس دو۔''

ایک ہاتھ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب تک گیا۔ پھر کوئی اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی کے دوسری طرف لے گیا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر ٹھونس دیا۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا مگر دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر سیدھا بٹھا دیا اور اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھ دیے۔

''اب زیادہ بننے کی کوشش مت کرو مسٹر!'' گریڈی

کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کر بیٹھیں، گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلتے بنو۔''

☆☆☆

پیر کی صبح کو جب اوسکر کی آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا ہر جوڑ اپنی جگہ چھوڑ چکا ہو۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ گزشتہ رات وہ گھر کس طرح پہنچا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا، پھر اس نے اٹھ کر ٹیلی فون پر فورڈ کا نمبر ملایا اور بتایا کہ آج سے وہ اس کے کام سے دستبردار ہو رہا ہے۔

''لیکن بات کیا ہے؟'' فورڈ نے وجہ جاننا چاہی۔

''ڈیوڈ فیئر کو اس معاملے میں میری مداخلت پسند نہیں آئی۔ گزشتہ رات اس نے اور اس کے کرگوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو بچ نکلا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اگلے جہان پہنچ چکا ہوتا۔''

''مجھے تمہاری تکلیف کا احساس ہے۔ میں اس کا ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ کام جاری رکھنے کا کیا لو گے؟'' فورڈ کا لہجہ کاروباری تھا۔

''ایک ملین سے شروع کر کے اوپر بڑھتے رہو۔ جہاں مناسب سمجھوں گا تمہیں ٹوک دوں گا۔'' اوسکر زہرخند سے بولا۔

''اخراجات کے علاوہ دو سو ڈالر روزانہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر تم کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بونس الگ ملے گا۔'' فورڈ نے سنجیدگی سے کہا۔

اوسکر کے لیے یہ پیشکش بُری نہیں تھی۔ ''کچھ حاصل کر لینے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' وہ بولا۔ ''قتل کے سلسلے میں یا کتوں کے بارے میں؟''

''کوئی بھی ایسی بات جس سے پولیس یہ یقین کر لے کہ قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے بلکہ میری بیوی کو کسی اور نے قتل کیا ہے۔''

''غالباً تم بینڈٹ کے خلاف کوئی ثبوت چاہتے ہو؟''

''کوئی بھی ایسی بات جس سے پولیس میرا پیچھا چھوڑ دے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اوسکر نے جواب دیا۔ ''یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ میں ڈیوڈ فیئر کے راستے سے دور رہتے ہوئے تمہارے سالے اور ڈاکٹر رائز پر توجہ مبذول رکھوں گا۔ وہ دونوں کمزور اعصاب کے مالک ہیں۔ ممکن ہے بدحواسی میں کوئی ایسی غلطی کر ڈالیں جس سے مجھے ان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل سکے۔''

میں نے تمہارے سارے حیلے بہانے ہنستے ہوئے یوں سن لیے کہ تم غلط گھر میں آ گئے ہو

''گڈ!'' فورڈ کی آواز سنائی دی۔ ''اگر تم بینڈٹ سے ملنا چاہو تو وہ آج رات تمہیں میرے مکان پر ملے گا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر جا رہا ہوں اس لیے رات کو گھر پر نہیں رہوں گا۔ میرا مکان تمہارے قبضے اور اختیار میں ہوگا۔ تم جب چاہو آ سکتے ہو۔''

اوسکر نے جب اسے بتایا کہ پہلی ملاقات پر بینڈٹ کس طرح بھڑک اٹھا تھا تو فورڈ جلدی سے بولا۔ ''اگر بینڈٹ کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اسے اس طرح بھڑکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اور ڈیوڈ فیئر دونوں اس قتل میں ملوث ہیں۔''

اس گفتگو کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اوسکر اس کے مکان پر پہنچ گیا۔ ملازمہ نے اسے اوپر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ سوٹ کیس پلنگ پر پھینک کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے سے اسے کچھ تازگی سی محسوس ہوئی اور وہ کمرے سے نکل کر دوبارہ نیچے آ گیا۔

کھانا خوش ذائقہ تھا۔ وہ اس سے نمٹا ہی تھا کہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''اوہ! تم یہاں بیٹھے ہو مسٹر اوسکر! آؤ میں تمہیں ایک خاص ہستی سے ملاؤں۔''

وہ لیلا تھی۔ مدھم روشنی کی وجہ سے اوسکر اس کے ساتھ آنے والی دوسری لڑکی کو فوری طور پر نہیں پہچان سکا تھا۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو وہ یاٹ کلب میں دیکھ چکا تھا۔ وہ منظر اوسکر کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا، جب وہ سرخ بالوں والی لڑکی کے لیے شراب لینے گیا تھا اور واپسی پر اسے غائب پایا تھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے جن سے وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس وقت اوسکر کو دیکھتے ہی لڑکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''ویون! یہ مسٹر اوسکر ہیں۔'' لیلا نے تعارف کرایا۔ ''اور مسٹر اوسکر! یہ ویون ہے۔ مسٹر فورڈ کی سالی۔''

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔'' اوسکر نے کہا۔ ''اور میں تو مس ویون کے ایک گلاس مارٹینی کا مقروض بھی ہوں۔''

''مجھے اچھی طرح وہ رات یاد ہے۔'' ویون بولی۔ ''دراصل میں بھول ہی گئی تھی کہ تم میرے لیے شراب لینے گئے ہو۔ پھر میری بہن کے قتل کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے تم سے دوبارہ ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔''

''کیا تمہاری بہن کے زیورات ملے تھے یا نہیں؟'' اوسکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔'' ویون نے جلدی سے کہا۔ پھر چند لمحوں بعد اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''غوطہ خور پانی کی تہ سے نیکلس اور بریس لیٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے مگر انگوٹھی نہیں مل سکی تھی۔ آج میرا ذہن کچھ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے شاید زیادہ پی لینے کا نتیجہ ہے۔''

ویون بدحواس سی ہو رہی تھی۔ اوسکر سوچ رہا تھا، شاید اس رات وہ زیورات اسی نے اس کی جیب میں رکھے تھے اور اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کی اس حرکت سے واقف ہو چکا ہے یا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بہن کی موت کی باتیں اس کے ذہن پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ بہرحال، اس جیسی لڑکی پر کسی کے قتل کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''مسٹر اوسکر اس کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ مسٹر فورڈ نے اس مقصد کے لیے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔'' لیلا نے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' ویون نے الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔'' اوسکر بولا۔ ''مارٹینی پیش کروں یا کچھ اور؟''

''کچھ نہیں۔'' ویون نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس وقت ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ میں زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی۔''

''لیکن میں تمہارا ایک گلاس مارٹینی کا مقروض ہوں اور جلد سے جلد یہ قرض اتارنا چاہتا ہوں۔ جمعرات کی شام کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ڈنر میری طرف سے!''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ دعوت منظور ہے۔'' ویون نے جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اوسکر بھی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

صبح اوسکر نے اکیلے ہی ناشتا کیا اور تولیا کندھے پر ڈال کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جسم پر مالش کے تیل کی بوتل تھی اور اس کا رخ سوئمنگ پول کی طرف تھا۔ لیلا پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ وہ نہانے کا لباس پہنے پول کے کنارے پانی میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اوسکر کو دیکھتے ہی پانی میں اتر گئی۔ کچھ دیر بعد پانی سے نکل کر گھاس پر لیٹ گئی۔ وہ چند لمحے اسی طرح دھوپ میں لیٹی رہی پھر اوسکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنا سن ٹین آئل لانا بھول گئی ہوں۔ کیا تمہاری یہ بوتل استعمال کر سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں؟'' اوسکر نے یہ کہہ کر بوتل اسے دے دی۔

لیلا نے بوتل کھول کر پہلے چہرے اور بانہوں پر کچھ تیل ملا پھر ٹانگوں پر ملنے لگی۔ اوسکر سوئمنگ پول میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پانی خاصا ٹھنڈا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیر ہلانے لگا۔ لیلا نے کچھ کہا مگر وہ سمجھ نہ سکا۔ اس نے لیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' اوسکر نے کہا۔ ''شاید تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' لیلا یہ کہتی ہوئی آگے جھک گئی۔ آہستہ آہستہ وہ اس طرح دہری ہوگئی کہ اس کا پیٹ گھٹنوں سے جا لگا۔

''اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ تم ناشتے کے فوراً ہی

بعد پانی میں اتر گئی تھیں۔'' اوسکر بولا۔

لیلا اسی طرح دہری ہو کر بیٹھی رہی، پھر دفعتاً اچھل کر پشت کے بل سیدھی لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ جسم میں کھنچاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ سر کو دائیں بائیں پٹخنے لگی۔ اس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں، جیسے شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ اچانک وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے گھٹنے ایک بار پھر پیٹ سے جا لگے۔ کبھی وہ اپنے جسم کو بُری طرح نوچنے لگتی اور کبھی اس کے دانت کلائیوں میں گڑ جاتے۔

یہ سب کچھ اچانک ہی شروع ہوا تھا۔ اوسکر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر منہ سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا جسے وہ دانتوں سے بری طرح بھنبھوڑ رہی تھی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیلا کے دانت جیسے کلائی میں گڑ کر رہ گئے تھے۔ وہ بے بسی سے چاروں طرف دیکھنے لگا، پھر دفعتاً مکان کی طرف بھاگ اٹھا۔ جب وہ کچن میں پہنچا تو ملازمہ دوپہر کے کھانے کے لیے گوشت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ رہی تھی۔ اوسکر کو اس طرح بدحواس دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

''ڈاکٹر کو فون کرو جلدی۔'' اوسکر چیخا۔ ''مس لیلا سخت تکلیف میں ہے۔''

جب وہ سوئمنگ پول پر واپس پہنچا تو لیلا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اسی طرح تڑپتے ہوئے اپنے جسم کو نوچ اور بھنبھوڑ رہی تھی۔ جسم پر جگہ جگہ خراشیں نظر آ رہی تھیں جن سے خون رِس رہا تھا۔

''میں جل رہی ہوں... میرا جسم پھنک رہا ہے...'' وہ چیخ رہی تھی۔

اوسکر نے ایک بار پھر اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور گھاس پر لوٹتی ہوئی سوئمنگ پول میں جا گری۔ اوسکر نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ لیلا پانی کی تہ میں جا رہی تھی۔ اوسکر نے بھی غوطہ لگا دیا۔ وہ پانی کے اندر بھی بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ اوسکر نے اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر وہ بل کھا جاتی۔ بالآخر اوسکر نے اس کی گردن پکڑ لی لیکن جیسے ہی وہ سطح پر ابھرا لیلا ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ آخرکار وہ اسے سوئمنگ پول سے باہر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیلا نے چیخنا بند کر دیا تھا۔ اگرچہ

یہ لوایک ڈالر......اور مجھے بانسری پر مائیکل جیکسن کا کوئی نغمہ سناؤ

بظاہر اس کی تکلیف میں بھی کسی حد تک کمی آ گئی تھی مگر اوسکر کو اس پر قابو پانے میں اب بھی خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔

لیلا کسی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی لیکن اب اوسکر اپنے جسم کے مختلف حصوں میں جلن محسوس کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کے ان حصوں پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ پیٹ میں بھی اینٹھن سی محسوس ہونے لگی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ پیشانی اور کنپٹیوں کی نسیں پھول رہی تھیں۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون اسی جگہ جمع ہو گیا ہو اور نسیں کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔ اس کے جسم کے وہ حصے جہاں جلن ہو رہی تھی، بری طرح کھنچ رہے تھے، جیسے کھال پھٹ جائے گی۔ اسے دور سے کچھ آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں، اس نے مڑ کر آوازوں کی سمت دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اوسکر کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھا اور قریب بیٹھا ڈاکٹر اس کی کلائی تھامے نبض دیکھ رہا تھا۔ اوسکر نے پوری طرح آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ایک بار پھر غنودگی کا حملہ ہوا اور اس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ دوسری مرتبہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔ کمرا خالی تھا۔ وہ چت لیٹا کمرے کی چھت کو گھورتا رہا۔ اسے ہوش میں آئے تین چار منٹ گزرے تھے کہ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نرس بھی تھی۔

''میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ دھماکے سے ہو رہے ہیں۔'' اوسکر نے ڈاکٹر کے کیفیت پوچھنے پر بتایا۔ ''لیکن مجھے ہو

کیا تھا؟''

''کسی نے تمہیں زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ زہر مس لیلا کے سن ٹین آئل میں شامل کیا گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

سن ٹین آئل کے نام سے اوسکر کو سب کچھ یاد آ گیا۔

''مس لیلا کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے۔ ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔'' ڈاکٹر نے تاسف کا اظہار کیا۔ ''تیل میں ایک خاص کیمیکل کی آمیزش تھی جسے 'ڈی ایم ایس او' کہا جاتا ہے یہ کیمیکل عام طور پر کتوں کے علاج کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بعض دوسرے کیمیکلز ملا کر اسے بہت ہلکا کر لیا جاتا ہے جبکہ خالص ڈی ایم ایس او انتہائی خطرناک زہر ہے جو جلد میں جذب ہو کر خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر بروقت اس کا علاج نہ کیا جائے تو مریض کو بچانا ممکن نہیں ہوتا۔ مس لیلا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہمیں یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی اور اس زہر نے چند منٹ میں اس کا خاتمہ کر ڈالا۔ غالباً اسے بچانے کی کوشش میں تمہارا جسم اس کے جسم سے مس ہوا ہو گا۔ اس طرح وہ زہر تمہارے جسم تک بھی پہنچ گیا لیکن اس کی مقدار بہت کم تھی اور پھر تمہیں بروقت طبی امداد بھی پہنچا دی گئی تھی۔''

ڈاکٹر جا چکا تھا۔ اوسکر اپنے بستر پر لیٹا چھت کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر رائز جیسا شخص ڈیوڈ فیز کا آلۂ کار کیوں بنا تھا؟ یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ محض دولت کے لالچ میں وہ ایسا کر رہا ہو گا کیونکہ اس روز رائز کے کلینک میں بیمار کتوں کو لانے والی عورتوں کی تعداد دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک ہزار ڈالر ضرور کما لیتا ہو گا۔ دفعتاً اوسکر کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ زر پرستی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ اس کے ذہن میں ڈاکٹر رائز کا وہ ڈپلوما گھوم رہا تھا جو اس نے کلینک کے ویٹنگ روم کی دیوار پر آویزاں دیکھا تھا۔ یہ ڈپلوما کورنل ویٹرنری یونیورسٹی سے 48ء میں جاری ہوا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس پہنچ گیا اور ریسیور اٹھا کر کورنل ویٹرنری یونیورسٹی کا نمبر ملایا۔ لائن ملنے پر اس نے متعلقہ شعبے کے سربراہ سے رابطہ قائم کرانے کو کہا، اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد شعبے کے سربراہ نے بتایا کہ 48ء میں رائز نامی کسی شخص نے اس یونیورسٹی سے امتحان نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

''سنو اوسکر! میری قوتِ برداشت اب جواب دے چکی ہے۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو مجھے مجبوراً پولیس سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔'' یہ الفاظ ڈاکٹر رائز نے اس وقت کہے جب اوسکر نے اسے فون کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور پٹخ دیا تھا۔

اوسکر نے ایک بار پھر اس کا نمبر ملایا اور جیسے ہی کال ریسیو کی گئی، وہ جلدی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر! تم پولیس میں رپورٹ کر دو۔ میں پہلے ہی ان سے مل چکا ہوں اور پولیس والے تم سے بھی مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔''

''تم گویا دھمکی دے رہے ہو؟'' ڈاکٹر رائز کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''لیکن میں تمہاری دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

''میری کسی دھمکی میں آنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' اوسکر بولا۔ ''بہتر ہو گا کہ تم میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کر ہی ڈالو لیکن اس سے پہلے اپنے دفتر کی دیوار پر آویزاں اپنا وہ جعلی ڈپلوما کسی ایسی جگہ چھپا دینا جہاں پولیس کی نظر نہ پڑ سکے۔ میں تم سے صرف ڈیوڈ فیز اور بینڈٹ کے بارے میں معلومات چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری مطلوبہ معلومات بہم پہنچا دو تو میں ڈپلومے والی بات بھول جاؤں گا۔''

''تم جہنم میں جاؤ۔'' ڈاکٹر رائز نے غراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

اوسکر نے بھی ریسیور رکھ دیا اور کچھ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ ویون کے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ویون کے دروازے پر دستک دے رہا تھا جس کے جواب میں دروازہ ویون ہی نے کھولا تھا۔

''اوہ تم! میں تو سمجھی تھی کہ تم ابھی تک بیمار ہو اور آج کا پروگرام منسوخ ہو چکا ہے۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

''لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور حسبِ وعدہ پہنچ گیا ہوں۔'' اوسکر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''مجھے تیار ہونے میں چند منٹ لگیں گے۔'' ویون معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم جتنا وقت چاہو، لے سکتی ہو۔'' اوسکر کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا اور ویون دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نشست گاہ کے طور پر استعمال کیا جانے والا یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ، کافی ٹیبل اور دو

کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ویون کی مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اس کی بہن نے مرنے کے بعد تقریباً چالیس لاکھ ڈالر نقدی اور جائداد کی صورت میں چھوڑے تھے، اور ظاہر ہے ویون بھی اس وراثت میں کچھ آس لگائے بیٹھی ہوگی۔

اوسکر صوفے پر بیٹھا ایک پرانے میگزین کی ورق گردانی کررہا تھا کہ ویون کمرے سے نکل کر باتھ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم سے اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ کار میں خاموش بیٹھی ونڈ شیلڈ کے اس پار دیکھتی رہی۔ گھر سے چلنے کے بعد سے اب تک اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا، مگر کار مختلف راستوں سے گھومتی ہوئی جیسے ہی سویپ اسکاٹ کی طرف مڑی، وہ اوسکر کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”مجھے لیلا کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گی۔“

”ہاں، واقعی اس کی موت بڑی افسوسناک تھی۔“ اوسکر نے یہ کہتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے خیال میں سن ٹین آئل میں وہ زہر کس نے ملایا ہوگا؟“ ویون نے پوچھا۔

”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ تم بھی ہوسکتی ہو۔“ اوسکر نے جواب دیا۔

”نہیں!“ ویون نے فوراً تردید کی۔ ”مجھے بھلا اس کی زندگی یا موت سے کیا فائدہ! میں تو اسے اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی۔“

”لیکن وہ زہر میرے لیے سن ٹین آئل کی بوتل میں ملایا گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔“

”مجھے اس کا علم نہیں۔“ ویون بولی۔ ”لیکن... کوئی تمہیں ہلاک کیوں کرنا چاہتا تھا؟“

”شاید اپنے ذہنی سکون کی خاطر ایسا کرنا چاہتا ہو۔“ اوسکر نے جواب دیا۔

ویون نے سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ”کم از کم میں وہ نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس وقت مجھے ڈنر پر کون لے جارہا ہوتا؟ اور ہاں، مجھے پتا چلا ہے کہ مسٹر فورڈ نے میرے بھائی بف کے خلاف تحقیقات کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟“

”کیا اسے میں ایک سوال سمجھوں؟“

”اوہ نہیں۔“ ویون جلدی سے بولی۔ ”فورڈ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ بف کو پسند نہیں کرتا اور اسے کسی معاملے میں پھنسانا چاہتا ہے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔ ”کیا تم میرا ایک کام کرسکتے ہو؟“

”کیسا کام؟“

”بف کے متعلق ایسی رپورٹ جس سے اس پر فورڈ کا شبہ ختم ہوجائے۔“

”لیکن میں پہلے ہی فورڈ کے لیے کام کررہا ہوں۔“

”کہیں تمہیں بھی تو یہ شبہ نہیں کہ تمہارے سن ٹین آئل میں زہر بف نے ملایا تھا؟“

”وہ تمہارا بھائی ہو یا کوئی اور لیکن ایک نہ ایک دن اس کی گردن میرے ہاتھ میں آہی جائے گی۔“

ویون سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں، اوسکر!“

”میرا خیال ہے یہ محبت کے اظہار کا مناسب موقع نہیں ہے۔ اسٹیئرنگ پر میرا ہاتھ بہک بھی سکتا ہے۔“ اوسکر نے مسکرا کر کہا۔

کھانا کھانے کے بعد جب وہ واپس لوٹے تو ویون اس کے کندھے سے ٹیک لگائے اونگھتی رہی۔ ایک چوراہے پر سرخ بتی کی وجہ سے ایک جھٹکے سے گاڑی رکی تو اس نے آنکھیں کھول کر خمار آلود نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے کار روک کر اوسکر نے جب رخصت ہونا چاہا تو وہ بولی۔ ”ایک کپ کافی نہیں پیو گے؟“

اوسکر انکار نہ کرسکا۔ کافی پیتے ہوئے وہ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے پھر اوسکر اٹھنے لگا تو ویون نے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں رکا۔ باہر آکر کار میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کی اور ڈاکٹر رائز کے کلینک کا رخ کیا۔

جب وہ کلینک پہنچا تو ویٹنگ روم میں نرس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا کمرا کباڑ خانے کا منظر پیش کررہا تھا۔ فائل کیبنٹ کے دراز باہر نکلے ہوئے تھے اور تمام کاغذات فرش پر بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس صورت حال سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ ڈاکٹر بڑی عجلت میں فرار ہوا تھا۔ نرس کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے اور آنکھیں غصے سے سرخ ہورہی تھیں۔

”وہ گھٹیا انسان!“ نرس اسے دیکھ کر بولی۔ ”میری آدھے مہینے کی تنخواہ اس کے ذمے ہے لیکن میں اسے بخشوں گی نہیں۔“

"اس طرف کیا ہے؟" اوسکر نے دفتر کی عقبی دیوار میں ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں ایک چھوٹا سا کتا خانہ ہے جہاں ایسے کتوں کو رکھا جاتا ہے جن کا کسی قسم کا آپریشن کیا گیا ہو۔" نرس نے زمین پر بکھرے کاغذوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ اوسکر کے کہنے سے اس نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ناگوار بو کا ایک بھبکا اٹھا۔ نرس کے بڑھتے قدم رک گئے اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ اوسکر ابھی تک دروازے میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے فوراً ہولسٹر سے پستول نکال لیا اور نرس کو ایک طرف ہٹاتا ہوا دروازے میں داخل ہوا لیکن اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر کمرے میں تقریباً ایک درجن کتے مرے پڑے تھے۔

"وہ... وہ ذلیل آدمی... اس نے کتوں کو بھی مار دیا۔" نرس ہکلائی۔

کتوں کے پنجرے الگ الگ تھے۔ ہر پنجرے میں ان کے کھانے کے برتن تھے اور ہر برتن میں آدھی سے زیادہ خوراک موجود تھی، جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکٹر رائز نے فرار ہونے سے پہلے ان کتوں کی خوراک میں زہر ملا دیا تھا۔

ہفتے کے دن کی ابتدا اوسکر کے لیے زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سب سے پہلے وہ اس گیراج میں پہنچا جہاں واکس ویگن مرمت کے لیے دی تھی۔ نئے رنگ روغن سے گاڑی کا حلیہ بدل گیا تھا۔ وہ کہیں اور بھی جانا چاہتا تھا لیکن پھر پروگرام ملتوی کر کے اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا اور بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے ٹی وی دیکھتا رہا۔ اس دوران میں سارجنٹ کوگان بھی پہنچ گیا۔

"میں تم سے کچھ اہم باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر رائز کی نرس نے بتایا ہے کہ گزشتہ روز تم اس کے کلینک گئے تھے کیوں نہ تمہیں شہادتیں پوشیدہ رکھنے کے الزام میں بڑے گھر کی سیر کرا دی جائے؟"

"کیسی شہادتیں؟" اوسکر نے کہا۔

"کتوں کی ریس میں گڑبڑ یا قتل... کوئی بھی الزام لگ سکتا ہے۔"

"فی الحال تم مجھ پر کوئی بھی الزام عائد نہیں کر سکتے۔" اوسکر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اتنی زیادہ خوداعتمادی بھی اچھی نہیں ہوتی۔" سارجنٹ کوگان نے اسے گھورا۔

"میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھ سکیں گے لیکن تم شاید ایسا نہیں چاہتے۔ تم لوگ قتل کے اس کیس پر کام کر رہے ہو لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر رائز فرار ہونے میں کامیاب کیسے ہو گیا؟"

"تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ رائز اور بینڈٹ، ڈیوڈ سے چوری اپنے کسی منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ فورڈ کے کتا خانے کے ٹرینر کا بیان ہے کہ بینڈٹ اور ڈاکٹر رائز اکثر وہاں آیا کرتے تھے مگر ڈیوڈ فیئر کو کبھی ان کے ساتھ کتا خانے میں آتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں کسی ایسے منصوبے پر کام کر رہے تھے جس کا ڈیوڈ فیئر کو علم نہیں ہو سکا تھا۔"

اوسکر نے اپنے گلاس میں مزید بیئر انڈیلی۔ اس نے سارجنٹ کوگان کی بات سے اتفاق کیا۔ کوگان کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

اس رات نو بجے کے قریب اوسکر کو ویون کی فون کال ملی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں اوسکر۔" وہ بولی۔ "میں ثابت کر سکتی ہوں کہ میرے بھائی کے خلاف تمہارے خیالات بالکل غلط ہیں۔"

"گڈ!" اوسکر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اس موضوع پر تم سے کوئی بات یقیناً مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کب مل رہی ہو؟"

"ہماری ملاقات جلد سے جلد ہونی چاہیے۔ کیا تم نے ہائی وے اٹھائیس پر 'ٹوکل بار' دیکھا ہے؟" ویون کی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔" اوسکر نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں ٹھیک ایک گھنٹے بعد تمہیں وہاں کاک ٹیل لاؤنج میں ملوں گی۔" ویون نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

اوسکر مقررہ وقت سے کچھ پہلے ٹوکل بار پہنچ گیا۔ ہفتے کی رات ہونے کے باوجود رش زیادہ نہیں تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کھڑا اپنے سامنے رکھے شیری کے گلاس میں تیرتے ہوئے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا کہ اپنی پسلیوں پر کسی سخت چیز کا دباؤ محسوس کر کے چونک گیا۔

"شرافت سے کھڑے رہنا۔ کوئی غلط حرکت تمہاری موت کا سبب بن سکتی ہے۔"

آواز سن کر اوسکر نے گردن اس طرف گھما دی۔ وہ

بوس تھا جو اس کے بالکل ساتھ ملا کھڑا تھا۔ اس کا پستول اوسکر کی پسلی سے لگا ہوا تھا۔ بوس کے ہونٹوں پر اس طرح مسکراہٹ تھی جیسے وہ محض اتفاقاً اپنے پرانے دوست سے مل گیا ہو۔

''پارکنگ پلاٹ پر ہم نے تمہاری گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''رنگ و روغن سے بالکل نئی ہوگئی ہے۔''

اوسکر نے گردن گھما کر دیکھا۔ ان سے دو قدم پیچھے گریڈی بھی موجود تھا۔

''ڈیوڈ تم سے ملنا چاہتا ہے۔'' بوس نے کہا۔ ''وہ باہر اپنی گاڑی میں تمہارا منتظر ہے۔'' پھر وہ اوسکر کی پسلیوں پر پستول کا دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اب چل پڑو۔ ڈیوڈ انتظار کرنے کا عادی نہیں ہے۔''

ڈیوڈ کی گاڑی پارکنگ پلاٹ کے آخری سرے پر تاریکی میں کھڑی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کوٹ کے کالر اس نے گردن تک اٹھا رکھے تھے۔ اوسکر کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر گہری سی مسکراہٹ آگئی۔ بوس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اوسکر کو اندر دھکیل دیا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی اوسکر!'' ڈیوڈ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں تم سے ہاتھ نہیں ملا سکتا تم دیکھ سکتے ہو کہ میرا ہاتھ فارغ نہیں ہے۔''

اوسکر نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں ہاتھی دانت کے دستے والا آٹومیٹک پستول دبا ہوا تھا۔ بوس اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے بیٹھ چکا تھا اور گریڈی نے ان کے ساتھ کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ گاڑی حرکت میں آگئی اور پارکنگ لاٹ سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئی۔

''ڈاکٹر رائز نے شکایت کی تھی کہ تم اسے پریشان کر رہے ہو۔'' ڈیوڈ نے اوسکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارے لیے تکلیف دہ ہوتے جا رہے ہو۔ تمہیں کوئی نہ کوئی سبق سکھانا ہی پڑے گا۔''

''ویسے رائز ہے کہاں؟ اس کی نرس نے بتایا تھا کہ وہ جیکا فرار ہو چکا ہے۔'' اوسکر بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''وہ بھی ہمارے لیے تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے لمبی رخصت پر بھیج دیا گیا ہے۔ کتوں کی خوراک میں زہر ملانا انتہائی گھٹیا حرکت تھی اور تم جانتے ہو کہ مجھے اس قسم کی بربریت بالکل پسند نہیں ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ڈاکٹر رائز کو لمبی چھٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔''

''مستقل چھٹی؟'' بوس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''اب وہ تمہیں پریشان کرنے کے لیے کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''ڈاکٹر رائز کے افسوسناک انجام پر مجھے گہرا صدمہ پہنچا ہے، اوسکر!'' ڈیوڈ بولا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس انجام تک پہنچنے کے لیے اپنے یا ہمارے لیے مشکلات پیدا نہیں کرو گے۔ گریڈی نے کچھ نئے طریقے ایجاد کیے ہیں اور میں اسے ان طریقوں کے استعمال کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ کیوں گریڈی؟''

''یس باس! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' گریڈی نے جواب دیا۔

''گریڈی بہت شریر آدمی ہے۔'' ڈیوڈ نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے اس کا خیال تھا کہ تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں کم از کم دو ہفتوں کے لیے تمہاری گاڑی کی ڈکی میں بند کر دیا جائے لیکن مجھے یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔''

اوسکر نے ہیٹ آنکھوں پر جھکا لیا اور یہ تاثر دینے لگا کہ اس وقت اسے اونگھنے سے زیادہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ڈیوڈ نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر بات جاری رکھی۔ ''اگر تمہیں گاڑی کی ڈکی میں بند کر دیا جائے تو تم کسی نہ کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور ہمارے لیے مستقل مصیبت کا باعث بنے رہو گے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں کوئی ایسی سزا دی جائے کہ آئندہ تم دوسروں کو پریشان نہ کر سکو۔ گریڈ! اسے بتاؤ کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔''

''بلو ٹارچ!'' اگلی سیٹ سے گریڈی کی آواز سنائی دی اور اوسکر لرز اٹھا۔ اس کے اعصاب ایک دم تن گئے اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

''مزہ آجائے گا، اوسکر!'' ڈیوڈ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم پیر کی انگلیوں سے تمہاری کھال ادھیڑنا شروع کریں گے۔ پھر پنڈلیوں کی باری آئے گی اور اس کے بعد یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تمہاری کھوپڑی تک نہ پہنچ جائے۔ تمہاری کھال اتارنے کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''باس!'' گریڈی نے اسے متوجہ کیا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس کے چہرے سے کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

''بات متنازعہ ہوگئی لیکن اس کا فیصلہ اوسکر کرے گا۔

کیوں اوسکر! کہاں سے کھال ادھیڑنا شروع کی جائے؟ پیروں سے یا چہرے سے؟ تمہیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوگا۔''

اوسکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ونڈر لینڈ، ریپڈ ٹرانزٹ اسٹیشن کے قریب ٹریفک سگنل کی وجہ سے گاڑی رک گئی۔ اوسکر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ سڑک تاریک اور سنسان پڑی تھی۔ سگنل تبدیل ہوتے ہی گاڑی ایک بار پھر تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے کوئی عمارت دکھائی دے جاتی ورنہ ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک بار پھر ٹریفک سگنل پر رک گئی۔ اوسکر نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ان سے آگے پانچ چھ اور گاڑیاں بھی رک چکی تھیں۔ اور تقریباً پچاس گز آگے بائیں طرف سے آنے والی گاڑیاں سڑک عبور کر رہی تھیں۔ چوراہے کے درمیان ایک ٹریفک کانسٹیبل کھڑا تھا جس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ بائیں طرف سے آنے والی گاڑیوں کو گزرنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ اوسکر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور انگڑائی لیتے ہوئے ایک ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ گرانے لگا۔ اس کی یہ حرکت ڈیوڈ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''آرام سے بیٹھے رہو۔ ہاتھ ہٹالو۔'' ڈیوڈ غرایا۔

''حبس ہو رہا ہے تازہ ہوا کے لیے شیشہ کھول رہا ہوں۔'' اوسکر نے کہا۔

ڈیوڈ کا پستول اوسکر کے سینے کے قریب پہنچ گیا۔ اوسکر اتنے میں آدھے سے زیادہ شیشہ گرا چکا تھا۔ وہ پستول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے فائر کرتے ہی کم از کم سو آدمی اس کار کو گھیرے میں لے لیں گے اور تم لوگ کسی طرح بھی بچ کر نہیں نکل سکو گے۔''

ان کی کار کے آگے پیچھے بہت سی گاڑیاں تھیں اور پولیس کانسٹیبل بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ فائر کی آواز آسانی سے اس تک پہنچ سکتی تھی۔ اوسکر نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا گریڈی تیزی سے اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ فائر کی صورت میں آواز دبانے کے لیے اس نے سیٹ کا کشن اٹھا کر پستول کی نال کے ساتھ لگا دیا۔

''فائر مت کرنا۔'' ڈیوڈ اس کی نیت بھانپ کر غرایا۔ ''یہ ہم سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ ہم بعد میں اس سے نمٹ لیں گے۔''

اوسکر نے کار سے چھلانگ لگا دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا جہاں کنارے کے ساتھ ساتھ قدِ آدم سے بھی اونچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اندھا دھند جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ بعض جھاڑیاں کانٹے دار تھیں جس سے اس کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں آگئیں۔ جھاڑیوں کے دوسری طرف پہنچ کر وہ ان کے ساتھ ساتھ تقریباً پچاس گز تک دوڑتا چلا گیا، پھر زمین پر لیٹ کر کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ ہائی وے ایک بار پھر سنسان ہو چکی تھی۔ حشرات الارض کے سوا کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کبھی کبھار کوئی تیز رفتار گاڑی گزرتی تو سڑک کے قریب کی جھاڑیوں سے روشنی چھنتی ہوئی نظر آنے لگتی۔

اس نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ پیچھے سے ایک سست رفتار کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ جلدی سے ایک جگہ جھاڑیوں میں دبک گیا۔ کار آگے نکل گئی لیکن تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک گئی اور ریورس گیئر میں واپس آنے لگی۔ اوسکر نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ کار کے اندر کی بتی جل رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر ڈیوڈ کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ اوسکر جس جگہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا، وہاں لکڑی کی ریلنگ لگی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف دور تک پانی پھیلا ہوا تھا۔ یہ نیم زدہ علاقہ تھا۔ وہ کیچڑ میں لت پت تقریباً پچاس گز آگے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں دبک گیا۔ اسی لمحے اسے ڈیوڈ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے گرگوں سے کہہ رہا تھا۔

''میں اسے زندہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنا تم لوگوں نے! اسے زندہ پکڑنا ہے۔''

اوسکر جھکا جھکا جھاڑیوں میں آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ وہ صرف ایک لمحے کو رکا۔ قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو اسی طرف آرہی تھی۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگا پھر ایک جگہ رک کر متجسس نگاہوں سے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے ایک موٹی سی لکڑی مل گئی جو چار پانچ فٹ لمبی تھی۔ وہ اس لکڑی کو اٹھائے جھاڑیوں میں راستہ بنا کر آگے بڑھتا رہا۔

گریڈی اور بوس قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ دونوں اس سے چالیس گز سے زیادہ دور نہیں تھے، لیکن تاریکی میں صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ اوسکر جس جگہ چھپا ہوا تھا، اس کے ساتھ ہی زمین کی ایک قدرے اونچی خشک پٹی سی تھی۔

وہ دونوں اس خشک پٹی پر چل رہے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے دبنے والی جھاڑیوں کی آواز ان کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اب وہ تقریباً پندرہ فٹ دور رہ گئے تھے۔ اوسکر نے ایک پتھر اٹھا کر اپنے سے آگے اچھال دیا۔

''اس طرف بوس!'' گریڈی کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے ابھی ابھی آواز سنی ہے۔'' وہ اوسکر کے زیادہ قریب تھا۔

''ایک منٹ رک جاؤ۔'' بوس کی آواز قدرے فاصلے سے آتی ہوئی سنائی دی۔

اوسکر نے جھاڑیوں سے جھانک کر دیکھا، گریڈی قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اس سے آگے نکل گیا۔ غالباً وہ اس جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں اس نے آواز سنی تھی۔ وہ جیسے ہی آگے نکلا اوسکر نے لکڑی کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور آواز پیدا کیے بغیر نہایت آہستگی سے اٹھ کر گریڈی کے سر پر بھرپور وار کیا۔ گریڈی کو منہ سے کوئی آواز نکالنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس کی کھوپڑی پھٹ گئی تھی اور وہ منہ کے بل ڈھیر ہو گیا تھا۔ اوسکر نے اس کے ہاتھ سے پستول کھینچا اور جھاڑیوں میں دبک کر بوس کا انتظار کرنے لگا۔

بوس بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اوسکر کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا کہ کیچڑ میں اس کا پیر پھسلا اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ اوسکر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔ دونوں گولیاں بوس کے سینے میں لگیں۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا مگر فوراً سنبھل گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا، اور اوسکر بھی جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ بوس نے اوسکر کو دیکھا اور چمگادڑ کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف لپکا۔ اوسکر نے ایک اور فائر کر دیا۔ اس مرتبہ گولی بوس کے چہرے پر لگی۔ اس کے بائیں رخسار کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوس کو ایک زبردست جھٹکا لگا لیکن وہ سخت جان کسی عفریت کی طرح اوسکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا، اوسکر نے اس کے سینے پر چوتھی گولی چلا دی لیکن بوس کے دونوں ہاتھ اوسکر کی گردن پر پہنچ چکے تھے۔ اوسکر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن آہنی شکنجے میں کسی جا رہی ہو بوس کا انگوٹھا اوسکر کے نرخرے پر تھا اور گرفت شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اوسکر کا سانس گھٹنے لگا۔ اس نے پستول پھینک کر دونوں ہاتھوں سے بوس کی کلائی پکڑ لی اور خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر بوس کی گرفت آہنی شکنجے سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ اوسکر کا سانس رک رہا تھا۔ اس نے بوس کی کلائی چھوڑ دی اور اس کے دونوں ہاتھ نیچے جھول گئے۔

اوسکر کو یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا لیکن چند سیکنڈ بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ زمین پر پڑا تھا اور بوس کے بھاری جسم کا بوجھ اس کے اوپر لدا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک اوسکر کی گردن پر تھے لیکن ان کی گرفت ختم ہو چکی تھی۔ اوسکر نے پوری قوت سے دھکیل کر اسے اپنے اوپر سے ہٹا دیا۔ پھر گریڈی کے قریب پہنچ کر نہایت پھرتی سے اس کا کوٹ اتار کر خود پہن لیا، اور پستول تلاش کر کے اس کا میگزین چیک کرنے لگا۔ اس میں صرف ایک گولی رہ گئی تھی۔

اوسکر جب جھاڑیوں سے نکلا تو ڈیوڈ فیز ریلنگ کے قریب کھڑا تھا۔ تاریکی میں اس کا صرف ہیولا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''کیا ہوا گریڈی؟ کیا وہ ختم ہو گیا؟'' کوئی جواب نہ پا کر وہ ریلنگ پھلانگ کر آگے آ گیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اسے زندہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں زندہ تمہارے سامنے موجود ہوں، ڈیوڈ!'' اوسکر نے کوٹ کی جیب سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔

اوسکر کی آواز سنتے ہی ڈیوڈ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے پستول نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر کچھ سوچ کر دونوں ہاتھ پہلو میں گرا دیے۔ اوسکر اس سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ دفعتاً اس کا پیر ایک چھوٹے سے گڑھے میں پڑا اور ایک لمحے کے لیے اس کا توازن بگڑ گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈیوڈ نے اس کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اوسکر نہایت پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کے دستے سے ڈیوڈ کی کنپٹی پر زوردار ضرب رسید کر دی۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس کا چہرہ کیچڑ میں لتھڑ گیا۔ اوسکر نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا اور ایک پیر سینے پر رکھ کر اس کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر پستول کی نال اس کی ناک سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''اب بولو... کیا خیال ہے؟''

''نہیں!'' ڈیوڈ کے حلق سے مردہ سی آواز نکلی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے... یہ قتل ہوگا۔''

''مجھے ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟'' اوسکر

غرایا۔
''ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔ تمہیں صرف خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔'' ڈیوڈ گھگیایا۔
''اگر یہ سب کچھ مذاق تھا تو ڈاکٹر رائز کہاں ہے؟''
''میں نہیں جانتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جینکا جا رہا ہے۔''
''لیکن میرا خیال ہے کہ جھیل کی مچھلیاں اب تک اسے ہضم کر چکی ہوں گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟''
''م... میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسے گریڈی نے مارا تھا۔ وہ کسی کی جان لے کر خوش ہوتا ہے۔ میں اس پر کنٹرول نہیں کرسکتا تھا۔''
''تم جھوٹ بکتے ہو۔'' اوسکر اس کے چہرے پر پستول سے ضرب لگاتے ہوئے دہاڑا۔ ''بینڈٹ کے بارے میں بتاؤ۔ اس سارے معاملے میں اس کا کتنا ہاتھ ہے؟''
''وہ میرا مقروض تھا۔ کتوں کو نشہ آور دوا کھلانے کا منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ میں تو اپنا قرض وصول کرنے کے لیے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔''
''اور مسز فورڈ کو کس نے قتل کیا تھا؟''
''میں نہیں جانتا۔ میں اس وقت وہاں نہیں تھا۔ اسے کتوں کے معاملے میں بینڈٹ کی حرکت کا پتا چل گیا ہوگا اور ممکن ہے اس نے بینڈٹ کو کسی قسم کی دھمکی دی ہو جس پر بینڈٹ نے اسے ختم کردیا۔''
''اور وہ لڑکی؟ اس سارے ڈرامے میں اس کا کردار کیا ہے؟''
''کون سی لڑکی؟''
''بینڈٹ کی بہن ویون!''
''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ممکن ہے وہ اپنے بھائی کی مدد کر رہی ہو؟''
''ٹھیک ہے۔'' اوسکر نے اس کے سینے سے پیر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ساتھ کار تک چلو گے اور ایک اعتراف نامہ لکھ کر دو گے اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔''
اوسکر نے پستول کا رخ زمین کی طرف کردیا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے نہایت پھرتی سے اوسکر کے پیٹ پر لات رسید کرنا چاہی مگر وہ پیٹ کے بجائے ران پر لگی۔ اوسکر لڑکھڑا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر ڈیوڈ کو دبوچ لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ پستول ان دونوں کے سینوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔ دفعتاً ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اوسکر کے پستول والے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ گولی اس کے حلق میں داخل ہوکر کھوپڑی کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اچھل کر پشت کے بل کیچڑ میں گرا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کی تاریکی میں جھانک رہی تھیں۔ اوسکر نے اس کی جیب سے ہاتھی دانت کے دستے والا پستول نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور گریڈی والا پستول رومال سے اچھی طرح صاف کر کے ڈیوڈ کی لاش کے قریب ہی کیچڑ میں پھینک دیا۔
اوسکر جب اپنے فلیٹ پر پہنچا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہی اس نے کیچڑ اور خون آلود کپڑے اتار کر گریڈی کے کوٹ میں بنڈل کی صورت میں لپیٹ دیے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل کے بعد اس نے اسکاچ کے دو تین پیگ چڑھائے اور فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ اپنی واکس ویگن وہ ڈوکل سے لے آیا تھا۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ وہ دریا کا پل عبور کر کے ماربل ہیڈ کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

دستک کے جواب میں دروازہ ویون ہی نے کھولا تھا۔ اوسکر کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ دھواں ہوگیا اور آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ وہ متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اوسکر اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ ویون نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر رخسار پر پڑنے والے اوسکر کے بھرپور تھپڑ نے آواز کو ہونٹوں سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ اس کا ایک ہاتھ بے اختیار منہ پر پہنچ گیا تھا اور وہ دہشت زدہ نگاہوں سے اوسکر کی طرف دیکھنے لگی۔
''میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔'' اوسکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے غرایا۔ ''لیکن اب تمہاری زندگی اور موت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک بات طے ہے کہ یہاں سے جانے سے پہلے میں تم سے ایک ایک لفظ اگلوا لوں گا۔ اس کے لیے خواہ مجھے تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ ہی الگ کیوں نہ کرنا پڑے۔''
وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ سرکنے لگی تو اوسکر نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔ اس کی فولادی انگلیاں ویون کے گوشت میں

پیوست ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے اور وہ ہولے ہولے کراہتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی مگر اوسکر کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اوسکر نے اسے دھکا دے کر ایک بار پھر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر جماتے ہوئے غرایا۔ ''میں ابھی ابھی تین آدمیوں کو قتل کر کے آیا ہوں۔ مجھے غصہ دلانے کی کوشش مت کرنا۔''

''پلیز، اوسکر!'' وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کراہی۔ ''تم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہو۔ میں نہیں جانتی تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟''

''تم واقعی کچھ نہیں جانتیں؟'' اوسکر کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔ ''جان بھی کیسے سکتی ہو؟ اگر وہاں ہوتیں تو دیکھ لیتیں کہ میں کس طرح موت کے جال میں پھنس گیا تھا اور میرے گرد موت کا یہ جال تم نے پھیلایا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں! بف اور میں ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھے تمہارا انتظار کرتے رہے لیکن تم وہاں نہیں پہنچے۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم نے بف کو اس ملاقات کا بتا دیا تھا؟'' اوسکر نے اسے گھورا۔

''ہاں... میرا خیال تھا کہ اس کی موجودگی سے ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔'' ویون کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''بف اور میں اکٹھے ہی گھر سے نکلے تھے۔ بف ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن اسے ٹوکل بار کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ وہ غلط راستے پر مڑ گیا۔ اس طرح ہم اگرچہ خاصی دیر میں وہاں پہنچے تھے لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد ہم واپس آگئے۔ بف مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔''

اوسکر کا ذہن الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ویون کی کہانی پر یقین کرے یا نہیں۔ اس نے گردن چھوڑ دی۔ ویون کی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک سی ابھر آئی مگر وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑائی۔ اگر اوسکر نے اسے تھام نہ لیا ہوتا تو وہ منہ کے بل گر پڑتی۔ اوسکر نے اسے لے جا کر صوفے پر لٹا دیا۔

''بف کچھ نہیں جانتا۔ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ یہ سب اس بدمعاش ڈیوڈ ہی کا کیا دھرا ہے۔'' ویون مردہ سی آواز میں بولی۔

''بف سب کچھ جانتا ہے اور یقیناً تم بھی لاعلم نہیں ہو کہ تمہارے بھائی اور ڈیوڈ نے کتوں کی ریس میں گڑبڑ کا پروگرام بنایا تھا۔ بف کو اس منصوبے میں جونیئر پارٹنر کی حیثیت حاصل تھی۔''

''لیکن... وہ قاتل نہیں ہے۔'' ویون بولی۔ ''وہ بدقماش ہوسکتا ہے لیکن قتل جیسا جرم نہیں کر سکتا۔''

''اس نے مجھے موت کے گھاٹ اتروانے کی بھرپور کوشش کی تھی، اور ڈیوڈ فیئر کے بیان کے مطابق اپنی بہن کو بھی اسی نے قتل کیا تھا یعنی تمہارے بھائی نے۔''

''بہن کو؟'' ویون نے غیر یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں! ڈیوڈ کو اس پورے واقعے کا علم نہیں لیکن اس کے خیال میں تمہاری بہن کو کتوں کے بارے میں بف کے منصوبے کا علم ہو گیا ہوگا۔ اس نے بف کو کسی قسم کی دھمکی دی ہوگی جس پر بف نے اسے قتل کر دیا۔ ممکن ہے ڈیوڈ جھوٹ بول رہا ہو مگر تمہارا بھائی بھی کم نہیں۔ ان دونوں کی کسی بات کا یقین کرنا ممکن نہیں۔''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ بف اور سب کچھ کر سکتا ہے مگر اس میں کسی کو قتل کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اس نے بہن کو قتل نہیں کیا۔ اگر تمہیں ایسا ہی شبہ ہے تو پولیس کو اطلاع کر دو۔ وہ لوگ خود اس معاملے کی تحقیقات کر لیں گے۔''

''میں پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتا کیونکہ دیوار کے قریب سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں تین لاشیں پڑی ہیں اور پولیس میری بات کا یقین نہیں کرے گی کہ وہ تینوں وہاں کس طرح پہنچے تھے۔''

''دیکھو اوسکر! تم اپنے آپ کو اس معاملے میں مت الجھاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہیں کتنا چاہنے لگی ہوں اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟'' اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو امڈ آئے۔

دوسرے دن اوسکر نے فورڈ کو فون کیا۔ وہ صرف یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے نئی صورت حال کا علم ہوسکا ہے یا نہیں۔

''میں نے آج صبح اخبار میں پڑھا تھا۔'' فورڈ نے جواب دیا۔ ''اور کئی مرتبہ تمہیں فون بھی کیا لیکن تم سے رابطہ قائم نہیں ہوسکا۔ اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''مختلف جگہوں سے مختلف باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ ڈیوڈ اور تمہارے سالے میں تصادم ہو گیا تھا جس میں کامیابی بینڈٹ کو ہوئی۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنا کام جاری رکھو۔'' فورڈ کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اوسکر کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ

فورڈ اس صورتِ حال سے خاصا مطمئن تھا۔ وہ اپنے سالے کو پھنسانا چاہتا تھا اور واقعات بینڈٹ کے خلاف ہی جا رہے تھے۔ یہ حقیقت صرف ویون ہی کو معلوم تھی کہ ڈیوڈ اور اس کے ساتھیوں کو اوسکر نے ہلاک کیا تھا۔ لیکن اوسکر کو یقین تھا کہ وہ اس سلسلے میں زبان نہیں کھولے گی۔ بینڈٹ کو شبہ ہو سکتا تھا لیکن وہ بھی اپنے آپ کو ملوث کیے بغیر پولیس کے سامنے اوسکر پر اپنے شبہ کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

پیر کے دن اوسکر اپنا دفتر بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ فورڈ تھا جس نے اوسکر کی آواز سنتے ہی کہا۔

''بینڈٹ تقریباً چار گھنٹے پہلے میرے گھر کا صفایا کر گیا ہے۔''

''لیکن... وہ اندر کیسے داخل ہوا تھا؟'' اوسکر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ گزشتہ رات کچھ رقم قرض لینے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اسے دو سو ڈالر دے دیے اور رات اپنے گھر میں بسر کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ تقریباً آٹھ بجے صبح جب ملازمہ اسے ناشتا تیار ہونے کی اطلاع دینے گئی تو کمرا خالی تھا۔ پہلے تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی پھر اپنی بیوی کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی موت کے بعد میں نے یہ کمرا بند کر دیا تھا۔ جب کمرے میں داخل ہو کر جائزہ لیا تو انکشاف ہوا کہ میری بیوی کے بیشتر زیورات غائب تھے۔''

''اندازاً ان کی کیا مالیت ہوگی؟'' اوسکر نے دریافت کیا۔

''گھر میں رکھے جانے والے وہ زیورات زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ قیمتی زیورات میں نے بہت عرصہ پہلے اپنے بینک کے سیف ڈپازٹ میں رکھوا دیے تھے۔ چوری ہونے والے زیورات زیادہ سے زیادہ دس ہزار ڈالر کی مالیت کے رہے ہوں گے۔ وہ میری میز کی دراز سے تقریباً بیس ہزار ڈالر کی نقد رقم بھی نکال کر لے گیا ہے۔''

''اتنی رقم میز کی دراز میں رکھنا میرے خیال میں کسی طرح بھی دانشمندی نہیں کہلائی جا سکتی۔'' اوسکر نے کہا۔

''وہ رقم میں نے دراز میں کاغذات کے نیچے چھپا کر رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اسے وہاں رقم کی موجودگی کا پتا کیسے چل گیا؟''

''ظاہر ہے اس نے دراز کھول کر پوری طرح تلاشی لی ہوگی۔ بہر حال، تم نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی یا نہیں؟''

''ابھی نہیں۔''

''پولیس کو فوراً مطلع کر دو اور اس کی کار کا ماڈل اور نمبر بھی بتا دو۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی کار ہی کے ذریعے فرار ہو رہا ہوگا۔''

''میں نے اس کی گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے وہ ٹیکسی میں آیا ہوگا۔''

''بہر حال، تم پولیس کو جو کچھ بھی بتا سکتے ہو، بتا دو۔ میں بھی سارجنٹ کوگان سے بات کرنے کے بعد بینڈٹ کے اپارٹمنٹ کی طرف چلا جاؤں گا۔'' اوسکر نے فون بند کر دیا۔

اوسکر اور سارجنٹ کوگان تقریباً اکٹھے ہی وہاں پہنچے۔ کوگان گاڑی سے اترا تو اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور شولڈر ہولسٹر میں سے ریوالور کا جھانکتا ہوا دستہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' کوگان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم ذرا الگ رہو۔'' اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ اندر ہائی ہیل سینڈلوں کی کھٹ کھٹ کی آواز ابھری جو دروازے کے قریب آ کر رک گئی اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''بینڈٹ! کیا تم ہو؟''

''پولیس! دروازہ کھولو۔'' کوگان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

دروازہ چند انچ کے قریب کھل گیا اور ایک لڑکی کا خوب صورت چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔ کوگان نے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور لڑکی کو ایک طرف ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''بینڈٹ کہاں ہے؟'' کوگان نے لڑکی سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ میں خود اس کا انتظار کر رہی ہوں۔'' لڑکی نے الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اوسکر بھی کمرے میں آ چکا تھا۔ ایک طرف دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی بھی کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔

''تم لوگ کہاں جانے والے تھے؟'' کوگان نے لڑکی سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ بولا۔ ''دیکھو لڑکی! تمہارا دوست تمہیں دھوکا دے کر فرار ہو چکا ہے۔ وہ اب تک بہت دور نکل چکا ہوگا، تم لوگوں نے کہاں کا پروگرام بنایا تھا؟''

لڑکی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی خوب صورت سیاہ

آنکھوں میں اداسی جھلکنے لگی۔ پھر وہ رونے لگی اور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی رام کہانی سنانے لگی۔ لڑکی کے کہنے کے مطابق وہ دونوں پیوٹرو ریکو جانے والے تھے، جہاں پہنچ کر وہ شادی کر لیتے۔ بینڈٹ گزشتہ رات ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ صبح نو بجے کے قریب آکر اسے ساتھ لے جائے گا۔ وہ اب تک بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

کوگان فلیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ اوسکر بھی اس کے پیچھے تھا۔ کوگان نے کار کے ریڈیو پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے ہدایت کی کہ فوری طور پر پیوٹرو ریکو کی تمام فلائٹس کے ریکارڈ کو چیک کیا جائے۔

لیکن... پولیس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے دن کے تمام اخبارات ہف بینڈٹ کی تصویر سے آراستہ تھے۔ اسے خوفناک قاتل قرار دیتے ہوئے پورے ملک میں اس کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔ اخبارات کا خیال تھا کہ کسی بہت بڑے اسکینڈل کا انکشاف ہونے والا ہے۔

کئی روز گزر گئے۔ بینڈٹ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اوسکر بیکار ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ دن بھر دفتر میں بیٹھا دیواروں کو گھورتا رہتا۔ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جس سے اسے آگے بڑھنے کا راستہ مل سکے۔

منگل کی صبح ریڈیو سے نیو ہمپشائر جھیل سے ایک لاش کی دستیابی کی خبر نشر کی گئی۔ اوسکر اس وقت باہر نکلنے والا تھا مگر دروازے کے قریب رک کر پوری خبر سننے لگا۔ ریڈیو کی اطلاع کے مطابق لاش کئی روز پرانی تھی۔ اوسکر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بینڈٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا ممکن ہے وہ بینڈٹ ہی کی لاش ہو اور اس نے قانون سے بچنے کے لیے کسی ایسی جگہ خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا ہو جہاں اس کی لاش بھی کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔

جمعے کی صبح اوسکر کو فورڈ کی فون کال ملی۔ ''مسٹر اوسکر! میرا خیال ہے یہ معاملہ اب ختم ہو چکا ہے۔ میں ڈاک سے تمہیں چیک بھیج رہا ہوں۔''

''شکریہ! لیکن میں تو اس انتظار میں تھا کہ شاید تمہارا گمشدہ سالا کہیں مل جائے تاکہ تم سے حسبِ وعدہ بونس کی رقم بھی وصول کر سکوں۔''

''اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر بینڈٹ مل بھی گیا تو میرے لیے کوئی دشواری پیدا نہیں کر سکے گا۔ جہاں تک تمہاری رقم کا سوال ہے تو میں تمہیں دس ہزار ڈالر کا چیک بھیج رہا ہوں۔ اس میں بونس اور اخراجات کی رقم بھی شامل ہے۔ میں یہ چیک آج ہی بھیج دوں گا لیکن اگر تمہارا اس طرف آنے کا اتفاق ہو تو خود ہی لے لینا۔''

''تمہارے دفتر سے؟'' اوسکر نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں تمہیں گھر پر ملوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' اوسکر نے یہ کہتے ہوئے کریڈل ٹیپ کیا اور ویون سے رابطہ قائم کر کے اس سے لنچ کا پروگرام طے کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

اوسکر، ویون کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ اس کی منتظر ہی بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد اوسکر کی گاڑی ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں جب فورڈ کے مکان پر پہنچے تو چیک تیار تھا۔ اوسکر نے چیک پر رقم اور دستخط دیکھتے ہوئے اسے جیب میں رکھ لیا۔

''کیا لنچ میرے ساتھ کرنا پسند کرو گے؟'' فورڈ نے پوچھا۔

اوسکر انکار کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن اس وقت اس کی جیب میں دس ہزار ڈالر کے چیک کے علاوہ ویون بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے فورڈ سے معذرت کر لی۔

کار پرڈرائیو وے سے گزرتے ہوئے کونارڈ کو دیکھ کر اوسکر نے گاڑی روک لی۔ ''ہیلو کونارڈ! تمہارے کتوں کا کیا حال ہے؟''

کونارڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔

''کیا بات ہے؟ پھر کوئی گڑبڑ؟'' اوسکر نے پوچھا۔

مگر کونارڈ کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے ایک طرف چل دیا۔ ڈرائیو وے سے نکل کر اوسکر نے سڑک پر گاڑی روک لی۔

''اب کیا معاملہ ہے؟'' ویون نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کونارڈ سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔''

''ارے چھوڑو بھی۔ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے اور تمہیں کسی گڑبڑ کی سوجھ رہی ہے۔''

''چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' اوسکر یہ کہتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ دوسری طرف سے ویون بھی نیچے آگئی۔ وہ جھاڑیاں عبور کر کے اس جنگلے کے قریب پہنچ گئے جو مکان کی چار دیواری کا کام دے رہا تھا۔ جنگلا عبور کر کے انہیں

کتا خانے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کتے پہلے تو انہیں دیکھ کر غرانے اور بھونکنے لگے مگر ویون کو پہچان کر خاموش ہو گئے۔ اوسکر نے ایک خوب صورت سا کتا اٹھالیا اور اس کے گلے میں زنجیر ڈالنے لگا۔

"آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" ویون نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کونارڈ نے اشارہ دیا تھا کہ کتے ایک مرتبہ پھر گڑبڑ کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔" اوسکر نے جواب دیا اور دونوں کتا خانے سے باہر نکل آئے۔ کتے کی چین اوسکر کے ہاتھ میں تھی اور کتا زمین سونگھتا ہوا ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔

کتا لان کے آخری سرے پر پہنچ کر پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر کی زمین سونگھنے لگا، اور ایک جگہ رک کر پنجے مارنے لگا۔

"یہاں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" اوسکر نے ویون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تقریباً دو ہفتے پہلے فورڈ نے اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں پکنک منائی تھی اور بچی کچی ہڈیاں وغیرہ اس جگہ دبا دی گئی تھیں۔" ویون نے جواب دیا۔

"لیکن کیا دو ہفتے بعد کتے کا اس طرح کرنا معنی خیز نہیں؟" اوسکر بولا۔ ویون نے کوئی جواب نہیں دیا تو اوسکر کتے کو کھینچتا ہوا دوبارہ کتا خانے کی طرف چل دیا۔ ویون بھی ساتھ ہولی۔

"تم ایک منٹ یہیں رکو۔" اوسکر نے کتا اس کے پنجرے میں بند کرتے ہوئے ویون سے کہا۔ "کوئی بیلچہ یا پھاوڑا لے کر آؤ۔ میں وہ زمین کھودنا چاہتا ہوں۔"

"پھاوڑا کتا خانے کے اوپر والے کمرے میں مل جائے گا۔ ایسی چیزیں وہیں رکھی ہوتی ہیں۔" ویون نے ایک طرف اشارہ کیا۔

دونوں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے، جن کا اختتام ایک کمرے کے وسط میں ہوا۔ کمرے کے چاروں طرف لکڑی کی دو ڈھائی فٹ اونچی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔ اوسکر ایک بیلچہ اٹھا ہی رہا تھا کہ ویون نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میرا خیال ہے، میں نے ابھی ابھی کوئی آواز سنی ہے۔" اس نے اوسکر کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

اوسکر نے بھی کان لگا دیے۔ کتا خانے کے لکڑی کے فرش پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اوسکر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ویون کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر اوسکر! کیا اوپر تم ہو؟" نیچے سے آتی ہوئی آواز سن کر اوسکر نے اپنا سانس روک لیا۔ وہ فورڈ تھا۔ "مجھے معلوم ہے تم اوپر ہو۔ نیچے آجاؤ۔ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے فوراً ہی بعد کھٹک کی ہلکی سی آواز ابھری اور لکڑی کی ریلنگ پر ایک جگہ سے چھوٹی چھوٹی کرچیاں بکھر گئیں۔ اوسکر، ویون کو کھینچتا ہوا کمرے کے آخری سرے پر لے گیا، اور اس کے کان کے قریب مدھم سرگوشی میں کہا۔ "اس کے پاس پستول ہے جس پر سائلنسر بھی لگا ہوا ہے۔"

اس نے جوتے اتار دیے اور ننگے پاؤں دبے قدموں چلتا ہوا کمرے کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا جہاں مختلف سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک لمبا سا ڈنڈا اٹھالیا جس کے ایک سرے پر ایک آہنی پٹی کے ساتھ لوہے کی موٹی اور نکیلی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ بھی ایک قسم کا بیلچہ ہی تھا جس سے عام طور پر جھاڑیاں وغیرہ سمیٹنے یا زمیندار لوگ فصل کی کٹائی کے وقت بھوسا وغیرہ اڑانے کا کام لیتے ہیں۔

"کیا تم نے بینڈٹ کو تلاش کرلیا؟" فورڈ کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

اوسکر نے ویون کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ منہ پر جما رکھا تھا۔ آنکھوں سے بے پناہ خوف جھلک رہا تھا۔ اوسکر نے اسے فرش پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور خود آہستہ آہستہ ایک طرف سرکنے لگا۔

"مجھے اوپر آنے پر مجبور مت کرو۔" فورڈ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ "اگر تمہیں کونارڈ کا انتظار ہے تو یہ بیکار ہوگا۔ میں اسے چھٹی دے کر رخصت کر چکا ہوں۔ تمہیں کسی طرف سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔"

اوسکر ریلنگ کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ فورڈ اوپر آنے کی حماقت نہیں کرے گا لیکن اس امکان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ آہنی بیلچہ سنبھالے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا جیسے وہ کمرے میں اکیلا رہ گیا ہے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ویون غائب تھی۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ویون کہاں غائب ہو سکتی تھی! وہ سینے کے بل رینگتا ہوا آہستہ آہستہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے ویون کو چھوڑا تھا۔

وہ چند لمحے تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر دیوار ٹٹولنے لگا۔ لکڑی کی دیوار میں ایک جگہ چند تختے الگ سے نظر آئے۔ تختوں پر دباؤ ڈالنے سے انکشاف ہوا کہ وہ چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ اس نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو

سکا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ویون کو اس کھڑکی کا علم تھا۔ وہ اس راستے سے نہ صرف فرار ہوئی تھی بلکہ دوسری طرف سے کھڑکی بند کر گئی تھی تاکہ اوسکر باہر نہ نکل سکے۔ اوسکر کے خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ اس نے تختوں کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف تاریکی تھی۔ غالباً اس طرف بھی کوئی کمرا ہی تھا۔ وہ کھڑکی پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ وہ پیٹرول کی بو تھی جو سیڑھیوں کی طرف سے آرہی تھی۔

فورڈ کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے اوسکر! تم نیچے نہیں آنا چاہتے، مت آؤ۔ مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں۔“

اوسکر کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسی جگہ لیٹے لیٹے چیخ کر بولا۔ ”تم جو کچھ کرنا چاہتا ہو مسٹر فورڈ! میں سمجھ رہا ہوں لیکن تمہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مس ویون بھی میرے پاس ہے جس کے لیے تم نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ ختم ہو گئی تو تمہاری ساری محنت رائگاں جائے گی۔“

”میں اتنا احمق نہیں ہوں اوسکر!“ نیچے سے فورڈ کی آواز سنائی دی۔ ”ویون میرے پاس موجود ہے۔ اگر تمہیں یقین نہ ہو تو نیچے آکر دیکھ لو۔“

”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو، فورڈ!“ اوسکر چیخا۔ ”قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ مجھے ختم کرنے کے بعد تم بھی نہیں بچ سکو گے۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ قانون جس طرح میرے ہاتھوں کا کھلونا بنا رہا، وہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری ہڈیاں تک جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تم ہو۔ قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اوسکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر وہی کچھ ہوا جس کا خدشہ تھا۔ فورڈ نے سیڑھیوں پر پیٹرول چھڑکنے کے بعد آگ لگا دی تھی۔ شعلوں کی روشنی اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ اوسکر کو یقین تھا کہ آگ کے اوپر تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ اب اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ پوری قوت سے کھڑکی پر کندھے کی ضربیں لگانے لگا۔ سیڑھیوں پر شعلے دکھائی دینے لگے تھے۔ لکڑی کے زینے پر آگ بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اوسکر کھڑکی پر زور آزمائی کرتا رہا، اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ کھڑکی ٹوٹتے ہی اس نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن وہ جیسے ہی اس کمرے کے آخری سرے پر پہنچا اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس طرف کی سیڑھیاں بھی آگ کی لپیٹ میں تھیں۔ گویا فورڈ نے اس کے فرار کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔

اوسکر نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر لمحہ بھر کو سوچا پھر نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے نیچے چھلانگ لگا دی اور دروازے کی طرف دوڑا، مگر دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا گیا کندھے پر لگنے والی ضرب خاصی شدید تھی۔ وہ سنبھل کر تیزی سے مڑا۔ ویون لوہے کا سریہ ہاتھوں میں لیے اس پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اوسکر نے بجلی کی سی پھرتی سے اچھل کر ویون کو پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ جلتے ہوئے زینے کے تختے اب ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ آگ پھیل رہی تھی، اور کسی بھی لمحے لکڑی کی چھت نیچے گر سکتی تھی۔ اپنے اپنے پنجروں میں بند کتے بُری طرح بھونک رہے تھے۔

اوسکر دروازے سے دو قدم دور ہی تھا کہ فورڈ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اوسکر نے نہایت پھرتی سے ویون کو دونوں بانہوں سے پکڑ کر اس طرح آگے کر لیا کہ وہ اس کے لیے ڈھال بن گئی۔

”اسے چھوڑ دو اوسکر!“ فورڈ پستول والا ہاتھ اٹھاتے ہوئے غرایا۔

”نہیں، اگر تم مجھے ختم کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ یہ بھی جائے گی۔“ اوسکر بولا۔

”اگر تم یہی چاہتے ہو تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ فورڈ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ ”ویون کی حیثیت میرے لیے ایک مہرے سے زیادہ نہیں اور مہرے پٹتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کی جائداد حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا اگر ویون کو شادی کا لالچ نہ دیتا تو شاید یہ سب کچھ ممکن نہ ہوتا۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن... اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”فورڈ...!“ ویون چیخی۔

فورڈ نے اس کی پروا کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی آواز ابھری اور گولی ویون کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اوسکر نے پوری قوت سے ویون کو آگے دھکیل دیا۔ وہ فورڈ سے جا کر ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اوسکر نے بھی ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن اسے قدرے تاخیر ہو گئی تھی۔ فورڈ نے گرتے گرتے بھی پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا۔ گولی اوسکر کا کندھا توڑتی ہوئی نکل گئی۔ زخمی ہونے کے باوجود اوسکر نے فورڈ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ لکڑی کے جلتے

ہوئے گھنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ایک تختہ ویون کی لاش پر گرا اور اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ اوسکر اور فورڈ ایک دوسرے سے گتھم گتھا کتوں کے پنجرے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ معاً فورڈ کا ایک پیر پنجرے کے اندر چلا گیا۔ پنجرے میں بند غراتے ہوئے گرے ہاؤنڈ نے اس کا پیر دبوچ لیا اور اسے جھنجوڑنے لگا۔ فورڈ بری طرح چیخ رہا تھا۔ اسی لمحے لکڑی کا ایک اور جلتا ہوا تختہ ان کے قریب گرا۔ اوسکر کی پتلون کا پائنچہ جلنے لگا۔ وہ خود کو فورڈ کی گرفت سے چھڑانا چاہتا تھا مگر فورڈ نے اس کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ اوسکر نے اس کے منہ پر ضرب لگائی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اچانک پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ اوسکر اپنے آپ کو فورڈ کی گرفت سے چھڑا کر دروازے کی طرف لپکا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جلتے ہوئے دو اور تختے فورڈ کے قریب گر چکے تھے اور اس کے کوٹ نے آگ پکڑ لی تھی۔ ایک طرف کتا اس کی ٹانگ جھنجوڑ رہا تھا، دوسری طرف آگ تھی۔

اوسکر نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے کپڑوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ چند قدم گیا تھا کہ لڑکھڑا کر گرا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ دو پولیس والے اس کی طرف لپکے تھے۔

☆☆☆

اوسکر کی آنکھ اسپتال کے بستر پر کھلی۔ اس کی دائیں ٹانگ پر پنڈلی کی کھال جل چکی تھی اور کندھے پر جہاں گولی لگی تھی، پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب کرسی پر سارجنٹ کوگان بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب تم ہمیں کچھ بتا سکتے ہو؟" سارجنٹ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"فورڈ کا کیا ہوا؟" اوسکر نے دھیمی آواز سے کہا۔

"ہمیں افسوس ہے ہم کسی کو بھی نہیں بچا سکے۔ جلے ہوئے ملبے سے تقریباً ایک درجن کتوں کے علاوہ ویون اور فورڈ کی جلی ہوئی لاشیں بھی برآمد ہوئیں۔ مکان کے کمپاؤنڈ میں ایک جگہ زمین کھود کر وہ لاش بھی نکال لی گئی، جس کے بارے میں تم بے ہوشی میں بڑبڑاتے رہے تھے۔ وہ بینڈٹ کی لاش تھی۔ ہم شناخت کر چکے ہیں۔ اب میں تم سے سننا چاہتا ہوں، یہ سب کچھ کیا تھا؟"

"اسے تم دولت کی ہوس کہہ سکتے ہو۔" اوسکر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "فورڈ نے اپنی بیوی کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے یہ خونی ڈراما کھیلا تھا۔ اس نے اپنی سالی ویون کو شادی کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا، جبکہ دیگر کاموں کے لیے اس نے ڈیوڈ فیئر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ فورڈ کا سالا بینڈٹ، ڈیوڈ کا مقروض تھا۔ اس نے بینڈٹ کے ذریعے سب سے پہلے فورڈ کی بیوی کے کتوں کو ناکارہ بنایا۔ فورڈ کی بیوی کو اس کا پتا چل گیا۔ اس نے بینڈٹ کو پولیس کے حوالے کر دینے کی دھمکی دی۔ بینڈٹ نے موقع پا کر اسے ہلاک کر دیا۔ ویون بھی بینڈٹ کے اس منصوبے میں شامل تھی۔ اس نے مجھے پھنسانے کے لیے اپنی بہن کے زیورات میری جیب میں ڈال دیے۔ انہیں کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ مسز فورڈ نے کتوں کے معاملے کی تحقیقات کے لیے مجھے یاٹ کلب میں بلایا تھا۔ کتوں کو ناکارہ بنانے میں ڈاکٹر رائز کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن جب میں ڈاکٹر تک پہنچ گیا تو ڈیوڈ نے اسے ختم کر دیا۔ وہ اپنے گرگوں کے ذریعے مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا مگر میں بچ نکلا۔" اوسکر چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔ "ایک تیر سے دو شکار والا محاورہ تو عام ہے مگر فورڈ ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نہ صرف ڈیوڈ کو میرے پیچھے لگا دیا بلکہ ویون کے ذریعے ڈیوڈ اور بینڈٹ کو بھی ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ آخرکار فورڈ نے بینڈٹ کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور مشہور یہ کیا کہ وہ اس کے گھر سے قیمتی چیزیں چرا کر غائب ہو گیا ہے۔ پولیس بینڈٹ کی تلاش میں لگی رہی اور فورڈ اطمینان سے آخری مرحلے کی تیاری کرنے لگا۔ اب وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے ایک بار پھر ویون کو استعمال کیا۔ ویون کا خیال تھا کہ حالات درست ہوتے ہی فورڈ اس سے شادی کر لے گا، مگر فورڈ نے اس کی یہ خوش فہمی بھی رفع کر دی۔ ویون، فورڈ ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی اور فورڈ اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل مرا۔"

"ٹھیک ہے اوسکر!" کوگان کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "فی الحال تمہارا اتنا ہی بیان کافی ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو پولیس تم سے مزید کچھ پوچھنا پسند کرے گی۔"

سارجنٹ کوگان کمرے سے جا چکا تھا۔ اوسکر کی نظریں سامنے والی دیوار پر جم گئیں، پھر وہ اس نرس کی طرف دیکھنے لگا جو کوگان کے جانے کے بعد کمرے میں داخل ہوئی تھی... اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ دیکھ کر اوسکر نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک عورت کی مسکراہٹ ہی تو تھی جس نے اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ کسی لڑکی کی مسکراہٹ پر فدا نہیں ہوگا۔

ایک ہی وقت میں مشترکہ سوچ کو عملی روپ دینے والے میاں بیوی کا قصہ

الٹی تدبیر

سکندر علیم

گزشتہ دنوں کی خوشگوار یادیں اس وقت تلخ و تکلیف دہ محسوس ہونے لگتی ہیں... جب حال کی زندگی کا ہر دن ناخوشگوار اور ناپسندیدہ باتوں اور عادتوں کی وجہ سے تلخی کو پروان چڑھا رہا ہو... وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے بیزار ہو چکے تھے... یہ بیزاری ان کی آزاری کو بڑھا اور آزادی کو گھٹا رہی تھی... دونوں نے اپنی اپنی جگہ اس کا حتمی حل سوچ لیا تھا...

شیپرڈ نے اپنی بیوی کے منہ سے خارج ہونے والے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے کو ہاتھ لہراتے ہوئے خود سے دور کیا اور میز کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی بیوی کو گھورنے لگا۔

کیا اس سے بھی زیادہ بور کرنے والا کوئی اور وجود ہو سکتا ہے، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی وہ اس عورت سے محبت بھی کیا کرتا تھا۔ یا کم از کم اس سے محبت کی تھی۔ یہ ایک

حقیقت تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت رہی تھی لیکن تب وہ اس سے قطعی مختلف تھی جیسی کہ اب ہو چکی تھی۔ وہ یہ بدصورت بڑھیا اور چڑیل ہرگز نہیں تھی جس کے بالوں میں اب کرلرز دکھائی دیتے تھے اور ہر وقت ایک خستہ گھٹیا سا باتھ روب پہنے رہتی تھی جو یقیناً اس کے پاس اس وقت سے تھی جب ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کچھ عرصے تک آسودہ اور مطمئن رہا تھا۔ اب وہ اپنا وقت اپنے شوق کی نذر کیا کرتا تھا۔ نادر سکے جمع کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ زندگی سکون اور آسودگی سے گزر رہی تھی۔

لیکن پھر نٹالی بھی ریٹائر ہو گئی۔ اب وہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنے لگی تھی۔ اسے دن بھر نہ صرف نٹالی کی چڑچڑی باتیں سننا پڑتی تھیں بلکہ قابلِ نفرت سگریٹ کے دھوئیں کو بھی سانس کے ساتھ اندر اتارنا پڑتا تھا۔

اب شیپرڈ کا سکون غارت ہو چکا تھا اور وہ بے حد بور رہنے لگا تھا۔ پہلے تو وہ ریٹائرمنٹ کے بعد سیر و تفریح کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ لیکن اب نٹالی شاپنگ مال تک سفر کرنا گوارا نہیں کرتی تھی۔

وہ بس یہی چاہتی تھی کہ اپنا پرانا خستہ حال باتھ روب پہنے دن بھر گھر میں محدود رہے، ٹی وی پر پرانی فلمیں دیکھتی تمباکو نوشی کرتی رہے اور شیپرڈ کو آزار پہنچاتی رہے۔ شیپرڈ کی اس بدوضع سے رینچ ہاؤس کو خریدنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے یہ رینچ ہاؤس نٹالی کو خوش کرنے کے لیے خریدا تھا۔ یہ رینچ ہاؤس حد بندی کی باڑھ سے گھرا ہوا تھا۔ داخلی گیٹ کے پاس گلاب کی جھاڑی تھی۔

نٹالی گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالتی تھی۔ اس کا جواز یہ ہوتا تھا کہ باہر کیڑے مکوڑے اور پتنگے بہت ہیں، دھوپ بہت تیز ہوتی ہے، مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔

لیکن شیپرڈ کو باہر نکلنا پڑتا تھا۔ کبھی احاطے کی باڑھ کو رنگ کر رہا ہے، کبھی گلاب کی جھاڑی کو چھانٹ رہا ہے تو کبھی گھاس کی تراش کر رہا ہے۔ لیکن اسے تو کوئی الرجی نہیں ہوتی تھی۔ اگر نٹالی اتنے زیادہ سگریٹ نہ پیے تو کیا اسے تب بھی الرجی کی شکایت ہو سکتی ہے؟

شیپرڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی لیکن نٹالی نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھی۔ شیپرڈ کی رگوں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے وجود میں ایک جھنجھناہٹ سی طاری تھی۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں سختی سے کھول اور بند کر رہا تھا۔

حالات اب بدل جائیں گے۔ آج کی رات۔

وہ تمام باتوں پر تفصیل سے غور کر چکا تھا۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے آج کی رات کا انتخاب کیا تھا۔ آج کی رات نٹالی کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جائے گی۔

غلطی تمام تر نٹالی ہی کی تھی۔ اس کے ساتھ زندگی نہایت ہی بور گزر رہی تھی۔ کوئی اور متبادل بھی نہیں تھا۔ شیپرڈ معاشقے کے بارے میں غور کر چکا تھا لیکن اس سے معاشقہ کون لڑاتا؟ وہ عمر رسیدہ، گنجا اور موٹا تھا۔ اس نے طلاق کے بارے میں بھی سوچا تھا لیکن طلاق اسے بے حد مہنگی پڑتی۔ طلاق کی صورت میں نٹالی وہ سب کچھ لے جاتی جو اس کے پاس تھا۔ وہ کنگال ہو جاتا۔

وہ خود بھی کسی اور سے رشتہ استوار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی ناجائز تعلقات قائم کرنے کا حامی تھا۔ لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ دنیا میں ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں دلکش نوجوان لڑکیاں اس بات کی قطعی پروا نہیں کرتیں کہ مرد دیکھنے میں کیسا ہے بشرطیکہ اس کے پاس کافی دولت ہو اور اس کی قربت میں وقت اچھا گزر جائے۔

اور شیپرڈ بھی یہی چاہتا تھا۔

کسی سے ناجائز تعلقات استوار نہ ہوں اور وقتاً فوقتاً وقت بھی اچھا گزر جائے۔

نٹالی کے راہ سے ہٹنے کے بعد وہ بیمہ کی رقم وصول کر لے گا، اپنا مکان اور اپنے نادر سکوں کا ذخیرہ فروخت کر دے گا۔ وہ ہمیشہ بہترین سکے خریدتا۔ اس لیے یہ ذخیرہ خاصا قیمتی تھا۔ ان چیزوں کی فروخت سے اسے اچھی خاصی رقم ہاتھ آنے کی توقع تھی۔ یہ رقم اس کے سفری اخراجات اور گاہے بگاہے عیاشی کے لیے ہرگز کم نہیں پڑ سکتی تھی۔

رات آنے میں بہت دیر کر رہی تھی۔ لیکن شیپرڈ اپنی دُھن کا پکا تھا۔ وہ صبر اور سکون سے رات کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ یہ انتظار کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے اس رات کی پلاننگ میں کئی ہفتے صرف کیے تھے۔ وہ مہینے میں ایک بار اپنے کوائن کلب کی میٹنگ میں لازمی شرکت کرتا تھا۔

اور آج کی شب بھی اس کے کوائن کلب کی میٹنگ منعقد ہو رہی تھی۔ وہ پروگرام کے مطابق اس میٹنگ میں شرکت کرنے چلا جائے گا۔ اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد نٹالی خودکشی کر لے گی۔ یقیناً یہ خودکشی ہرگز نہیں ہوگی۔

کیونکہ اپنی میٹنگ کے لیے روانہ ہونے سے قبل وہ اپنا کام سرانجام دے دے گا۔

شیپرڈ نے تمام منصوبہ پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔ اس نے ایک پیغام ترتیب دیا تھا اور وہ پیغام ٹائپ شدہ اس کے کمپیوٹر میں محفوظ تھا۔ پیغام پر دستخط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی اس کا پرنٹ آؤٹ لینا ضروری تھا۔

یہ پیغام بعد میں کمپیوٹر پر ہی دیکھا جاسکتا تھا جو کہ نتالی کی جانب سے تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بور ہو چکی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شیپرڈ کے پاس ایک پستول تھا جو اس نے کئی برس پہلے خریدا تھا۔ یہ پستول اس کی میز کی دراز میں رکھا رہتا تھا۔ نتالی کی کنپٹی پر ایک گولی اور ہاتھ میں موجود پستول اس کی خودکشی کی تصدیق کردیتے۔ اس بارے میں کون سوال کرسکتا تھا؟

جب وہ اپنے کوائن کلب کی میٹنگ سے گھر لوٹتا تو تب اس کی لاش دریافت کرلیتا۔ وقتی طور پر اسے ایک غم زدہ شوہر کا کردار نبھانا پڑتا۔ پھر وہ ایک بھرپور نئی زندگی کے لیے وہاں سے فرار اختیار کرلیتا۔

امن وسکون اور آزادی اس کا نیا مقدر بن جاتی۔

اب تقریباً وقت ہو چکا تھا کہ وہ اپنے منصوبے پر کام کرنا شروع کردے۔

نتالی اس وقت صوفے پر گھٹنے سمیٹ کر بیٹھی ہوئی اپنا پسندیدہ احمقانہ ریئلیٹی شو دیکھنے میں مگن تھی۔

شیپرڈ نے ایک گوشے کی آڑ سے اپنا سر نکالتے ہوئے کمرے میں جھانکا اور نتالی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں اب اپنی میٹنگ میں جارہا ہوں۔''

نتالی نے اس کی جانب ہاتھ لہرا دیا اور بولی۔ ''تو ٹھیک ہے، جاؤ۔''

ہاں، وہ اسے مس نہیں کرے گا۔ قطعی نہیں۔

پھر شیپرڈ اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جہاں سونے میں کام کیا کرتا تھا۔ یہ اس کی خلوت گاہ تھی۔ وہ کمرے کے آخر میں رکھی ہوئی میز کے پاس چلا گیا اور اس کی نچلی دراز کھولی تاکہ اس میں رکھا ہوا پستول اٹھالے۔

پستول وہاں موجود نہیں تھا۔

تب اسے اپنے عقب میں ایک آواز سنائی دی تو وہ گھوم گیا۔

نتالی دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان ان قابلِ نفرت سگریٹوں میں سے ایک دبی ہوئی تھی اور وہ سگریٹ کے کش لگارہی تھی۔

''تمہیں جس شے کی تلاش ہے، وہ یہ تو نہیں؟'' نتالی نے اپنے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ شیپرڈ کی جانب کرتے ہوئے پوچھا۔

شیپرڈ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

''میں نے کمپیوٹر میں موجود وہ پیغام پڑھ لیا ہے۔'' نتالی نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ''خودکشی؟ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔''

''کیا؟ تم نے غلط سمجھا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''

''میں نے تمہیں بور کررکھا ہے..... اس حد تک کہ تم مجھے مارنے پر تل گئے ہو۔ میں بھی تم سے بیزار ہو چکی ہوں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ایک حادثے سے دوچار ہونے والے ہو۔''

''نتالی۔'' شیپرڈ نے ایک قدم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ڈھال کے طور پر اپنے سامنے کیا ہوا تھا۔ ''ہم اس بارے میں گفتگو کرسکتے ہیں۔''

یہ سن کر نتالی مسکرادی۔ ''میں سمجھی کہ تم اپنے کوائن کلب کی میٹنگ میں گئے ہوئے ہو۔ مجھے کوئی آواز سنائی دی تو میں تحقیق کرنے آگئی۔ میں سمجھی کہ کوئی چور گھس آیا ہے اور تمہارے قیمتی سکوں کے ذخیرے کو چوری کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ میں نے تمہارا پستول نکال لیا اور تمہیں گولی ماردی۔ یقیناً مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔ تمہیں تو اپنے کلب کی میٹنگ میں ہونا چاہیے تھا۔ یہاں تمہاری خلوت گاہ میں اندھیرا تھا۔ میں نے کسی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو گولی چلادی، یہ سوچ کر کہ یہ کوئی چور ہے۔''

''تم ایسا ہرگز نہیں کرسکتیں۔''

''لیکن میں کرسکتی ہوں۔ میں کچھ عرصے تک صدمے سے نڈھال بیوہ بنی رہوں گی لیکن میں اس مرحلے کو بھی خوش اسلوبی سے نمٹادوں گی۔''

شیپرڈ نے نتالی کی جانب ایک قدم اور بڑھایا تو اس کے کانوں میں پستول کا کھٹکا سنائی دیا۔

تب نتالی نے مسکراتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔

نیلی موت

منظر امام

سرزمینِ پاک کا ہر خطّہ قدرت کی کسی نہ کسی نعمت سے لبریز ہے۔ سرسبز ولہلہاتے کھیت... شور مچاتے تندوتیز دریا... سمندر کی گہرائیوں میں مدفون اَن گنت خزانے... اور زمین کی تہ میں چھپے قیمتی و نایاب معدنیات کے ذخائر۔ وطن سے محبت اور اپنے پروفیشن سے دیانت برتنے والے کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوتے ہیں... ایسے صاحبِ کردار، ایمان داروں کی راہوں میں کتنے ہی پتھر کھڑے کردیے جائیں... وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے ہوئے بھی اپنے حصے کا کام ضرور انجام دیتے ہیں... ازل سے دشمنی نبھانے والے ان اپنوں کا احوال جو ہمیشہ ہوس کی خاطر دشمنوں کا رخ کرتے ہیں... اپنے سر سے ایمان داری و دیانت داری کا تاج نوچ کر پھینک دیتے ہیں اور اسی غلط کرداری سے اپنے لباس، کردار اور سرزمین کو داغ دار کردیتے ہیں۔

امید و آس کے دامن کو ہمیشہ کے لیے
تھام لینے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔
سرورق کی وطن کہانی

وہ ایک عجیب سا بوڑھا تھا۔

طوطے جیسی ناک، بھنویں آپس میں ملی ہوئی، بے پناہ چمک دار آنکھیں، لیکن ورزشی جسم اور بغیر داڑھی مونچھ کے شفاف چہرہ۔

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا پھر کھڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس عجیب بوڑھے کے پاس اپنی ملازمت کے سلسلے میں گیا تھا۔

ایسی بات نہیں تھی کہ میں بے روزگار تھا لیکن میں جس جگہ کام کررہا تھا وہ جگہ میرے مزاج کے مطابق... نہیں تھی اور تنخواہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔

اس لیے اخبار کے اس اشتہار نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔ ”ضرورت ہے۔ ایسے حوصلہ مند نوجوانوں کی جو زندگی کی یکسانیت سے تنگ آکر ایڈونچر کے شائق ہوں۔ معقول تنخواہ کے ساتھ دیگر سہولیات بھی۔“

اس اشتہار کے آخر میں اس جگہ کا ایڈریس بھی ساتھ تھا جہاں باحوصلہ نوجوانوں کو پہنچنا تھا۔ وہ جگہ شہر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ ایک ایسا علاقہ تھا جو ابھی آباد ہونا شروع ہوا تھا اس لیے بہت سی عمارتیں وہاں خالی پڑی ہوئی تھیں۔

ایک دو بار اس علاقے کے سامنے سے میرا گزر ہوا تھا اور یہ خیال آیا تھا کہ اس شہر میں آبادی ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔ ابھی یہ خالی خالی نظر آرہا ہے لیکن پانچ سال کے بعد یہاں رہنے کو جگہ بھی نہیں ملے گی۔ اس جگہ تک جانے کے لیے...... صدر سے ایک ویگن چلا کرتی تھی لیکن میں نے ویگن کے بجائے ٹیکسی کرلی تھی اور اس سے آنے جانے کا طے کرلیا تھا۔

اس دفتر کی عمارت اگرچہ پرانی تو نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں لکڑی کی سیڑھیاں استعمال کی گئی تھیں جس سے پورا ماحول بہت پُراسرار سا ہوگیا تھا۔

جس طرح پرانی فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتا ہے۔ چرچر کرتے ہوئے زینے، ایک بڑا سا کمرا اور اس کمرے میں بیٹھا ہوا ایک پُراسرار سا شخص۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔

میں اس بوڑھے کے کہنے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی چمکیلی نگاہیں کچھ دیر تک میری طرف جمی رہیں پھر اس نے اسی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

''ارسلان۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، تم بہت حوصلہ مند اور بہادر ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ شاید میں اس معیار پر پورا اتر سکوں جس کے لیے یہ اشتہار دیا گیا ہے لیکن اپنی حوصلہ مندی اور بہادری کے بارے میں اسی وقت بتا سکتا ہوں جب کام کی نوعیت کا پتا چلے۔''

''کام کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بھی بہت عجیب تھی۔ جیسے کوئی مردہ ہنس رہا ہو، دہشت زدہ کر دینے والی۔

''اگر کام کچھ نہیں ہے تو پھر آپ نے اشتہار کیوں دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کام بھی بتا دیتا ہوں۔ کام آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔''

''میرا خیال ہے کہ اگر آپ صاف صاف سمجھا دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔''

''اوہو ..... ہو ..... ہو .....'' وہ پھر بے ڈھنگے پن سے ہنس پڑا۔ ''بہت جلدی ہے تمہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس آکر میں نے اپنا وقت برباد کیا ہے۔'' میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو بیٹھو۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نے تمہیں نوکری دے دی۔ تم بہادر اور حوصلے والے ہو۔''

میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ ''آپ کو کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے تیور یہ بتا رہے ہیں نوجوان، تمہیں نوکری مل گئی۔''

''لیکن نوکری کیا ہے، یہ تو پتا چلے۔''

پھر اس نے بتایا کہ اس کا کام کیا تھا۔ وہ بہت دور کے علاقوں کے جنگلات کی لکڑیوں کا ٹھیکیدار تھا۔ ایک خاص تعداد میں اسے درخت کاٹنے کا لائسنس ملا ہوا تھا۔

اس نے مجھے وہ لائسنس بھی دکھایا۔ ''مسٹر ہماری فرم کا سارا کام قانونی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ہمارے مزدور مقررہ تعداد میں درخت کاٹ کر ساری لکڑیاں بڑے بڑے ٹریلرز کے ذریعے اس بیوپاری کو بھیج دیتے ہیں جو اِن لکڑیوں کو پورے ملک میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ کس بھاؤ بیچتا ہے، کہاں بیچتا ہے، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''لیکن جناب، میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ میرا کیا کام ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نگرانی...'' اس نے بتایا۔

وہ ابھی کچھ اور بتانے والا تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا کمرا ایک چھوٹے سے ہال کے برابر میں تھا۔ اس ہال میں تین چار آدمی بیٹھے کام کر رہے تھے۔

انہوں نے ہی

میری

اس بوڑھے کے کمرے تک رہنمائی کی تھی۔
''آجاؤ۔'' بوڑھے نے آواز لگائی۔
ایک چاند کمرے میں اتر آیا، وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جو اپنے ہاتھ میں ایک فائل لیے اندر داخل ہوئی تھی۔
''ہاں کہو۔'' بوڑھے نے پوچھا۔
''سر! تین چار اور لوگ بھی آئے ہوئے ہیں۔'' لڑکی نے بتایا۔
''انہیں رخصت کر دو۔ کہہ دو سلیکشن ہو گیا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔
''ایسے کیسے کہہ دوں۔'' لڑکی نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ ''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ سب کو اشتہار دے کر بلا لیا اور کہہ رہے ہیں سلیکشن ہو گیا۔ اب میں کیا جواب دوں گی اُن کو؟''
''اب جو بھی جواب دو۔'' بوڑھا غرایا۔ ''اب نکلو یہاں سے، میں ان سے بات کر رہا ہوں۔''
لڑکی پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ مجھے اس کی اس بدتمیزی پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ یہ کیسا باس تھا اور وہ کیسی ورکر تھی۔
''اب میری بات سنو۔'' بوڑھے نے مخاطب کیا۔ ''تمہاری سیلری پچیس ہزار ہو گی۔ کھانا پینا اور رہائش الگ۔ ہم نے اسی جنگل میں ایک آرام دہ کیبن بنوا رکھا ہے، جہاں سب کچھ موجود ہے۔ کھانا پکانے کے لیے ایک کک بھی ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟''
''آپ کی آفر تو اچھی ہے جناب لیکن ابھی تک یہ نہیں پتا چلا کہ مجھے کرنا کیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔
''بات یہ ہے کہ کچھ گروہ یا افراد ہمارے مزدوروں کی کاٹی ہوئی لکڑیوں کو اسلحے کے زور پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کا کام ان کو روکنا ہے۔''
''اس میں دو باتیں ہیں جناب، پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ان کے پاس اسلحہ ہوتا ہے تو میں انہیں کیسے روک سکوں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں گا۔''
''ان دونوں باتوں کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس اسلحہ بھی ہو گا، باقاعدہ لائسنس یافتہ اسلحہ اور آپ اکیلے بھی نہیں ہوں گے۔ تین مددگار بھی ہوں گے۔ وہ تینوں ریٹائرڈ فوجی ہیں۔''
''او کے۔ تو پھر میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب جا کر آپ نے یہ کام بتایا ہے جو میرے مزاج کے عین مطابق ہے۔''
''گڈ، اب آپ ایسا کریں، تیاری شروع کریں۔ پرسوں آپ کی روانگی ہے۔ آپ کو باہر مس ارم سے ایک مہینے کی سیلری ایڈوانس مل جائے گی۔''
ارم وہی چاند جیسا چہرہ تھا جو بوڑھے کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنی میز پر جھکی ہوئی کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھی۔
''تشریف رکھیں۔'' اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں اس کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ ''مس، آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' میں نے کہا۔
''جی فرمائیے۔''
''یہ صاحب کچھ زیادہ خشک مزاج، میرا مطلب ہے ٹو دی پوائنٹ قسم کے آدمی نہیں ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن آپ ان کے حوالے سے دو باتیں سن لیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان صاحب کا نام شوکت علی ہے۔ وہی اس فرم کے مالک ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ میرے باپ ہیں۔''
''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب بات سمجھ میں آ گئی۔''
''کیا سمجھ میں آ گیا؟''
''یہی کہ ایک بیٹی ہی اپنے باپ سے اتنی ضد کر سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''باس سے نہیں کر سکتی۔''
''جی ہاں۔'' اس نے ایک فارم میری طرف بڑھا دیا۔ ''اس کو پڑھ کر اسے بھر دیں اور سائن کر دیں۔ آپ کی ایڈوانس سیلری تیار ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ آپ بھی بہت ٹو دی پوائنٹ قسم کی لڑکی ہیں۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

دو دن ... بعد یہ سفر شروع ہو چکا تھا۔
یہ سفر ایک بڑی سی اسٹیشن ویگن میں تھا۔ اس میں دو ڈرائیور تھے اور ایک سرفراز نام کا آدمی تھا۔ جو ان ہی علاقوں کا رہنے والا تھا جہاں جنگل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ میرا عہدہ منیجر کا تھا۔
اب تک تو سب ٹھیک ہی تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہاں جا کر کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فرم کی طرف سے ایک عدد رائفل بھی مجھے دے دی گئی تھی جس کے

ساتھ ایک باقاعدہ اجازت نامہ بھی تھا۔
ملتان تک یہ سفر بہت خوش گوار گزرا تھا۔ راستے بھر ہم کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے آئے تھے۔
دونوں ڈرائیور اور سرفراز بھی بہت خوش مزاج ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بتایا تھا کہ ان جنگلوں میں ویسے تو کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن خطرہ اس وقت سامنے آتا ہے جب کچھ انجان لوگ ہماری لکڑیوں کے ٹریلرز پر حملہ کر دیتے ہیں۔
''اور یہ انجان لوگ کون ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں معلوم صاحب۔'' سرفراز نے بتایا۔ ''ہماری طرف کے نہیں معلوم ہوتے۔ عجیب سے حلیے ہوتے ہیں ان کے۔ بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔ چہروں سے وحشت برس رہی ہوتی ہے۔ ان کے پاس جدید قسم کا اسلحہ ہوتا ہے۔ صاحب اصل مسئلہ لکڑیوں کا نہیں ہے۔''
''تو پھر کیا ہے؟''
''وہ ہمارے مزدوروں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔'' سرفراز نے بتایا۔
''اوہ، یہ تو خطرناک بات ہے۔''
''جی صاحب، پھر ان کا پتا بھی نہیں چلتا۔ خدا جانے یہ اغوا کرنے والے ان بے چاروں کو لے جا کر کیا کرتے ہیں۔ اگر مارنا ہی ہوتا تو وہیں مار دیتے۔ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔''
''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بہت سنبھل کر رہنا ہو گا۔''
''جی صاحب، وہاں کام آسان تو ہے لیکن مشکل بھی بہت ہے۔''
''چلو، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ خدا ہمارا ساتھ دینے والا ہے۔ ایک بات بتاؤ، کیا کبھی ان حملہ آوروں کا بھی کوئی نقصان ہوا ہے؟''
''جی صاحب، دو چار بار۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بار ہم نے ان کے بندے کو مار گرایا تھا اور دوسری بار ایک کو پکڑ لیا تھا۔''
''اوہ، تو پھر کیا بتایا اس نے؟ کون ہیں وہ لوگ؟''
''کچھ نہیں بتایا صاحب، اس نے پتا نہیں کیا چیز اپنے منہ میں ڈال لی تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کا پورا بدن نیلا ہو گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔''
''مائی گاڈ۔'' یہ کوئی عام بات نہیں ہے سرفراز۔'' میں نے کہا۔ ''اس قسم کی خودکشی کرنے والے معمولی چور ڈاکو نہیں ہوتے۔ کوئی منظم تنظیم معلوم ہوتی ہے۔''
''جی صاحب، لگتا تو ہے۔''
''ہم گاڑی روک رہے ہیں صاحب۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''اندھیرا ہو گیا ہے۔''
''ہاں اندھیرا تو ہو گیا ہے لیکن گاڑی کہاں روکو گے؟'' میں نے پوچھا۔
''یہاں پر ایک اچھا ہوٹل بھی ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم رات کو وہاں رک سکتے ہیں۔ صبح ناشتا کر کے یہاں سے چل دیں گے۔''
ڈرائیور نے ٹھیک ہی بتایا تھا، کچھ دور جانے کے بعد ایک دو منزلہ ہوٹل نظر آ گیا۔ گاڑی ہوٹل کے سامنے روک دی گئی جہاں اور بھی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مسافر یہاں رکا کرتے ہیں۔
ہوٹل چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ اوپری منزل پر رہائش کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ نیچے ایک بڑا سا کھانے کا کمرا اور کچن وغیرہ تھا۔
ہم نے واش روم جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ تازہ دم ہوئے اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ سرفراز نے اس دوران دو کمرے رات بھر کے لیے بک کروا لیے تھے۔
کھانا بھی ٹھیک ہی تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور کمرے میں آ گئے۔ رات خیریت سے گزر گئی بلکہ تھکان کی وجہ سے بہت اچھی نیند آئی تھی۔
صبح اٹھ کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب ہوٹل سے جانے لگے تو سرفراز نے روک لیا۔ ''صاحب!'' وہ ایک طرف بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ''اس آدمی کو دیکھیں صاحب۔''
''ہاں دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہوا ہے اس کو؟ کون ہے یہ آدمی؟''
''یہ ہمارے مزدوروں کا ٹھیکیدار تھا۔ وہ لوگ اس کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر یہ دکھائی نہیں دیا اور اب یہاں دکھائی دے رہا ہے۔''
''اوہ۔'' وہ آدمی میری دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ ''تم نے ٹھیک سے پہچانا ہے اس کو؟''
''ہاں صاحب، اس کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ڈھنگ کی باتیں کر لیتا ہے۔''
مجھے اور سرفراز کو رک کر باتیں کرتے دیکھ کر دونوں ڈرائیور بھی ہمارے پاس آ گئے۔ انہوں نے بھی تصدیق کر

دی کہ یہ وہی آدمی ہے۔

''چلو اس سے معلوم تو کریں کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔'' میں نے کہا۔

''آئیں صاحب۔''

ہم اس آدمی کی میز کے پاس آگئے۔ اس نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا پھر بے نیازی سے گردن جھکالی جیسے اس نے کسی کو پہچانا ہی نہ ہو۔

''رشید۔'' سرفراز نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیسے ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا لیکن اس کا لہجہ بہت سپاٹ تھا۔

''تم رشید ہی ہونا؟'' سرفراز نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، میں رشید ہی ہوں۔'' اس بار بھی اس کا لہجہ ہر جذبے سے عاری ہی تھا۔

''یار! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' ایک ڈرائیور نے پوچھا۔ ''تمہیں کون اٹھا کر لے گیا تھا؟ کہاں رہے اتنے دن؟''

''اپنی دنیا میں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کون سی دنیا ہے تمہاری؟'' دوسرے ڈرائیور نے پوچھا۔

''تمہاری دنیا سے الگ۔'' اس نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ ''وہاں بہت سکون ہے، بہت آرام ہے مجھے۔ وہاں شیخ صاحب ہیں۔''

''کون شیخ صاحب؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''وہی، جو سکون دیتے ہیں۔ آرام دیتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ اس کا لہجہ ویسا ہی کھویا کھویا تھا۔

وہ ویسے تو ہم سے باتیں کررہا تھا لیکن اس کی نگاہیں خلا میں تھیں۔

میں سرفراز کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے آیا۔ ''سرفراز! یہ آدمی مجھے اپنے ہوش میں نہیں معلوم ہوتا، یہ کہیں اور ہے۔''

''ہاں صاحب، مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن یہ چکر کیا ہے۔ یہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟''

''اب یہ کیسے معلوم ہو گا؟''

''اس سے کہتا ہوں صاحب کہ یہ ہمارے ساتھ چلے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''یہ ہمارا بہت سا حساب کتاب جانتا ہے۔ پھر اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ دوسرے مزدور کہاں ہیں؟''

''چلو بات کر کے دیکھ لو۔ ویسے مجھے تو مشکل لگتا ہے۔''

''رشید! تم ہمارے ساتھ چلو۔'' سرفراز نے اس سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ حقارت سے مسکرا دیا۔ ''جنت چھوڑ کر میں تمہارے جہنم میں کیوں جاؤں اور ویسے بھی مجھے ایک مبارک کام کرنا ہے۔ وہ ہو جائے تو پھر تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''کون سا مبارک کام؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''تم لوگ جاؤ، اپنی دنیا میں جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔''

''چلو سرفراز، چھوڑ دو اس کو۔'' میں نے سرفراز کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔''

رشید پھر ہماری طرف سے بے نیاز ہو کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے ہماری پروا ہی نہیں تھی۔ ہم اسے چھوڑ کر ہوٹل سے باہر آگئے۔

''صاحب! اس کو آسانی سے جانے نہیں دینا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''اس سے بے چارے دوسرے مزدوروں کا پتا چل سکتا ہے۔''

''ہم نے اس کو جانے نہیں دیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اس پر ایک ٹرانس کی کیفیت طاری ہے اور یہ نہیں معلوم کہ اس کی منزل کیا ہے۔ کہاں جانا ہے اس کو۔''

''سمجھ گیا صاحب۔'' سرفراز پُرجوش ہو کر بولا۔ ''یعنی ہم اس کا پیچھا کریں گے۔''

''ہاں سرفراز، یہ سمجھ لو کہ ہم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم اسی لیے تو اس علاقے میں آئے تھے۔''

''تو پھر چل کر گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔'' سرفراز نے مشورہ دیا۔ ''اس طرح ہم اس کو دیکھتے بھی رہیں گے اور جہاں جائے گا اس کا پیچھا بھی کرتے رہیں گے۔''

کچھ دیر بعد وہ بھی ہوٹل سے نکل آیا۔

اس نے ہماری طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ وہ سیدھا اسی طرف جا رہا تھا جہاں کچھ موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی ایک موٹر سائیکل نکالی اور اسٹارٹ کر کے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

ہم نے بھی اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی تھی۔

ہم جس روڈ سے گزر رہے تھے، وہ بازار تھا۔ دونوں

طرف دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار مڑ کر ہماری طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے شبہ ہو گیا ہو کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

ہم نے اس سے بہت فاصلہ رکھا تھا۔

پھر اچانک اس نے اپنی موٹر سائیکل ایک کنارے روک دی۔ ہم دور ہی سے دیکھتے آ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ اچانک زمین پر گر پڑا۔

اس کو اس طرح گرتے دیکھ کر آس پاس کے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی ایک طرف روک دی اور گاڑی سے اتر کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔

وہ زمین پر گرا ہوا تھا، بالکل بے حس، بے حرکت۔ اس کا پورا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ ''کیا ہو گیا بھائی؟'' کسی نے دریافت کیا۔

''پتا نہیں بھائی، اس بندے نے اپنی بائیک روکی اور زمین پر گر پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔''

''بھائی، اس کا پورا جسم نیلا ہو رہا ہے۔''

سرفراز کچھ بتانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے کچھ بولنے سے روک دیا۔ ہم اس طرح کسی کی موت کا افسوس کرتے ہوئے اپنی گاڑی کے پاس آ گئے۔

''صاحب! یہ..... یہ بالکل اسی طرح مرا ہے جس طرح وہ آدمی مرا تھا۔'' سرفراز نے کہا۔ ''وہی، جس کو ہم لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔''

''ہاں میں سمجھ گیا... اور یہ کوئی لمبا کھیل معلوم ہوتا ہے سرفراز۔'' میں نے کہا۔ ''چلو، آگے بڑھتے ہیں۔ ورنہ یہاں خوامخواہ الجھ جائیں گے۔''

☆☆☆

وہ بہت خوب صورت مقام تھا۔

حیرت تھی کہ میں نے اپنے ملک میں رہنے کے باوجود اس علاقے کے بارے میں نہیں سنا تھا۔

ایک طرف پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جو حیرت انگیز طور پر سرسبز تھیں۔ پیالہ نما وادی میں دور تک جنگل ہی جنگل تھے۔ اونچے اونچے درخت اور ان درختوں کے درمیان مزدوروں کا ایک بڑا کیمپ اور کیمپ کے ساتھ ایک بہت خوب صورت کیبن بنا ہوا۔

یہی کیبن میری رہائش کے لیے تھا۔ روشنی کا بھی بہت معقول انتظام تھا۔ فرم نے کئی عدد بڑے بڑے جنریٹرز لگا رکھے تھے جن سے رات کے وقت یہ علاقہ جگمگ کرنے لگتا تھا۔

ایک طرف کیمپ کے قریب اینٹوں کے بڑے بڑے چولھے تھے جن پر مزدوروں کے لیے کھانے بنائے جاتے۔ یہ سب مجھے وہاں پہنچ کر ہی پتا چلا تھا۔

سرفراز نے پورے علاقے کا دورہ کراتے ہوئے بتایا۔ ''صاحب! اس پورے علاقے میں لکڑیاں کاٹنے کا ٹھیکا صرف ہمارے پاس ہے، باہر سے کوئی اور نہیں آ سکتا۔''

''اور یہ کام کب سے چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی برسوں سے۔'' اس نے بتایا۔

''اور جنگل ابھی تک ختم نہیں ہوا؟''

''نہیں صاحب، ہم نے اس پر بہت تحقیق کر رکھی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ درخت پر نشان لگے ہوئے ہیں۔ ہم صرف ان ہی درختوں کو کاٹتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص حد میں، یہ نہیں ہوتا کہ اندھا دھند پورا جنگل برباد کر کے رکھ دیں۔ مہینے میں دو دن مزدوروں کو چھٹی دی جاتی ہے۔ وہ اپنے اپنے شہروں کو چلے جاتے ہیں۔''

''اور جاتے کیسے ہیں؟''

''ٹرانسپورٹ کا بھی انتظام ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''پچھلی بار ان پُراسرار لوگوں نے کب حملہ کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پچھلی واردات دو مہینے پہلے ہوئی تھی صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے بعد سے نہیں ہوئی۔''

''اچھا ایک کام کرنا، ابھی ہم نے راستے میں جس کیمپ کے بندے کو دیکھا تھا اور اس کے ساتھ یہاں جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتانا۔ ورنہ خوامخواہ بددلی پھیل جائے گی۔''

''جی صاحب! اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ میں نے دونوں ڈرائیوروں کو بھی منع کر دیا ہے۔''

''اچھا اب تم مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں... پہرے کا انتظام ہوتا ہے۔''

دو سمتوں میں پہرے داروں کا انتظام تھا۔ دو دو پہرے دار باری باری پہرا... دیتے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔

سرفراز نے سب سے میرا تعارف کروایا۔ وہ سب میرے آنے پر خوش ہو رہے تھے۔''

کیبن بھی بہت اچھا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس کیبن

میں موجود تھی۔ تنہائی پسندوں کے لیے وہ ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ میں کوئی ایسا تنہائی پسند تو نہیں تھا لیکن زندگی میں کوئی خاص چارم بھی نہیں رہا تھا۔ بس یونہی گزر رہی تھی۔ اسما کے جانے کے بعد سب کچھ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

اسما وہ لڑکی تھی جس سے میں نے محبت کی تھی۔ ہم دونوں کی دلچسپی ایک مضمون سے رہی ہے۔ اور وہ ہے جیالوجی (علمِ طبقات الارض)

یونیورسٹی میں ہم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ گھر والے اور خاندان کے لوگ ہمارا مذاق اُڑایا کرتے۔ ''بھائی! یہ تم نے کون سا مضمون لے لیا ہے۔ اس ملک میں اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اس ملک میں اس کی ضرورت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''قدرت نے ہماری زمین میں اتنے خزانے چھپا کر رکھ دیے ہیں کہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم جب یہ علم حاصل کر لو گے تو اس کے بعد سارے چھپے ہوئے خزانے باہر لے آؤ گے؟''

''ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں میں جیالوجی کی آگاہی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والا کل اس کی ضرورت کو محسوس کر لے۔''

میں اور اسما اکثر زمین کی سطح کے حوالے سے بات کیا کرتے۔ ان امکانات کا جائزہ لیتے رہتے کہ پاکستان کے کس حصے کی.. مٹی نے کون سے خزانے چھپا رکھے ہیں۔

ہمارے دوست ہم سے پوچھا کرتے۔ ''یار یہ بتاؤ، جیالوجی میں سوائے زمین کھودنے کے اور ہے کیا؟''

''کاش تم لوگ اس مضمون کی اہمیت کو جان سکتے۔'' ہم کہا کرتے۔ ''ہم اس کے ذریعے بہت کچھ کر سکتے ہیں..... اور زمین میں چھپی ہزار قسم کی معدنیات کو دریافت کر سکتے ہیں۔''

ہم بہت پُر امید تھے کہ جب اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا کیونکہ اب اس..... کے امکانات واضح ہونے لگے تھے۔

لیکن اس کے برعکس کچھ نہیں ہوا۔ اسما نے گرچہ اس مضمون میں ٹاپ کیا تھا لیکن وہ بھی اپنی کوششوں کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر سکی۔

مجھے ایک فرم میں ملازمت مل گئی جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن اسما۔ غائب ہو گئی۔

خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے گھر والے رو رو کر ہلکان ہو گئے۔ خود میں اپنی محبت کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔

کبھی ایک تھانے، کبھی دوسرے تھانے، ایف آئی آر سے لے کر اس کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

آدمی مر جائے، طبعی موت یا حادثاتی موت تو کچھ دنوں کے بعد رو دھو کر سکون آ ہی جاتا ہے اور جو غائب ہو جائے تو پھر کہاں کا سکون۔

میں اپنے شہر سے بہت دور ایک جنگل کے ایک کیبن میں لیٹا ہوا اپنی محبت کو یاد کر رہا تھا۔ نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

نئی جگہ تھی، نیا ماحول تھا پھر ایک انجانا سا خوف بھی تھا۔ اس جنگل میں تو کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔

سوائے سرفراز اور ان دو ڈرائیورز کے۔ ان کے ساتھ بھی جان پہچان بس اتنی تھی کہ میں ان کے ساتھ شہر سے یہاں تک آیا تھا اور بس۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اچانک کسی آواز نے چونکا دیا۔ یہ ایک مخصوص آواز تھی۔

کسی ہیلی کاپٹر کی آواز۔ اتنی رات گئے اس جنگل میں ہیلی کاپٹر کہاں سے آ سکتا تھا۔ میں جلدی سے کیبن سے باہر آ گیا۔

کیمپ میں خاموشی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے پھر میں نے سرفراز کو دیکھا جو اپنے خیمے سے نکل کر میری طرف آ رہا تھا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ اس کیمپ میں روشنی کا بہت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ اسی لیے سرفراز مجھے دکھائی دے گیا تھا۔

وہ میرے کیبن کے نزدیک آ چکا تھا۔ مجھے کیبن سے باہر دیکھ کر اس نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ ''صاحب آپ نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اس آواز کو سن کر ہی میں باہر آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''پتا نہیں صاحب، خاص بات ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔'' اس نے کہا۔

"آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

ہم اندر آگئے۔ کیبن میں کرسیاں بھی تھیں۔ "ہاں اب بتاؤ۔" میں نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

"صاحب! سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ یہ ہیلی کاپٹر کس کے ہیں۔ کس طرف سے آتے ہیں اور کس طرف جاتے ہیں۔ اتنی رات گئے ان علاقوں میں ایسے ہیلی کاپٹرز کی پرواز کا کیا مطلب ہے؟"

"کیا یہ اکثر آتے ہیں؟"

"مہینے میں ایک دو مرتبہ تو ضرور آتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اور ایک دوسری بات بھی ہے۔ جب بھی ایسی کوئی پرواز ہوتی ہے، اس کے ایک یا دو دن کے بعد کیمپ پر حملہ ضرور ہوتا ہے۔"

"اوہ، یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔" میں نے کہا۔

"جی صاحب، میں اسی لیے تو پریشان ہو کر آپ کی طرف آیا تھا۔"

"کیا تم نے پہرے داروں کو چوکس کر دیا ہے۔"

"جی ہاں، وہ بے چارے پہلے ہی چوکس ہیں۔" سرفراز نے بتایا۔ "خیر، آپ جا کر آرام کریں، میں ابھی جاگ رہا ہوں۔"

"اگر کوئی بات ہو تو مجھے اٹھا دینا۔" میں نے کہا۔

رات گزر گئی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اس ہیلی کاپٹر کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ وہ اگر کسی اڈے پر گیا تھا تو واپس بھی جانا چاہیے تھا یا پھر وہیں رُک گیا تھا۔

بہرحال میں نے نیند آنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے طور پر جنگل میں آگے جا کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔

صبح میں دیر سے اٹھا تھا۔ کیبن کے باہر مزدوروں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں ہاتھ منہ دھو کر باہر آیا تو مزدور اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سرفراز مجھے دیکھ کر میرے پاس آگیا۔ "کام شروع ہو گیا ہے صاحب، پرسوں تک پچاس ٹن لکڑیاں پارٹی کو پہنچانی ہیں۔"

"ہو جائیں گی پرسوں تک؟"

"ہو جائیں گی صاحب، ہم نے اس سے بھی زیادہ مال سپلائی کیا ہے۔"

"ہوں، خیر تم دیکھتے رہو۔ میں ذرا ایک چکر لگا کے آتا ہوں۔"

میں مزدوروں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ سب مجھے دیکھ کر سلام کرتے۔ میں ان کا حال پوچھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

آگے جا کر یہ جنگل اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ یہاں مجھے خرگوش بھی دکھائی دیے۔ خدا نے اس علاقے کو درختوں کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔

میں جیالوجی کا طالب علم ہوں اسی لیے یہاں کی زمین مجھے بہت کچھ بتا رہی تھی۔ وہ خبر دے رہی تھی کہ اس کے اندر بہت کچھ ہے۔

میں نے چلتے وقت اپنا پستول بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ انجان علاقہ تھا اور کون جانے کیسے کیسے خطرات بسے ہوئے ہوں۔

میں کیمپ سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ جنگل کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں ملا تھا جو کسی بات کی نشان دہی کر سکتا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس قسم کے جنگلات میں ہوا کرتا ہے۔ دور تک پھیلے ہوئے درخت اور پودے، پرندوں کی آوازیں اور کبھی کبھی اِدھر سے اُدھر دوڑتا ہوا کوئی جنگلی جانور اور ہاں، ایک طرح کی سکون پرور خاموشی جو ایسے مقامات پر ہوا کرتی ہے۔

اچانک ایک طرف سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ یہ کچھ ایسی آوازیں تھیں جیسے بہت زور کا طوفان آرہا ہو اور اس طوفان سے گھبرا کر جنگل کے سارے جانور شور کرنے لگے ہوں۔

نہیں، ان آوازوں کو شور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بین کرنے کی آوازیں تھیں جیسے جنگلی جانور ایک جگہ اکٹھے ہو کر کسی آفت پر فریاد کر رہے ہوں۔"

میں گھبرا کر رک گیا۔

آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں کبھی جنوں اور بھوتوں وغیرہ کا قائل نہیں رہا ہوں لیکن پھر یہ آوازیں کیسی تھیں۔ ہواؤں کا غضب ناک شور تھا لیکن درختوں کے پتے اپنی اپنی جگہ تھے صرف طوفان کی آوازیں تھیں اور طوفان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یہ ایک پُراسرار بات تھی۔ میں خوف زدہ ہونے سے زیادہ حیرت زدہ تھا۔ اس جنگل میں ایسا کچھ تھا۔ سرفراز نے اس قسم کی کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں نے آگے جانے کے بجائے مناسب سمجھا کہ یہیں سے واپس ہو جاؤں۔ پھر کسی کو ساتھ لا کر دیکھوں... اور ان پُراسرار آوازوں کے مرکز کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کروں۔

جب کیمپ واپس پہنچا تو یہاں ایک نئی خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ سارے مزدور کام روک کر ایک طرف کھڑے تھے۔ سرفراز مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف آیا۔

''صاحب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں جنگل کا سروے کرنے آگے تک گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''اور جو کچھ وہاں دیکھ کر آیا ہوں، اس کی کہانی تو بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ یہاں کیا ہوا؟''

''صاحب! ہمارا ایک مزدور غائب ہو گیا تھا۔ وہ واپس آ گیا ہے۔''

''چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات نہیں ہے صاحب، اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ وہ پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کر رہا ہے، چلیں چل کر دیکھتے ہیں اس کو۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ایک جگہ بہت سے مزدوروں نے ایک آدمی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا۔ بظاہر بالکل تندرست لیکن اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ دوسرے مزدوروں سے کہہ رہا تھا۔ ''سب کچھ ہے وہاں۔ شیخ صاحب ہمارے مالک ہیں۔ ان کے پاس جنت بھی ہے، جہنم بھی ہے۔ شیخ صاحب جو کہہ دیں، وہی ہو جاتا ہے۔ میں نے حوروں کو دیکھا۔ وہ میرے پاس آئی تھیں۔ میرا خیال رکھتی تھیں۔''

میں اس آدمی کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جیسے وہ جو کچھ بھی بول رہا ہو، اس کا تعلق اس کے جذبات سے نہ ہو۔ آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں۔

''اس کی بھی وہی حالت ہے صاحب۔'' سرفراز نے کہا۔ ''جو اس مزدور کی تھی جو ہمیں راستے میں ملا تھا اور جس نے خودکشی کر لی تھی۔''

''ہاں، اور یہ بھی کسی شیخ کا نام لے رہا ہے۔'' میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''کون ہے یہ شیخ؟''

''پتا نہیں صاحب۔''

''میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں اس کی طرف بڑھا۔ مجھے دیکھ کر مزدور ادھر اُدھر سمٹ گئے تاکہ میں اس تک پہنچ سکوں۔ ''ہاں بھائی! تم کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے مزدور سے پوچھا۔

''شیخ صاحب کے پاس۔'' اس نے کھوئی کھوئی آواز میں جواب دیا۔

''کون ہیں یہ شیخ صاحب؟''

''خدا کے خاص بندے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ان کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تقدیر بدل دیتے ہیں۔''

''تم وہاں سے کیوں چلے آئے شیخ صاحب کو چھوڑ کر؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے اپنا کام کرنا ہے۔'' اس نے اسی کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کام کر کے میں حوروں کے پاس چلا جاؤں گا۔''

''تمہارا کام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

اس کے انداز میں ابھی بھی وہی بات تھی۔ بے نیازی کیفیت، کھویا کھویا پن۔

''سرفراز! تمہارا وہ بندہ بھی تو کسی شیخ کی بات کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کے پاس بھی کسی شیخ کی کہانی ہے۔''

''جی صاحب! یہی تو سوچ رہا ہوں کہ یہ چکر کیا ہے۔ اس جنگل میں کوئی شیخ کہاں سے آ گیا اور وہ حوریں کون سی ہیں جن کی یہ بات کر رہا ہے۔''

''بہت گہرا معاملہ معلوم ہوتا ہے سرفراز، یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اپنا فرض ادا کرنے جا رہا ہے۔ کون سا فرض؟''

''ہمیں تو نہیں بتا رہا ہے صاحب۔'' سرفراز نے کہا۔ ''پتا نہیں کیا چکر ہے۔''

''ایسا کرو، اس کی اچھی طرح تلاشی لے کر کہیں بند کر دو۔'' میں نے ہدایت دی۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اگر اس پر دھیان نہ دیا گیا تو یہ بھی نیلی موت کا شکار ہو جائے گا۔''

''خدا خیر کرے۔ پتا نہیں کیا کیا ہونے والا ہے۔''

بہرحال میری ہدایت پر اس کی تلاشی لی جانے لگی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اس وقت اصل مسئلہ یہ تھا کہ مزدور خوف زدہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے کام روک دیا تھا۔

میں اپنے کیبن میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد سرفراز بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس مزدور کو ایک جگہ قید کر دیا گیا ہے اور تلاشی پر اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا..... پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ جنگل کے بارے میں کیا بتا رہے تھے صاحب؟''

میں نے اسے بتایا کہ جنگل میں آگے جا کر مجھے پُراسرار آوازوں کا کیسا تجربہ ہوا تھا۔ سرفراز حیران رہ گیا۔ ''صاحب! یہ سب تو بہت نئی نئی باتیں ہونے لگی ہیں۔''

''ہاں سرفراز، میرا خیال ہے کہ ان جنگلوں میں کوئی راز پرورش پا رہا ہے، کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اب یہ کھیل کیسا ہے، یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''صاحب! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو۔''

''آپ یہاں کے حالات سے پریشان ہو کر واپس تو نہیں چلے جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بلکہ میرا تو جوش بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اس راز کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھوں تو سہی، یہاں کیا ہو رہا ہے۔''

''تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ ہوں صاحب، اگر یہ جنوں اور بھوتوں کا چکر ہے پھر تو اور بات ہے لیکن اگر یہ انسانوں کا معاملہ ہے تو پھر اس کی جڑ تک پہنچنا ہے۔''

''جو بندہ ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ اگر وہ ہوش میں آ جائے تو اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے یہ بات کی تو تھی لیکن دوسرے ہی پتا چلا کہ وہ بندہ بھی مر چکا ہے۔ کیسے یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس کا بدن بھی نیلا پڑ گیا تھا۔ نیلی موت اس کا بھی مقدر بن گئی تھی۔

ایک آدمی شہر کی طرف دوڑا دیا گیا تاکہ وہ پولیس کو اس موت کی خبر دے دے۔ ہم نے الٹے سیدھے سوالات سے بچنے کے لیے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی موت کا سبب کسی زہریلے سانپ کے کاٹنے کا نتیجہ بتا دیں گے۔

وہ دن انہی چکروں میں گزر گیا۔ پولیس والے آئے۔ ایک دو سوال کیے پھر اس کی لاش بھلوال روانہ کر دی گئی جو اس کا آبائی علاقہ تھا۔

میں نے اس طرح کی یہ دوسری موت دیکھی تھی اور دونوں انتہائی پُراسرار۔ ان دونوں اموات سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ غائب ہو کر واپس آنے والے بندے کسی نامعلوم ذریعے سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ کوئی ایسا زہر کھا لیتے ہیں جس سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

رات کے کھانے کے بعد سرفراز میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ''صاحب! سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کس طرح ہوا، میں نے تو خود اس کی تلاشی لی تھی لیکن اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے وہ کھا سکتا۔''

''جو کچھ بھی ہے، بہت منظم انداز میں ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ کسی گروہ کی کارستانی ہے تو بہت منظم گروہ معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ عام طور پر چھوٹے موٹے گروہ اس قسم کی کارروائی نہیں کر سکتے۔''

''لیکن یہ ہے کیا صاحب؟''

''بس اسی کا تو پتا چلانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کے لیے میں نے سوچا ہے کہ کل صبح میں پھر وہاں جاؤں گا جہاں میں نے پُراسرار آوازیں سنی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مقام سے کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔ اگر کچھ ہو رہا ہے تو اس کے آس پاس ہی ہو رہا ہے۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا صاحب۔''

''ہاں ضرور چلنا۔ تمہاری وجہ سے تقویت رہے گی۔''

اور اسی وقت فضا میں ہیلی کاپٹر کی گونج سنائی دینے لگی۔ شاید یہ وہی ہیلی کاپٹر تھا جسے ہم نے جنگل میں ایک سمت جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب وہ اپنی واپسی کے سفر پر تھا۔

''کاش کسی طرح اس.... ہیلی کاپٹر کا راز پتا چل سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا تعلق اسی گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔''

''کل چل کر دیکھتے ہیں صاحب، شاید کچھ مل ہی جائے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''اب آپ سو جائیں صاحب، بہت رات ہو گئی ہے۔''

لیکن شاید اس رات سونا نصیب میں نہیں تھا۔

شاید ایک ہی گھنٹا گزرا ہو گا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سرفراز تھا اور اس کے ساتھ وہی لڑکی تھی۔ وہی باس کی بیٹی۔ وہی چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں۔ میں اس لڑکی کو یہاں اس جنگل میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

''ہیلو مسٹر ارسلان۔'' وہ مسکرا دی۔ ''تم مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟''

''ہاں، واقعی حیران ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، بابا بھی میرے ساتھ ہیں۔'' اس نے بتایا۔

وہ یقیناً فرم کے باس اس بوڑھے کے بارے میں کہہ رہی تھی جو کچھ ہی لمحے میں وہاں نمودار ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کمپنی کا ایک ڈرائیور بھی تھا۔

اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''ہیلو نوجوان! یہاں بور تو نہیں ہو رہے؟''

''نہیں سر، یہ تو بہت اچھی جگہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ اتنی رات گئے آپ دونوں کو یہاں دیکھ کر حیران ضرور ہو رہا ہوں۔''

''ارے بھائی، ہم شیڈول کے مطابق تو دس بجے ہی

پہنچ جاتے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن راستے میں گاڑی خراب ہوگئی اسی لیے اس وقت پہنچے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں سر، آئیں اندر تشریف لائیں۔"

میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ سب اندر آگئے۔ ڈرائیور تو ان کا سامان رکھ کر چلا گیا تھا۔ صرف سرفراز ان کے ساتھ آیا تھا۔

"بابا! مسٹر ارسلان نے اس کیبن کو کتنا صاف ستھرا رکھا ہے۔" ارم نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میڈم! ابھی مجھے یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سر! میں آپ لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" سرفراز ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ہاں سرفراز، مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔" ارم بول پڑی۔

سرفراز کے باہر جانے کے بعد بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ "جانتے ہو ارسلان، میں اچانک یہاں کیوں آگیا؟"

"آپ ہی بتائیں گے سر۔"

"بھائی غائب ہونے والے دونوں مزدوروں کی موت کا سن کر آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "سرفراز نے فون کے ذریعے مجھے اطلاع دے دی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ مزدور ڈر کر بھاگ نہ جائیں۔ پھر میرا سارا کام ٹھپ ہو جائے گا۔"

"یہ بات تو ہے سر۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "کچھ پُراسرار سے واقعات بھی ہوئے ہیں۔"

"کیسے واقعات؟"

میں نے بتایا کہ میں نے جنگل میں کیسی آوازیں سنی تھیں اور ہیلی کاپٹر پرواز کیا کرتے ہیں۔ میں نے نہ جانے کیوں یہ محسوس کیا کہ جنگل کی آوازوں کا سن کر تو اس بوڑھے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا لیکن ہیلی کاپٹر کی پرواز کا سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ ایک جوش کا سا اظہار ہو رہا تھا جس کو اس نے بڑی خوبی سے چھپا لیا تھا۔

سرفراز نے ان دونوں کے لیے کھانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے لیے اس نے خیمے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ظاہر ہے میں ان دونوں کے ساتھ تو اس کیبن میں نہیں رہ سکتا تھا۔

میں ان دونوں سے اجازت لے اس خیمے میں آگیا جو میرے لیے ٹھیک کیا گیا تھا۔ یہاں ایک آرام دہ بستر تھا اور ایک لیمپ بھی تھا۔ سرفراز واقعی بہت کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے سرفراز کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے باس کے چہرے پر کیسے تاثرات دیکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔

بہرحال بہت دیر کے بعد سونا نصیب ہوا۔

میری ایک عادت رہی ہے کہ میں چاہے رات کے کسی بھی حصے میں سوؤں، میری آنکھ ہمیشہ جلدی کھل جاتی ہے۔ چاہے کوئی بھی موسم ہو، جیسے بھی حالات ہوں۔ میں جلدی اٹھ جاتا ہوں۔

اس صبح بھی میں اپنی عادت کے مطابق جلدی اٹھ کر خیمے سے باہر آگیا۔ اس وقت بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات میں جلائے رکھنے والے بلب بجھا دیے گئے تھے۔

جنگل میں اس وقت کی ہوا بہت تازہ اور فرحت بخش تھی۔ اس اندھیرے میں اچانک مجھے کچھ نظر آگیا۔ روشنی کی ایک لکیر جو ایک طرف چلی جا رہی تھی۔

خدا جانے وہ لکیر کیسی تھی۔ لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی ٹارچ کی روشنی تھی اور اس اندھیرے میں کوئی آدمی ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھتا ہوا آگے چلا جا رہا تھا۔ کون ہوسکتا تھا؟ اتنا شدید تجسس تھا کہ میں بھی دبے پاؤں اس آدمی کے تعاقب میں چل پڑا۔

اس آدمی کا رخ گھنے جنگل کی طرف تھا۔ اگرچہ ابھی بھی اندھیرا تھا لیکن ٹارچ کی روشنی اور اس آدمی کے چلنے کے انداز نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔

وہ اس فرم کا مالک تھا۔ وہی بوڑھا، سو فیصد وہی۔ وہ ایسی بے خوفی سے چلا جا رہا تھا جیسے اسے راستے معلوم ہوں۔

یہ حیرت کی بات تھی۔ بوڑھا اس وقت کہاں جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے آواز دے کر روک لوں۔ شاید وہ جنگل کے سروے کے لیے نکلا ہو۔

لیکن نہیں، یہ احمقانہ خیال تھا۔ اگر اس قسم کی کوئی بات ہوتی تو وہ کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور لے لیتا اور اجالے میں نکلتا۔ رات کے اس وقت اس طرح جانے کا کیا مطلب ہوسکتا تھا؟

باس کا رخ اسی طرف تھا جہاں میں نے پُراسرار قسم کی آوازیں سنی تھیں۔ یہ بوڑھا اس طرف کیوں جا رہا تھا؟

ایک بات اور تھی کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی آواز بھی

نہیں سنائی دے رہی تھی۔ البتہ جنگل کے پرندے جاگ رہے تھے اور ان کی خوب صورت آوازوں نے پورے ماحول کو خوب صورت بنا دیا تھا۔

بوڑھا بالکل اسی جگہ تھا جہاں اس دن میں موجود تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے بچنے کے لیے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اب اس نے ٹارچ بند کر دی تھی کیونکہ اب ہر طرف روشنی پھیل چکی تھی۔ پورا جنگل صاف دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے درخت کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ بوڑھا وہاں نہیں تھا۔ شاید کسی درخت کی آڑ میں ہو یا شاید آگے چلا گیا ہو۔

اس کا اس طرح وہاں سے چلے جانا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہاں جا سکتا تھا۔ میں اس کی تلاش میں درخت کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔

پھر آگے بڑھ کر دیکھا اور آگے لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ بوڑھا حیرت انگیز طور پر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

میں سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہیں رک کر اسے تلاش کروں یا واپس چلا جاؤں لیکن یہاں رہ کر میں اسے کہاں تلاش کرتا۔ بہتر یہی تھا کہ میں واپس چلا جاؤں اور میں واپس کیمپ میں آگیا۔

یہاں زندگی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ مزدور ناشتا ختم کر چکے تھے۔ اب ان میں چائے تقسیم کی جارہی تھی۔

میں مزدوروں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے خیمے میں آگیا۔ ناشتا مجھے یہیں کرنا تھا۔ میں نے پردہ اٹھایا اور جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔

میرے خیمے میں باقاعدہ ناشتے کی میز سجی ہوئی تھی جس کے گرد کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر وہی لڑکی بیٹھی تھی۔ بوڑھے کی بیٹی ارم اور دوسری کرسی پر خود وہی بوڑھا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

میں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آگیا یا تو جو کچھ میں اس وقت دیکھ رہا تھا، یہ دھوکا تھا یا جو کچھ دیکھتا آیا تھا، وہ دھوکا تھا۔

اچانک بوڑھے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''میاں وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، آؤ ناشتا تیار ہے۔''

میں اُن کے سامنے تیسری کرسی پر بیٹھ گیا جو خالی پڑی تھی۔ شاید وہ میرے ہی لیے تھی۔

''کہاں کی سیر کر آئے ارسلان صاحب؟'' ارم نے پوچھا۔

''میں یونہی ہوا خوری کے لیے نکل گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جنگل بہت خوب صورت ہے اور صبح کے وقت یہ اور زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے۔''

''ہاں، اگر ذہن الجھا ہوا نہ ہو تو بہت مزہ آتا ہے۔''

''بھائی تم نے ذہن کے الجھنے کی بات کر کے مجھے یاد دلا دیا کہ آج تو میں بھی اپنے ذہن کی الجھن دور کرنے کے لیے جنگل کی طرف گیا تھا۔''

''اوہ...'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ جب یہ بوڑھا خود ہی اعتراف کر رہا تھا تو مجھے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔ میری الجھن تو دور ہو جانا چاہیے تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے معاملہ کچھ اور ہے ویسے بظاہر تو کچھ بھی نہیں تھا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے سر؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی، تم نے بتایا تھا نا کہ تم نے جنگل میں کچھ پُراسراری آوازیں سنی تھیں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''تو میں ان آوازوں کی کھوج میں گیا تھا۔''

اس کا یہ کہنا بھی درست تھا کیونکہ وہ جنگل کے اسی حصے کی طرف گیا تھا جہاں میں نے وہ آوازیں سنی تھیں۔ میں بھی خوامخواہ الجھ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور راستے سے کیمپ کی طرف واپس آگیا ہو۔

ہم ناشتا ختم کر چکے تھے کہ سرفراز آگیا۔ اس نے بتایا۔ ''کام شروع ہو گیا ہے سر، آپ چل کر دیکھ لیں۔''

''او کے، میں چلتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا۔

اسی وقت ارم نے اسے مخاطب کیا۔ ''بابا! میں مسٹر ارسلان کے ساتھ جنگل کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔''

''نہیں، نہیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' بوڑھا جلدی سے بولا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ''ارسلان! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھی خاصی سمجھ دار لڑکیاں کبھی کبھی اتنی بے وقوف کیوں ہو جاتی ہیں۔''

''کیا بات ہو گئی ہے سر؟''

''اب خود سوچو، اس لڑکی کو میرے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں لاکھ سمجھاتا رہا کہ بیٹا جنگل ہے نہ جانے کیسے حالات ہوں لیکن نہیں، ضد پکڑ لی۔ خیر، اب تم لے کر جا رہے ہو تو اس طرف مت نکل جانا جہاں تم نے وہ آوازیں سنی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کچھ بھی نہ ہو لیکن کیا

بھروسا؟ ہوسکتا ہے واقعی کوئی گڑبڑ ہو۔"

"یس سر، مجھے اندازہ ہے۔ میں ان کا خیال رکھوں گا۔"

"اب جاؤ۔" بوڑھے نے ارم سے کہا۔" میں سرفراز کے ساتھ کام دیکھ رہا ہوں۔"

ارم میرے ساتھ چل پڑی۔ اس جگہ کسی خوب صورت لڑکی کا اس طرح میرے ساتھ ساتھ چلنا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک خوش گوار سا احساس ہو رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد... بہت دنوں کے بعد ایسی فرحت مل رہی تھی مجھے۔ اسما کے غائب ہوجانے کے بعد تو میں زندگی کے حسین لمحات کو ترس کر رہ گیا تھا۔

خدا جانے وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔

ہم گھنے درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ پرندوں کی خوش گوار آوازیں کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اچانک ارم نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔"اگر میں تمہیں ارسلان کہہ کر پکاروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟"

"بالکل نہیں۔"

"بابا بتا رہے تھے کہ تم نے جیالوجی پڑھی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں پڑھی ہے اور یہ سبجیکٹ میرا جنون رہا ہے۔" میں نے کہا۔"لیکن افسوس ابھی تک یہ معاشی طور پر کام نہیں آسکا ہے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ یہ ریک ڈیک کیا ہے؟" اس نے دفعتاً پوچھا۔

"ریک ڈیک؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔"کیوں؟ خیریت تو ہے۔ یہ تم نے ریک ڈیک کیوں پوچھ لیا؟"

"تم بتاؤ تو سہی، یہ ہے کیا؟"

"یہ ہمارے ملک میں شروع ہونے والے ایک بہت بڑے منصوبے کا نام ہے۔" میں نے بتایا۔"ہمارے ملک میں زیرِ زمین خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ کوئلے اور دوسری چیزیں تو عام طور پر مل جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں لیکن ریک ڈیک ایک ایسا منصوبہ ہے جو بہت قیمتی چیزوں کو نکالنے کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"کون سی قیمتی چیزیں؟"

"جیسے سونا، یورینیم، پلاٹینم وغیرہ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"یونہی، میں نے بابا سے ایک دو بار یہ نام سنا تھا۔" اس نے بتایا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے پھر اس نے کہہ ہی دیا۔"ارسلان! تم اس نام کو یاد رکھنا۔ یہ تمہارے کام آئے گا۔"

"کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھ سکا۔"

"اس وقت اس سے زیادہ میں نہیں بتا سکتی۔ آؤ اب واپس چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔"دیر ہو رہی ہے۔ ہم شاید بہت دور نکل آئے ہیں۔"

بہت ہی الجھا ہوا اور پُراسرار رویہ تھا اس کا۔ اس نے جو کہا، وہ بھی الجھا ہوا تھا۔ شاید اس لڑکی کے سینے میں کوئی راز ہے لیکن وہ کھل کر نہیں بتا رہی تھی۔

ہم کیمپ واپس آگئے۔ یہاں کام جاری تھا۔

وہ کیبن کی طرف چلی گئی اور میں ہونے والے کام کی نگرانی کرنے لگا۔ شام کے وقت کیبن کے پاس اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔"ارم! تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں دن بھر تمہاری باتوں پر سوچتا رہا ہوں۔ آخر تم کہنا کیا چاہتی تھیں؟"

"چلو، کل صبح جب سیر کے لیے چلیں گے تو سب بتا دوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن دوسری صبح کی نوبت نہیں آسکی۔ کیونکہ اسی رات مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔

☆☆☆

جو کچھ بھی ہوا، بالکل بے خبری میں میری نیند کے دوران میں ہوا تھا۔

ایک بار ہلکی سی آہٹ محسوس تو ہوئی تھی لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے کہ خیمے سے باہر کوئی چل پھر رہا ہو یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہو۔

ہوش اس وقت آیا جب کسی نے مجھے بے رحمی سے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ وہ چار آدمی تھے۔ نقاب پوش اور اسلحہ بردار۔ ان کے ہتھیاروں کے رخ میری ہی طرف تھے۔

"خبردار، آواز نہیں نکالنا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔"چلو ہمارے ساتھ۔"

میں نے اپنا ریوالور میز پر رکھا ہوا تھا اور وہ میز اس وقت میری پہنچ سے دور تھی...... اگر میں ریوالور اٹھانے میں کامیاب بھی ہوجاتا تو پھر بھی کیا ہوتا۔ وہ چار تھے اور میں اکیلا تھا۔

"چلو۔" اس نے دوبارہ کہا۔

''کہاں چلوں؟''

''سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔''

مجبور ہو کے میں بستر سے نیچے آ گیا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں ان سے لپٹ پڑوں۔ خدا جانے کون تھے اور کیا چاہتے تھے مجھ سے۔

وہ چاروں مجھے کیبن سے باہر لے آئے۔ انہوں نے بہت ہی مناسب وقت کا انتخاب کیا تھا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ خیموں میں خاموشی تھی۔ ظاہر ہے دن بھر کے تھکے ہوئے مزدور اس وقت سو ہی رہے ہوں گے۔

ان میں سے ایک آگے آگے چل رہا تھا۔ کیمپ کی حد سے باہر نکل کر انہوں نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مجھے کہاں اور کیوں لیے جا رہے ہیں۔

کچھ دور جانے کے بعد میں چونک پڑا۔ ہمارا رخ تو جنگل کے اسی حصے کی طرف تھا جہاں میں نے وہ پراسرار آوازیں سنی تھیں۔

لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا پھر یہ لوگ مجھے اس طرف کیوں لیے جا رہے تھے پھر اچانک کچھ ہوا۔ بالکل غیر متوقع طور پر۔

ایسا لگا جیسے میری آنکھوں اور ناک میں کسی نے مرچوں کی دھونی دے دی ہو۔ اتنی شدید جلن تھی کہ میں نے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں پھر ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنی دیر تک اس عالم میں رہا ہوں گا پھر کسی کے کس .... نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔

میں نے آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے ایک نورانی چہرہ تھا۔ سرخ و سفید رنگت اور مہربان مسکراتی ہوئی آنکھیں۔

میں نے اٹھنا چاہا لیکن انہوں نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''لیٹے رہو، تم ابھی کمزور ہو۔''

''محترم! یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میرا غریب خانہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم جنگل میں بے ہوش تھے۔ میں تمہیں اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں۔''

مجھے یاد آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ مجھے اغوا کر کے لا رہے تھے کہ اچانک میری آنکھوں اور ناک میں جلن ہونے لگی تھی اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔

''محترم! کچھ لوگ مجھے اٹھا کر کہیں لے جا رہے تھے کہ اچانک میری آنکھیں جلنے لگی تھیں اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔''

''اوہ۔'' وہ بزرگ مضطرب ہو گئے۔ ''اس جنگل میں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ یہ سب کسی زہریلی گیس کی وجہ سے ہوتا ہے۔''

''جی ہاں، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ پھر ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''محترم! اس جنگل میں آپ کا قیام میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''ہاں ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ تم جیسوں کی مدد ہی کے لیے خدا نے مجھے یہاں رکھا ہو۔ میری ڈیوٹی لگا دی ہو۔''

ان بزرگ کی باتوں سے تقویت حاصل ہو رہی تھی۔ خدا جانے وہ کون تھے اور اس جنگل میں کیوں آ کر رہنے لگے تھے۔

''میں تمہارے لیے سوپ لاتا ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔ ''اکیلا ہوں، اس لیے سارا کام خود کرنا پڑتا ہے۔''

''جناب! آپ رہنے دیں۔'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکرا کر رہ گیا۔ بے پناہ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

''ابھی لیٹے رہو، تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ کسی گیس کا اثر اتنی دیر تک تو نہیں رہتا ہے۔''

''یہاں سب کچھ ممکن ہے۔'' بزرگ بڑبڑائے۔ ''خدا جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ میری آنکھیں تو بہت کچھ دیکھ چکی ہیں۔''

پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کہیں وہی شیخ تو نہیں ہیں جن کے حوالے مرنے والے مزدور دے رہے ہیں۔

وہ بھی تو یہی بتاتے تھے کہ وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور وہ اپنے شیخ کے اتنے وفادار ہوتے تھے کہ اپنی جان تک دے دیتے تھے۔

خدایا، یہ اگر وہی تھے تو پھر میں کسی لمبے چکر میں پھنس گیا تھا۔

وہ سوپ بنانے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

جس کمرے میں، میں موجود تھا۔ وہ سادگی سے سجا ہوا ایک کمرا تھا۔ اس کے ساتھ دو کمرے اور بھی دکھائی

دے رہے تھے۔ ان کے دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ یہ بزرگ اس جنگل میں کیوں آ کر رہنے لگے ہیں اور اس جنگل میں ایسا مکان کیونکر بن گیا ہے۔

شیخ صاحب کی شخصیت نے بھی الجھا کر رکھ دیا تھا۔ شیخ صاحب کچھ دیر بعد ایک ٹرے میں دو پیالے لے کر آ گئے۔ ان میں گرما گرم سوپ تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شیخ صاحب نے ایک پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ پی لو، تمہاری توانائی بحال ہو جائے گی۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے سوپ پینا شروع کر دیا۔ سوپ بہت خوش ذائقہ تھا۔

”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ گے؟“ شیخ صاحب نے دریافت کیا۔

”جناب! میرا نام ارسلان ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس جنگل میں ایک فرم لکڑیوں کا کام کرتی ہے، میں نگراں بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

”اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہو؟“

”کچھ خاص نہیں، بس اِدھر اُدھر ملازمتیں کرتا رہا جبکہ میری اصل فیلڈ تو کچھ اور تھی۔“

”اور وہ کیا تھی؟“

”جیالوجی۔“ میں نے بتایا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آ کر ملک اور قوم کے لیے کوئی کارنامہ کر جاؤں گا۔ خدمت کروں گا اس قوم کی لیکن شاید اس قسم کی چیزوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”دیکھو، تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ کسی قوم کی تباہی اور اس کی کامیابی کی کیا نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔“

”جی جناب۔“

”نشانی یہ ہوتی ہے کہ کامیاب قومیں اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں اور ناکام قومیں اپنے وسائل کی قدر ہی نہیں کرتیں۔“

”جی ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”اور جانتے ہو، خود خدا کیا فرماتا ہے۔ اس نے تم جیسے اہلِ علم کے لیے میرا مطلب ہے کہ زمین کے علم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کیا کہا ہے۔“

”آپ فرمائیں جناب۔“

”وہ فرماتا ہے۔ غور کرو کہ پہاڑوں میں سفید، سرخ اور سیاہ رنگ پتھروں کی تہیں موجود ہیں۔ نیز انسانوں، چوپایوں اور مویشیوں کے مختلف رنگوں کا مطالعہ کرو۔ اور یاد رکھو اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف عالم ہی ڈرتے ہیں۔“

”کمال ہے جناب، یہ تو ہم جیالوجی والوں کے لیے ایک واضح پیغام ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور آگے سنو کہ جو قومیں ان کی قدر نہیں کرتیں، اللہ ان کے لیے کیا کہتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں۔ کیا یہ لوگ آسمان اور زمین وغیرہ کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے ان کی موت قریب آ گئی ہے۔“

”یہ تو بہت کھلی ہوئی تنبیہ ہے جناب۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ اب قوم کو مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔“

”یہ تو بہت مایوس کر دینے والی صورتِ حال ہے جناب۔“

”ہاں، بہت مایوس کن۔ دیکھو، جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے، وہ کسی صورت ناانصافی نہیں کر سکتا۔ جو قومیں محنت کریں گی، وہ انہیں اس کا صلہ دے گا اور جن قوموں پر اس کا کرم ہوگا جو محنت کریں گی، علم حاصل کریں گی، خدا ان قوموں کا ساتھ دے گا۔ ایک اور آیت کا مفہوم ہے۔“

”جی جناب، فرمائیں۔“ میں شیخ صاحب سے بے حد متاثر ہو گیا تھا۔

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اگر تم نے آئینِ حیات سے منہ پھیر لیا تو یہ زمین کسی اور کے قبضے میں دے دی جائے گی۔“

”تو جناب، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟“

”دیکھو، ڈوبتی کشتی پر سفر نہیں کیا جاتا۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”کیونکہ وہ تو ڈوب ہی رہی ہے۔ اگر تم اس میں سوار ہوئے تو خود بھی ڈوب جاؤ گے۔“

”آپ نے تو دہلا دیا ہے جناب۔“

”یہ قوم تمہارے علم اور تمہارے ہنر کی قدر اس لیے نہیں کر رہی کہ اس نے اپنی بہتری اور بھلائی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے جناب؟“

”پھر ان قوموں کا ساتھ دینا چاہیے جو انعام یافتہ

ہیں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''اور انعام یافتہ قومیں وہ ہیں جو اہل علم کی قدر کرتی ہیں۔ ان کے علم سے فائدہ اٹھاتی ہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی میں دنیا کی امامت کر رہی ہیں۔ اقبال نے فرمایا تھا۔ ''لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا'' تو دنیا کی امامت کا مطلب کسی مسجد کی امامت نہیں ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ کر دوسروں کو روشنی دکھانا ہے۔ خیر، اب میری نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ تم سے پھر باتیں ہوں گی۔''

شیخ صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ شاید وہ ٹھیک ہی فرما رہے تھے کہ جو قوم خود تباہ ہونا چاہے، اسے کون روک سکتا ہے اور جو کشتی ڈوب رہی ہو اس میں سفر کرنا حماقت ہے۔ تو یہ کشتی ڈوبنے والی تھی۔ اسی لیے میرا ہنر، میری تعلیم اس قوم کے کام نہیں آ رہی تھی۔

میں ایک بار پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نقاہت ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ خدا جانے کیا مسئلہ تھا۔ اب تک تو اس گیس کا اثر ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن......

شیخ صاحب کی واپسی بہت دیر کے بعد ہوئی۔ شاید دو گھنٹوں کے بعد۔ وہ میرے لیے ایک ٹرے میں کھانا لے کر آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' شیخ صاحب نے پوچھا۔

''بہت بہتر، توانائی محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''چلو کھانا کھا لو۔'' شیخ صاحب نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔

اس ٹرے میں سالن کے ساتھ ابلے ہوئے چنے اور ایک چھوٹی سی روٹی بھی تھی۔ شیخ صاحب نے سالن اور روٹی میری طرف بڑھا دی۔ ''لو کھا لو۔''

''اور آپ جناب؟''

''بس، میرے لیے یہ کافی ہے۔'' انہوں نے چنے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور وہ بھی چوبیس گھنٹوں میں ایک بار۔''

''بس۔'' میں حیران ہو رہا تھا۔

''ہاں میاں، اسی کا شکر ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔ دوسری نعمتوں کا کہاں سے کروں گا۔''

میرے دل میں ان کی عقیدت دو چند ہو گئی۔ ایک اجنبی سے حادثے نے مجھے اتنے بڑے انسان سے ملوا دیا تھا۔ ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

''میری باتوں نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟'' شیخ صاحب نے پوچھا۔

''نہیں جناب، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ یہاں شاید اب بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ کشتی ڈوبنے والی ہے اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے جیالوجی کی تعلیم بس یونہی لے لی ہے۔''

''نہیں میاں، یونہی نہیں لی۔ انسان کی پلاننگ دو چار، دس سال کے لیے ہوتی ہے لیکن خدا کے یہاں قیامت تک کی پلاننگ موجود ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس وقت کیا کرنا ہے اور کس سے کیا کام لینا ہے۔ تمہیں اس سچائی سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں جناب، انکار کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں کس کے لیے کام کروں گا؟''

''اس قوم کے لیے جو تمہارے اس علم کی قدر کرے گی جو ترقی یافتہ ہے لیکن تمہارا ہنر اسے اور ترقی یافتہ بنائے گا۔''

''ایسی قوم کہاں سے لاؤں گا جناب؟'' میں نے پوچھا۔

''میاں، خدا نے تمہاری بے بسی اور بے چارگی دیکھ لی ہے۔'' شیخ صاحب نے فرمایا۔ ''دو آدمی تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ چکے ہیں۔''

''کون سے دو آدمی جناب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ایک ترقی یافتہ قوم کے دو آدمی۔ انہیں تمہارے بارے میں تمہاری فرم سے پتا چلا تھا۔ وہ تمہیں تلاش کرتے رہے اور خوش قسمتی سے مجھ تک پہنچ گئے۔ آؤ، میں تمہیں ان سے ملواتا ہوں۔ چل تو سکتے ہو نا؟''

''جی جناب، میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''تو آ جاؤ۔''

میں پہلی بار دوسرے کمرے میں آیا تھا۔

یہ دبیز قالین سے سجا ہوا کمرا تھا۔ اس کی دیواروں پر طغرے لگے ہوئے تھے۔ پورے کمرے میں کسی عطر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ دو آدمی کمرے میں موجود تھے۔ اگرچہ وہ مقامی لباس میں تھے لیکن پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں۔

ہمیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر دونوں جلدی

سے کھڑے ہو گئے۔

''یہ ہیں ارسلان۔'' شیخ صاحب نے ان سے میرا تعارف کروایا۔ پھر ان دونوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ ہیں ابراہیم ہنری، نومسلم ہیں۔ ابراہیم ان کا نیا نام رکھا گیا ہے اور ہنری ان کے والد کا نام ہے۔''

''السلام علیکم۔'' ابراہیم ہنری نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''اور یہ ہیں مسٹر چارلس براؤن۔'' شیخ صاحب نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دونوں ہی اپنے ملک کے اعلیٰ عہدیدار اور ذمے دار لوگ ہیں۔''

میرے اس اندازے کی تصدیق ہو چکی تھی کہ دونوں غیر ملکی ہیں۔

''ارسلان بہت کام کے آدمی ہیں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''اور یہ اپنے وطن اور مذہب سے محبت کرنے والے شخص ہیں۔ کوئی بات اگر ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تو میں انہیں واپس بلا لوں گا۔''

میں حیران ہو کر یہ سب سن رہا تھا۔ جو باتیں بھی ہو رہی تھیں، وہ میری سمجھ سے باہر تھیں۔ یہ شیخ صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ اگر کوئی بات میری مرضی کے خلاف ہوئی تو مجھے واپس بلا لیں گے۔

کہاں سے واپس بلائیں گے؟ مجھے کہاں جانا ہوگا؟ کون ہیں یہ لوگ؟ یہ لوگ مجھ تک کیسے پہنچ گئے اور شیخ صاحب نے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر کوئی بات ملک اور مذہب کے خلاف ہوئی تو مجھے واپس بلا لیں گے۔

تو کیا یہ لوگ ملک اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہنے جا رہے تھے یا کچھ کرنے والے تھے؟ کیسا الجھا ہوا معاملہ تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں ان لوگوں کا پابند نہیں تھا۔ میں تو کہیں اور ملازمت کر رہا تھا۔ میری وفاداری تو اس فرم سے ہونی چاہیے تھی، یہ لوگ کون ہوتے۔

''حضرت۔'' میں نے ایک فیصلہ کر کے شیخ کو مخاطب کیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ میری بات کا خیال نہ کریں۔ میرا ذہن بہت بری طرح الجھ گیا ہے۔ سیدھا سادہ معاملہ تھا جو میری ملازمت سے شروع ہوا تھا۔ یہاں آ کے پتا چلا کہ کچھ لوگ کیمپ پر حملہ کر کے مزدوروں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ کہاں لے جاتے ہیں، یہ نہیں معلوم۔ پھر دو افراد ایسے ملے جو نیلی موت کا شکار ہو گئے۔ کیا ہے یہ نیلی موت۔ پھر پُراسرار طور پر ہیلی کاپٹر کی پرواز۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مجھے اغوا کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں زہریلی گیس کا حملہ ہوتا ہے۔ ہاں، اس سے پہلے میں جنگل میں پُراسرار آوازیں سن چکا ہوں۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ آپ مجھے مل جاتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں۔ اور اب آپ کے آستانے پر یہ دو غیر ملکی آ کر مجھے کس بات کی آفر کر رہے ہیں۔ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا ہوں۔''

''یہ بات تو ہے۔'' شیخ صاحب نے گہری سانس لی۔ ''لیکن تم ان کے ساتھ نقصان میں نہیں رہو گے۔ یاد رکھو، ڈوبتی کشتی پر سفر کرنا حماقت ہے۔''

''آپ کی بات بالکل درست ہے حضرت۔ لیکن کم از کم مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میں اپنی ہی کشتی پر ڈوب رہا ہوں۔''

''تمہاری مرضی۔'' شیخ صاحب کا لہجہ اچانک خشک ہو گیا۔ ''ہم تم پر کوئی زور نہیں دے سکتے۔ یہاں ہر شخص اپنی تقدیر ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو بلکہ ٹھہرو، میں کسی کو تمہارے ساتھ کر دیتا ہوں۔ وہ تمہیں کیمپ تک پہنچا دے گا۔''

''بڑی نوازش حضرت، میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، بس اس بات کی اجازت چاہوں گا کہ میں کبھی کبھی آپ کے پاس حاضر ہو سکوں۔''

''بہت شوق سے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔''

اس مکان سے باہر بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ وہ سب مقامی ہی لوگ تھے۔ شیخ نے دروازہ کھول کر کسی کو آواز دی۔ ''سردار خان۔''

ایک لمبا چوڑا شخص شیخ کے سامنے ادب سے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''جی حضرت۔''

''ان صاحب کو ان کے کیمپ پہنچا دو۔'' شیخ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''وہ جو لکڑیاں کاٹنے والوں کا کیمپ ہے۔''

''سمجھ گیا حضرت۔'' اس نے کہا پھر میری طرف دیکھا۔ ''آئیں جناب۔''

میں نے شیخ اور ان دونوں آدمیوں سے معانقہ کیا اور اس آدمی کے ساتھ ہو لیا جس کو سردار خان کہا گیا تھا۔

جنگل اسی طرح دلکش اور پُراسرار لگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کیمپ والے میری گمشدگی سے حیران اور پریشان ہو رہے ہوں گے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں بھی شاید دوسرے مزدوروں کی طرح غائب ہو چکا ہوں۔

لیکن اس کیمپ تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔
مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ مجھ پر پیچھے سے حملہ کر کے بے ہوش کر دینے والا سردار خان ہی تھا یا کوئی اور تھا۔
میرا خیال ہے کہ وہی ہوگا۔ کیونکہ میرے پیچھے وہی چل رہا تھا۔ ابھی ہم شیخ کے مکان سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں تھے کہ اچانک میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پتا نہیں کس چیز سے حملہ کیا گیا تھا کہ میں وہیں اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

خدا ہی جانتا ہے کہ کب اور کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔
سر بہت بری طرح دکھ رہا تھا۔ جیسے پورے سر پر زخم ہی زخم ہوں۔ بہت دیر تک سوچنے کے قابل ہی نہیں ہوسکا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ آنکھوں کے آگے ایک دھند تھی جو آہستہ آہستہ چھٹتی جارہی تھی اور مناظر واضح ہونے لگے تھے۔
میں کسی بستر پر تھا۔
اور وہ بستر نہ تو شیخ صاحب کے آستانے کے کسی کمرے میں تھا اور نہ ہی کیمپ میں تھا بلکہ کہیں اور تھا کسی اور جگہ۔
یہ کمرا پختہ بنا ہوا تھا اور سلیقے سے سجا ہوا بھی تھا۔ ایک طرف ایک بڑا سا ریفریجریٹر تھا۔ ایک طرف ایک میز پر ایک ٹی وی سیٹ بھی تھا۔
کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جس کے باہر کا منظر بستر سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دروازہ تھا جو اس وقت بند دکھائی دے رہا تھا۔
میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر میں تکلیف ہونے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔
یہ دونوں میرے لیے اجنبی تھے
''اوہ، تم ہوش میں آگئے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔
''جی ہاں، لیکن بہت تکلیف میں ہوں۔''
''ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اس نے دوسرے کو مخاطب کیا۔ ''ڈاکٹر! ذرا چیک کرنا، کم بخت جاہل لوگ ہیں اور بھی طریقے ہوتے ہیں، کیا ضروری ہے کہ کسی کا سر ہی پھاڑا جائے۔''
میں خاموش رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے میرے سر کے زخم کا معائنہ شروع کردیا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک قینچی نکالی اور دوسری دراز سے مرہم پٹی کا سامان نکال لیا۔
ڈاکٹر نے اس جگہ سے بال کاٹے جہاں زخم لگا تھا پھر اس نے میرے زخم پر کوئی دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔
پھر اس آدمی نے ڈاکٹر کو جانے کے لیے کہا۔ اس کے جانے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ ''اب کیسا محسوس کررہے ہو تم؟''
''میں سوائے پاگل ہو جانے کے اور کچھ بھی محسوس نہیں کررہا ہوں۔'' میں نے تنگ کر کہا۔ ''خدا جانے میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''
''جو کچھ ہو رہا ہے، تمہاری بھلائی کے لیے ہو رہا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''ویسے تمہارا نام تو معلوم ہے لیکن میرا نام وقار ہے، وقار ندیم۔''
''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''
''تم کیا سمجھتے ہو کہ تم اتفاقاً یہاں دکھائی دے رہے ہو؟ نہیں، بلکہ ایک پلاننگ کے تحت تمہیں یہاں لایا گیا ہے۔ شیخ صاحب کا خیال تھا کہ انہوں نے تم سے جو باتیں کی تھیں، تم ان سے متاثر ہو کر ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہو جاؤ گے۔ جب ایسا نہیں ہوا تو تم پر حملہ کر کے تمہیں بے ہوش کر کے یہاں لایا گیا ہے۔''
''لیکن کیوں؟ مجھ میں ایسی کیا بات ہے کہ تم سب میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔ ''اور یہ شیخ صاحب! یہ کیا ہیں؟''
''شیخ صاحب ہی تو سب کچھ ہیں۔ خیر، اب تم اپنی بات کرو۔ تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''
''ظاہر ہے، یہ معلوم کرنا تو میرا حق ہے۔'' میں نے کہا۔
''تو پھر آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔ ''چل تو سکتے ہو نا؟''
''ہاں کیوں نہیں۔''
''تو پھر آجاؤ۔''
وہ مجھے کمرے سے باہر لے آیا۔ اس کمرے سے باہر ایک برآمدہ تھا۔ جیسا آپ نے انگلش فلموں وغیرہ میں دیکھا ہوگا۔ اس برآمدے کی اونچائی اتنی تھی کہ نیچے اترنے کے لیے کئی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔
سامنے ایک میدان تھا۔ جہاں کچھ مزدور قسم کے

لوگ ٹرالی دھکیلتے ہوئے آجارہے تھے۔ کان کنی کی بھاری مشینیں بھی موجود تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جو بالکل جدید طرز کی تھیں۔

سامنے چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ان پہاڑیوں کے پتھر بالکل سیاہ ہورہے تھے۔ شاید لاکھوں برس گزرنے کے بعد ان پہاڑیوں نے یہ روپ اختیار کرلیا تھا۔

''ارسلان! وہ سامنے والی پہاڑیوں کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟'' وقار نے پوچھا۔

''بہت قیمتی پہاڑیاں ہیں۔'' میں بے ساختہ بول پڑا۔ ''ہمارے پوائنٹ آف ویو سے ان پہاڑیوں میں بہت نایاب اور قیمتی دھاتیں ہوا کرتی ہیں۔''

''بس، تمہارے اسی علم اور معلومات سے فائدے کے لیے تمہیں یہاں لایا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ، اب سمجھا۔ تو تم لوگ مجھے اس لیے لائے ہو کہ میرے جیالوجی کے علم سے فائدہ اٹھاسکو۔''

''ہاں، کیونکہ تمہارا اپنا وطن تو تمہارے اس علم کی قدر کرنے سے رہا۔ تم خواہ مخواہ ضائع ہورہے ہو اسی لیے ہم تمہیں یہاں لائے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' کیا میں اپنے ملک میں نہیں ہوں۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی تک تو اپنے ہی ملک میں ہو۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ دنوں کے بعد تمہیں کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ اس دوران میں تم ان علاقوں کا سروے کروگے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروگے کہ کس چٹان کے نیچے کون سا خزانہ پوشیدہ ہے اور ہاں تمہاری مدد کرنے کے لیے تمہیں کچھ لوگ بھی دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس مائننگ کے لیے جدید ترین اوزار اور مشینیں موجود ہیں۔''

''ہمارے پاس سے کیا مراد۔ تم بھی تو ہمارے ہی ملک کے معلوم ہوتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، اب سے پانچ سال پہلے تک میں اس ملک کا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک محب وطن پاکستانی۔ جانتے ہو، میں نے کس سبجیکٹ میں ڈگری لی تھی ہے۔ میٹریالوجی میں۔ دھاتوں کا علم، یہ کوئی عام علم نہیں ہے۔ جب کوئی جیالوجسٹ زمین سے خزانے نکال کر ہمارے حوالے کرتا ہے، اس کے بعد سے ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔ ہم اس خزانے پر ریسرچ کرتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارے کام آسکتا ہے۔ اتنا مفید علم ہے لیکن ہوا کیا۔ میں یہاں خوار ہوتا رہا۔ سیاست

راز کی بات

دو سہیلیوں کی عرصہ بعد ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ ایک سہیلی نے دوسری سہیلی سے کہا۔

''فرزانہ! برا نہ منانا۔ میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟''

فرزانہ نے کہا۔ ''ہاں ہاں، باجی ثمینہ، ضرور پوچھو۔''

ثمینہ بولی۔ ''عرصہ پہلے تمہارے بال کندھوں تک ہوتے تھے۔ تم بالوں کو کھلا رکھتی تھیں۔ اب تم نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنا لیا ہے۔ حالانکہ کھلے بال جو تمہارے شانوں تک پہنچتے تھے، بڑے خوب صورت لگتے تھے۔ کھلے بالوں سے تمہارا چہرہ بھی بھرا بھرا لگتا تھا۔ جوڑا کرنے کی وجہ بتا سکتی ہو؟''

فرزانہ بولی۔ ''باجی! بات یہ ہے جب میں بالوں کو کندھوں تک کھلا رکھتی تھی۔ اس وقت میرے پاس سونے کی کٹوری والے جھمکے نہیں تھے۔''

بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور کا تعاون

دانوں اور بیوروکریسی نے مجھے لفٹ ہی نہیں دی۔ پھر اس ملک نے آفر دی اور اپنی شہریت اور بھاری معاوضے کی پیشکش کردی۔ میں بددل تو ہو ہی چکا تھا۔ فوراً ہاں کردی اور اب اس ملک کے مفاد کے لیے کام کررہا ہوں۔''

''یہ واقعی ایک المیہ ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہاری بات مان لوں گا؟''

''بہتر یہی ہے کہ بات مان لو۔ ورنہ میکارتے کے پاس ایسے ایسے طریقے ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔''

''اور یہ میکارتے کون ہیں؟''

''وہی، تم جن کو شیخ صاحب کے طور پر جانتے ہو۔'' وقار نے مسکرا کر بتایا۔

اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا۔

☆☆☆

الجھی ہوئی گتھیاں اب آہستہ آہستہ کھلتی جارہی تھیں۔ بہت سی باتیں مجھے وقار سے معلوم ہوئیں۔ اس نے بتایا۔ ''میکارتے غیر ملکی ہے۔ کئی زبانیں اہلِ زبان کی طرح بولتا ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ اور فلاسفی کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ عربی بہت اچھی جانتا ہے۔ قرآن و حدیث پر بہت گہری نگاہ ہے اس کی۔''

"ہاں، اس کا تجربہ تو مجھے ہو چکا ہے۔" میں نے بتایا۔ "دورانِ گفتگو اس نے مجھے قرآن ہی کے حوالے دیے تھے۔"

"اس کے حوالے غلط نہیں ہوتے۔ کاش ہم مسلمان ایسی باتوں کو سمجھ پاتے۔"

اس وقت ہم کھلے میدان میں ٹہلتے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ سامنے مزدور اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

"وقار! ایک بات بتاؤ۔" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے تم ابھی بھی اپنے وطن سے پیار کرتے ہو؟"

اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ جیسے اس سوال کا جواب دینے سے کترا رہا ہو۔

"میری بات کا جواب دو وقار۔"

"یہ پرانی بات ہو چکی۔" اس نے کہا۔ "اب میرا نیا ملک ہی میرا وطن ہے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ ملک چاہے لاکھ تبدیل کرتے رہیں لیکن وطن صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ جہاں اس کی جڑیں ہوتی ہیں۔ جہاں وہ جنم لیتا ہے۔ جہاں کی فضاؤں میں کھیل کود کر بڑا ہوتا ہے اس کا نعم البدل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "لیکن جب وطن ہی میں کوئی قدر نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟"

"تم اس کے بیوروکریٹس اور دوسرے اربابِ اختیار سے نفرت کرو۔ کیونکہ یہ تمہارا حق ہے۔ بے چارہ وطن تو خاموش دھرتی ہے۔ وہ تمہیں سوائے دعاؤں کے اور کیا دے سکتا ہے۔"

"کوئی اور بات کرو ارسلان۔" اس نے کہا۔

"فرض کرو، اگر میں کام کرنے سے انکار کردوں تو کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ایسا مت کرنا۔ اس میکارتے کے پاس بہت دردناک طریقے ہیں، تمہارے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" میں نے وقار سے کہا۔ "اگر ان کے پاس مائننگ کے جدید طریقے اور مشینیں ہیں، تو پھر ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟"

"بہت سامنے کی بات ہے۔ اسپتال میں دنیا بھر کی مشینیں ہوتی ہیں۔ ایکسرے مشین، اسکین کی مشین، ڈیلائسس کی مشین وغیرہ۔ لیکن وہ اس وقت تک بے کار ہیں جب تک ٹیکنیشن ان کو استعمال نہ کرے۔ اسی طرح زمین ہے اس میں خزانے بھی ہیں۔ لیکن جب تک جیالوجسٹ فیصلہ نہ کرے۔ زمین سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا تو تم لوگ دراصل زمین کے ٹیکنیشن ہوتے ہو۔"

"ہاں، بات سمجھ میں آگئی۔ اب یہ بتاؤ، ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"اب اس علاقے میں تم سے کام لیا جائے گا۔ تمہیں یہاں کی زمین کی سطح کا معائنہ کرکے یہ بتانا ہوگا کہ کہاں کہاں پر کون سے ایلیمنٹس ہیں۔ اب اگر کوئی قیمتی اور نایاب چیز مل بھی جائے تو اس کا اظہار مت کرنا۔ ورنہ وہی ہوجائے گا جو ریک ڈیک میں ہوا ہے۔"

"ریک ڈیک؟" میں چونک پڑا۔ "یہ تو ہمارا وہ منصوبہ ہے جو ہمیں صدیوں کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا کردے گا۔"

"ہاں، اس عظیم الشان منصوبے کے ساتھ یہی ہوا ہے۔" وقار کی آواز میں دکھ تھا۔ "ان لوگوں نے یہ تو بتادیا کہ یہاں لوہا ہے۔ تیل ہے یا سونا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہاں یورینیم بھی موجود ہے اور وہ بھی بہت بڑی تعداد میں۔ ہم چونکہ اپنے جیالوجسٹ سے کام نہیں لے رہے تھے اس لیے وہ جو بتاتے رہے، ہم اس پر یقین کرتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک یورینیم کی بہت بڑی مقدار ہمارے ملک سے ٹرانسفر ہو چکی ہے۔"

میرے پورے وجود میں ایک سناٹا سا شامل ہوگیا۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا۔ یہ کتنا بڑا دھوکا فریب تھا۔

"وقار۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ بتاؤ، اگر کسی نایاب دھات کا پتا چل بھی گیا تو کیا فائدہ ہوگا، ہم تو فائدہ اٹھانے سے رہے۔"

"امید پر دنیا قائم ہے میرے دوست۔" وقار نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ قدرت کو ہم پر رحم آجائے اور وہ ہمارے لیے ایسے حکمران بھیج دے جو کسی غرض اور لالچ کے بغیر ملک کے وسائل سے فائدہ اٹھا کر پوری قوم کی قسمت بدل دیں۔"

"درست، تم اگر اتنے ہی پاکستانی ہو اور ہو، تمہاری باتیں یہ بتا رہی ہیں تو پھر تم کھل کر اپنے ملک کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟"

"میں مجبور ہوں بھائی۔ میری بیوی اور بچے اسی ملک کے قبضے میں ہیں۔" وقار نے بتایا۔

اور اسی وقت فضا میں ایک ہیلی کاپٹر کی گھن گرج سنائی

دی۔ وہ ہیلی کاپٹر اسی علاقے کے گرد منڈلا رہا تھا۔

☆☆☆

ریک ڈیک۔ بوڑھے باس کی بیٹی ارم نے بھی یہی نام لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا، وقار کی باتوں کا مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا۔

یہ سب کچھ اس ملک کے قدرتی وسائل کو حاصل کرنے کے لیے کیا جارہا تھا۔ کیا دور اَز کار پلاننگ تھی اور اب آنے والے ہیلی کاپٹر کا معما بھی حل ہونے والا تھا۔

''وقار! یہ ہیلی کاپٹر! یہ کس کا ہے اور کہاں جاتا ہے؟''

''کہیں نہیں جاتا۔'' وقار نے بتایا۔ ''یہ یہیں تک آتا ہے۔ تم سامنے جو ایک بڑا سا ٹیلا دیکھ رہے ہو نا، اس کے دوسری طرف ایک باقاعدہ ہیلی پیڈ بنا ہوا ہے۔ یہ ہیلی کاپٹر اسی پر اترتا ہے۔''

''اور کون آتا ہے اس میں؟''

وقار نے جس کا نام بتایا، وہ سن کر میں تو اچھل ہی پڑا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اسلم دُرّانی صاحب تو اس ملک کے ایک بہت اعلیٰ عہدے دار ہیں۔''

''ہاں اور میکارتے کے گہرے دوست بھی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ان ہی کی خصوصی اجازت سے میکارتے اور اس کی ٹیم کو اس علاقے میں مائننگ کی اجازت ملی ہے۔''

''لیکن کیوں؟ کیا یہ حکومت کو معلوم ہے؟''

''بالکل معلوم ہے۔ لیکن شاید یہ نہ معلوم ہو کہ یہاں سے نکلنے والی قیمتی دھات ان ہی اسلم دُرّانی صاحب کے ذریعے میکارتے کے ملک میں بھیج دی جائے گی۔''

''اور اسلم دُرّانی صاحب کو پیسے ملتے رہیں گے۔'' میں تلخ ہو کر بولا۔

''ہاں کروڑوں، اسلم دُرّانی صاحب یا ان جیسے دوسروں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کی دھرتی کی کوکھ خالی ہوتی جارہی ہے۔ انہیں صرف اس بات کی فکر ہے کہ ان کا بینک بیلنس خالی نہ ہو۔''

''کاش، میرے اختیار میں کچھ ہوتا۔'' میں نے دکھی دل سے کہا۔

''تم اپنے حصے کا کام کرتے رہو دوست، ان کو یقین دلا دو کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''حالانکہ ہو سکتا ہے کہ یہاں بہت کچھ ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بہت کچھ ہے یہاں، یہ سیاہ چٹانیں یہی بتا رہی ہیں۔''

''اب آؤ، میکارتے اور اسلم دُرّانی تمہارا انتظار کررہے ہوں گے۔ کیونکہ تم ہی بتاؤ گے کہ یہاں کیا امکانات ہیں۔''

''ایک بات تو بتاؤ، جب انہیں ابھی کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو پھر اتنی بھاری مشینری اور اتنے مزدور یہاں کیوں لگا دیے؟''

''کیونکہ یہ قوم کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتی۔'' وقار نے بتایا۔ ''یہاں سے کچھ فاصلے پر نمک کا بھی ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔ یہ لوگ نمک نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہاری رپورٹ کے بعد اصل کام شروع ہوگا۔ اب آؤ، ابھی تمہیں بہت کچھ معلوم ہونا اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

میرے قریب سے کام کرنے والے گزر رہے تھے، بڑی خاموشی کے ساتھ۔ میں نے ایک بات یہ محسوس کی کہ ان میں سے کسی مزدور کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ سپاٹ چہرہ۔ جیسے روبوٹ ہوں یا خوف زدہ ہوں۔

میں نے وقار سے پوچھا۔ ''یہ مزدور اتنے بجھے بجھے کیوں ہیں؟ بس کام کیے جارہے ہیں۔ کسی ولولے کے بغیر۔''

''اس کی وجہ میکارتے ہے اور کیوں ہے، یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

سامنے ہی وہ مکان تھا جہاں میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا تھا۔ اس طویل برآمدے کے آخر میں ایک بڑا سا کمرا تھا جو شاید ان کا میٹنگ روم تھا۔

وہ کمرا بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔

نرم قالین، مہنگے صوفے، اعلیٰ درجے کا دیگر فرنیچر۔ اس میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ان سبھوں کو میں جانتا پہچانتا تھا۔

ایک تو وہی شخص یا میکارتے تھا جس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نرم سی مسکراہٹ تھی اور دوسرا اسلم دُرّانی تھا جس کو سیکڑوں بار ٹی وی اسکرین پر وطن سے محبت کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

تیسرا شخص وہی بوڑھا تھا۔ لکڑیاں کاٹنے کی فرم کا مالک۔ بوڑھا باس اور اس کے برابر میں اس کی بیٹی وہی چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی ارم بیٹھی ہوئی تھی۔

ان سبھوں کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں اور میں جیسے بھک سا ہو کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ذہن میں خیالات سرسرا رہے تھے۔ سانپوں کی طرح پھنکاریں لے رہے تھے۔ میرے خدا ان آنکھوں کو اب اور کیا کیا دیکھنا تھا۔ کیسے کیسے حیرت انگیز واقعات اور مناظر سے گزرنا تھا۔

''آؤ ارسلان!'' شیخ کی آواز آئی۔ اس وقت وہ آواز کسی خدارسیدہ کی نہیں تھی۔ وہ ایک سانپ کی سرسراہٹ تھی۔ ذہن پر کوڑے مارتی ہوئی آواز۔

''تم کو ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی ہو گی، کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید۔''

''شاید کیوں؟''

''اس لیے کہ میں اب حیران ہونے کے مراحل سے گزر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔ تم کو یقیناً یہ سب دیکھ دیکھ کر اب بے حس ہو جانا چاہیے۔ دیکھو، یہ زندگی ہے۔ دریا کی موجوں کی طرح بہتی ہوئی۔ اگر یہ جامد ہو جائے تو زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔''

''مسٹر میکارتے اس نوجوان سے کام کی باتیں کریں۔'' اسلم درّانی نے کہا۔

''کیوں، آپ کو بہت جلدی ہے مسٹر اسلم درّانی۔'' میکارتے نے ہنس کر پوچھا۔

''میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم زیادہ دنوں تک حکومت اور آرمی کی نگاہوں سے اس علاقے کو چھپا نہیں سکتے۔ اتنی مشینری اور اتنے آدمی یہاں کام کر رہے ہیں وہ جواز بھی مانگ سکتے ہیں۔''

''جواز یہ ہے کہ ہم نمک تو نکال ہی رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب دوسری طرف بھی توجہ ہونی چاہیے۔''

''دیکھیں اسلم صاحب! ہم ہر کام پلاننگ سے کرتے ہیں۔'' میکارتے نے کہا۔ ''ہم نے ریک ڈیک کے منصوبے پر کتنی کامیابی سے عمل کیا۔ آپ کی حکومت اور عوام کو پتا بھی نہیں چل سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک ہے لیکن ....''

''سنتے جائیں مسٹر اسلم درّانی، خود آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ آپ اس منصوبے سے کتنا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن آج کی بات کریں۔''

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ ہمارے سروے کے مطابق اس علاقے میں نمک موجود تھا اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی پھر اس لڑکی نے بتایا کہ ان سیاہ چٹانوں کے نیچے بہت کچھ ہے۔''

''سر! اس لڑکی نے آپ کو ایک پاکستانی سمجھ کر بتایا تھا۔'' وقار بول پڑا۔

''ہاں۔'' میکارتے ہنس پڑا۔ ''اس بے چاری کو یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ تو میرا کیموفلاج ہے۔ شیخ کا روپ ... تو میں نے یہاں کے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بنا رکھا تھا۔''

میں اس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ کاش، میں اسے جہنم رسید کرسکتا۔

''اب دیکھو ہماری پلاننگ۔'' میکارتے نے پھر بولنا شروع کردیا۔ ''ہم نے اس علاقے سے نمک نکالنے کا ٹھیکا لے لیا۔ مسٹر اسلم درّانی، اس وقت بھی تم ہی کام آئے پھر ہمیں کان کنی کرنے والے مزدوروں کی ضرورت پڑی۔ اس وقت مسٹر شوکت علی ہمارے کام آئے۔'' اس کا اشارہ فرم کے بوڑھے باس کی طرف تھا۔ ''اگرچہ لکڑیاں کاٹنا ان کا کام تھا۔ ان کی فرم برسوں سے یہ کام کررہی ہے لیکن زیادہ کی خواہش کس کو نہیں ہوتی اور وہ بھی کروڑوں میں۔ ان کی مہربانی کہ انہوں نے ہماری آفر قبول کرلی۔''

''اور تم ان کے مزدوروں سے کام لینے لگے۔'' اسلم درّانی نے کہا۔

''ہاں، مسٹر شوکت علی نے دو قسم کے مزدور فراہم کیے۔ ایک وہ جو صرف مائننگ کے لیے ہائر کیے گئے اور دوسرے ....''

''مسٹر میکارتے۔'' اسلم درّانی نے اسے ٹوک دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آپ اس نوجوان سے بات کریں۔ اس کو اس کی ڈیوٹی سمجھا دیں۔''

''ہاں۔'' میکارتے نے میری طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تو تمہیں یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا بات کی تھی۔''

''ہاں، آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اپنی صلاحیتیں کسی ایسے ملک کے لیے استعمال کرنی چاہئیں جو ان کی قدر کرسکتا ہو۔''

''بالکل، تو وہ ملک تمہیں مل گیا ہے۔ یہ سمجھو کہ تم یہاں اس ملک کے نمائندے بن کر کام کرو گے۔ یہاں بیٹھے ہوئے تمہاری آئیڈنٹٹی بدل جائے گی۔ تمہارا پاسپورٹ کچھ اور ہوجائے گا۔ تم ایک طاقت ور ملک کے طاقت ور فرد

ہو گے۔ ہم تمہاری محنت کے ایک ایک لمحے کا اتنا معاوضہ دیں گے کہ تم یہاں سوچ بھی نہیں سکتے ۔''

''جی مسٹر میکارتے، بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو تمہاری تعلیم ہے۔ تمہارا ہنر ہے۔'' میکارتے نے کہا۔

''اور ہاں، جلد سے جلد اپنی رپورٹ بھی پیش کرو گے۔'' اسلم دُرانی نے کہا۔

''اس دوران میں تمہارے ڈاکومنٹس بھی تیار ہو جائیں گے۔'' میکارتے نے بتایا۔ ''اور ہاں۔'' اس نے باس کی بیٹی ارم کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم اس کو تو جانتے ہو گے؟''

''بہت اچھی طرح۔'' میں خشک لہجے میں بولا۔ ''یہ ہمارے باس کی بیٹی ہے۔''

''اور یہ تمہاری اسسٹنٹ کے طور پر تمہارے ساتھ رہے گی۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کسی انسان کے کتنے چہرے ہو سکتے ہیں۔

اس وقت دونوں طرح کے چہرے سامنے تھے۔

فرم کا بوڑھا باس اور اس کی بیٹی دونوں اسی ملک کے شہری تھے۔ اس کے باوجود ان کی وفاداریاں کسی اور ملک سے تھیں۔

میکارتے بظاہر ایک روحانی پیشوا تھا۔ لوگ اس کو شیخ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا احترام کرتے تھے لیکن وہ اندر سے کچھ اور تھا۔ اس نے لارنس آف عریبیہ کی یاد دلا دی تھی۔

اسلم دُرانی، ایک رہنما، ایک محب وطن لیڈر، لیکن کیا کردار تھا۔ اس کو صرف اپنے مفادات عزیز تھے۔ ملک کا چاہے جو بھی ہو۔

اور ایک وقار، جو بظاہر کسی اور ملک کا شہری بن چکا تھا لیکن اس کی محبت کی جڑیں پاکستان میں تھیں۔

کیسے کیسے کردار سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں وہاں سے ان کی مرضی کے خلاف کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا جو لوگ اتنے منظم ہوں اور اتنی پلاننگ سے کام کر رہے ہوں، انہوں نے کوئی دروازہ کھلا تو نہیں چھوڑا ہوگا۔

''کیا سوچنے لگے مسٹر ارسلان۔'' میکارتے کی آواز آئی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''سوچنا کیا ہے سر۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''جب میں نے انہیں سروس آفر کر دی ہے تو ہر حال میں کروں گا۔''

''شاباش۔'' میکارتے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''اب تم ہم میں سے ایک ہو۔ ہم تمہیں ایک نئی زندگی کی طرف خوش آمدید کہتے ہیں۔''

''شکریہ جناب۔''

''وقار۔'' اس نے وقار کو دیکھا۔

''جی جناب۔'' وقار ادب سے جھک کر بولا۔

''ہمارے نئے ممبر کو آج رات پارٹی میں لے جاؤ۔ تاکہ ارسلان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ ہم جس کو خود میں شامل کر لیتے ہیں، اس سے کچھ نہیں چھپاتے۔''

''ایسا ہی ہوگا سر۔''

''ارسلان! آج رات تم پارٹی میں رہو گے۔ کل صبح سے تمہارا کام شروع ہو جائے گا۔''

☆☆☆

میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس جنگل اس ویرانے میں کوئی ایسی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔

یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ دیواروں کے ساتھ آرام دہ کرسیاں تھیں۔ درمیان میں رقص کے لیے ایک ڈانس بنا ہوا تھا۔

فانوس روشن تھے۔ ان کے علاوہ مختلف رنگوں کی لیزر شعاعیں تھیں۔ موسیقی کا ایسا انتظام تھا کہ دیواروں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات کہ اس ہال میں جوان اور خوب صورت لڑکیاں اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھیں۔

یہ جگہ اسی جنگل میں بنائی گئی تھی۔

یہ پوری جگہ زمین دوز تھی اسی لیے اوپر سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ کئی سیڑھیاں اترنے کے بعد.... اس ہال میں پہنچا جا سکتا تھا۔

وقار مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے اس نے میرا ہاتھ دبا کر آہستہ سے بتایا تھا۔ ''ارسلان! یہ پوری جگہ بگڈ ہے۔ یہاں کی آوازیں باہر مانیٹر کی جاتی ہیں۔ اس لیے تم ایسی ویسی بات نہ کرنا بلکہ بہتر ہوگا کہ تم اس ملک کی تعریف کرتے رہنا جس نے یہ سارا جال بچھایا ہے اور اپنے ملک سے مایوسی کا اظہار کرتے رہنا۔''

''اور ہمیں اگر اپنی بات کرنی ہو تو؟'' میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ بھی بتادوں گا، بس اب خاموش رہنا۔''

سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ ہال تھا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ایک خوب صورت سا ماحول تھا۔ رقص و نغمہ سے بھرپور۔

ہر طرف ہنستے مسکراتے ہوئے چہرے۔ میں یہ سب دیکھ دیکھ کر دنگ ہوا جا رہا تھا۔ کیا تھا یہ سب۔ کیسے ممکن تھا کہ اس جنگل میں یہ سارا انتظام ایک دو دنوں میں ہو گیا ہو۔ یہ تو بہت طویل پلاننگ کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

اس ہال میں کچھ غیر ملکی بھی تھے اور کچھ جانے پہچانے چہرے بھی تھے۔ یہ چہرے ہمارے ملک کی مشہور ہستیوں کے تھے۔ بیوروکریٹس، سیاست داں، سول سوسائٹی کے کچھ لوگ۔

اس میکارتے نے اپنے جال کا دائرہ کہاں تک وسیع کر رکھا تھا۔

''ہاں تو مسٹر ارسلان! اب کیا خیال ہے تمہارا؟'' وقار نے پوچھا۔ اس وقت ہم دونوں ایک میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے وقار کی طرف دیکھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ دبا دی۔

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو وقار صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو پہلے ہی ڈھیر ہو چکا ہوں اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے خوامخواہ اپنی زندگی ملک اور قوم کی محبت میں گنوادی۔''

''چلو، کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔'' اس نے کہا۔

اس دوران ہم ایک میز کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک خوب صورت سی غیر ملکی لڑکی ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بہت اشتعال انگیز لباس پہن رکھا تھا۔

''ڈو یو نیڈ کمپنی۔'' اس لڑکی نے پوچھا۔

''تھینکس۔'' وقار نے جواب دیا۔

''اوکے۔'' لڑکی چلی گئی۔

میں نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وقار کی ہدایت یاد آ گئی کہ ہماری باتیں یہاں سے کہیں اور سنی جا رہی ہوں گی۔

''مسٹر ارسلان! اصل بات یہ ہے کہ آپ جتنی محنت کرتے ہیں، جتنا آپ کا ہنر ہے، جتنی آپ کی تعلیم ہے، اس کا ریوارڈ بھی ملنا چاہیے۔''

''بالکل، اگر ریوارڈ نہ ملے تو آدمی بددل ہو جاتا ہے۔''

''اسی لیے دیکھ لو کہ اپنے ملک کے ہنرمند اور تعلیم یافتہ لوگ موقع ملتے ہی یہاں سے چلے جاتے ہیں لیکن تم ایک خوش نصیب آدمی ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ اس لیے کہ موقع کی تلاش میں تمہیں کہیں جانا نہیں پڑا بلکہ موقع خود تمہیں تلاش کرتا ہوا تمہارے پاس آ گیا ہے۔''

''یہ تو ہے، آئی ایم لکی۔''

''یہ لوگ اگر کام لینا جانتے ہیں تو جو کام کا بندہ ہو، اس کے ناز بھی اٹھاتے ہیں۔'' وقار نے کہا۔ ''مثال کے طور پر تم اس ہال میں موجود جس لڑکی کی طرف اشارہ کرو وہ تمہارے پاس بھیج دی جائے گی۔''

''میں تو واقعی یہ سب دیکھ دیکھ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں۔''

ڈائس پر ایک لڑکی رقص کرنے لگی تھی۔ بالکل فلمی ماحول تھا۔ جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ اتنا انتظام تو شاید شہر میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔

''ارسلان! یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وقار نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ''نہ جانے کیوں اچانک گھبراہٹ سی ہونے لگی ہے۔''

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ ''چلیں، کچھ دیر باہر کی ہوائیں ہو کر آتے ہیں۔''

ہم ہال سے باہر آ گئے۔ اب ہم کھلی فضا میں تھے۔ یہاں آزادی سے بات ہو سکتی تھی۔

''وقار صاحب! خدا کے لیے بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ کھیل کب سے جاری ہے؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بہت دنوں سے۔'' وقار نے جواب دیا۔ ''چلو اس پتھر پر چل کے بیٹھتے ہیں۔ یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں سے ہم دیکھے تو جا سکتے ہیں لیکن ہماری آوازیں نہیں جا سکتیں۔''

ہم پتھر پر آ کر بیٹھ گئے۔

''ہاں وقار صاحب، بتائیں، کیا ہے یہ سب؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''یہ گھناؤنا کھیل بہت دنوں سے جاری ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ ہال ایک سال میں تعمیر ہوا ہے۔''

''اور حکام کو پتا نہیں چلا؟''

''حکام۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''کن حکام کی بات کر رہے ہو۔ کیا تمہیں یہاں حکام نظر نہیں آئے جو لڑکیوں کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔ بے دریغ شراب چڑھا رہے تھے۔''

"ہاں دیکھ لیا میں نے۔" میں نے دکھ سے کہا۔ "جب وطن کے محافظ ہی ایسے ہوں تو پھر کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"تم نے تو دیکھ لیا کہ میکارتے کیسا آدمی ہے۔ وہ مقامی زبان بھی جانتا ہے۔ عربی بھی جانتا ہے۔ باتوں میں قرآن اور احادیث کے حوالے بھی دیتا ہے۔ لوگ اس سے متاثر ہو کر اسے مرشد مان لیتے ہیں۔ میکارتے ان پر اپنی روحانی طاقت کا اثر ڈال کر انہیں فدائی بنا دیتا ہے۔"

"فدائی۔" میں چونک پڑا۔

"خود سوچو۔ بے چارے غریب لوگ جنہیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی، انہیں جب میکارتے کی روحانی طاقت اس ماحول میں لے آتی ہے تو وہ پاگل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر اور بھی کئی طریقے ہیں جن سے ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے اور وہ پوری طرح ٹرانس میں آجاتے ہیں اور فدائی بن جاتے ہیں۔"

"اور ان سے کام کیا لیا جاتا ہے؟"

"محب وطن لوگوں کے قتل کا۔" وقار نے انکشاف کیا۔ "تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمارے حکام، اور سیاست دانوں اور دیگر شعبوں میں سب ہی بک جانے والے لوگ ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے محب وطن بھی ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں نہیں ہوتے کہ اس ملک کے وسائل کہیں اور چلے جائیں۔ وہ راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور میکارتے ان ہی فدائی کے ذریعے ان پر حملہ کروا کے انہیں راستے سے ہٹا دیتا ہے۔"

"او خدا! اب سمجھا۔ تو یہ میکارتے حسن بن صباح بنا ہوا ہے۔"

"ہاں، بالکل وہی پیٹرن ہے۔ اس کی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ لوگ اس پر بھروسا کرنے لگتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے اس کی باتوں پر عمل کر جاتے ہیں۔"

"بہت ہی بھیانک کھیل ہے یہ تو۔"

"ہاں، بہت ہی بھیانک، ہمارے بہت سے قیمتی لوگ اس طرح ضائع ہو جاتے ہیں۔"

"کیا انہیں گرفتار نہیں کیا جاسکا؟"

"گرفتار ہوتے ہی وہ اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ خودکشی کر لیتے ہیں۔" وقار نے بتایا۔ "ان کے منہ کے اندر ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی اس طرح لگا دی جاتی ہے کہ جب تک اسے دانتوں سے کچلا نہ جائے وہ نہیں پھٹتی۔ اور وہ باہر سے نظر بھی نہیں آتی۔"

"اب سمجھا۔ تو وہ نیلی موت۔ میں نے خود دو آدمیوں کو اس طرح مرتے دیکھا ہے۔"

''ہاں، وہ اس طرح مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ضروری لوگوں کو اس طرف آنے سے روکنے کے لیے جنگل میں طاقت ور اسپیکرز لگائے گئے ہیں جہاں سے بھیانک آوازیں نشر ہوتی رہتی ہیں۔''

''اوہ، اب یہ بات سامنے بھی آگئی۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''تو جنگل کی آوازوں کی کہانی یہ ہے۔''

''ہاں، ان کم بختوں نے نہ جانے کیا کیا کر رکھا ہے۔''

''اور وہ ہمارے فرم کے باس کا کیا کردار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت گھناؤنا، وہ برسوں سے اس جنگل میں یہ کام کر رہا تھا۔ یعنی لکڑیوں کا کام پھر کسی طرح میکارتے سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ ایک تو میکارتے کی باتیں پھر انسان کی ہوس، وہ کہاں ختم ہوتی ہے۔ وہ فروخت ہوگیا۔ بک گیا۔ اس کی فرم کی وجہ سے مزدور آجاتے ہیں۔ اور ان میں سے چند کو اغوا کر کے کان کنی کے کاموں پر لگا دیا جاتا ہے۔''

''اور... یہ سب کچھ ..... اس ملک کے وسائل پر قبضے کے لیے ہو رہا ہے۔''

''ظاہر ہے، دیکھو۔ اس ملک کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ باقاعدہ کسی ملک پر حملہ کر کے اس کے وسائل پر قبضہ رکھے۔ لیکن اس قسم کے فوجی معاملات میں بہت بدنامی ہوتی ہے اور دوسرا طریقہ ہے اس قسم کی سازشیں۔ لہٰذا وہ ہمارے لیے سازشیں کر رہا ہے اور ہم اس کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں۔''

اب پوری تصویر واضح ہوگئی تھی۔

پتا چل گیا تھا کہ ہمارے یہاں وسائل کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھا پاتے۔ ایک تو سازشیں پھر ہمارے اپنے لوگ۔

''وقار! اب ایک بات اور۔ ویسے تو سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ یہ ہے کہ وسائل کے لیے اپنی توجہ ریگستانی علاقوں میں دینی چاہیے۔ جیسے ریک ڈیک کا منصوبہ وغیرہ۔ پھر یہ اس طرف کیسے آگئے؟ انہیں کیسے پتا چلا کہ ان جنگلوں میں بھی ایسے وسائل ہیں؟''

''یہ بھی بہت عجب کہانی ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''اب سے چند سال پہلے کچھ لڑکیوں کا ایک گروپ اس علاقے میں سیر کے لیے آیا تھا۔ وہ سب یونیورسٹی کی لڑکیاں تھیں۔ مختلف ڈپارٹمنٹ کی۔ ان میں سے ایک لڑکی جیالوجی کی بھی تھی۔ اس نے ان پہاڑیوں کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ ان میں بے پناہ خزانے موجود ہیں۔ اگر تفصیل سے سروے کیا جائے تو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اتفاق سے ان ہی لڑکیوں میں ایک ایسی لڑکی بھی تھی جس کا باپ ایک غدار وطن قسم کا بیوروکریٹ تھا۔ اس نے یہ بات اپنے باپ کو جا کر بتا دی۔ باپ کو تو اس ملک سے اپنی وفاداری کرنی تھی جس ملک نے یہ ساری سازشیں تیار کی ہیں تو اس بیوروکریٹ نے یہ بات اس ملک کے کچھ عہدے داروں کو بتا دی۔ انہوں نے فوراً میکارتے کو روانہ کر دیا۔ جسے خاص طور پر جنوبی ایشیا ہی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس نے آتے ہی یہاں کا چارج سنبھال لیا اور اس جیالوجسٹ لڑکی کو اغوا کرا لیا جس نے یہ انکشاف کیا تھا۔''

میں ایک سناٹے کے عالم میں وقار کی باتیں سن رہا تھا۔

''پھر یہ ہوا کہ اس لڑکی نے میکارتے کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ سروے کر کے بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ پھر اس بے چاری پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ ذہنی مریض ہوگئی اور اسے ایک طرف ڈال دیا گیا کیونکہ وہ اب ان کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ شکر ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔''

''وقار!'' میری آواز کانپنے لگی۔ ''اس کا، اس کا نام کیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو؟''

''ہاں جانتا ہوں میں۔ اس کا نام اسما ہے۔'' وقار نے بتایا۔

☆☆☆

میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

یہ وہی اسما تھی، میری محبت۔ میں نے جس کے ساتھ مل کر زندگی کو خوب صورت بنانے کے خواب دیکھے تھے جو ایک ذہین جیالوجسٹ تھی۔ جو مٹی اور پتھروں کو پہچاننا جانتی تھی۔ جس کے دل کی دھڑکنیں اس ملک کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ تھیں۔

وہ اس وقت میرے ساتھ تھی۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے کے اتنے برسوں کے بعد میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت ہوا کرتی تھی۔ بہت حسین۔ لیکن اب اس کو ایسا کر دیا گیا تھا جیسے ذہنی اسپتال میں رہنے والے مریض ہوتے ہیں۔ الجھے ہوئے بال وحشت زدہ آنکھیں۔

وقار نے جس وقت مجھے نام بتایا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدا کے لیے وقار! تم مجھے اس لڑکی تک پہنچا دو۔ وہ میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد میں تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ مل کر مٹی اور پتھروں کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔''

''اوخدا۔'' وقار نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ کیسا تماشا ہے۔ وہ بدقسمت لڑکی شاید اب تک تمہارے ہی انتظار میں

زندہ ہو، میں تمہیں اس تک لے چلتا ہوں۔“

”ابھی لے چلو، پلیز، میں اب رہ نہیں سکتا۔“ میری بے قراری اور اشتعال عروج پر تھا۔

”آؤ، وہ یہیں ہے۔ وہ چونکہ ایک جگہ خاموش بیٹھی رہتی ہے اس لیے اس پر کوئی پابندی بھی نہیں لگائی گئی ہے۔“

ہم وہاں سے چل دیے۔ اندھیرے میں ایک طرف۔ جس طرف نمک کی کانیں تھیں۔ میرے قدم بہت بے تابی سے آگے اٹھ رہے تھے۔

یہاں آنے کے بعد کیسے کیسے تماشے ہو رہے تھے۔ کیا کیا سننے کو مل رہا تھا۔

ہم کچھ دور آگے بڑھے تھے کہ کوئی ہمارے سامنے آگیا۔ ”اوہ ارسلان! میں تو کتنی دیر سے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔“

وہ وہی تھی۔ بوڑھے باس کی چندے آفتاب چندے مہتاب بیٹی۔ اس کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

”منافق۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پکڑ لی۔ ”میں تجھے جان سے ماردوں گا۔“

”ارے، کیا کر رہے ہو؟“ وقار نے مجھے پکڑ لیا۔ ”چھوڑ دو اس کو۔“

”وقار! تم نہیں جانتے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔“

”ارسلان! میں تو جانتا ہوں لیکن تم نہیں جانتے کہ یہ کیسی محب وطن ہے۔“ وقار نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے ارم کی گردن چھوڑ دی۔

”یہ اپنے باپ کے بالکل برعکس ہے۔ میں سیلوٹ کرتا ہوں اس لڑکی کو۔ یہاں کے بارے میں ساری معلومات اسی نے فراہم کی ہیں۔“

”ارم! پلیز، معاف کردو مجھے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ارم نے کہا۔ ”شیطان کے گھر ولی بھی تو پیدا ہو سکتا ہے نا۔“

”ارم! کیا تم جانتی ہو کہ جو لڑکی ہماری قید میں ہے اسما، وہ ارسلان کی محبت ہے۔“

”کیا؟“ اس دفعہ ارم حیران رہ گئی۔

”ہاں ارم، ہم ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔“ میں نے بتایا۔ ”پھر وہ اچانک غائب ہوگئی۔“

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کو یہاں سے لے جاؤ۔“

”چلو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم اسی کے پاس جا رہے ہیں۔“

تو اس طرح میں اتنے دنوں کے بعد اسما کو دیکھ رہا تھا۔

بس ایک لمحے کے لیے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی پھر بجھ کر رہ گئی۔

”ارسلان! اگر اس کا علاج کیا جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ وقار نے کہا۔ ”تم اس کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

”لیکن کیسے جاؤں؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہوں۔“

”ارم، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

”نہیں، ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔“ ارم نے کہا۔

”کون سا کام؟“

”وہ کام یہ ہے کہ مجھے اپنے ملک اور اپنے باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے اپنے وطن کا انتخاب کرلیا ہے۔ اب میں اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو ٹھکانے لگاؤں گی۔“

میں اس لڑکی کو ستائشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”ارسلان! تم سے ایک درخواست ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

یہاں سے جانے کے بعد فوج کے افسران سے مل کر انہیں اس سازش سے آگاہ کر دینا۔ اس ملک میں کم از کم ایک ادارہ تو ایسا ہے جس پر ہم بھروسا کر سکتے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“

”تو پھر جاؤ۔ تم لوگوں کا اللہ نگہبان ہو۔“ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

میں اس نیم پاگل سی اسما کو لے کر وقار کے ساتھ باہر آیا تو۔۔ اچانک سامنے سے میکارتے کسی طرف جاتا ہوا دکھائی دے گیا۔

”وقار! کیا تمہارے پاس پستول ہے؟“

”ہاں ہے۔“

”مجھے دے دو پلیز، میں اس کم بخت کو گولی مارنا چاہتا ہوں۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرا میکارتے آجائے گا۔“

”میں جانتا ہوں کہ دوسرا میکارتے آجائے گا لیکن اس دوران میں ہماری ملٹری کچھ نہ کچھ کر ہی لے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اس سے اپنی اسما پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا چاہتا ہوں، پلیز۔“

وقار نے اپنا پستول میرے حوالے کر دیا اور میں نے ساری گولیاں میکارتے پر اتار دیں۔ ایک بہت بڑا باب بند ہوگیا۔

لذتِ آزار

مریم کے خان

زندگی سمندر کے ایک جزیرے کے مانند ہے... ایک ایسا جزیرہ جس کی چٹانیں امیدیں ہیں... جس کے خواب درخت... پھول... تنہائی اور دریا تشنگی ہیں... تنہائی کی ٹیسیں اور آرزو کا دکھ زندگی کو دربدر کر دیتا ہے... خوابوں اور خواہشوں کے اَن گنت دیے دل میں جگائے... آزاد فضائوں کی متوالی لڑکی کی کٹیلی کہانی۔ ایک حادثے نے اس کے ذہن و دل... اور معصوم خواہشوں کو روند ڈالا... اور وہ ایسے راستے کا انتخاب کر بیٹھی... جس میں تشنگی اور سراب کے جزیرے تھے... وہ سیراب ہونا چاہتی تھی... مگر روح پیاسی ہی رہی... اسی تشنہ کامی اور لذتِ آزار نے اسے پھر ایک حادثے سے دوچار کر ڈالا...

لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی لڑکی کے پرفریب چہرے... ہر چہرے کے پیچھے ایک نیا چہرہ چھپا تھا

''سبینا کہاں ہے؟''

ماں نے پوچھا۔ وہ چھت پر سرما کی نرم دھوپ میں چارپائی پر لیٹی آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک پرندہ ہوتی اور اسی طرح آزادی سے اڑتی پھرتی، اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہوتا۔ گھر سے نکلنا تو دور کی بات تھی، وہ چند لمحوں کے لیے گھر والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتی تو اس کے نام کی آوازیں

آنا شروع ہو جاتی تھیں۔ وہ سوچتی کہ خدا نے اسے انسان کیوں بنایا اور بنایا تھا تو لڑکی ہی کیوں بنایا۔ بارہ سال کی عمر تک پھر بھی سکون تھا۔ اتنی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ باہر بھی چلی جاتی تھی اور محلے کی لڑکیوں کے ساتھ کھیل بھی لیتی تھی مگر اِدھر وہ بارہ سال کی ہوئی اور اُدھر جیسے قیامت آ گئی۔ روک ٹوک، احکامات اور نگرانی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

شکل صورت کی وہ شروع سے اچھی تھی۔ بچی تھی تو جو دیکھتا پیار کیے بغیر نہ رہتا۔ بعض بچی سمجھ کر پیار کرتے تو بعض اس میں مستقبل کی جوان لڑکی تلاش کرتے تھے۔ سمجھ اور شعور نہ ہونے کے باوجود اسے ایسے پیار سے الجھن ہوتی تھی اور وہ ان لوگوں سے دور بھاگتی تھی۔ پھر پابندیاں لگنے لگیں تو ایسے لوگوں سے از خود نجات مل گئی۔ مگر اب یہ پابندیاں اس کی جان کو آ گئی تھیں۔ وہ آزاد رہنا چاہتی تھی اور یہاں زنجیریں اس کے قدموں میں مستقل ڈالی جا رہی تھیں۔

وہ سوچتی کہ ماں نے اس سے بڑی بہنوں کو تو کبھی یوں دوپٹے اور ڈھک چھپ کر رہنے کا پابند نہیں کیا پھر اس کی کم بختی کیوں آئی رہتی ہے۔ اس سے کیا قصور ہوا تھا بارہ سال کی ہو کر۔ اس نے بھی خود پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ بارہویں سال میں قدم رکھتے ہی وہ کس طرح بدلنے لگی تھی۔ ماں نے بے شمار حکم دینے شروع کر دیے تھے۔ یوں چلا کر، یوں اٹھا اور بیٹھا کر اور ایسے ڈھک چھپ کر رہا کر مگر اسے وجوہات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس پر مستزاد کہ اسے ہمہ وقت گھر میں کسی نہ کسی کی نظروں میں رہنا بھی لازمی تھا۔ جیسے گھر والوں کو خطرہ ہو کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی۔

اس کا تعلق ایک متوسط.... گھرانے سے تھا۔ یہ گھر ایک چھوٹے شہر میں تھا۔ جہاں شہروں والی سہولتیں تو تھیں مگر ماحول گاؤں دیہات والا تھا۔ لوگوں کی ذہنیت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کا باپ ایک چھوٹے درجے کا آڑھتی تھا۔ اس کی شہر کی منڈی میں دکان تھی۔ اپنا مکان تھا جس کا کچھ حصہ پکا تھا اور کچھ حصہ کچا تھا۔ اس مکان میں وہ اپنے ماں باپ اور نصف درجن بہن بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور اس کا نمبر تقریباً آخری تھا۔ تقریباً یوں کہ اس سے چھوٹا بھائی اس سے صرف دس منٹ چھوٹا تھا اور وہ اس کا جڑواں تھا۔ اس سے بڑی دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ بھائی خاصے بڑے تھے اور کم عمری میں باپ کے ساتھ منڈی میں کام کرنے لگے تھے۔ تعلیم کا خیال بس اتنا تھا کہ جس نے جتنا پڑھنا چاہا، پڑھ لیا۔ اس کی دونوں بہنوں نے اسکول میں ہی تعلیم چھوڑ دی تھی۔ دونوں بڑے بھائیوں نے بہ مشکل میٹرک کیا۔ البتہ اسے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے نہیں کہ اسے پڑھنا اچھا لگتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اسکول کے بہانے سہی باہر تو نکلتی تھی۔

چودہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک کر لیا تھا اور اب وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر ماں راضی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں اس نے جتنا پڑھ لیا تھا، اس کے لیے کافی تھا۔ باپ کو اعتراض نہیں تھا۔ اس نے یہ شعبہ بیوی پر چھوڑ رکھا تھا اور وہ ماں کو منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے وہ ان دنوں اس کی ایک آواز پر لبیک کہتی تھی اور بھاگ بھاگ کر اس کے کام بھی کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ماں کی آواز پر تیزی سے نیچے آئی۔ ”ہاں اماں؟“

”کہاں تھی؟“

”اوپر دھوپ سینک رہی تھی۔“

”تیرے کون سے جوڑوں میں درد ہے جو دھوپ سینک رہی تھی۔“ ماں نے جھڑک کر کہا۔ ”چل آٹا گوندھ دے، شام کو گوندھے گی تو روٹی ٹھیک سے نہیں پکے گی۔“

آٹا گوندھنے سے اس کی جان جاتی تھی مگر ماں کا حکم تھا اور اسے پورا کرنا ہی تھا۔ ماں نزدیک ہی شام کے سالن کے لیے چنے نکال رہی تھی۔ اس نے آٹا گوندتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”اماں وہ آگے پڑھنے کا تو بتایا نہیں۔“

”چھوڑ کیا کرے گی آگے پڑھ کر یہاں کس لڑکی نے اتنا پڑھا ہے۔“

”اماں مجھے اچھا لگتا ہے اور پھر دو سال کی تو بات ہے۔“

”میں سوچ رہی ہوں تیری شادی کر دوں۔“ اماں نے پہلی بار اس کی شادی کی بات کی تو اس کا دل دھڑک اٹھا اور اس نے خوش ہو کر کہا۔

”سچ اماں۔“

ماں نے اسے گھورا۔ ”تجھے کس بات کی اتنی خوشی ہو رہی ہے۔“

اس کے نزدیک شادی بھی آزادی اور خوشی کا دوسرا نام تھا۔ ماں کے گھورنے پر اس نے منہ بسور کر کہا۔

”کسی طرح خوش ہونے نہیں دیتی ہو۔“

”میرا بس چلے تو تجھے کل دفع کر دوں۔“ ماں نے چڑ کر کہا۔ ”پر ابھی تیری دو بڑی بہنیں بیٹھی ہیں۔“

”تب مجھے پڑھنے دو۔“

پتا نہیں اس وقت ماں کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ

مان گئی اور سبینا خوشی سے اچھل پڑی۔ وہ جس اسکول میں پڑھ رہی تھی اس میں ایف اے کی کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ یوں تعلیم پھر سے شروع ہوگئی۔ یہاں لڑکیاں بڑی تھیں اور اکثر تو اس سے خاصی بڑی تھیں۔ وہ جوانی اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں خاصی سے بھی زیادہ جہاندیدہ تھیں اور یہاں آکر سبینا کو بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ پہلی بار اسے صنفِ کرخت سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اسکول لڑکیوں کا تھا اس لیے یہاں کسی لڑکے کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹیچرز اور دوسرا اسٹاف بھی خواتین پر مشتمل تھا۔ پورے اسکول میں دو مرد تھے۔ ایک مالی جو نام نہاد باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا اور عملاً چھٹی کرتا تھا۔ دوسرا چوکیدار جو اتنا بوڑھا تھا کہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتا تھا اسکول کی حفاظت کہاں سے کرتا؟

اسکول میں اسے پتا چلا کہ وہ خوب صورت تھی اور اپنی ساتھی لڑکیوں سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ اس پر رشک کرتی تھیں اور جب بات ہوتی تو اسے کہتیں کہ اس کا شوہر خوش نصیب ہوگا جسے اس جیسی حسین لڑکی ملے گی اور یہ بھی کہتیں کہ وہ کسی شہزادے کے لائق تھی۔ جب اس قسم کی باتیں اس کے ذہن میں پڑنے لگیں تو خود بہ خود اس کا ذہن بنا چلا گیا اور وہ اس شہزادے کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کے لیے آئے گا اور اسے اپنے محل، اپنی سلطنت میں لے جائے گا۔ اسے بہت پیار و محبت، عیش و آرام سے رکھے گا۔ پھر اس کی زندگی میں شہزادہ آگیا مگر وہ مالی کے روپ میں آیا تھا۔ پرانے مالی کو مسلسل غیر حاضری پر نوکری سے نکال دیا گیا اور اس کی جگہ دوسرا مالی آگیا تھا۔ یہ جوان اور خوش شکل نوجوان تھا۔ لمبا قد، چھریرا جسم، فلمی ہیرو جیسے نقوش، اس کے لائٹ براؤن بال بھی ہیرو کی طرح لمبے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آتے ہی لڑکیوں میں مقبول ہوگیا۔ لڑکیاں جو پہلے جنوری کی دھوپ میں بھی بہ مشکل باہر نکلا کرتی تھیں۔ اب مئی کے مہینے میں باغ میں منڈلانے لگیں۔

اختر لڑکیوں کی طرف کم توجہ دیتا تھا شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں لائق توجہ لڑکیاں بہت کم تھیں مگر جب اس نے سبینا کو دیکھا تو پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ سبینا نے اس کی توجہ محسوس کرلی تھی اور وہ خوش تھی۔ بے شک وہ اصل میں شہزادہ نہ سہی لیکن دیکھنے میں تو شہزادہ ہی لگتا تھا۔ دونوں ایک ہی جگہ ہوتے تھے اس لیے رابطے میں دیر نہیں لگی۔ پھر سبینا کو پتا چلا کہ اختر اسے پسند کرتا ہے تو وہ جیسے اس کی دیوانی ہوگئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس پر نچھاور ہوجائے۔ مگر ساتھ ہی اسے گھر والوں کا بھی خوف تھا اس لیے رازداری سے کام لیا۔ پہلے انہوں نے خط کو رابطے کا ذریعہ بنایا اور یہ کام سبینا اتنی ہوشیاری سے کرتی تھی کہ اس کی ساتھی لڑکیوں کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔

اس کے باوجود یہ بات زیادہ دن چھپی نہ رہی اور اسکول میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اختر اور سبینا میں چکر چل رہا ہے۔ لڑکیاں سبینا سے پوچھتی تھیں مگر وہ بہت چالاکی سے انہیں ٹال جاتی۔ اس وقت وہ انٹر کے دوسرے سال میں تھی۔ پیپرز قریب تھے جب اس کی تنہائی میں اختر سے اولین ملاقات ہوئی۔ اختر نے اسے ملاقات کے لیے اسکول کے عقب میں واقع سامان رکھنے والی کوٹھری میں بلایا تھا۔ یہ جگہ اس کی تحویل میں تھی۔ اس ملاقات میں اسے پہلی بار عملی محبت کا علم ہوا اور اختر کے نامکمل قرب نے اسے مدہوش کردیا۔ اختر حد سے نہیں گزرا تھا اگر وہ ایسا کرتا تب بھی سبینا اسے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں وہ گریز کرتا رہا۔ اسے اس راہ کے اسرار و رموز کا زیادہ علم نہیں تھا، کم سے کم عملی تجربہ نہیں تھا اس کے باوجود اس کے اندر ایک پیاس سی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اور جاننا اور حاصل کرنا چاہتی تھی۔

جب اختر نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے تو وہ معمولی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ تیار ہوگئی۔ گھر اور گھر والوں سے اسے ویسے ہی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سینٹر برابر والے قصبے کے اسکول میں پڑا تھا اور وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پیپرز دینے جاتی۔ اس کے اور اختر کے درمیان طے ہوا کہ جس دن اس کا آخری پیپر ہوگا، اسی دن وہ اس کے ساتھ وہاں سے نکل جائے گی۔ اسے اختر کے پس منظر کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ وہ اسے لے کر کہاں جائے گا۔ محبت ایک لڑکی کو جس حد تک اندھا کر سکتی ہے، چالاک سبینا اس سے زیادہ اندھی ہوچکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اختر ہی اس کے خوابوں کا اصل شہزادہ ہے۔

وہ پیپر دینے اسکول آئی تو اتفاق سے تمام ٹیچرز بھی ساتھ تھیں اور وہ گروپ سے الگ نہ ہوسکی۔ مجبوراً اسے پیپر دینے اسکول میں جانا پڑا۔ اختر باہر دیکھتا رہ گیا۔ جب وہ پیپر دے کر باہر آئی تب اسے موقع ملا اور وہ وین میں سوار ہونے کے بجائے اختر کے پاس چلی آئی جو ایک ٹیکسی لیے اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے لے کر فوراً روانہ ہوگیا۔ کئی گھنٹے بعد ٹیکسی ایک بڑے شہر میں رکی اور اختر اسے لے کر وہاں اتر گیا۔ وہ ایک بازار میں اترے تھے اور یہاں سے انہوں نے ایک رکشا لیا اور دوبارہ روانہ ہوئے۔ سبینا تھک

گئی تھی مگر پہلی بار اس کے اندر خدشہ سا آیا تھا اور اس نے راستے میں کئی بار پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں مگر اختر نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ جب رکشا ایک بڑی سی کوٹھی کے سامنے رکا تو سینا نے پوچھا۔ ''یہاں کیوں لائے ہو؟''

''یہاں میرا ایک دوست مالی ہے ہم کچھ دن اس کے پاس رہیں گے پھر اپنا بندوبست کرلیں گے۔'' اختر نے کہا اور رکشے والے کو رخصت کرکے اس نے سینا کو باہر ہی چھوڑا اور کوٹھی میں چلا گیا۔ وہ ہراساں سی کھڑی رہ گئی۔ سفید چادر تلے وہ اسکول کے یونیفارم میں تھی اور اس کا بیگ اس کے شانے سے لٹک رہا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر دو عدد خوفناک گارڈ تھے۔ اختر اندر جاتے ہوئے ان سے کچھ کہہ گیا تھا اور ایک گارڈ نے اسے چھتری تلے رکھی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی مگر وہ کھڑی رہی۔ اختر تقریباً بیس منٹ بعد آیا اور اسے اندر لے گیا۔ وہ اسے سرونٹ کوارٹرز والے حصے میں ایک کوارٹر میں لایا۔ یہ ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ ''یہ میرے دوست کا کوارٹر ہے۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو میں کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔''

''مجھے پیاس لگی ہے۔''

اختر نے اسے پانی لاکر دیا اور کچھ دیر بعد وہ کہیں سے کھانا لے آیا۔ سالن اور روٹیاں گزشتہ رات کی لگ رہی تھیں۔ مگر کھانا مزے کا تھا اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے اس نے بھوک سے زیادہ کھالیا اور اس کے بعد اسے نیند آنے لگی تو اس نے اسے خمار سمجھا تھا۔ اختر نے اس کی آنکھوں میں ڈورے دیکھے تو اسے سونے کا کہا اور جب وہ چارپائی پر لیٹ گئی تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ سینا سوچتی رہ گئی کہ دروازہ اندر سے بند کرلے اور سوگئی۔ نیند اتنی گہری تھی کہ اسے کچھ یاد نہیں رہا اور جب وہ جاگی تو وہ اس معمولی سے کوارٹر میں نہیں تھی بلکہ ایک عالی شان حد تک سجے کمرے میں نرم و ملائم بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ کوارٹر میں گرمی تھی مگر یہاں اے سی کی خنکی تھی۔ سوائے جگہ بدلنے کے اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، کسی نے اسے نہیں چھیڑا تھا۔ وہ حیران ہوکر سوچ رہی تھی کہ یہاں کیسے آئی کہ دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت عورت اندر آئی۔ اس نے نرم لہجے میں سینا سے پوچھا۔

''کیسی ہو تم؟''

''میں... ٹھیک ہوں لیکن یہاں...''

''تم اپنے مقام پر ہو۔ وہ جگہ تمہارے قابل نہیں تھی۔ اس لیے تمہیں یہاں بلوالیا تم سو رہی تھیں۔''

''اور اختر جو میرے ساتھ...'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہنا چاہا مگر عورت نے اشارے سے اسے روک دیا

''میرا خیال ہے تمہیں پیاس لگی ہے۔'' عورت نے کہا اور پھر شفاف گلاس میں ٹھنڈا پانی نکال کر دیا۔ سینا کو پیاس لگ رہی تھی، اس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ اس نے پھر اختر کا پوچھا۔

''اختر کہاں ہے؟''

''وہ بھی تمہارے قابل نہیں تھا۔ اب وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ کبھی نہیں آئے گا اور تم یہاں سے کبھی نہیں جاؤ گی۔''

سینا بچی نہیں تھی، اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دھوکا کھا گئی ہے۔ اختر اسے گھر سے نکال لایا اور یہاں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ یقیناً اس کی منزل یہی تھی۔ وہ اسے شروع سے یہاں لانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے اسے محبت کا دھوکا دیا۔ تبھی اس نے اسکول کی کوٹھری میں تنہائی اور اس کی خود سپردگی کا فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ اس کے دام کھرے کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً کنواری لڑکی کے دام کہیں زیادہ ملتے۔ جیسے جیسے وہ اختر کے بارے میں سوچ رہی تھی، اس کے اندر موجود محبت غائب ہو رہی تھی اور اس کی جگہ نفرت بھر رہی تھی۔ اسے اس جگہ اور عورت کا خیال بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے آگ میں جلنے لگی تھی۔ پھر وہ عورت کی آواز پر چونکی، وہ کہہ رہی تھی۔ ''اب تم اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔''

عورت نے بہت نرمی اور اخلاق سے اسے سمجھایا کہ یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور وہ اس کمرے میں جو آسائشیں دیکھ رہی ہے یہ کچھ بھی نہیں ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ عیش و آرام سے رہ سکتی ہے لیکن ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور اسے بھی وہ قیمت دینا ہوگی۔ عورت نے اسے چند دن سوچنے کی مہلت بھی دی کہ وہ یہاں آرام سے رہے اور خوب سوچے۔ ان چند دنوں میں اس نے خوب سوچا مگر کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ بالآخر اسے وہی فیصلہ کرنا پڑا جو عورت نے اسے کرنے کو کہا تھا۔ البتہ اس نے ایک بات سوچ لی کہ جب اسے بکنا ہے تو وہ قیمت اپنی مرضی کی وصول کرے۔ وہ مذہبی سوچ نہیں رکھتی تھی۔ ماں کے دباؤ پر روزے نماز کی پابندی کرلیتی تھی۔ مگر جب اس نے فیصلہ کرلیا تو اس جگہ کی مالکہ کو اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔

''جوہری ہیرا خرید کر کیا کرتا ہے کہ اسے آگے زیادہ قیمت مل سکے؟''

مالکہ خوش ہوئی۔ ''وہ اسے تراشتا ہے، پہلے سے زیادہ خوبصورت کرتا ہے اور پھر فروخت کے لیے پیش کرتا ہے۔''

''کیا میں تراشیدہ ہوں۔''

مالکہ نے اسے غور سے دیکھا اور زیرِ لب بولی۔ ''تجھ جیسی ایک دو ہی آتی ہیں۔''

☆☆☆

وہ غضب کی حسین عورت تھی۔ تیکھی کھنچی ہوئی کمان تلے، آئی میک اپ سے آراستہ غلافی آنکھیں، سرخ ہونٹ ...... جیسے دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ لائٹ براؤن ریشمی بال کو کسی بہت اعلیٰ درجے کے ہیر اسٹائلسٹ نے جوڑے کی صورت دی تھی۔ قدرتی رنگت یقیناً گلابی تھی مگر سلیقے سے لگے بلش آن نے اسے دہکا دیا تھا۔ رخساروں سے یہ دہکا رنگ صراحی دار گردن تک آتے آتے کسی قدر سرد ہو گیا تھا مگر اس سے نیچے آتے ہی اس کی آتش فشانی کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ اس نے ہلکے عنابی رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ ساڑی کا بارڈر اور بلاؤز سیاہ رنگ کا تھا۔ یہ جہاں اس کے گلابی رنگ سے مل رہا تھا وہاں اسے اور نمایاں کر رہا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب عورت کا حسن اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ یقیناً اس نے اس عروج کو حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

وہ جتنی حسین تھی، اس سے زیادہ نظر آنے کے گُر جانتی تھی اور اس وقت ایک شاہانہ صوفے پر یوں تن کر بیٹھی تھی کہ کسی ماہرِ فن سنگ تراش کا تراشا ہوا مجسمہ لگ رہی تھی۔ مگر اس کے سامنے کھڑے اس خوبرو مرد کی جرأت نہیں تھی کہ نظر اٹھا کر اسے دیکھ ہی لے۔ مرد تقریباً چالیس کے آس پاس تھا۔ سنہری مائل براؤن بال، مضبوط مردانہ نقوش جو بیک وقت سخت بھی تھے اور خوشرو بھی۔ ہونٹوں کے گوشوں سے جھکی مونچھیں اسے مزید وجیہہ بنا رہی تھیں۔ صرف اس کا مؤدب انداز بتا رہا تھا کہ وہ خادم ہے۔ ورنہ وہ عورت سے کسی طرح کم نہیں لگ رہا تھا۔ عورت نے اس کی طرف دیکھا۔ ''شاہ نواز تم سمجھ گئے ہو کہ کیا کرنا ہے؟''

مرد طویل قامت تھا اس لیے جب جھکا تب بھی اس کی قامت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ''خادم آنکھ کا اشارہ سمجھتا ہے، یہ تو آپ نے زبان سے فرمایا ہے، اسے کیسے بھول سکتا ہوں؟''

عورت کھڑی ہوئی اور متوالی چال چلتی ہوئی ایک دروازے میں غائب ہو گئی۔ اس دروازے کے دوسری طرف اس علاقے کا سب سے طاقتور جاگیردار میاں شوکت علی سلطان موجود تھا۔ تقریباً ساٹھ برس کا میاں شوکت اپنے پورے روایتی کاسٹیوم میں تھا جس میں تقریباً سترہ گز کپڑے سے بنی پگ بھی تھی مگر آج اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے لباس ہو گیا ہے۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا اور ڈوبتے لہجے میں بولا۔ ''رخسانہ تم واپس آؤ گی نا؟''

عورت اس کے پاس آئی اور اپنا شاخ سا بازو اوپر کر کے نازک گلابی ہتھیلی اس کے رخسار تک لائی۔ ''تم جانتے ہو شوکت، میرے لیے دنیا تم سے شروع ہو کر تم پر ختم ہو جاتی ہے۔ تم سے بچھڑ کر رخسانہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک آدمی مل سکتا ہے۔'' میاں شوکت کے لہجے میں حسد نہیں بلکہ خدشہ تھا۔ ''یہ تو مجھے کہنا چاہیے کہ میں تمہاری بغیر ادھورا ہوں۔''

شوکت علی کے منہ سے کسی عورت کے لیے یہ الفاظ کسی صورت نہیں نکل سکتے تھے۔ رخسانہ اس کی پہلی بیوی نہیں تھی۔ اولاد کی خاطر اس نے پہلے بھی تین شادیاں کی تھیں۔ ان میں سے کوئی اسے باپ نہیں بنا سکی تھی پھر رخسانہ اس کی زندگی میں آئی۔ مگر شوکت نے اس سے شادی اولاد کے لیے نہیں کی تھی وہ تو اس کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ وہ سامنے آئی تو شوکت علی ڈھیر ہو گیا۔ وہ صرف سترہ سال کی تھی جب شوکت علی نے اس سے شادی کی اور اس وقت وہ اس سے پورے تیس برس بڑا تھا۔ رخسانہ نے اسے اولاد بھی دی تو وہ اس کا بالکل ہی غلام بن گیا۔ میاں شوکت علی سلطان سیکڑوں ایکڑ زرخیز ترین زمین کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دو عدد فیکٹریاں اور ایک آئل مل بھی تھی۔ دولت کے لحاظ سے وہ ارب پتی سے بھی آگے جا چکا تھا۔ میاں شوکت کی بات سن کر رخسانہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔

''مجھے بھی تو تم نے ہی الگ کیا ہے ورنہ میں تو مر کر بھی دور نہ جاتی۔''

میاں شوکت نے اپنا سر یعنی پگ تھام لی۔ ''مجھے بالکل یاد نہیں ہے، نشے نے میرے ذہن پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔''

''اسی لیے کہتی تھی کہ اب اتنا مت پیا کرو، میری یہ واحد بات ہے جو تم کسی صورت نہیں مانتے تھے۔''

''رخسانہ کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا ہے۔'' میاں شوکت نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''کوئی حل نہیں ہے سوائے اس کے جو میں اپنی ذات اور اپنی روح پر پتھر رکھ کر کرنے جا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔''

میاں شوکت کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''بالکل نہیں۔''

''تب مجھے جانے دو۔''

میاں شوکت ہچکچایا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایسے

ہی ساتھ ...‘‘

’’پلیز شوکت، میں جانتی ہوں کہ میں کتنی گناہ گار ہوں لیکن یہ گناہ نہیں کرسکتی ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے میں اپنی جان لے لوں۔‘‘

میاں شوکت کے شانے ڈھلک گئے۔ اس نے رخسانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’میں تمہارا انتظار کروں گا جیسے کوئی مرنے والا آبِ حیات کا انتظار کرسکتا ہے۔‘‘

’’میں آؤں گی اور جلد آؤں گی۔‘‘ رخسانہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ یک دم اس کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ وہ ایک بار پھر متوالی چال چلتی ہوئی لاؤنج تک آئی جہاں شاہ نواز اس کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ ’’تم نیچے جا کر میرا انتظار کرو۔‘‘

’’جو حکم بیگم صاحبہ۔‘‘

اب وہ اس شاندار محل نما حویلی کے رہائشی حصے میں جا رہی تھی۔ وہ جہاں سے گزرتی، خادمائیں اسے دیکھ کر جھک جاتی تھیں۔ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔ ’’یہ سب مجھے کہاں ملے گا، اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ مجھے آنا تو یہیں ہے۔‘‘

اس کمرے میں تین بچے اس کے منتظر تھے۔ ان کے نقوش گواہی دے رہے تھے کہ وہ رخسانہ کی اولاد تھے۔ سب سے بڑا لڑکا تھا اس کی عمر بارہ کے آس پاس تھی، اس سے چھوٹا آٹھ سال کا تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی چار سال کی تھی۔ تینوں بچے نہایت خوب صورت اور صحت مند تھے۔ ان کے انداز میں ایلیٹ کلاس کی تمکنت اور سکون نمایاں تھا۔ صرف بیٹی کسی قدر مضطرب تھی۔ اس نے اپنی گڑیا سینے سے دباتے ہوئے کہا۔ ’’ماما آپ کہاں جارہی ہیں؟‘‘

رخسانہ نے کسی قدر جھکتے ہوئے اسے اپنے شانے سے لگایا اور بولی۔ ’’میں جلد آؤں گی میری جان۔‘‘

اصل سوال بڑے بیٹے نے کیا۔ ’’ماما آپ کیوں جا رہی ہیں؟‘‘

’’میرے بیٹے میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتی لیکن وعدہ کرتی ہوں جب آپ کچھ بڑے ہو جائیں گے اور سمجھ دار ہوں گے تب میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔‘‘

چھوٹا بیٹا بے پروا تھا وہ ماں سے لپٹا ضرور لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بچوں سے مل کر رخسانہ نے ان کی ہیڈ گورنس کو بلایا۔ ناز واحدی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اوپری طبقے کے رکھ رکھاؤ سے آشنا عورت تھی۔ بچے اسی کی زیرِ نگرانی پرورش پاتے تھے۔ باقی ملازمائیں صرف خدمت کے لیے تھیں۔ مگر بچوں کے تمام کام ناز کی نگرانی میں ہی انجام پاتے تھے۔ بچوں کے معاملے میں اس کا اختیار ان کے ماں باپ سے بڑھ کر تھا۔ رخسانہ اس سے مطمئن تھی اس کے باوجود اس نے اسے کچھ ہدایات دیں۔ ’’شاید میرا تم لوگوں سے کچھ عرصے رابطہ نہ ہو سکے اس لیے جب بچوں کو میری یاد آئے تو ان کو بہلانا تمہاری ذمے داری ہوگی۔‘‘

’’آپ بے فکر رہیں میڈم میں اپنی ذمے داری نبھانا جانتی ہوں۔‘‘

رخسانہ نیچے آئی، حویلی کے وسیع و عریض کار پورچ میں ایک نسبتاً عام قسم کی لگژری کار کھڑی تھی اور اس کے پاس شاہ نواز کھڑا تھا۔ اس نے رخسانہ کو دیکھتے ہی پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ اپنا پلو اور سراپا سمیٹتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔ شاہ نواز نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور کار گھومتے ڈرائیو وے سے ہوتی حویلی کے گیٹ تک پہنچی۔ گیٹ کھلا اور کار باہر آئی۔ جیسے ہی وہ حویلی سے نکلے دونوں کے تاثرات بدل گئے۔ شاہ نواز کے چہرے کے ادب و آداب سے بھرپور تاثرات ایک نوع کی حاکمانہ کرختگی میں بدل گئے۔ اس نے کہا۔ ’’کیا پلان کا یہ حصہ میرے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ رخسانہ نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اس صورت میں تمہیں بھی میرے ساتھ غائب ہونا پڑتا اور شوکت جان جاتا۔‘‘

’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟‘‘

’’فرق پڑتا ہے۔‘‘ رخسانہ کے انداز میں تیزی آگئی۔ ’’تم شوکت کو جانتے ہو مگر اس طرح نہیں جانتے جس طرح میں جانتی ہوں۔ اس کے بعد تمہارا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا۔ میں ذرا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ تمہارا حویلی میں ہمہ وقت موجود رہنا لازمی ہے۔‘‘

’’میں ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔‘‘

’’میں جانتی ہوں لیکن تم اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ میاں شوکت ایک ہاتھی ہے اور اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا بہادری نہیں ہوگی۔‘‘

شاہ نواز سوچتا رہا۔ اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ ’’شوکت تمہارا شوہر ہے لیکن میں کسی اور کو تمہارے قریب برداشت نہیں کرسکتا۔‘‘

وہ ذرا آگے آئی اور جھک کر اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ’’میں سمجھتی ہوں، تم جانتے ہو میرے دل میں سوائے تمہارے اور کسی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ اتنے

گرمے سے میں تمہارے لیے سب کر رہی ہوں۔ اگر شوکت کی طرف سے یہ مسئلہ نہ ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"میاں بیوی کی بات ہے۔" رخسانہ کا چہرہ مزید سرخ ہوا۔ "میں نے اس کی ایک بات نہیں مانی تو وہ غصے میں آ گیا اور اس کے منہ سے وہ سب نکل گیا۔"

"اس کا کہنا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"وہ نشے میں تھا لیکن میں تو نشے میں نہیں تھی۔ میں نے سب سنا اور سمجھا۔"

شاہ نواز نے اسٹیرنگ پر مکا مارا۔ "عین اس وقت جب ہم اپنے پلان کے قریب تھے، یہ سب ہو گیا۔"

"تم فکر مت کرو، پلان زیادہ ڈیلے نہیں ہوگا۔" رخسانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "اس کے بعد سب ہمارا ہوگا۔"

اس بات پر شاہ نواز کے چہرے کا تناؤ ذرا کم ہو گیا۔ "شوکت کو کبھی شک نہیں ہوا کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق ہے۔"

"وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔" رخسانہ ہنسی۔

"اس کی دو بیویاں اور بھی ہیں۔"

"ہاں لیکن اسے اولاد صرف میں نے دی ہے۔" رخسانہ کے انداز میں غرور آ گیا۔ "ورنہ وہ اس قابل کہاں رہا تھا۔"

کمزوری میاں شوکت میں تھی۔ جوانی میں بے دریغ عیاشی کر کے اس نے اپنی صحت گنوا دی تھی۔ حالانکہ اس کی اولین شادی صرف انیس برس کی عمر میں ہو گئی تھی مگر اسے اپنی خاندانی بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس جاتا بھی کم تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب صحت تھی تب بھی وہ اولاد حاصل نہیں کر سکا۔ دوسری شادی اس نے چھبیس برس کی عمر میں کی اور اولاد کے معاملے میں یہاں بھی اسے ناکامی ملی۔ علاج کے لیے اس نے بے دریغ دولت لٹائی اور شاید ٹھیک بھی ہو جاتا مگر بد پرہیزی نے شفا کی راہ مسدود کر دی۔ اس پر اس نے ڈاکٹروں کے مشورے کے برخلاف تیسری شادی بھی کر لی اور اس کی تیسری بیوی نے شادی کے چھ مہینے بعد ہی خودکشی کر لی تھی۔ جب رخسانہ اس کی نظر میں آئی تو وہ اولاد سے مایوس ہو گیا تھا مگر عیاشی سے دست بردار نہیں ہوا تھا۔ رخسانہ کا حسن و شباب دیکھ کر وہ مچل گیا اور اس نے بہر صورت اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رخسانہ اسے عجیب حالات میں ملی۔

☆☆☆

اسے یہاں آئے ہوئے تین مہینے ہونے کو آئے تھے اور اس نے بہت کچھ سیکھا تھا بلکہ اتنا زیادہ سیکھ لیا تھا کہ مالکہ کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار اس نے سپنا سے کہا۔ "جتنا دوسری لڑکیاں سالوں میں اور رو پیٹ کر سیکھتی ہیں، تم نے چند مہینے میں اس سے زیادہ سیکھ لیا ہے۔"

"ہاں کیونکہ وہ اسے جبر سمجھتی ہیں اور میں اپنی خوشی سے سیکھ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ہم عورتوں کو کھلونا سمجھنے والے مرد میرے غلام بن جائیں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" مالکہ نے یقین سے کہا۔ "چند مہینوں میں تم بالکل بدل گئی ہو۔ تم ایسا ہیرا ہو جس نے خود کو تراشا ہو۔ اس میں میرا دخل کم ہی ہے۔"

مگر وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس نے جو چاہا مالکہ نے اسے مہیا کیا۔ اسے تمام سہولتیں اور آسائشیں دیں اور اس پر لاکھوں لٹا دیے جبکہ اس نے اسے ایک پیسا کما کر نہیں دیا تھا۔ وہ جو چاہتی منٹوں میں حاضر ہو جاتا۔ حد یہ کہ مالکہ نے اس کی انٹر کی مارک شیٹ اور سند بھی نکلوا کر دی تھی۔ اسے یہاں صرف ایک کمی تھی کہ اسے اس سارے عرصے میں ایک بار بھی باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ خود کو کسی سونے کے پنجرے میں قید محسوس کرتی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں قید نہیں رہے گی مگر اس نے اس خیال کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا تھا۔ وہ جانتی تھی یہاں رہنے والیوں کے پروں پر نظر رکھی جاتی تھی اور جس کے پر ذرا بھی بڑھتے، فوراً انہیں تراشنے کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے وہ پوری طرح خوش رہتے ہوئے سکون سے موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے ایک موقع ضرور ملے گا جب مالکہ اس پر کیا جانے والا خرچ مع سود وصول کرے گی اور اسے کسی کے سامنے پیش کرے گی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کسی معمولی شخص کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا اور اسے جس کے سامنے پیش کیا جائے گا وہی اس کا موقع ہوگا۔ تقدیر نے یہ موقع میاں شوکت کی صورت میں دیا۔

قوت نہ ہونے کے باوجود میاں شوکت کا عیاشی کے اڈوں پر آنا جانا تھا۔ وہ عام طور سے کمسن اور تازہ آنے والی لڑکیاں طلب کرتا تھا۔ اس بار اڈے کی مالکہ نے اسے کنواری لڑکی کی پیشکش کی۔ اگرچہ اس نے بہت بھاری معاوضہ مانگا تھا۔ اس نے میاں شوکت سے کہا۔ "میاں صاحب، ایک اَن چھوا اور گلاب کی بند کلی جیسا شاہکار آیا

ہے۔ اس کے بدلے لوگ منہ مانگے دام دینے کو تیار ہیں مگر میں نے سوچا یہ ہیرا آپ جیسے جوہری کے لائق ہے۔"

میاں شوکت مالکہ کی مکاری سمجھ رہا تھا۔ جیب میں مال اور دل میں موجود ہوس نے میاں شوکت کو اس گناہ بے لذت کے لیے تیار کرلیا۔ جب وہ سامنے آئی تو میاں شوکت کے ہوش اُڑ گئے۔ حسن و معصومیت کا ایسا امتزاج اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی یقین ہوجاتا تھا کہ اسے آج تک کسی مرد نے نہیں چھوا ہے اور جب اس نے ہراساں اور معصومانہ لہجے میں کہا کہ کیا وہ اسے یہاں سے ہمیشہ کے لیے لے جاسکتا ہے تو میاں شوکت دل و جان سے راضی ہوگیا۔ اس نے اسی وقت مالکہ سے بات کی۔ "میں اس کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہوں لیکن ایک رات کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے۔"

مالکہ خوش ہوگئی مگر چالاکی سے بولی۔ "آپ جانتے ہیں میاں صاحب میں مال کرائے پر دیتی ہوں، بیچتی نہیں ہوں۔"

"تم یہ باتیں چھوڑو اپنے دام بتاؤ۔"

"سوچ لیں میاں صاحب کہیں ارادہ نہ بدل جائے دام سن کر۔"

میاں شوکت کو غصہ آگیا۔ "تم جانتی ہو کس سے یہ بات کررہی ہو۔"

مالکہ نے اپنے طور پر اتنا مانگ لیا کہ چند لمحے کو میاں شوکت بھی ڈگمگا گیا تھا مگر اسے اپنے الفاظ یاد آئے اور اس نے سر ہلا دیا۔ کیونکہ مالکہ نے اسے غصہ دلایا تھا اس لیے اس نے اسی وقت کیش منگوا کر اسے دیا اور اسے لے کر وہاں سے نکل گیا۔ سینا کے حسن نے اسے ایسا پاگل کیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کو تیار ہوگیا۔ گھر آکر اس نے اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی تو سینا نے کہا۔ "میں آپ کے قبضے میں ہوں جو چاہیں کریں لیکن اگر مجھ سے پوچھ رہیں تو اس شادی کے لیے میری کچھ شرائط ہیں۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"پہلی شرط یہ کہ آپ میرے ماضی کی کھوج نہیں کریں گے۔ میرا تعلق ایک غریب گھر سے ہے جہاں عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور ایک بار گھر کی عزت گھر سے نکل جائے تو اس کی واپسی نہیں ہوتی ہے۔ اب میرا بھی ماضی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"میں اپنے فیصلوں میں خودمختار ہوں گی۔"

میاں شوکت نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "بس اتنی سی شرائط۔"

"میرے لیے یہ بھی کافی ہیں، ان کے بدلے مجھے ساری عمر آپ کے قدموں کی دھول بن کر رہنا بھی منظور ہے۔"

اس کی لفاظی نے میاں شوکت کو جھوم جانے پر مجبور کردیا۔ "ٹھیک ہے تم ماضی سے تعلق نہیں رکھنا چاہتیں تو ماضی کا نام بھی بھول جاؤ، آج سے تمہارا نام رخسانہ ہے۔"

اگلے دن ان کا نکاح پڑھایا گیا اور میاں شوکت نے بہت دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ اس عمر میں بھی وہ ایسی گلاب کی کلی حاصل کرسکتا ہے۔ ایک رات میں اسے اندازہ ہوگیا کہ میاں شوکت اس کا کس حد تک دیوانہ ہوگیا ہے۔ رخسانہ کے لیے اس کے ڈھے جانے والے جسم میں بھی جان آگئی تھی اور تین چار دن اس نے بہت سرمستی میں گزارے۔ رخسانہ صرف حسین نہیں ذہین بھی تھی۔ اس نے مالکہ کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا اور اب اس کا عملی تجربہ کررہی تھی۔ اسے مردوں پر حکمرانی کے گُر آگئے تھے۔ رخسانہ نے بجا طور پر اندازہ لگایا کہ اس کے حسن کا جادو کتنا ہی سر چڑھ کر کیوں نہ بولے، ایک وقت آئے گا جب یہ جادو بے اثر ہوگا۔ اس لیے اس نے میاں شوکت کو ایسی زنجیر میں جکڑنے کا فیصلہ کیا جس سے وہ کبھی نہ نکل سکے اور یہ زنجیر اولاد کی ہوتی۔

میاں شوکت نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ باپ نہیں بن سکتا ہے۔ وہ مصنوعی طریقوں کے خلاف تھا مگر رخسانہ نے اس سے منوالیا۔ انہوں نے جدید ترین میڈیکل ٹیکنالوجی کی مدد لی اور انہیں اولاد مل گئی۔ شادی کے دوسرے سال اس نے پہلے بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس نے میاں شوکت سے کہا کہ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ میاں شوکت نے اسے اجازت دے دی اور اس نے ایک معروف کالج میں گریجویشن میں داخلہ لیا اور بہت اچھی ڈویژن میں گریجویشن کیا اور اس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی سے ماسٹر کے دوران اس نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔ دو بیٹوں کے بعد میاں شوکت اس کا بالکل ہی بے دام غلام بن کر رہ گیا۔ بیٹی ہوئی تو ان کا گھر مکمل ہوگیا۔ بچے اس کا مسئلہ نہیں تھے۔ ان کے لیے کئی ملازمائیں اور ناز واحدی جیسی گورنس تھی۔ گھر کی طرف سے بےفکر ہوکر رخسانہ نے سوشل سرگرمیاں شروع کردی تھیں۔ مختصر عرصے میں وہ بہت سے حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت بن گئی۔ مخصوص طبقے میں پارٹیوں میں جان اس کی آمد سے آتی تھی۔

رخسانہ نے کوشش کی کہ اگر میاں شوکت عیاشی ترک

نہ کرے تب بھی کم ضرور کر دے۔ بالکل ترک کر دینا تو ناممکن تھا کہ یہ ان کے طبقے کا طرزِ زندگی تھا۔ مگر میاں شوکت نے اعتدال کی راہ ضرور اپنالی تھی۔ اس نے پینا کم کر دیا تھا اور دوسری عیاشیاں بھی کم کرنے لگا تھا۔ رخسانہ جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی وہ منہ مارنے سے باز نہیں آتا تھا۔ رخسانہ سب جانتی تھی مگر انجان بنی رہتی تھی۔ میاں شوکت کی زندگی میں شامل ہوتے وقت اس نے جو سوچا تھا، آج وہ حاصل کر چکی تھی۔ اب میاں شوکت اس کے اشارۂ ابرو پر ناچتا تھا۔ اس کے پاس تمام تر اختیارات تھے۔ وہ اپنا سارا بزنس رخسانہ کے نام کر چکا تھا مگر زمین کے معاملے میں وہ مجبور تھا کہ خاندانی روایت کے مطابق وہ صرف اس کی اولاد کو منتقل ہو سکتی تھی۔ ورنہ وہ زمین اور حویلی رخسانہ کے نام کر دیتا۔ رخسانہ کی اپنی دو گاڑیاں اور ذاتی ڈرائیور بھی تھا۔ مگر وہ ڈرائیور سے مطمئن نہیں تھی اس لیے اس نے میاں شوکت سے دوسرے ڈرائیور کے لیے کہا اور اس نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اس کے جواب میں جو لوگ آئے، ان میں شاہ نواز بھی تھا۔ فیصلہ رخسانہ کو کرنا تھا اور اس نے شاہ نواز کو چن لیا۔

اپنی آمد کے دوسرے ہی دن شاہ نواز اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن گیا۔ مگر دونوں اتنی احتیاط سے ملتے تھے کہ آج تک میاں شوکت کو شک نہیں تھا۔ حویلی کی کچھ ملازمائیں ان کی ہمراز تھیں مگر ان کی زبانیں رخسانہ نے خرید لی تھیں۔ وہ اس حویلی میں یوں آئی جیسے کسی طوفان میں ڈوب جانے والا اچانک کسی سرسبز و شاداب جزیرے میں آجائے۔ جس کی آب و ہوا خوب ہو اور کھانے پینے کے سامان کی فراوانی ہو مگر اس جزیرے میں وہ اکیلی تھی۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ پھر شاہ نواز آگیا تو اس کی یہ تشنگی بھی دور ہو گئی۔ وہ خوش اور مطمئن تھی مگر اچانک ہی ایسا واقعہ ہوا کہ اس کا سکون و چین برباد ہو گیا اور اس کے نتیجے میں وہ حویلی سے نکل کر جا رہی تھی اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ واپس آئے گی تو کامیاب ہو گی یا ناکام ہو گی۔ میاں شوکت اور شاہ نواز بہ ظاہر اس کے منصوبے سے واقف تھے لیکن اپنے اصل منصوبے سے وہ خود ہی واقف تھی۔

☆☆☆

عمران اپنا بیگ بند کر رہا تھا کہ کوئی سائے کی طرح کمرے میں آیا اور وہ دیکھے بغیر مخصوص مہک سے جان گیا کہ وہ روبی تھی۔ اس نے شرارت سے کہا۔ ”صائمہ بی بی میرے رومال کہاں ہیں؟“

”یہ رہے۔“ ایک نازک گلابی ہاتھ آگے آیا۔ اس پر ہاتھ کے کڑھے رومالوں کا ایک سیٹ تھا۔ اس نے رومال لینے کے بجائے کلائی پکڑلی تو وہ کسمسائی۔ ”چھوڑو مجھے۔“

عمران اس کی طرف گھوما۔ روبی اب شرما رہی تھی۔ وہ اس کی کزن ہی نہیں، منگیتر بھی تھی۔ جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیتا تو روبی اس کی ہو جاتی اور اب اس میں زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اس نے شرارت سے کہا۔

”کیوں چھوڑوں کوئی پرائی کلائی پکڑی ہے کیا؟“

”پکڑ کر تو دکھائیں پرائی کلائی۔“ روبی نے غصے سے کہا۔

”کیا کر لو گی؟“

”جان لے لوں گی اُس کی یا اپنی۔“

”یعنی میرا تو کچھ نہیں جائے گا۔“ اس نے روبی کو اور چھیڑا مگر وہ سمجھ گئی تھی، مسکرانے لگی۔ اس نے یقین سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے آپ کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔“

عمران نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور رومال رکھ کر بیگ بند کرنے لگا۔ زپ بند کر کے وہ اس کی طرف مڑا۔

”اتنا اعتماد ہے؟“

روبی نے سر ہلایا۔ ”خود سے بھی زیادہ۔“

روبی اس کے چچا کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ اپنے مرحوم ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ چار سال کا تھا جب اس کے ماں باپ ایک جیپ حادثے میں دنیا سے گزر گئے تھے۔ تب اس کی پرورش اس کے چچا اور چچی نے کی۔ انہوں نے اسے اپنی محبت اور خلوص ہی نہیں دیا بلکہ اپنی واحد کائنات روبی بھی اس کے نام کر دی۔ چچا چچی بیٹی سے زیادہ اس سے پیار کرتے تھے اور ان کی جان عمران میں تھی۔ روبی بچپن میں اس کی اس پذیرائی پر چڑتی اور اس سے لڑتی تھی۔ موقع ملتا تو اسے چٹکیاں کاٹتی اور اس کے بال نوچتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کی ننھی سی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ مگر جیسے چچا چچی کی جان اس میں تھی اسی طرح بہت کم عمری میں روبی میں اس کی جان آگئی تھی۔ اسے کچھ ہوتا تو اس کی تکلیف عمران محسوس کرتا تھا۔ بچپن میں وہ بہت بیمار ہوتی تھی اور جب بیمار ہوتی جان پر عمران کی بن آتی تھی۔

روبینہ جسے پیار سے سب روبی کہتے تھے۔ ذرا بڑی اور سیانی ہوئی اور اسے عمران سے اپنے رشتے کی نوعیت کا علم ہوا تو اس کی چڑ محبت میں بدل گئی۔ اب وہ عمران کا خیال رکھنے لگی اور اس کے کام یوں بھاگ بھاگ کر کرتی کہ چچا چچی بھی حیران رہ جاتے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی تیوریاں عمران کو دیکھتے ہی چڑھ جاتی تھیں۔ وہ اسے ذرا بھی لفٹ نہیں کراتی

تھی اور اب وہ جیسے اس کی خادمہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ بچی تھی عمران اس سے بے تکلف رہا۔ چچی نے اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش بہت سخت اصولوں کے ساتھ کی تھی۔ دس سال کی عمر میں وہ دوپٹا لینے لگی تھی اور بارہ سال کی عمر میں اسکول جاتے ہوئے پردہ کر کے جاتی تھی۔

ان کے علاقے میں ایک اعلیٰ درجے کا بورڈنگ اسکول تھا جہاں دور دور سے امیرزادے پڑھنے آتے تھے۔ عمران کو بورڈنگ میں نہیں رہنا پڑا تھا۔ اس نے انٹر یہیں سے کیا۔ علاقے میں کالج بھی تھے۔ مگر اس نے اسکول میں جس معیار کا پڑھا تھا اس کے بعد اس کا ان سرکاری کالجوں میں پڑھنے کو دل نہیں چاہا تھا اور اس نے چچا سے کہا کہ وہ اسلام آباد جا کر پڑھے گا۔ صمد اللہ اسے دور نہیں بھیجنا چاہتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عمران کی اعلیٰ تعلیم یہاں ممکن نہیں ہے۔ مالی مسئلہ نہیں تھا۔ زمینوں سے بہت اچھی آمدنی آرہی تھی اور ان لوگوں کو فضول خرچی کی عادت نہیں تھی۔ صمد اللہ فضول خرچی اور فضول رسموں کے سخت خلاف تھا۔ وہ وہیں خرچ کرتا تھا جہاں ضرورت ہوتی تھی۔ فضول خرچی نہ کرنے سے اس کے پاس چند سالوں میں اتنی رقم آجاتی تھی کہ وہ چاہتا تو اپنی زمین مزید بڑھا لیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اس کا خیال تھا کہ انسان دنیا میں کتنی ہی زمین پر کیوں نہ قابض ہو جائے، جانا اسے بالآخر دو گز زمین میں ہوتا ہے۔ ان کے دو بچے تھے اور ان کے لیے یہ سب بہت تھا۔ اضافی آمدنی صمد اللہ فلاحی کاموں پر خرچ کرتا تھا۔ اس نے آس پاس اسکول بنوائے تھے۔ سرکاری ڈسپنسریوں میں اپنے خرچ پر سامان اور عملہ مہیا کیا تھا۔ اس وجہ سے اس کا نام اور عزت تھی۔

عمران اپنے چچا پر اعتماد نہیں، اندھا یقین رکھتا تھا۔ چند ایک بار اس کے ننھیال والوں نے اسے بہکانے کی کوشش کی کہ زمین میں اس کا برابر کا حصہ ہے اور وہ اپنے چچا سے حساب طلب کرے تو اس نے ان سے ملنا چھوڑ دیا۔ جب چچا چچی نے اس سے پوچھا کہ وہ ننھیال والوں سے ملنے کیوں نہیں جا رہا ہے تب اس نے بتایا کہ انہوں نے اس سے کیا کہا اور اب وہ ان لوگوں سے کبھی نہیں ملے گا۔ مگر صمد اللہ نے اسے سمجھایا کہ قرابت داروں سے قطع تعلق اللہ کو پسند نہیں ہے اس لیے وہ ان سے تعلق رکھے اور ان کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دے۔ عمران چچا چچی کا ماں باپ جیسا احترام کرتا تھا۔ اس کے لیے ان کی کوئی بات ٹالنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح اگر وہ کوئی فرمائش کر دیتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ چچا چچی پوری نہ کریں۔ البتہ جب اس نے شہر جا کر پڑھنے کی بات کی تو اس کی دوری کے خیال نے انہیں مضطرب کر دیا۔ خاص طور سے روبی کا برا حال ہو گیا تھا اس نے موقع پاتے ہی تنہائی میں اس سے پوچھا۔

''آپ چلے جائیں گے۔''

''ہاں کیوں کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔''

''یہاں تعلیم کا معیار اتنا اچھا نہیں ہے۔'' عمران نے اسے سمجھایا۔ ''پھر تین چار سال کی بات ہے، مجھے کون سی نوکری کرنی ہے تعلیم مکمل کر کے آؤں گا اور یہاں چچا کا ہاتھ بٹاؤں گا۔''

''لیکن اتنے سال تو...'' روبی بات چھوڑ کر رو دی تب عمران نے پہلی بار اسے اپنے قریب کیا۔ اسے چپ کرانے کے لیے مگر روبی اس کے پاس آنے پر ایسا گھبرائی کہ رونا بھول کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ عمران خود جھینپ کر رہ گیا۔ صمد اللہ مان گیا اور اس نے شبینہ کو بھی راضی کر لیا تھا۔ شبینہ اس شرط پر مانی تھی کہ عمران وہاں اپنے گھر میں رہے گا اور اس کے لیے یہاں سے نوکر جائے گا جو اس کے کام کرے گا اور اس کا خیال رکھے گا۔ صمد اللہ نے دونوں شرطیں مان لیں وہ خود اسلام آباد گیا۔ اس نے وہاں ایک چھوٹا گھر خرید لیا اور اسے آراستہ کرایا۔ ایک اچھے نجی کالج میں عمران کا داخلہ کرایا۔ اس کے لیے چھوٹی فور وہیل ڈرائیو لی جو وہ شہر میں بھی استعمال کرتا اور جب حویلی آتا اس کے مشکل راستوں پر بھی سفر کر سکتا۔ اس کے ساتھ ایک خاندانی نوکر بھی روانہ کر دیا گیا۔

سترہ سالہ امید خان کا خاندان کئی نسلوں سے ان کی زمینوں پر کام کر رہا تھا۔ یہ لڑکا ہوشیار تھا اور بارہ سال کی عمر سے حویلی میں کام کر رہا تھا۔ دو سال سے وہ عمران کا ذاتی خادم تھا اس لیے اس کا نام ساتھ جانے کے لیے نکلا تھا۔ وہ اس کے ساتھ شہر آ گیا۔ گھر شہر کے ایک نئے آباد ہونے والے سیکٹر میں تھا۔ یہاں آس پاس کچھ بنگلوز تھے مگر آبادی زیادہ نہیں تھی۔ عام طور سے سکون اور سناٹا رہتا تھا۔ عمران نے گریجویشن کیا اور پھر ماسٹر میں داخلہ لیا۔ ہر دوسرے مہینے وہ ایک دو دن کے لیے حویلی جاتا تھا۔ اس طرح گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیاں مکمل طور پر حویلی میں گزرتی تھیں۔ کبھی کبھی کالج کی طرف سے... ٹور پر جانا ہوتا تھا ورنہ وہ حویلی میں چھٹیاں گزارتا تھا۔

روبی اس کے آنے کی منتظر رہا کرتی تھی۔ جب وہ آتا

تو روبی کی خوشی دیکھنے والی ہوتی تھی اور جب وہ جانے لگتا تو وہ سراپا مرجھا جاتی۔ اسے دیکھ کر عمران کا ارادہ ڈانواں ڈول ہو جاتا اور اس کا دل چاہتا کہ وہ تعلیم چھوڑ کر واپس حویلی آ جائے۔ مگر یہ سوچ کر وہ دل پر جبر کرتا کہ تین سال گزر چکے ہیں ایک سال کی اور باقی ہے اس کا ماسٹر مکمل ہو جائے گا۔ اس نے ماسٹر کے لیے جغرافیہ کا مضمون لیا تھا۔ وہ پہاڑوں کا رہنے والا تھا اور یہ اس کی دلچسپی کا مضمون تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے آیا تو نئے سمسٹر کی تیاریوں میں لگ گیا۔ تعلیم سے ہٹ کر اسے ٹینس کا شوق تھا۔ وہ پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی کی ٹیم میں شامل رہا تھا مگر ٹورنامنٹس میں بس اس حد تک شرکت کرتا تھا کہ اس کی تعلیم متاثر نہ ہو۔ اس نے گزشتہ سردیوں میں ہونے والے انٹر یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں حصہ لیا اور اس میں ٹرافی حاصل کی تھی۔ ٹورنامنٹ دوسرے شہر میں ہوا تھا اور دوران تعلیم یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی دوسرے شہر میں گیا۔ اس کے مقابلے میں اس کے ساتھی بہت سی جگہوں پر گھوم چکے تھے۔

اس بار بھی وہ چھٹیوں میں حویلی گیا اور پوری چھٹیاں وہیں گزاری تھیں۔ صمد اللہ نے اسے اشاروں کنائیوں میں کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی وہ تعلیم مکمل کر کے آئے گا، اس کی اور روبی کی شادی کر دی جائے گی۔ یونیورسٹی کھلی تو مون سون کا موسم تھا اور آئے دن بادل گرج کر برس رہے تھے۔ اس بار بارش بھی بہت زیادہ ہوئی تھی۔ مگر یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے ویسے بھی بارش کا موسم اچھا لگتا تھا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس کا تقریباً سارا وقت ہی گھر میں گزرتا تھا۔ امید خان اس کے سارے کام کرتا تھا۔ اس نے کھانا بنانا بھی سیکھ لیا تھا اور بہت اچھی ڈشیں بناتا تھا۔ کوٹھی کی صفائی، اس کی ذاتی چیزوں کا خیال رکھنا، باہر سے چیزیں لانا اور بہ وقتِ ضرورت اسے کمپنی دینا امید کی ذمے داری تھی۔ یہاں آنے کے بعد عمران نے اسے لکھنا پڑھنا بھی سکھایا تھا اور اب وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھتا تھا۔ باہر آنے جانے کے لیے عمران نے اسے بائیک لے دی تھی۔ وہ اسی پر آتا جاتا۔ اس دن وہ سامان لینے کے لیے نکلا ہوا تھا۔ اسے خاصی دیر ہو گئی اور وہ واپس نہیں آیا تو عمران اسے کال کر رہا تھا کہ اس کے نمبر سے کال آ گئی۔

''امید کہاں ہو؟'' عمران نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''اگر موبائل والے کا نام امید ہے تو وہ اس وقت اسپتال میں ہے اس کی موٹر سائیکل کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے اور وہ تشویشناک حالت میں اسپتال میں ہے۔''

عمران پریشان ہو گیا۔ ''کون سے اسپتال میں ہے، میں آ رہا ہوں۔''

فون ریسیو کرنے والے نے سرکاری اسپتال کا نام بتایا۔ عمران اسپتال پہنچا تو امید کا آپریشن ہو گیا تھا اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ مگر ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کی مکمل صحت یابی میں ایک مہینا لگ سکتا ہے۔ حادثے میں اس کے سر پر چوٹ آئی تھی اور کلائی میں فریکچر ہوا تھا۔ جب تک اسے ہوش نہیں آیا عمران اس کے پاس رہا۔ اس نے کال کر کے حویلی میں اطلاع کر دی تھی۔ گاؤں سے امید خان کے بھائی روانہ ہو گئے تھے۔ وہ بھی رات گئے اسپتال پہنچ گئے۔ عمران نے اسپتال کے تمام بل اور دوسرے اخراجات ادا کر دیے تھے اور آئندہ ہونے والے اخراجات کی ذمے داری بھی لی تھی۔ امید نے اس کے سامنے پولیس کو بیان دیا کہ ایک گاڑی نے اسے عقب سے آتے ہوئے ٹکر ماری۔ وہ گرا تو اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا تھا۔ چوٹ شدید تھی مگر بر وقت طبی امداد ملنے سے اس کی جان بچ گئی۔ امید خان کے بھائی آ گئے تھے اس لیے عمران انہیں امید کے پاس چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے اور بارش ہو رہی تھی اس لیے سڑک بالکل سنسان تھی۔ عمران کسی قدر تیز رفتاری سے جیپ چلا رہا تھا اس لیے جب وہ لڑکی اچانک سڑک پر آئی تو اس نے بہ مشکل بریک لگائے اور جیپ رکتے رکتے تقریباً لڑکی کو چھو گئی تھی۔ وہ گر گئی۔ عمران تیزی سے نیچے اترا اور اس نے لڑکی کو اٹھایا۔ وہ بدحواس تھی اور اس نے گھگیا کر کہا۔

''پلیز مجھے بچائیں، وہ میرے پیچھے ہیں۔''

لڑکی نے جس طرف اشارہ کیا تھا، عمران نے پلٹ کر دیکھا تو اسے گرین بیلٹ کے دوسری طرف ایک گاڑی سے دو افراد اتر کر آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور اسے جیپ میں دھکیل دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ بھاگ کر اپنی نشست کی طرف آیا۔ خوش قسمتی سے اس نے انجن بند نہیں کیا تھا اور گاڑی گیئر میں تھی اس لیے ایکسی لیٹر دباتے ہی تیزی سے بھاگی۔ اتنی دیر میں وہ دونوں افراد گرین بیلٹ پار کر کے اس طرف آ گئے تھے۔ جس کے پاس پستول تھا اس نے فائر کیے۔ عمران نے بے ساختہ سر نیچے کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے لڑکی کا سر پکڑ کر

پیچھے کی طرف جھکایا۔ اس نے بارش اور سڑک پر پھسلن کی پروا کیے بغیر رفتار تیز کی۔ فی الحال اس کی توجہ عقب سے آنے والوں پر تھی، اسے خدشہ تھا کہ وہ گاڑی میں اس کے پیچھے آسکتے تھے۔ وہ بار بار عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیپ ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ تب اسے سسکیوں کی آواز نے چونکایا۔ لڑکی رو رہی تھی۔

"کون ہو تم اور یہ کون تھے؟"

لڑکی نے لان کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کھلے بال بھیگ کر چہرے اور شرٹ سے چپک رہے تھے۔ بھیگا ہونے کی وجہ سے لباس بھی جسم سے چپکا ہوا تھا۔ عمران نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے نظر ہٹالی۔ اندر تاریکی تھی مگر تیز اسٹریٹ لائٹس کی روشنی اندر تک آکر اسے نمایاں کر رہی تھی۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "میں بے سہارا ہوں اور یہ میرے دشمن ہیں۔"

عمران نے جیپ ایک اور سڑک پر موڑی۔ اس کی کوشش تھی کہ اگر وہ پیچھے آرہے ہوں تب بھی اس تک نہ پہنچ سکیں۔ وہ مسلح تھے اور فائرنگ کر کے انہوں نے اپنے عزائم واضح کر دیے تھے یہ دارالحکومت کا علاقہ تھا اور یہاں کھلے عام فائرنگ صرف بہت زور آور لوگ ہی کر سکتے تھے۔ ان سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔ جب اسے عقب کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو وہ دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کہو، تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تم بے سہارا ہو؟"

"ہاں اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

"اور یہ لوگ؟"

"یہ ایک طاقت ور آدمی کے گماشتے ہیں جو میرے پیچھے پڑا ہے۔"

"کیوں پیچھے پڑا ہے؟"

"ایک طاقتور اور دولت مند شخص ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کے پیچھے کیوں پڑ سکتا ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں جوابی سوال کیا تو عمران جھینپ گیا۔ چند سوالوں سے کہانی اس کے سامنے واضح ہو گئی۔ لڑکی کا سوائے ایک ماں کے اور کوئی نہیں تھا۔ جب طاقتور شخص اس کے پیچھے پڑا اور اس نے مزاحمت کی تو طاقتور آدمی نے کچھ ایسی دھمکیاں دیں کہ اس کی ماں جو دل کی مریضہ تھی... سہہ نہ سکی اور دل کے دورے میں دنیا سے گزر گئی۔ یوں وہ اکیلی رہ گئی۔ اس کے پاس گھر تھا مگر پتھر اور اینٹوں سے بنا ہوا یہ گھر اسے تحفظ نہیں دے سکا تھا۔ رات کے وقت چپکے سے کچھ لوگ اندر گھسے اور تالا ناکارہ کر کے مکان کے اندر داخل ہوئے۔

اسے کچھ سونگھا کر بے ہوش کیا اور اسے لے جا رہے تھے کہ ان کی گاڑی خراب ہو گئی۔ وہ اسے ٹھیک کر رہے تھے کہ لڑکی کو ہوش آگیا اور وہ موقع پا کر گاڑی سے نکل بھاگی۔ اس نے سڑک پار کی تو عمران کی جیپ کے سامنے آگئی۔

"شکر ہے آپ مل گئے ورنہ وہ مجھے پھر پکڑ لیتے۔"

"اللہ کا شکر ہے، لیکن اب میں تمھیں کہاں چھوڑوں؟"

یہ سن کر اس نے گھوم کر عمران کا بازو پکڑ لیا۔ "کیا آپ مجھے اپنے گھر نہیں لے جا سکتے۔ میں اپنے گھر میں غیر محفوظ ہوں۔"

"اپنے گھر۔" وہ ہچکچایا۔ "ہم پولیس اسٹیشن چلتے ہیں وہاں تم اس شخص کے خلاف رپورٹ بھی لکھوا سکتی ہو اور سرکاری تحفظ بھی مانگ سکتی ہو۔"

"پولیس۔" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اس سے بہتر ہے کہ آپ مجھے یہیں اتار دیں، میں شاید پھر بھی بچ جاؤں مگر پولیس تو مجھے سیدھا اس شخص کے پاس لے جائے گی۔"

عمران نے جھجک کر کہا۔ "میں اپنے گھر میں اکیلا ہوتا ہوں۔ دراصل میں یہاں پڑھ رہا ہوں ورنہ میرا گھر مانسہرہ میں ہے۔"

"آپ شریف آدمی ہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ تحفظ کا احساس ہو رہا ہے۔" وہ کہتے ہوئے سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ "اب آپ کی مرضی ہے مجھے پولیس اسٹیشن لے جاتے ہیں یا یہاں اتار دیتے ہیں یا پھر..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر رونے لگی۔

"پلیز رومت۔" عمران نے درخواست کی، اس نے غیر ارادی طور پر جیپ کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ دس منٹ بعد وہ گھر کے سامنے تھا۔ اس نے اتر کر گیٹ کھولا اور پھر جیپ اندر لے آیا۔ نیچے اترنے سے پہلے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"سیما۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اسے اندر لایا۔ لاؤنج میں روشنی تھی اور یہاں اس کا بھیگا اور جسم سے چپکا لباس اسے زیادہ ہی نمایاں کر رہا تھا۔ عمران نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تمھیں لباس تبدیل کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہاں صرف مردانہ کپڑے ہیں۔ میں تمھیں اپنا ایک سوٹ دیتا ہوں۔"

وہ اس کے لیے اپنی پینٹ اور شرٹ لے آیا اور اسے

مسلسل بارش سے موسم دوسرے بیڈ روم کا واش روم دکھایا۔ خوشگوار ہو گیا تھا اور سیما بارش میں بھیگ کر آئی تھی اس لیے عمران نے اس کے لیے چائے بنائی۔ جب تک وہ لباس بدل کر اور بال خشک کر کے آئی وہ چائے بنا چکا تھا۔ عمران کے کپڑے اسے بڑے تھے، اس نے پینٹ کے پائنچے اور شرٹ کی آستین موڑ رکھی تھی۔ وہ اس لباس میں بھی اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ عمران نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ شرمائی اور اس کی رنگت شہابی ہو گئی۔ وہ چونکا اور پھر جھینپ گیا۔

''وہ... میں نے چائے بنائی ہے، اگر تمہیں بھوک لگی ہے؟''

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ نے زحمت کی چائے کی۔''

''زحمت کس بات کی۔'' وہ چائے کے مگ اٹھا کر لاؤنج میں لے آیا۔ ''بیٹھو کھڑی کیوں ہو؟''

سیما نے مگ اٹھالیا اور سپ لیا۔ ''میں آپ کے لیے پریشانی بن گئی ہوں۔''

''نہیں۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں پریشان تھا مگر اب نہیں ہوں۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ ابھی تم ٹینشن میں ہو۔ آرام کرو اور پھر فریش ہو کر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' وہ ممنون لہجے میں بولی۔ چائے کے بعد عمران نے اسے ایک بیڈ روم دکھایا۔

''اب تم آرام کرو، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔''

''نہیں سر چھپانے کو جگہ مل گئی ہے، میرے لیے یہی بہت ہے۔''

''اس کے ساتھ اٹیچ باتھ ہے اور تم اندر سے دروازہ لاک کر لینا۔''

اس نے نظر اٹھا کر عمران کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے۔'' عمران نے اصرار کیا۔ ''ہمارا مذہب کہتا ہے کہ جب مرد اور عورت اکیلے ہوں تو ان کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔''

سیما کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ''آپ... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''شب بخیر۔'' عمران نے کہا اور دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سیما نے دیکھا تو اس نے جاتے ہوئے لاک کا بٹن دبا دیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر گئی۔ عمران اپنے کمرے میں آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ جب تک وہ سیما کے سامنے رہا اسے عجیب سی بے چینی اور اضطراب رہا تھا۔ لڑکی وہ تھی مگر ڈر عمران رہا تھا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس نے دعا کی کہ اگر یہ کوئی آزمائش ہے تو اللہ اسے محفوظ رکھے۔ اس کی آنکھ حسبِ معمول سات بجے کھل گئی۔ رات وہ فجر کے لیے الارم لگانا بھول گیا تھا اسے افسوس ہوا۔ پھر اس نے اٹھ کر تیاری کی۔ اپنے پورے ہفتے کے کپڑے وہ ایک ساتھ پریس کروا کے الماری میں ہینگ کرا لیتا تھا اور باری باری استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس نصف درجن کے قریب مختلف طرح کے جوتے تھے جنہیں وہ لباس کی مناسبت سے استعمال کرتا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا۔

عام طور سے جب وہ صبح تیار ہو کر کمرے سے باہر آتا تو امید خان اس کا ناشتا بنا چکا ہوتا تھا مگر وہ تو اسپتال میں تھا۔ آج اسے یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں ناشتا کرنا پڑتا۔ وہ باہر آنے لگا تو اس نے سوچا کہ وہ سیما کو جگا کر بتا دے کہ وہ جا رہا ہے اور اب دوپہر تک آئے گا۔ وہ کچن میں اپنے لیے جو چاہے بنا لے۔ کچن میں کھانے پینے کا تمام سامان موجود تھا۔ فریج میں بھی بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ حیران رہ گیا جب اس نے سیما کو کچن میں دیکھا۔ وہ ناشتے کی تیاری کر رہی تھی، اسے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''آپ ناشتے میں کیا لیتے ہیں؟''

''تم زحمت مت کرو، میں یونیورسٹی میں ناشتا کر لوں گا۔''

''اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔'' وہ شرٹ کی آستین اوپر کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ گھر سے ناشتا کر کے جاتے ہیں۔''

''ہاں۔'' وہ اس کے سامنے چھوٹی میز پر آ گیا۔ ''میرا ملازم ہے لیکن کل اس کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔''

''اوہ۔'' سیما نے افسوس کیا۔ ''اس کی حالت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے اب۔''

''شکر ہے، آپ نے بتایا نہیں، کیا لیتے ہیں ناشتے میں؟''

''میں دیسی طرز کا ناشتا کرتا ہوں۔ پراٹھا، تلے ہوئے انڈے، آخر میں چائے، مگر تم جو آسانی سے بنا سکو، فریج میں ڈبل روٹی بھی ہے۔''

''مجھے خود ایسا ناشتا پسند ہے۔ جب تک امی تھیں منع

کرتی تھیں۔" ماں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہجہ ذرا نم ہوا مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔ پھر فریج سے گندھا آٹا نکالتے ہوئے بولی۔

اس نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے؟ بیلتے ہوئے آستین بار بار الٹ کر ہاتھوں پر آ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور بولی۔ "ذرا اسے اوپر کر دیں، بہت مسئلہ کر رہی ہے۔"

عمران نے آستین موڑ کر اوپر کی۔ اس دوران اس کی نازک سنہری جلد اس کی انگلیوں میں عجیب سا احساس جگا رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے اوپر کر دیا۔ وہ پھر سے پراٹھا بنانے میں لگ گئی۔ "میرے کپڑے سوکھ گئے ہیں مگر گندے ہو رہے ہیں۔"

"تم انہیں دھو سکتی ہو۔ یہاں واشنگ مشین اور سب چیزیں ہیں۔ ڈرائیر بھی ہے۔" عمران نے کہا۔ "کپڑے دھونے کی تمام چیزیں پیچھے ہیں، میں یونیورسٹی چلا جاؤں تو تم اپنے کپڑے دھو لینا۔"

"آپ چلے جائیں گے۔" وہ پریشان ہو گئی۔ "میں یہاں اکیلی رہوں گی۔"

"ہاں مگر تم محفوظ ہو۔ کوئی نہیں آئے گا اور تم دروازہ بھی اندر سے بند رکھنا۔ کوئی کال آئے تو ریسیو مت کرنا اور ہاں یہاں آس پاس کے لوگ جانتے ہیں، میں اکیلا رہتا ہوں اس لیے باہر مت نکلنا اور کھڑکیاں مت کھولنا۔"

"میں خیال رکھوں گی۔" سیما نے وعدہ کیا۔ اس نے تیزی سے پراٹھے بنائے اور پھر اس سے پوچھ کر خاگینہ تیار کیا۔ امید خان اچھے پراٹھے بناتا تھا۔ مگر جب عمران نے سیما کے بنائے ہوئے پراٹھے کا پہلا لقمہ لیا تو حیران رہ گیا۔ اس نے بہت مزے کا اور بالکل ایسا پراٹھا بنایا تھا جیسا اسے پسند تھا۔ پھر اس کا ہاتھ رکا نہیں۔ اسے کھاتے دیکھ کر سیما نے اپنے لیے بنایا ہوا پراٹھا بھی اس کے سامنے کر دیا تھا اور جب وہ سیر ہوا تو سیما چائے بنا رہی تھی۔

"سوری، میرا خیال ہے میں نے تمہارا پراٹھا بھی کھا لیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے ویسے بھی بھوک نہیں ہے۔ ڈبل روٹی ہے، مجھے بھوک لگی تو سینڈوچ بنا لوں گی۔"

چائے پی کر وہ یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ عجیب سا نہیں ہے۔ کل رات تک اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایک مصیبت زدہ لڑکی ملے گی اور وہ اسے یوں اپنے گھر لے آئے گا کہ وہ گھر میں بھی اکیلا ہوگا۔ لڑکی بھی غیر معمولی حسن و شباب کی حامل ہوگی۔ وہ رات اس کے گھر میں رہے گی اور صبح یوں نارمل سے انداز میں اس کے لیے ناشتا بنائے گی جیسے وہ شروع سے یہ کام کرتی آئی ہو۔ اس نے سنا تھا کہ عورت ہر صورتِ حال میں بہت جلد ایڈجسٹ کر لیتی ہے۔ مگر وہ بھی اسے اجنبی محسوس نہیں کر رہا تھا حتیٰ کہ اسے گھر میں چھوڑ کر جاتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اگرچہ گھر میں کوئی بہت قیمتی چیز نہیں تھی۔ چند ہزار کی رقم تھی جو اس کے پرس میں تھی۔ اسے جب رقم کی ضرورت ہوتی وہ نزدیک کسی اے ٹی ایم سے نکلوا لیتا تھا۔ یہ اکاؤنٹ اسے صمد اللہ نے کھلوا کر دیا تھا اور اس نے آج تک اسٹیٹ منٹ نہیں لی تھی کہ اس میں کتنی رقم ہے؟ اس نے جب اور جتنی رقم نکلوانا چاہی وہ آرام سے نکل آئی۔

یہ سب سوچتے ہوئے وہ مضطرب رہا اور لیکچر پر بھی زیادہ توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔

آخری کلاس چھوڑ کر وہ اسپتال آیا۔ امید خان کی کیفیت بہتر تھی اور ڈاکٹروں کے مطابق وہ مزید چار دن بعد ڈسچارج کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بھائی نے عمران سے کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جائیں گے۔ عمران نے اجازت دے دی کہ جب تک وہ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتا گاؤں میں رہ سکتا تھا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ رہ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب گھر کے پاس پہنچا تو اسے پھر وہی گھبراہٹ ہونے لگی... اور اب اسے خود پر غصہ آیا۔ اس نے خود سے کہا کہ سیما صرف ایک لڑکی ہے اور وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس کے باوجود اندر جاتے ہوئے اس کی کیفیت برقرار تھی۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ کاش وہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہو اور یہاں سے جا چکی ہو۔ بے شک وہ اس کا گھر صاف کر گئی ہو۔ مگر جب وہ اندر آیا تو سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا۔

سیما لاؤنج اور نشست گاہ میں نہیں تھی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے رکا اور دستک دی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ دستک دی اور اس بار بھی جواب نہیں آیا تو اس نے فکرمند ہو کر دروازہ کھولا۔ کمرا خالی تھا اور وہاں مکمل سکوت تھا۔ وہ اندر آیا تب اس نے دیکھا سیما کا رات والا لباس دھلا اور استری شدہ سلیقے سے بیڈ پر رکھا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ سیما کہاں ہے کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور وہ یوں سامنے آئی کہ اس نے جسم پر صرف تولیا

لپٹا ہوا تھا جو اسے بہ مشکل ہی چھپا رہا تھا۔ مگر تولیا بھی گلابی رنگ کا تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ کہاں تولیا ختم ہو رہا ہے؟ عمران کو دیکھ کر وہ چونکی اور ہلکی سی چیخ کے ساتھ جلدی سے دروازے کے پیچھے ہو گئی۔ عمران کے منہ سے بے ساختہ لاحول نکلی اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس بار بھی جاتے ہوئے وہ لاک کا بٹن اندر سے دبا گیا تھا۔

باہر آنے پر بھی اس کا دل دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور وہ دل میں بار بار لاحول پڑھ رہا تھا۔ پورے جسم میں گرمی کی ایسی لہر آئی کہ وہ لمحوں میں پسینے پسینے ہو گیا۔ رہ رہ کر وہ گلابی منظر سامنے آ رہا تھا اور اس کا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے فریج کھولا اور اندر رکھی یخ بستہ بوتل نکال کر منہ سے لگائی تو اس کا آخری قطرہ تک پی گیا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے کے واش روم میں آیا اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ جسم پر سرد پانی گرا تو رفتہ رفتہ جذبات کے درجہ حرارت میں کمی آنے لگی۔ جب وہ معتدل ہو گیا تو لباس پہن کر باہر آیا جہاں سیما لاؤنج میں صوفے پر شرمندہ سی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور دوپٹے کی جگہ ایک سوتی چادر لی ہوئی تھی۔ عمران خود شرمندہ تھا وہ اس کے کمرے میں گیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معذرت کیسے کرے۔ اس سے بات تو کیا اس کا سامنا بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کچن کی میز پر آ گیا۔ اس کی مشکل سیما نے خود آسان کی وہ اٹھ کر آئی اور پوچھا۔ ”کھانا لگاؤں۔“

عمران نے سر ہلایا اور بولا۔ ”آئی ایم سوری، مجھے اس طرح آپ کے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”یہ پورا گھر آپ کا ہے جہاں چاہیں آئیں جائیں، غلطی میری تھی۔ میں نے کپڑے باہر چھوڑے اور دروازہ لاک کیے بغیر نہانے لگی۔“ اس نے محجوب لہجے میں کہا۔

”پھر بھی مجھے اس طرح نہیں آنا چاہیے۔ میں نے دو بار ناک کی تھی مگر جواب نہیں ملا تو میں اندر آ گیا۔“

”شاور آن تھا اس لیے مجھے آواز نہیں آئی۔“ ساتھ ہی وہ میز پر کھانا لگانے لگی۔

”سوری، میں نے آپ سے پوچھے بنا آپ کے کچن کی چیزیں استعمال کیں۔“

”اس میں سوری کی کیا بات ہے۔“ عمران نے سونگھتے ہوئے کہا کیونکہ ڈش سے نہایت اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یہ خوشبو بتا رہی تھی کہ ڈش لاجواب ہو گی اور پہلے ہی نوالے میں اس کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے بے ساختہ تعریف کی تو سیما خوش ہو گئی۔

”سچ کہہ رہے ہیں نا، میرا دل تو نہیں رکھ رہے۔ کڑاہی اچھی بنی ہے نا؟“

”اگر میں کہوں کہ میں نے آج تک اتنی اچھی مٹن کڑاہی نہیں کھائی تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا۔“

”میں نے ڈرتے ڈرتے بنائی ہے کہ پتا نہیں آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔“

”تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔“

”میں نے امی سے پکانا سیکھا ہے۔ بہت کم عمری سے کھانا بنا رہی ہوں کیونکہ امی جاب کرتی تھیں۔ اس سے مجھے ڈشیں بنانا آ گئیں۔ کچھ میں نے کوشش کر کے سیکھی ہیں۔“

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کھانے کے بعد جب وہ اس کے لیے چائے بنا کر لائی تو عمران نے جھجک کر پوچھ لیا اور وہ مرجھا گئی۔ اس نے بے بسی سے عمران کی طرف دیکھا۔

”میں نے بہت سوچا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ اس ظالم سے بچنے کے لیے کہاں پناہ لوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی رشتے دار ایسا نہیں ہے جس کے گھر رہ سکوں۔ واپس اپنے گھر جا سکتی ہوں لیکن وہاں محفوظ ہوتی تو مجھے یوں نہ اٹھا لیا جاتا۔“

”تم فکر مت کرو۔“ عمران نے اسے تسلی دی۔ ”جب تک تم سوچ نہیں لیتی ہو، یہاں محفوظ ہو۔“

”لیکن میں آپ پر بوجھ ہوں۔“

”پلیز ایسا مت کہو، میں ایسا بالکل بھی نہیں سمجھ رہا بلکہ دیکھا جائے تو تم میرے کام آئی ہو، مجھے باہر کا کھانا اچھا نہیں لگتا ہے۔ امید خان ابھی ایک مہینے تک چھٹی پر ہے اور تم نے مجھے باہر کے کھانے سے بچا لیا ہے۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”میں جب تک یہاں ہوں آپ کے لیے کھانا بناؤں گی بلکہ گھر کے سارے کام کر دیا کروں گی۔“

عمران نے کہا۔ ”خدا کے لیے، ہم مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ ہیں، تم مہمان ہو یہاں نوکر نہیں ہو جو سارے کام کرو۔“

”مہمان بھی اپنی خوشی سے بہت کچھ کرتے ہیں، اگر میں اپنی خوشی سے کروں تو؟“

”جیسے تمہاری خوشی لیکن تم سے کام کرا کے مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ کھانے کی تو مجبوری ہے، بلکہ میں باہر سے لا سکتا ہوں۔“

"نہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ "مجھے باہر سے کھانا بالکل پسند نہیں ہے۔ جب تک میں ہوں، کھانا میں ہی بناؤں گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اب عمران نے ہتھیار ڈال دیے۔

"رات میں کیا کھائیں گے ویسے کڑاہی موجود ہے مگر اور سامان نہیں ہے۔"

"امید خان سامان لینے جا رہا تھا کہ اس کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا۔ سامان میں لے آتا ہوں تم بتا دو کیا لانا ہے۔ مقدار بھی بتا دو۔"

"میں پرچہ بنا دیتی ہوں۔"

عمران نے شاذ ہی گھر کے سامان کی خریداری کی تھی، وہ تو ذاتی خریداری بھی کم کرتا تھا۔ سیما نے اسے فہرست بنا کر دی اور ایک گھنٹے بعد وہ آبپارہ میں خریداری کر رہا تھا۔ وہاں اسے سامان لیتے ہوئے خیال آیا کہ سیما کے پاس ایک ہی لباس تھا اور اس میں بھی دوپٹا نہیں تھا۔ اسے مزید کپڑوں کی ضرورت تھی۔ وہ وہاں سے جناح سپر مارکیٹ آیا جہاں ریڈی میڈ گارمنٹس اور دوسری چیزیں دستیاب تھیں۔ اس نے موسم کی مناسبت سے اس کے لیے ایک ریڈی میڈ سوٹ لیا اور موجودہ لباس کی مناسبت سے ایک دوپٹا لیا تھا۔ ایک سینڈل اور گھر میں پہننے والی چپل بھی لے لی۔ ناپ اس نے اندازے سے لیے تھے۔ سامان کے ساتھ اس نے سیما کی چیزوں کا شاپر اسے تھمایا۔ "یہ تمہارے لیے ہے۔"

"اس میں کیا ہے؟"

"ضرورت کی کچھ چیزیں ہیں۔"

اس نے شاپر کھول کر چیزیں نکالیں اور پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ دوپٹا تو ٹھیک ہے لیکن سوٹ اور سینڈل لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت ہے، تم ایک ہی سوٹ تو نہیں پہنی رہو گی اور اگر باہر جاؤ گی تو گھر کی چپل میں تو نہیں جاؤ گی۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ سوٹ کیسا لگا؟"

"اچھا ہے۔" وہ بولی اور اسے واپس شاپر میں رکھنے لگی تو عمران نے روکا۔

"چیک کر لو اگر ناپ میں مسئلہ ہوا تو میں چینج کرا لوں گا۔"

وہ سوٹ لے کر اندر گئی اور کچھ دیر بعد چینج کر کے آئی۔ سوٹ اس پر بج گیا تھا۔ یہ کسی قدر تیز کھلتے بہار کے رنگوں والا سوٹ تھا اور بالکل فٹ آیا تھا۔ اس نے عمران سے پوچھا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بہت اچھی۔" اس نے سچائی سے کہا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اسے خوش دیکھ کر عمران بھی مسکرا دیا۔ اس کی ابتدائی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی اور اب وہ سیما کے سامنے خود کو پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ اس نے ذہنی طور پر اس گھر میں اس کی موجودگی قبول کر لی تھی۔ گلابی رنگ کی سوفٹی میں اس کے پیر جیسے دو گلابی کبوتر لگ رہے تھے۔ اس نے نیا سوٹ پہنے رکھا اور اس کے سامنے آبیٹھی۔ اس نے سادگی سے پوچھا۔

"آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا نہیں۔"

"بتایا تو تھا کہ مانسہرہ سے تعلق ہے۔ خاندانی زمیندار ہیں مگر میں تعلیم کو ضروری سمجھتا ہوں۔ ماں باپ میرے بچپن میں ایک حادثے میں گزر گئے تھے مگر میرے چچا چچی نے ان کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ ایک کزن ہے۔ ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔"

"آپ اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں کہ آپ کے پاس چاہنے والے رشتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کزن کے بارے میں نہیں بتایا کہ لڑکی ہے یا لڑکا؟"

"روبی نام ہے اور مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔

اس وقت وہ بی اے کر رہی ہے۔"
"اچھا۔" سیما بولی پھر اس نے موضوع بدل دیا۔
"آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔"
عمران نے اسے بتایا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے تو سیما نے اس سے جیوگرافک کے حوالے سے ایسی گفتگو کی کہ وہ حیران رہ گیا۔ "تم اس بارے میں جانتی ہو؟"
"ہاں۔" اس نے چہرے پر آجانے والے بال پیچھے کیے۔ "میری کوئی سوشل لائف نہیں تھی۔ مطلب کہ مجھے دوست بنانے کا شوق نہیں تھا۔ کالج سے آنے کے بعد گھر کے کام کرتی تھی اور جو فارغ وقت ملتا تھا، اس میں پڑھتی تھی اس لیے میں بہت سے شعبوں کے بارے میں جانتی ہوں۔"
اس سے بات کر کے عمران کو لگا جیسے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ علم رکھتی ہو۔ دیکھنے میں وہ زیادہ عمر کی نہیں لگتی تھی۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا اور الفاظ کے چناؤ کا اختیار تھا۔ پھر بات کا رخ اس کے مسئلے کی طرف مڑ گیا اور عمران نے کہا۔ "کچھ دن رک جاؤ اس کے بعد دیکھتے ہیں، ہوسکتا ہے میں خود تمہارے گھر جا کر دیکھ لوں کہ وہاں کیا حالات ہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر میں کوئی نقدی یا زیور تو نہیں ہے۔"
"کچھ رقم ہے شاید دس گیارہ ہزار ہوگی اور امی نے میرے لیے زیور بنایا تھا چار تولے ہوگا۔ باقی گھر کا سامان ہے اور گھر بھی میرا ہے۔"
"یہ سب دیکھ لیں گے اگر تمہاری سیٹنگ کہیں اور ہو گئی تو مکان اور اس کا سامان بک سکتا ہے۔ تمہارے ڈاکو منٹس بھی گھر پر ہوں گے؟"
"ظاہر ہے میں تو سوتے سے اغوا کی گئی تھی۔"
عمران سوچ رہا تھا کہ وہ ایک دو دن میں اس کے گھر چکر لگا کر دیکھے گا کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے پھر اس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ وہ شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ بدمعاش اس کے پیچھے اس کے گھر تک نہیں آئے ورنہ یہ جگہ ان کی نظر میں آتی تو وہ یہاں بھی گھس سکتے تھے۔ اگرچہ عمران کمزور نہیں تھا اور اس کے پاس لائسنس یافتہ پستول اور شاٹ گن بھی تھی۔ مگر بہرحال وہ شریف آدمی تھا۔ بدمعاشوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ان سے دور رہے۔ اس نے سیما سے کہا۔ "ہم تاریکی میں گھر آئے تھے اور بارش ہو رہی تھی ممکن ہے ان بدمعاشوں نے پیچھا کیا ہو اور یہاں تک آئے ہوں۔"

سیما گھبرا گئی۔ "آپ... آپ کا مطلب ہے کہ وہ یہاں میری موجودگی سے واقف ہیں۔"
عمران نے تسلی دی۔ "میں نے ایک امکان کی بات کی ہے مگر تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ کسی کھلی جگہ جانے سے گریز کرو اور کسی کھڑکی سے بھی مت جھانکنا۔"
"آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں پہلے ہی اس پر عمل کر رہی ہوں۔" سیما نے اسے اطمینان دلایا۔
گفتگو کے دوران میں فون کی بیل بجی۔ سیٹ لاؤنج میں رکھا ہوا تھا اس نے کال ریسیو کی، نمبر حویلی کا آرہا تھا، دوسری طرف روبی تھی۔ وہ اسے بہت کم کال کرتی تھی۔ عام طور سے کسی موقع پر کرتی تھی جیسے مبارک دینی ہو یا برتھ ڈے وش کرنی ہو اس لیے عمران کو تعجب ہوا۔ مگر اس نے سیما کی موجودگی کی وجہ سے ذرا محتاط انداز میں پوچھا۔ "کیا حال ہیں، خیریت آج تم نے کال کی ہے۔"
"کیا میں کال نہیں کرسکتی؟"
"کیوں نہیں کرسکتیں۔ مگر تم کرتی کہاں ہو؟"
"وہ مجھے پتا چلا کہ امید اسپتال میں ہے تو آپ کے کام کون کر رہا ہے؟"
"کوئی نہیں۔" اس نے ہچکچا کر جھوٹ بولا۔ "مجبوری ہے۔"
"کھانا باہر سے کھا رہے ہوں گے آپ کو تو گھر کا پسند ہے۔"
"میں نے کہا نا مجبوری ہے۔"
"میں نے بابا سے کہا ہے کہ یہاں سے کسی اور کو بھیج دیں۔"
یہ سن کر عمران گھبرا گیا۔ سیما کی موجودگی میں وہ یہاں کسی کا آنا پسند نہیں کرتا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے کچھ دن کی بات ہے میں گزارا کرلوں گا۔"
"نہیں، آپ کو ضرورت ہے۔ آپ کی تعلیم کا حرج ہو گا اگر دوسرے کاموں میں پڑیں گے۔"
"نہیں ہوگا اور دوسرے میں امید خان کا عادی ہوں، دوسرا اس کی طرح مجھے نہیں سمجھے گا۔ تم چچا جان کو منع کردو کہ ابھی کسی کو نہ بھیجیں۔"
روبی خاموش ہوگئی پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں منع کردوں گی۔ ویسے کوئی آیا ہوا ہے؟"
عمران حیران ہوا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"آپ کے انداز سے، آپ مجھ سے اس طرح ریز رو ہو کر بات اس وقت کرتے ہیں جب کوئی آس پاس

ہو۔''

''ہاں ایک یونیورسٹی فیلو ہے۔'' عمران نے پھر جھوٹ بولا۔ اسے جھوٹ بولنے سے چڑ تھی مگر اس وقت مجبوری تھی۔ ''چچا جان اور چچی جان کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اپنے دوست کو کمپنی دیں۔''

''خدا حافظ۔'' عمران نے کہا اور ریسیور رکھ کر سکون کا سانس لیا اسے خوف تھا کہ کہیں روبی، سیما کی بائیں کلائی میں موجود دھاتی چوڑیوں کی کھنک نہ سن لے جو اس کے کلائی ہلانے سے پیدا ہو رہی تھی۔

☆☆☆

روبی نے چھپ کر کال کی تھی۔ ویسے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر اسے باپ تو کیا ماں کے سامنے بھی فون پر عمران سے بات کرتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے وہ اس وقت کال کرتی تھی جب ماں باپ اِدھر اُدھر ہوں۔ اٹھارہ سال کی اور بی اے میں ہونے کے باوجود اسے موبائل نہیں ملا تھا۔ حویلی میں صرف دو موبائل تھے اور وہ دونوں صمد اللہ کے پاس ہوتے تھے۔ صمد اللہ لڑکیوں کے موبائل رکھنے کے سخت خلاف تھا اور ایک بار روبی نے ماں کے توسط سے موبائل کی فرمائش کی تو اس نے کہا۔ ''اسے کہہ دو جب اس کی شادی ہو جائے تو اپنے شوہر سے کہہ کر موبائل لے لینا۔ یہاں ماں باپ کے گھر اسے موبائل نہیں ملے گا۔''

روبی کو اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس اس کی کچھ کالج کی سہیلیوں کے پاس موبائل تھا اس لیے اسے بھی شوق ہوا ورنہ اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ موبائل پر عمران سے رابطہ کرے گی۔ اگرچہ وہ عمران سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس کی سوچیں اسی کے گرد گھومتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے لیے ہے اور اس کے ذہن میں کبھی معمولی سا خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اس کے سوا کسی کا ہو سکتا ہے۔ جب وہ پڑھنے کے لیے شہر گیا تب بھی روبی کے ذہن میں ایسا کوئی خدشہ نہیں آیا۔ جبکہ وہ جانتی تھی کہ عمران کو ایجوکیشن میں پڑھ رہا ہے۔ مگر آج جب اس نے کال کی تو پہلے تو اسے عمران کا لہجہ اور انداز تھوڑا الگ سے لگا پھر اس سے بات کرتے ہوئے مسلسل عقب سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے چوڑیاں کھنک رہی ہوں۔ پھر اس نے پوچھا تب بھی عمران کا لہجہ بدل گیا تھا اور اس نے صرف یہ کہا کہ اس کا یونیورسٹی فیلو ہے، اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟ آخر عمران نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ وہاں کوئی لڑکی یا عورت ہے؟ یہ خیال اس کے ذہن میں آیا مگر اس کے باوجود اسے عمران پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ اس کا یقین اسی طرح برقرار رہا کہ عمران صرف اس کا ہے اور اسی کا رہے گا۔

☆☆☆

سیما بدستور چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''کزن تھی؟''

''ہاں! اسے فکر ہے کہ میں ملازم کے بغیر کیسے رہوں گا۔''

''آپ نے میرے بارے میں نہیں بتایا؟'' وہ سادگی سے بولی۔ ''مجھے یونیورسٹی فیلو بنا دیا۔''

عمران کھسیا گیا۔ ''مجبوری تھی، میں تمہارے بارے میں کس طرح بتا سکتا ہوں؟''

''مرضی آپ کی ورنہ اس میں چھپانے والی بھی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی اور کھڑی ہو گئی پھر اندر جاتے ہوئے بولی۔ ''آپ ایک مجبور اور بے سہارا لڑکی کی مدد کر رہے ہیں۔''

وہ اس کے جانے کے بعد سوچتا رہ گیا کہ واقعی اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے۔ شاید وہی مخصوص اور محدود معاشرتی ذہنیت کہ اس گھر میں ایک لڑکی کی موجودگی کا غلط مطلب نہ نکالا جائے جبکہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں یہ بات سیما کے دل کو نہ لگی ہو۔ وہ اس وقت زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی تھی اور اس کا دل حساس ہو رہا تھا۔ جب وہ کہہ رہی تھی تو آخر میں اس کا لہجہ بھرّا گیا تھا۔ وہ اس کے کمرے تک آیا اور دروازے پر دستک دی۔ پہلی بار جواب نہیں آیا تو اس نے دوبارہ دستک دی۔ تب اندر سے اس کی دھیمی اور بھیگی سی آواز آئی۔ ''آ جائیں۔''

وہ اندر داخل ہوا تو ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کا لرزتا جسم بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ چند لمحے کے لیے عمران کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟ اسے اس طرح دیکھنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ وہ جب اسے دیکھتا تو اسے احساس ہوتا کہ وہ بے انتہا خوب صورت ہے۔ قدرت نے اسے کسی شاہکار کی طرح تراشا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد وہ اس کی طرف بڑھا اور نزدیک آ کر بولا۔ ''پلیز، آئی ایم سوری۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''آپ کیوں سوری کر رہے ہیں، آپ کا کیا قصور ہے۔ قصور میرا ہے۔ پہلے ایک جابر نے مجھ پر تسلط جمانا چاہا اس سے بچی تو آپ کے پاس ہوں مگر یوں جیسے

یہاں غلط طور پر رہ رہی ہوں۔"
"میں کیا کروں، تم جانتی ہو ہمارے معاشرے اور اس میں رہنے والے لوگوں کی ذہنیت؟" اس نے بے بسی سے کہا۔"میں کیسے کسی کو بتاؤں کہ میں نے ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کو صرف پناہ دی ہوئی ہے۔ اسے عزت سے مہمان کی طرح رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے گھر والے مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں مگر ان کے دل میں کوئی خیال آجائے تو؟"
سیما نے چہرہ صاف کیا۔"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ابھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔"
"تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہیں جانے دیتا۔"
سیما نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔"مجھے معلوم ہے آپ مجھے جانے نہیں دیتے اس لیے میں خاموشی سے چلی جاتی۔"
"ہرگز نہیں۔" عمران مضطرب ہو گیا۔"اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لو کہ میرے خلوص کے منہ پر تھپڑ مار کر جاؤ گی۔ اگر تمہیں میرا اپنے گھر والوں سے چھپانا برا لگا تو میں ابھی کال کر کے چچا جان کو بتا دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ بھی مجھ پر شک نہیں کریں گے۔"
"نہیں، اس سے آپ مشکل میں پڑ جائیں گے اور میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" اس نے اپنے بکھر جانے والے بال سمیٹنا شروع کیے۔ دوپٹا سرک گیا تھا اور اس کا بدن یوں نمایاں ہوا کہ عمران کو پھر نظریں چرانا پڑیں۔ مگر سیما کے انداز میں اتنی سادگی اور معصومیت تھی کہ وہ اسے بے ساختہ ہی سمجھا تھا۔
"مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔" عمران نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ باہر نکل کر اس نے چند گہرے سانس لیے اور پانی پی کر اپنے اندر جمع ہونے والی گرمی کو سرد کیا۔ اب وہ سیما کی موجودگی سے دوسری طرح کی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ پہلے وہ اس کے لیے اجنبی تھی مگر اب ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے۔ وہ اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ مرد کی فطرت ہے کہ وہ اپنے پاس اور اپنی پناہ میں آنے والی عورت پر اپنا حق سمجھنے لگتا ہے اگر اسے اپنی عورت کی طرح نہ سمجھے تب بھی کسی قدر حق تو سمجھتا ہی ہے اور ایسا ہی عمران بھی اس پر محسوس کر رہا تھا۔ اس میں کچھ ہاتھ سیما کا بھی تھا۔ وہ یوں اس کے سامنے بے تکلف اور خود سے بے پروا ہو جاتی جیسے وہ اس کے لیے محرم ہو۔ یہ تبدیلی بہت تیزی سے آئی تھی اور ابھی اسے یہاں آئے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ سوچتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں وہ منظر آیا جب سیما تولیا میں واش روم سے باہر آئی تھی۔
"لاحول ولا..." اس نے دل میں کہا مگر جب اس منظر نے پیچھا نہیں چھوڑا تو وہ کمرے میں آگیا۔ وہ ہر دن نیا لباس پہنتا تھا۔ البتہ گھر والے کپڑے ایک دو دن چل جاتے تھے۔ وہی اس کا نائٹ سوٹ بھی ہوتے تھے اور کہیں آس پاس جانا ہوتا تو ان ہی کپڑوں میں چلا جاتا تھا۔ گھر میں وہ عام طور سے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں وہ صبح اور رات سونے سے پہلے شاور لیتا تھا مگر اس وقت وہ ذہن بٹانے کے لیے واش روم میں آگیا اور شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ جب ذہن پُرسکون ہوا تو وہ تولیا باندھ کر باہر آیا اور الماری سے صاف ٹراؤزر اور ٹی شرٹ نکال رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور سیما کی جھلک دکھائی دی مگر اسے دیکھتے ہی وہ اوٹ میں ہو گئی۔
"سوری... وہ میں چائے کا پوچھنے آئی تھی۔"
"بنا لو۔" عمران نے کہا تو دروازہ بند ہو گیا۔ وہ باہر آیا تو چائے بناتی سیما جھینپ گئی۔ اس نے ایک بار پھر معذرت کی۔
"میں نے ایک بار ناک کیا تھا مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔"
"میں بھی شاور میں نہیں سن سکا۔" اس نے بے ساختہ کہا اور پھر جھینپ گیا۔ اس نے دل میں خود کو برا بھلا کہا کہ وہ سوچے سمجھے بغیر کیوں بول رہا ہے اور یہ کہ معاملہ کس طرف جا رہا ہے؟ سیما اس کے لیے صرف ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی اسے اس کے بارے میں کسی اور انداز سے سوچنا چاہیے مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں سوچیں آرہی تھیں۔ پھر سیما کی معصومیت اور اجنبی مردوں کے حوالے سے ناتجربہ کاری بھی مسئلہ کر رہی تھی۔ اسے جس طرح رہنا چاہیے تھا، وہ اس طرح ری ایکٹ نہیں کر رہی تھی۔ مگر عمران اس سے یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے برا نہ لگے اور اس کا دل نہ دکھ جائے۔ چائے لا کر اس کے سامنے رکھی تو عمران نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھا۔"بس میرے لیے لائی ہو؟"
"ہاں میں چائے صرف صبح ناشتے میں لیتی ہوں۔ مجھے عادت نہیں ہے۔"

"لیکن کل تو لے لی تھی۔"

"ہاں اس وقت میں بہت ٹینشن میں تھی۔"

"اور اب۔"

"اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے میں خود کو آپ کی پناہ میں محفوظ سمجھ رہی ہوں۔" وہ چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ یہ اس کی عادت تھی۔

"حالانکہ میں بھی تمہارے لیے اجنبی ہوں۔"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "آپ میرے لیے اب اجنبی نہیں ہیں۔"

"ابھی ہمیں ملے زیادہ گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔"

"ہاں، لیکن اس کے باوجود مجھے اجنبی نہیں لگ رہے۔" سیما نے کہا اور پھر بات بدل دی۔ "مجھے ایک خیال آیا ہے۔"

"کیا؟"

"آپ مجھے کہیں نوکری نہیں دلوا سکتے جہاں مجھے رہائش بھی مل جائے اور میں کسی کی نظروں میں بھی نہ آؤں۔"

"شاید ایسا ہی کرنا پڑے لیکن ابھی ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں تمہیں بے فکر ہو کر بھجوا سکوں۔ مجھے تلاش کرنا پڑے گا اور جب مجھے اطمینان ہو جائے گا تب ہی میں تمہیں کہیں بھیج سکوں گا۔"

"میں کسی وومین ہوسٹل میں بھی رہ سکتی ہوں۔"

"نہیں وہ حوالے مانگتے ہیں اور پھر تم ان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات کیسے افورڈ کرو گی۔"

"میں اپنا مکان سیل کر دوں گی، اس سے ملنے والی رقم ڈپازٹ کرا دوں گی تو مجھے کچھ نہ کچھ تو ملتا رہے گا۔" اس نے وکیل سے کہا۔ "میرے پاس حوالے ہیں، تمام ڈاکومنٹس ہیں، میں کوئی بے نام تھوڑی ہوں۔"

"تب ممکن ہے۔" عمران نے کہا۔

"مجھے بھی یہی مناسب لگ رہا تھا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "مگر آپ نے بھی کہہ دیا تو یہی سب سے ٹھیک ہے۔ پھر ہو سکتا ہے مجھے کوئی ملازمت بھی مل جائے۔"

عمران کو بھی یہ خیال اچھا لگا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے سب سے پہلے تمہارا مکان دیکھنا ہوگا۔"

سیما سہم گئی۔ "کیا میں بھی جاؤں گی؟"

"نہیں تم پتا بتا دو میں خود چلا جاؤں گا۔"

اگلے دن اسے کچھ اور کام نمٹانے تھے۔ تھانے سے بائیک لے کر مکینک کے حوالے کی۔ اسپتال میں مزید رقم ادا کرنا تھی۔ نام کو سرکاری اسپتال تھا مگر اخراجات نجی اسپتالوں سے کم نہیں تھے۔ صبح یونیورسٹی اور پھر یہ کام نمٹاتے ہوئے اسے شام ہو گئی۔ اس نے سیما کو بتا دیا تھا کہ اگر اسے دیر ہو جائے تو وہ پریشان نہ ہو۔ اس نے سیما کے مکان کا پتا لے لیا تھا۔ اسے وہاں پہنچتے ہوئے رات ہو گئی تھی۔ یہ اسلام آباد کا چھوٹے درجے کے ملازمین کے لیے وقف علاقہ تھا جہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ سیما کا مکان گلی کے آخری سرے پر تھا اور اس کے سامنے چھوٹا سا جنگل بھی آ جاتا تھا۔ ایک اکیلی لڑکی کے لحاظ سے یہ جگہ بالکل غیر محفوظ تھی اور مکان دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ اغوا کرنے والے اتنی آسانی سے اس کے مکان میں کیسے گھس گئے تھے۔ اس کا صحن کھلا تھا اور کوئی بھی آسانی سے گیٹ کود کر اندر جا سکتا تھا۔ جانے والوں نے یقیناً ایسا ہی کیا ہوگا۔

گیٹ اندر سے بند تھا اور اسے آس پاس کوئی مشکوک شخص نظر نہیں آیا۔ یہ جگہ سنسان تھی اور آبادی کے کونے میں ہونے کی وجہ سے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ چاہتا تو اندر بھی جا سکتا تھا مگر اس کے لیے اسے گیٹ پھلانگنا پڑتا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا کرے اور اسے یہی مناسب لگا کہ بعد میں بھی سیما کو ساتھ لے کر آئے اور وہی اپنے مکان کے اندر جائے، اس کا کسی بھی طریقے سے اندر جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ واپس آیا اور جب اندر آیا تو سیما بے قراری سے اس کا انتظار کر رہی تھی، اسے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ "شکر ہے آپ واپس آ گئے، میں پریشان ہو رہی تھی۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس آدمی کے بدمعاش میرے مکان کی نگرانی نہ کر رہے ہوں۔" سیما بولی۔ "مجھے آپ کا خدشہ تھا کہ کہیں وہ آپ کو نہ روک لیں یا پیچھے لگ کر نہ آ جائیں۔"

"بے فکر رہو، میں نے پورا خیال رکھا۔ میں تو اپنی جیپ بھی تمہارے مکان سے خاصی پیچھے چھوڑ کر گیا تھا۔ تمہارا مکان اندر سے بند ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا۔ یہ بتاؤ کہ محلے والوں سے تمہارا ملنا جلنا نہیں تھا؟"

"بہت کم، بس امی ملتی تھیں، ان کے بعد کوئی پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ میں اکیلی ہی سارا دن گھر میں پھرتی رہتی تھی۔"

"وہ جگہ تمہارے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ تمہارا وومین ہوسٹل والا آئیڈیا بہترین ہے۔" عمران نے

کہا۔ ”یہ بتاؤ آج کیا بنایا ہے؟“
”پزا کیسا لگتا ہے؟“
”بہت اچھا۔“
”بس آج وہی بنایا ہے۔ سامان تھا، میں نے سوچا کہ آپ کو اپنے ہاتھ کا پزا کھلاتی ہوں۔“
”تیار ہے؟“
”ہاں مائیکرو ویو میں رکھا ہے، آپ ہاتھ دھو کر آجائیں۔“

سیما نے دو طرح کے پزا بنائے تھے اور دونوں ہی لاجواب تھے۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنک تھی۔ دونوں پزا ایکسٹرا لارج سائز میں تھے اس لیے اس نے دل کھول کر کھائے۔ تندوری تکے والے پزا میں مرچیں کسی قدر زیادہ تھیں اور وہ کولڈ ڈرنک کے کئی گلاس خالی کر گیا تھا۔ جب میز سے اٹھا تو سانس بھی کسی قدر مشکل سے آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج سونے سے پہلے چہل قدمی لازمی ہے ورنہ نیند نہیں آئے گی۔ سیما نے چائے کا پوچھا مگر اس نے منع کر دیا اور باہر پورچ میں نکل آیا۔ ٹہلنے سے پیٹ کی گرانی کم ہوئی تھی مگر دل عجیب سا ہونے لگا۔ ذہن چکرا رہا تھا اور اسے اپنی توجہ مرکوز رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ایک بار اسے چکر سا آیا تو اس نے جیپ کے بونٹ کا سہارا لیا۔ پتا نہیں اسے کیا ہو رہا تھا؟ چکر ایسا تھا کہ سارا منظر نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس کا ہاتھ بونٹ پر زور سے لگا تو اندر سے سیما نے جھانکا۔
”کیا ہوا، آپ ٹھیک ہیں؟“
”ہاں، کچھ چکر سے آرہے ہیں۔“
وہ پریشان ہو گئی۔ ”میں آؤں؟“
”نہیں، تم باہر مت آؤ میں آرہا ہوں۔“ اس نے کہا اور ڈولتے قدموں سے دروازے تک آیا۔ سیما اسے دیکھ رہی تھی، وہ دروازے تک آیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اندر آیا اور ایک بار پھر اس کا سر چکرایا۔ سیما نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے اسے سہارا دیا تھا اور اس کا وزن اپنے نازک وجود پر لے لیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔
”کیا ہوا ہے آپ کو، ابھی تو ٹھیک تھے۔“
”پتا نہیں۔“ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”چکر سے آرہے ہیں اور دل عجیب سا ہو رہا ہے۔“
”آئیں میں آپ کو کمرے تک لے جاتی ہوں۔“ سیما نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔ سہارا دینے کی کوشش میں اس کا نرم و نازک وجود عمران کے جسم میں پیوست ہو رہا تھا اور اسے محسوس کر کے اس کا دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کسی طرح اس کے ساتھ اپنے بیڈ تک آیا۔ سیما اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں وہ عمران سمیت بیڈ پر یوں گری کہ وہ اس کے نیچے دب گئی تھی۔ عمران کو آخری چیز جو یاد تھی وہ اس کے اوپر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے ہوش آیا تو بستر پر بے ترتیب لیٹا ہوا تھا اور نہ صرف اس کا لباس بلکہ بیڈ کی چادر بھی بری طرح مسلی اور سمٹی ہوئی تھی۔ وہ چونک کر اٹھا اور جلدی سے اپنا لباس درست کیا۔ بیڈ کی چادر پوری طرح بگڑی ہوئی تھی۔ ایک خدشے کے ساتھ وہ تیزی سے اٹھا اور اپنا سر تھام لیا۔
”میرے خدا کیا مجھ سے کوئی گناہ ہو گیا ہے؟“
”سیما۔“ اس نے باہر آتے ہوئے کہا۔ وہ لاؤنج میں موجود تھی۔ اس نے اپنا پرانا لباس پہن لیا تھا اور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔
”میرے پاس مت آئیں، مجھے مت دیکھیں۔ میں اس قابل نہیں رہی ہوں۔“
”سیما کیا ہوا ہے؟“ اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے کچھ یاد نہیں ہے لیکن...“
”میں برباد ہوئی ہوں۔“ وہ رونے لگی۔ ”آپ کو بھی برباد کیا، کاش کہ میں یہاں نہ آتی۔“
عمران نے سر پکڑ لیا۔ ”اللہ کی قسم، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“

سیما روتی رہی اور وہ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ سب کچھ اتنا واضح تھا کہ مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ آخری یادداشت جو ذہن میں تھی وہ سیما سمیت بیڈ پر گرا تھا اور پھر اس کا ذہن بلینک ہو گیا۔ مگر سیما کا رونا بستر کی حالت اور اس کا لباس خود گواہی دے رہا تھا۔ سیما کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ عمران تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“
”کسی ایسی جگہ جہاں مجھے آسانی سے موت آجائے۔“
”پلیز سیما جو ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔“
”پھر کس کا قصور ہے، آپ کا؟“
”ہاں یہ میرا قصور ہے۔“
”اور آپ کہتے ہیں آپ کو کچھ یاد نہیں ہے۔“
”اس کے باوجود یہ میرا ہی قصور ہے۔“

''قصور کسی کا بھی ہو سزا مجھے ہی ملے گی۔ میں لڑکی ہوں اور کمزور ہوں۔ بھگتنا مجھے پڑے گا۔'' وہ آگے بڑھی۔ ''مجھے جانے دیں۔''

''تم ایسے نہیں جاسکتی ہو۔'' عمران نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''قصور میرا ہے تو سزا صرف تمہیں نہیں مجھے بھی ملے گی۔''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''آپ کو کیسی سزا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میری سزا یہ ہے کہ میں تمہیں اپناؤں گا۔''

اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ ''آپ مجھ سے شادی کریں گے؟''

''ہاں کیونکہ اب ایک یہی راستہ رہ جاتا ہے۔ میں اپنے کیے کی کسی حد تک تلافی کرسکوں۔'' عمران کو کہتے ہوئے روبی کا خیال آیا۔ اس کے اس فیصلے سے اس پر کیا گزرے گی۔ وہ جیتے جی مرجائے گی مگر وہ کیا کرتا۔ یہ اس کی سزا بھی تو ہوتی۔ اس نے سیما کی طرف دیکھا۔ ''اگر تمہیں قبول ہے تو آج ہی ہمارا نکاح ہوگا۔''

سیما کے بھیگے چہرے پر خوشی یوں نمودار ہوئی جیسے کھل کر برسنے کے بعد بادلوں سے سورج نکل آتا ہے۔ مگر فوراً ہی وہ مرجھا گئی۔ ''میں اس قابل کہاں ہوں؟''

''تم معصوم ہو اور پہلے کی طرح پاک ہو، گناہ گار تو میں ہوں۔'' عمران نے کہا اور جھجک کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''میں نہیں جانتا کہ یہ فیصلہ میرے لیے کیا آزمائشیں لائے گا مگر میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ان میں سے کوئی آزمائش میں تم تک نہیں آنے دوں گا۔''

وہ منہ ہاتھوں میں چھپا کر رو دی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عمران اسے بانہوں میں لے کر چپ کرانے لگا۔ دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ یاخدا یہ کیسی آزمائش ہے۔ اگر اسے نہیں اپناتا تو ساری عمر ضمیر کا مجرم رہوں گا اور اگر اسے اپنالیتا ہوں عمر بھر کے لیے روبی اور چچا چچی کا مجرم بن جاؤں گا۔ خدایا اس آزمائش میں میری مدد فرما تو جانتا ہے جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا۔ اس میں میرے نفس کا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے۔ وہ سیما کی آواز سن کر چونکا۔ ''آپ پچھتا رہے ہیں؟''

''ہاں کام ہی ایسا کیا ہے۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''میں آپ کے فیصلے کی بات کررہی ہوں۔''

''نہیں، میں فیصلہ کرکے پچھتاتا نہیں ہوں۔''

باہر صبح کی روشنی نمودار ہورہی تھی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر مسجد تھی۔ عمران نماز پڑھنے وہیں جاتا تھا۔ اس نے مسجد کے امام سے نکاح کے سلسلے میں مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہا کر آیا تو سیما کچن میں تھی۔ اس نے ناشتے کا پوچھا۔ ''دل نہیں چاہ رہا ایسا کرو، چائے بنادو۔''

''کیوں نہیں چاہ رہا، پلیز آپ ناشتا کریں۔'' اس نے ضد کی۔ ''اگر آپ نہیں کریں گے تو میں بھی نہیں کروں گی۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مجھے بھوک نہیں ہے، رات بھی میری طبیعت خراب تھی۔ ایسا کرو مجھے چائے کے بجائے گرین ٹی بنادو لیمن ڈال کر۔''

عمران اس وقت بھی ٹھیک محسوس نہیں کررہا تھا۔ اس کا سینہ بھاری اور معدے میں جلن سی تھی۔ گرین ٹی لے کر وہ باہر نکلا۔ اس نے مسجد کے امام سے بات کی اور دوپہر تک اس کا نکاح سیما سے ہوچکا تھا۔ سیما کے پاس آئی ڈی کارڈ نہیں تھا مگر اسے اپنا نمبر یاد تھا اس نے بتادیا اور نکاح نامے میں وہی درج ہوا۔ نکاح خواں نے کہا کہ وہ اسی وقت نکاح رجسٹر ہونے کے لیے دے گا جب دلہن کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اسے ملے گی کیونکہ اس کے بغیر نکاح نامہ نامکمل رہے گا۔ عمران نے وعدہ کیا کہ وہ جلد اسے آئی ڈی کارڈ کی کاپی مہیا کردے گا۔ نکاح گھر میں ہوا تھا۔ سیما نے اپنا چہرہ چادر میں چھپایا ہوا تھا، کسی بھی موقع پر اس نے اپنا چہرہ نہیں کھولا تھا۔ نکاح خواں اور اس کے ساتھ آنے والے گواہ رخصت ہوئے تب سیما نے اپنا پردہ ختم کیا تھا۔ اس نے تنہائی پاتے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

''آپ سوچ نہیں سکتے کہ آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ شاید اس وقت تک میں زندہ نہ ہوتی۔''

''میں نے احسان نہیں کیا، شاید اپنے گناہ کا کفارہ بھی ادا نہیں کیا۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی میری سزا باقی ہے۔''

''کیا میرا ساتھ آپ کے لیے سزا ہوگا؟'' سیما بھی سنجیدہ ہوگئی۔ ''اگر ایسی بات ہے تو...''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' عمران نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں دوسری سزا کی بات کررہا ہوں۔''

''کیسی دوسری سزا آپ کھل کر بات کریں۔''

عمران ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ روبی میری کزن ہی نہیں، میری منگیتر بھی ہے۔ تم سوچ سکتی ہو کہ اس اطلاع پر کیا ردِعمل ہوگا؟''

سیما پر اس اطلاع کا خاص ردِعمل نہیں ہوا۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ آپ ان کو سب سچ بتا دیں اور میں خود آپ کی گواہی دوں گی۔“

”نہیں۔“ عمران کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ ”میں کسی صورت یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ اس سے زیادہ آسان تو میرے لیے مر جانا ہے۔ تم نہیں جانتیں میری پرورش کس ماحول میں ہوئی ہے۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود میں نے روبی سے آج تک محبت کا ایک لفظ نہیں کہا۔ مگر میں نے کبھی اس کے سوا کسی لڑکی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔“

سیما اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر آج کل ایسی محبت کا تصور نہیں ہے۔“

”مجھے ... یا لوگوں کی پروا نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور کمرے میں آ گیا۔ وہ بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ دو دن سے بھی کم وقت میں اس کی زندگی الٹ پلٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ خود کو ایسا پرندہ محسوس کر رہا تھا جو کسی جال میں پھنس گیا ہو۔ غلطی اس کی بھی تھی مگر اس کی سزا بہت بڑی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے کے نتائج پر غور کر رہا تھا، اس کے اندر گھٹن سی بڑھ رہی تھی۔ اس کی زندگی حویلی سے شروع ہو کر حویلی میں ختم ہو جاتی تھی اور حویلی اس کے نزدیک اینٹ پتھروں سے بنی اس عمارت کا نام نہیں تھا جس میں اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ حویلی اس کے لیے وہ رشتے تھے جو وہاں بستے تھے اور وہی اس کی زندگی تھے۔ اس نے کبھی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا تھا۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان سے الگ ہو گیا ہے۔ وہ اس حویلی کا حصہ نہیں رہا ہے۔ دروازہ کھلا اور سیما اندر آئی۔ اس نے اجازت طلب نہیں کی اور نہ ہی جھجکی تھی۔ وہ اب اس کی بیوی تھی اور اسے حق حاصل تھا بلکہ یہ بیڈ روم اب اس کا ہو گیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں عمران کو لگا جیسے کوئی اجنبی عورت اس کے بیڈ روم میں آ گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا تھا۔ سیما اپنے گلابی لب دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔

”آپ میری وجہ سے پریشان ہیں؟“

”نہیں، میں نے بتا دیا ہے کہ میں کس لیے پریشان ہوں۔“

سیما بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی اور ہاتھ بڑھا کر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ ”میں آپ کی پریشانی کس طرح دور کر سکتی ہوں۔“

عمران نے جلدی سے پاؤں سمیٹ لیے اور بولا۔ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

سیما کا لمس اس کے اندر کوئی سنسنی نہیں جگا سکا تھا بلکہ اسے الجھن ہی ہوئی تھی اور اسی احساس کے تحت اس نے بے ساختہ پاؤں کھینچ لیا تھا۔ سیما کا چہرہ اتر گیا، اس نے بجھے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی زندگی میں زبردستی آئی ہوں۔ کاش کہ آپ مجھے جانے دیتے۔“

عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟ وہ اب اس کی بیوی تھی اور اس پر حق رکھتی تھی مگر وہ فی الحال اس کے لیے خود کو آمادہ نہیں پا رہا تھا۔ سیما کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اٹھ کر جانے لگی تو عمران نے کہا۔ ”میری ایک بات مانو گی؟“

وہ رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ عمران نے بات جاری رکھی۔ ”ابھی ہم کچھ عرصہ الگ الگ کمروں میں رہیں گے۔ جب تک کہ میں ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے خود کو تیار نہیں کر لیتا۔“

”جو مرضی آپ کی۔ ویسے جو ہونا تھا وہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔“ سیما نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ باہر آتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے اور اس نے زیرِلب کہا۔ ”دیکھتی ہوں کب تک بچتے ہو مجھ سے۔ اب میں بیوی ہوں۔“

عمران کو روبی کا خیال آیا کہ اگر اسے علم ہو جائے کہ ایک عورت اس کی زندگی اور اس کے بستر تک آ چکی ہے تو اس کی کیا حالت ہو گی؟ وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گی۔ اسے اپنے اعتماد اور محبت کا قاتل سمجھے گی۔ ایک بار پھر اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ اٹھ کر باہر آیا تو سیما لاؤنج میں موجود تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہیں جا رہے ہیں؟“

”ہاں، میں ذرا امید خان کو دیکھ آؤں۔“ اس نے جیب کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کچھ منگوانا ہے۔“

وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور ایک ادائے محبوبی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ ”میرے لیے اچھا موڈ۔“

عمران پر اس کی اس ادا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میرے بس میں تمہارے لیے جو ہوا میں کروں گا۔“

”اور جو میں چاہوں گی۔“

”ظاہر ہے جو تم چاہو گی، میں وہی کروں گا۔“ عمران جھنجلانے لگا۔ ”مجھے کچھ وقت تو دو۔“

”کیا کھائیں گے ڈنر میں؟“

"میرا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ سیما کا چہرہ اور آنکھیں دہک اٹھیں۔ عمران باہر نکل کر کچھ دیر کھلی ہوا میں گہری سانسیں لیتا رہا اور پھر جیپ لے کر نکل گیا۔ اس کا ارادہ تو نہیں تھا مگر جب سیما نے پوچھا تو اس نے سوچا کہ باہر نکل جائے شاید اس گھٹن سے نجات ملے جو وہ گھر میں محسوس کر رہا تھا۔ نکاح ہوتے ہی سیما کے انداز میں جو تبدیلی آئی تھی اس نے اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ امید خان کے پاس گیا۔ اب اس کی حالت خاصی بہتر تھی اور دو دن بعد ڈاکٹر اسے چھٹی دے دیتے۔ اس کے بھائی اسے گاؤں لے جاتے۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک پارک میں آیا۔ گرمی کی وجہ سے رات ہونے پر لوگ وہاں موجود تھے۔ وہ ایک ایسے گوشے میں آیا جہاں نسبتاً تنہائی تھی۔ وہ سگریٹ پیتا تھا لیکن بہت کم، آج اسے طلب ہو رہی تھی اس نے سگریٹ سلگائی اور چند گہرے کش لیے۔

"یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے؟" اس نے خود سے پوچھا۔ "اس رات سڑک پر اتفاق سے وہی تھا۔ امید خان کی وجہ سے اسے دیر ہوئی، ورنہ وہ اتنی رات گئے باہر نہیں ہوتا تھا۔ دوسری صورت میں نہ سیما اسے ملتی اور نہ وہ اس مصیبت میں پڑتا۔ پھر وہ اسے مل ہی گئی تھی تو ضروری تھا کہ وہ اسے اپنے گھر لے جاتا، اسے کہیں بھی چھوڑ سکتا تھا۔ اپنی حفاظت کرنا اس کی اپنی ذمے داری تھی۔ مگر عمران کی مروت آڑے آئی اور وہ اسے گھر لے گیا۔ گھر بھی لے گیا تھا تب بھی وہ اسے جلد ہی کسی محفوظ جگہ بھیج دیتا۔ کسی دارالامان یا ایسی این جی او تک جو بے سہارا عورتوں اور لڑکیوں کو سہارا دیتی ہے۔ پھر یہ حادثہ پیش آ گیا جس نے اسے اپنی نظروں میں گرا دیا۔ اسے اپنے کردار پر فخر تھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی مگر اب وہ خود کو بہت حقیر اور نفس پرست شخص محسوس کر رہا تھا جس نے ایک ایسی لڑکی پر دست درازی کی جو اس کی پناہ میں تھی۔ جسے وہ بچا کر لایا تھا اور خود ہی اس کی عزت برباد کر دی۔ ٹھیک ہے اس نے سیما سے نکاح کر لیا تھا مگر گناہ، گناہ ہوتا ہے۔ سوائے توبہ کے کسی طرح معاف نہیں ہوتا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ "یا اللہ مجھے معاف فرما۔"

☆☆☆

سیما لاؤنج میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اس وقت اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ اچانک فون کی بیل بجی۔ وہ اٹھ کر فون تک آئی اور سی ایل آئی اسکرین پر نمبر دیکھا۔ نمبر جانا پہچانا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور کسی قدر سرد لہجے میں بولی۔ "کیوں کال کی ہے، اگر وہ گھر پر ہوتا تو؟"

"مجھے معلوم ہے وہ گھر پر نہیں ہے۔" دوسری طرف موجود مرد نے جواب دیا تو اس کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔

"تم میری نگرانی کر رہے ہو؟"

"میں نہیں ہوں لیکن میرے ہی آدمی ہیں۔" آدمی بولا۔ "آج تمہارا اس سے نکاح ہو گیا ہے۔"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" سیما بولی مگر وہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔

"کل تک تمہیں وہاں سے نکل آنا چاہیے۔"

"یہ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے کب آنا چاہیے اور کب نہیں۔" سیما کا لہجہ تیز ہو گیا۔ مگر مرد اس پر توجہ دیے بغیر بولا۔

"اگر تم کل تک وہاں سے نہ نکلیں تو عمران زندہ نہیں رہے گا۔ کل بہرحال تمہیں وہاں سے نکلنا پڑے گا۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" سیما برہم ہو گئی۔

"بالکل درست ہے اور تم جانتی ہو میں جو کہتا ہوں وہ کر گزرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تیار رہنا میں کل تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"میری بات سنو تم..." سیما بولتے بولتے رک گئی اب ٹون کی آواز آ رہی تھی۔ دوسری طرف سے فون رکھا جا چکا تھا۔ وہ سوچتی رہی اور دانت پیستی رہی پھر اس نے کہا۔ "دیکھ لوں گی تجھے۔"

☆☆☆

موبائل نے بیل دی تو وہ چونکا۔ موبائل نکالتے ہوئے اس کا خیال تھا کہ شاید سیما اسے کال کر رہی ہو مگر سیما کے پاس اس کا نمبر ہی نہیں تھا۔ نمبر حویلی کا آ رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" دوسری طرف سے روبی کی دھیمی آواز آئی۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں لیکن میں نے آپ کے بارے میں اچھا خواب نہیں دیکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں دوپہر میں نہیں سوتی ہوں لیکن آج نہ جانے کیسے میری آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب دیکھا۔"

"کیسا خواب؟"

"میں نے دیکھا کہ آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہیں اور وہاں بہت تیز ہوا چل رہی ہے آپ اس کے خلاف سنبھلنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر وہ ہوا آپ کو کنارے کی طرف

دھکیل رہی ہے۔ وہ آپ کو بالکل کنارے تک لے جاتی ہے اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

چند لمحے کے لیے عمران گم صم رہ گیا۔ اسے لگا جیسے روبی نے خواب نہیں، اس کے حالات بیان کیے ہیں۔ وہ خود کو ٹھیک ایسی کیفیت میں محسوس کررہا تھا۔ پھر وہ چونکا روبی ہیلو ہیلو کررہی تھی۔ "ہاں میں موجود ہوں۔"

"شکر ہے میں تو سمجھی کہ لائن کٹ گئی ہے۔" روبی نے کہا۔ "کتنی دیر سے ہیلو ہیلو کررہی ہوں، آپ نے میرا خواب سنا؟"

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "لیکن تم فکر مت کرو، میں ٹھیک ہوں۔"

"کیسے فکر نہ کروں، میں نے آپ کو بتایا نہیں لیکن میں آپ کے بارے میں کئی بار خواب دیکھ چکی ہوں اور وہ سچے نکلے۔"

"تم نے پہلے نہیں بتایا۔" وہ حیران ہوا۔

"کیونکہ آج سے پہلے میں نے آپ کے بارے میں ہمیشہ اچھے خواب دیکھے۔ جب آپ نے انٹر میں پورے اسکول میں اول پوزیشن لی تھی تب میں نے دیکھا کہ آپ کے سر پر بہت خوب صورت سا پرندہ بیٹھ رہا ہے۔ اس بار خواب اچھا نہیں ہے تبھی آپ کو بتایا اور اسی لیے فکر ہو رہی ہے۔ آپ کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جھوٹ کہا اور اندر سے پچھتانے لگا۔

"تب اللہ آپ کو ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔"

عمران نے ہمت کر کے پوچھا۔ "روبی اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو کیا تم مجھے معاف کر دو گی۔"

"آپ کی غلطی معاف کرنے والی میں کون ہوتی ہوں؟"

"اگر غلطی تمہارے حوالے سے ہو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہو۔"

"عمران میں نے آپ کو اپنے تمام حقوق سونپ دیے ہیں۔ اب میرے پاس آپ کے حوالے سے کوئی حق نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ کچھ بھی کرلیں، میں اف بھی نہیں کروں گی۔"

عمران کو لگا اس کے اندر کچھ پگھل رہا ہے۔ یہ لڑکی اس کے لیے کیسی پاگل ہے۔ عشق کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور اس نے کیا کیا ہے۔ اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے اور وہ پہلے ہی اسے معاف کر چکی ہے۔ تب اس نے سچ بول دیا۔

"روبی میں بہت بڑی آزمائش میں گھر گیا ہوں۔ اللہ گواہ ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ابھی تمہیں بتا نہیں سکتا لیکن تم دعا کرنا کہ اللہ مجھے اس سے نکال لے۔ میں اس آزمائش سے خود نہیں نمٹ سکتا۔ اللہ ہی بچائے تو بچائے۔"

روبی کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے کہا۔ "آپ نے پوچھنے سے منع کر دیا ہے اس لیے میں اب صرف دعا کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ اللہ میری دعا رد نہیں کرے گا۔"

"اللہ کرے ورنہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میرے کسی عمل کی سزا ہے جو میں یوں پھنس گیا ہوں۔"

"آپ یوں نہ سوچیں، اگر آپ مشکل میں ہیں اور آپ اللہ سے دور ہو گئے ہوں تو یہ سزا ہے اور جو مشکل آپ کو اللہ کی یاد دلائے اور اس کی طرف متوجہ کرے، وہ آزمائش ہوتی ہے۔"

عمران حیران ہوا۔ "تم تو بہت عقل مندی کی باتیں کرنے لگی ہو۔"

"وہ تو میں ہمیشہ کرتی ہوں۔" روبی نے کہا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"میں گھر سے باہر ہوں۔" اس نے جواب دیا اور چچا چچی کا حال پوچھ کر کال بند کر دی۔

☆☆☆

سیماب فکرمند تھی جیسے جیسے... وقت گزر رہا تھا، اس کی فکر بڑھ رہی تھی۔ اسے یہ فکر عمران کے بارے میں تھی۔ اسے گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ اتفاق سے اس کے پاس عمران کا موبائل نمبر نہیں تھا ورنہ وہ اسے کال کر لیتی۔ وہ بار بار دروازے تک جاتی اور کھڑکی سے باہر دیکھتی تھی۔ گیارہ بجے باہر جیپ رکنے کی آواز آئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔ باہر کے گیٹ کی چابی عمران کے پاس تھی وہ خود لاک کھول کر جیپ اندر لے آیا اور پھر گیٹ لاک کر کے اندر آیا۔ سیما دروازے کے پاس ہی اس کی منتظر تھی جیسے ہی وہ اندر آیا۔ سیما اس سے لپٹ گئی اور روہانسے لہجے میں بولی۔ "کہاں رہ گئے تھے آپ؟ اتنی دیر لگا دی۔ میرا ہول ہول کر برا حال ہو گیا۔"

"تم کیوں ڈر رہی تھیں؟" عمران نے اس کے یوں جذباتی ہونے اور لپٹنے پر بنا کسی تاثر کے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان نہ ہو جائے۔"

"تم فکر مت کرو، بچانے والی ذات اللہ کی ہے۔"
عمران نے کہا اور آگے بڑھا تو مجبوراً سیما کو اسے اپنی گرفت سے آزاد کرنا پڑا۔ عمران کی پشت اس کی طرف ہوئی تو اس کے تاثرات بدل گئے اور ان میں غضبناکی آ گئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر عمران کو کئی بار اپنے جسم سے روشناس کرایا، اپنا لمس دیا مگر اس کا ردِعمل نہایت سرد تھا اور یہ اس کی توہین تھی۔ وہ اپنی توہین برداشت نہیں کرتی تھی۔ یہ بات اس کے تاثرات سے بھی عیاں تھی مگر جیسے ہی عمران اس کی طرف مڑا، وہ پھر پہلے کی طرح معصوم اور فکر مند نظر آنے لگی۔
عمران نے پوچھا۔
"تم نے کھانا کھا لیا؟"
"میں آپ کے بغیر کھا سکتی ہوں؟"
"اب تک تم میرے بغیر ہی کھاتی آئی تھیں۔"
"تب اور اب میں بہت فرق ہے، اب میں آپ کی بیوی ہوں۔" اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "لیکن مجھے لگ رہا ہے شاید آپ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا بھی نہ کھائیں۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟"
"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا ہے جیسے بس مجھے برداشت کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی، مجھے سہارا کیوں دیا؟"
"تم جانتی ہو، کن حالات میں یہ رشتہ ہوا ہے۔" عمران نے کہا۔ "میں نے تم سے یہ بھی کہا کہ مجھے چند دن دو مگر تم..." وہ بات ادھوری چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی سیما کے تاثرات پھر بدل گئے۔ اس نے زیرِ لب کہا۔
"وقت ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔"
وہ صوفے پر گر گئی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سوچ رہی ہے اور پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔ اس نے اٹھ کر فریج سے انڈے، ڈبل روٹی، پنیر اور چکن نکالی۔ اس نے چکن اور انڈے بوائل کیے اور سینڈوچ بنانے لگی۔ سینڈوچ تیار کر کے اس نے ٹرے میں رکھے اور عمران کے کمرے تک آئی۔ دستک کے جواب میں عمران کی آواز آئی۔ "اندر آؤ۔"
وہ ٹرے لے کر اندر آئی اور ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ "آپ کی پریشانی کی وجہ میں ہوں نا، کھانے سے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
"مجھے تم سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
"آپ کچھ بھی کہیں آپ کی پریشانی کی وجہ میں ہوں۔"
عمران کو پہلی بار خیال آیا۔ "تم نے کچھ کھایا ہے؟"
"نہیں۔"
"تب تم بھی کھاؤ۔"
"پہلے آپ شروع کریں۔" اس نے کہا تو عمران نے ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔ سیما نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ برائے نام کھا رہی تھی۔ سینڈوچ مزے کے تھے اس لیے عمران بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی خاصے کھا گیا۔ خود سیما نے چند ایک ہی لیے تھے۔ اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"چائے لیں گے؟"
"ابھی نہیں۔" عمران نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔
"کتنی دیر بعد لاؤں؟"
"ایک گھنٹے بعد لے آنا۔" اس نے کہا اور واش روم میں گھس گیا۔ ہاتھ دھونے کا تو بہانہ تھا اصل میں وہ سیما سے دور ہونا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے دیکھتا تھا اور اب اسے حق بھی تھا۔ سیما باہر آئی اور برتن دھو کر کچن صاف کرنے لگی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے چائے بنائی اور اس کی تیاری کے دوران وہ کہیں سے ایک گولی لے کر آئی اور اسے پیس کر چائے کے خالی کپ میں ڈال دیا پھر اس نے اس میں دودھ شامل کیا۔ چائے میں بھی دودھ اور پتی تیز رکھی تھی۔ چائے تیار کر کے وہ عمران کے کمرے میں لائی اور سائڈ دراز پر رکھتے ہوئے بولی۔
"کوئی کام ہے تو بتا دیں میں نہانے جا رہی ہوں۔ گرمی لگ رہی ہے۔"
"نہیں کوئی کام نہیں ہے۔" عمران نے جواب دیا۔ "تم نہا کر سو جانا، صبح سے جاگ رہی ہو اور رات بھی..." وہ بولتے بولتے رک گیا۔
"پلیز یہ بات اب بھول جائیں۔" سیما نے کہا۔ "میں بھی بھول گئی ہوں۔"
سیما کے جانے کے بعد عمران نے چائے کا کپ اٹھایا اور خود سے بولا۔ "یہ بھلانے والی بات نہیں ہے۔"
سیما لاک کے سوراخ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ عمران کی بات نہیں سن سکی تھی مگر اسے کپ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی۔ اس نے لباس اتارا اور بال کھول کر واش روم میں آئی۔ اس بار بھی اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند

کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے بال شیمپو کیے اور شاور لے کر باہر آئی اور پنکھے کے نیچے کھڑے ہو کر بال خشک کرنے لگی۔ جسم اور بال خشک کر کے اس نے کپڑے پہنے۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے اور اس نے خود سے کہا۔ ''اب تم میری ضد ہو۔ کب سے تڑپ رہی ہوں، آج تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔''

☆☆☆

عمران چائے پی رہا تھا۔ اسے پہلے سپ میں چائے کا ذائقہ عجیب سا لگا۔ مگر اس نے ابھی دوسرا سپ لیا تھا کہ اچانک موبائل کی بیل بجی اور اس کے ہاتھ سے کپ چھلک گیا۔ چائے اس کے کپڑوں پر گری تھی۔ اس نے بدمزہ ہو کر چائے کا کپ رکھا اور موبائل اٹھایا، روبی کی کال تھی کیونکہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے حویلی سے وہی کال کر سکتی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تو روبی کی روہانسی آواز آئی۔

''عمران آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔ ''تم رو رہی ہو؟''

''میں نے ابھی وہی خواب دیکھا ہے، بالکل ویسا ہی خواب۔'' وہ بچ بچ رونے لگی۔ ''پلیز عمران مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، آپ حویلی آجائیں۔''

''کاش کہ میں آسکتا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اگر میرے آنے سے میری آزمائش ختم ہو سکتی تو میں ابھی چل پڑتا۔''

روبی چپ ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اللہ آپ کو سلامت رکھے، عمران یاد رکھیے گا میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔ چاہے آزمائش کیسی ہی کیوں نا ہو۔''

عمران کا دل پھر پگھلنے لگا۔ ''کاش میں ندامت کے ساتھ ہی سہی لیکن تمہارے سامنے آسکوں۔''

''اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' روبی نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عمران نے سرد آہ بھر کر موبائل واپس رکھ دیا اور اٹھ کر واش روم میں آیا اس نے شرٹ سے چائے کے دھبے صاف کیے اور باہر آیا تو اس کا موڈ بدل گیا تھا۔ اس نے کپ اٹھایا اور واش روم کے سنک میں الٹ دیا۔ کپ رکھ کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر سوچیں ذہن میں یوں گھوم رہی تھیں جیسے دشت کے ویرانوں میں بگولے گھومتے ہیں۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے اور اس مشکل سے کیسے نکلے۔ اچانک دروازہ کھلا اور سیما اندر آئی۔ اس کے بے پناہ گھنے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ رنگت یوں دمک رہی تھی جیسے اس کی جلد تلے روشنی کرنے والی کوئی چیز لگی ہو اور آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں تھے۔ وہ جس طرح اس کی طرف آئی، اس کے عزائم اسی سے واضح ہو گئے۔ وہ آتے ہی اس پر گری اور لپٹ گئی۔ وہ کسمسایا۔

''سیما یہ کیا کر رہی ہو؟''

''میں آپ... کی ہوں۔'' وہ تیز سانسوں کے درمیان بولی۔

''پلیز میں نے تم سے کیا کہا تھا۔'' عمران نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سیما نے اسے دبا لیا تھا، وہ اسے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

''یہ میرا حق ہے اور اب آپ گناہ نہیں کریں گے۔'' وہ جسم کو حرکت دیتے ہوئے بولی وہ اس وقت نہایت تجربے کار عورت لگ رہی تھی۔ عمران جتنا اس سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اتنی ہی تسمہ پا بنتی جا رہی تھی۔ وہ بھی مرد تھا اور جذبات سے عاری نہیں تھا۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ اچانک اسے لگا کہ وہ پہاڑی کے کنارے پر ہے اور تیز ہوا اسے نیچے گرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ احساس اتنا واضح تھا کہ مارے خوف کے اس کا جسم سرد پڑ گیا اور اس کی مزاحمت یک دم ختم ہو گئی۔ سیما نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ سمجھی کہ عمران نے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ سیما بے قرار ہو کر اٹھی۔

''کیا ہوا آپ کو۔''

عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ سیما اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔ اپنی بے قراری پر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ عمران کو یوں اشکبار دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ پھر وہ خود بھی روہانسی ہو گئی۔

''پلیز یوں نہ روئیں۔ آپ تو مرد ہیں۔''

''کیا مرد روتے نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا مرد پتھر کے ہوتے ہیں، وہ ٹوٹ نہیں سکتے؟''

''آپ میری وجہ سے رو رہے ہیں؟''

''نہیں اپنے نفس کی کمزوری پر رو رہا ہوں۔ اس نے مجھے میری نظروں میں ذلیل کر دیا۔ جب میں گھر سے نکل کر یہاں آیا تب میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ مجھے نفس کی آزمائش میں مت ڈالنا میں بہت کمزور انسان ہوں۔ میں یہاں بہت احتیاط سے رہا۔ لڑکیوں سے جو ساتھ پڑھتی ہیں

کبھی ایک حد سے زیادہ بے تکلفی نہیں برتی۔ کسی کے پیغام کا جواب نہیں دیا۔ خود کو ہمیشہ روبی کے لیے مخصوص سمجھا۔ اس کے باوجود میرے نفس نے مجھے کہاں لا کر مارا۔ میں خود اپنا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا۔" عمران روتے ہوئے کہہ رہا تھا اور سیما گم صم سی سن رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بے خیالی میں عمران کے آنسو صاف کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ خاموش ہو گیا اور آنسو بھی تھم گئے۔ سیما بدستور اس سے لگی بیٹھی تھی مگر جسم کی گرمی کب کی سرد ہو چکی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھا اور بولی۔

"قصور آپ کا نہیں، میرا ہے۔ آپ بے فکر رہیں اب میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔"

وہ بستر سے اتری اور کمرے سے نکل گئی۔ عمران کو لگا کہ رونے سے اس کے اندر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے لگا کہ وہ پہاڑ کی چوٹی سے گرنے سے بچ گیا ہے۔ اس کا ذہن پُرسکون ہوا تو اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اسے نیند آ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی سے تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ گھڑی دس بجا رہی تھی۔ وہ فکرمند ہوا کہ سیما نے اسے اٹھایا کیوں نہیں۔ وہ باہر آیا تو گھر خالی تھا۔ سیما نہ اپنے کمرے میں تھی اور نہ ہی باقی گھر میں کہیں۔ وہ کچن میں آیا تو اس نے ڈائننگ ٹیبل پر ایک کاغذ کپ تلے دبا دیکھا۔ یہ کل رات یہاں نہیں تھا۔ اس نے پرچہ اٹھایا تو اس پر نسوانی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا۔

"جان سے پیارے عمران، سدا خوش رہو۔

میں جا رہی ہوں کیونکہ مجھے جانا تھا مگر میں اس طرح نہیں گئی جس طرح جانا چاہتی تھی بلکہ اس طرح گئی جس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اپنے نفس کا چاہا پورا کرنے آئی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ سب ایک طے شدہ ڈراما تھا۔ امید خان کو پیش آنے والا حادثہ بھی طے شدہ تھا اور جو تم نے سمجھا، وہ بھی طے شدہ حادثہ تھا لیکن وہ سب ہوا نہیں تھا۔ صرف اسٹیج تیار کیا تھا۔ میں نے تمہیں انٹر یونیورسٹی ٹینس ٹورنامنٹ کے فائنل میں دیکھا اور دل ہار گئی۔ مگر اب لگا ہے میں دل نہیں ہاری تھی، نفس کے آگے ہار گئی تھی۔ تب میں نے تمہیں حاصل کرنے کا سوچا۔ میرے پاس قوت ہے، دولت ہے اور میں تمہیں حاصل کر سکتی تھی مگر میں تمہیں تمہاری رضامندی سے حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے یہ ڈراما ترتیب دیا اور مظلوم بن کر تمہارے پاس پہنچ گئی۔ میں اتنی اندھی ہو گئی تھی کہ اپنے شوہر کو بھی دھوکا دیا۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے لیکن میں خود کون سی اچھی عورت ہوں۔ یقیناً ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ تمہارے لیے روبی جیسی لڑکی مناسب ہے۔ معافی میں یوں نہیں مانگ رہی کہ میں نے جو کیا ہے، اس کے لیے معافی کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ یہ کم سے کم بھی گناہ ہے۔ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی یہ بھی بے معنی ہے۔ خط لکھنے کا مقصد تمہیں مطمئن کرنا ہے کہ تم پہلے کی طرح پاک ہو۔ جو نکاح ہوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ اس میں میرا نام ہی غلط ہے۔

ایک غلط عورت جسے بھول جانا مناسب ہوگا۔"

جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا، اس کے اندر موجود پریشانی کی برف پگھلتی جا رہی تھی۔ آخری جملہ پڑھ کر اس نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ اچانک کال بیل بجی تو وہ چونکا پھر اس نے جلدی سے خط تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور باہر آیا۔ گیٹ کے باہر جانی پہچانی گاڑی کی جھلک دیکھ کر وہ تیزی سے باہر آیا۔ کال بیل بجانے والا صمد اللہ تھا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ "چچا جان آپ اس طرح۔۔۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"نہیں بیٹا ہمیں ہی آنا تھا، اس پگلی نے رات سے رونا دھونا مچایا ہوا تھا۔" صمد اللہ نے جیپ کی طرف اشارہ کیا تب عمران نے پہلی بار دیکھا۔ اندر چادر میں لپٹی روبی موجود تھی۔ اس نے گیٹ کھولا اور جیپ اندر لے آیا۔ صمد اللہ گیٹ بند کر کے آ رہا تھا۔ انجن بند کرنے سے پہلے اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ نے کرم کیا اور آزمائش سے بچا لیا۔"

"شکر اللہ کا، میں سارے راستے دعا کرتی آئی ہوں۔" وہ بولی۔

عمران نیچے اترا اور انہیں اندر لے آیا۔ صمد اللہ اسے صحیح سلامت دیکھ کر خوش تھا اور ہنس ہنس کر بتا رہا تھا کہ روبی نے رات سے ایسا رونا دھونا مچایا اور یہاں آنے کی ایسی ضد پکڑی کہ میں تکبیر پڑھتے ہی اسے لے کر نکل کھڑا ہوا۔ "اس نے قسم دی تھی کہ تجھے خبر نہ کروں اسی لیے بتائے بغیر آیا ہوں۔"

"چچا جان آپ کا اپنا گھر ہے، جب چاہیں آئیں جائیں۔" عمران نے اس سے کہا۔ وہ اور روبی دونوں صمد اللہ کے سامنے جھجک رہے تھے۔ یہ بات محسوس کر کے صمد اللہ کھڑا ہو گیا۔

"صبح نہانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اب نہا لوں۔ جب تک تو ناشتا بنا لے۔" صمد اللہ نے جاتے ہوئے روبی کو حکم دیا۔

”میں باہر سے لے آتا ہوں۔“
”نہیں، میں بنالوں گی۔“ روبی جلدی سے بولی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ عمران باہر جائے اور اسے جو موقع مل رہا ہے وہ نہ ملے۔ وہ کچن میں آگئی اور عمران وہیں کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ روبی نے سامان نکالا اور ناشتا تیار کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ عمران اور صمد اللہ کیسا ناشتا پسند کرتے تھے۔ اس نے چولہے پر توا رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب آپ بتائیں گے کہ کیا ہوا تھا؟“

”ہاں لیکن پہلے یہ پڑھ لو۔“ اس نے جیب سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”پھر بتاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا؟“

روبی نے خط پڑھنا شروع کیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ جب خط ختم ہو گیا تو اس نے کہا۔ ”اب آپ بتائیں کہ یہاں کیا ہوا تھا؟“

عمران نے بولنا شروع کیا اور کوشش کرنے لگا کہ تیزی سے لیکن تفصیل کے ساتھ ساری بات بیان کرے۔ روبی خاموشی سے سنتی رہی۔ عمران نے سب سچائی سے اور مکمل کر بتایا اس لیے روبی کا چہرہ سرخ ہوتا رہا۔ عمران نے بات مکمل کی اور بولا۔ ”اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ میں کس آزمائش سے گزرا تھا۔“

روبی نے سر ہلایا۔ اسی اثنا میں صمد اللہ آ گیا۔ اس کی بات سننے کے دوران میں روبی ناشتا بھی بنا رہی تھی اور اس نے بن جانے والا ناشتا میز پر لگا دیا۔ عمران اور صمد اللہ ناشتے میں لگ گئے۔ عمران فکر مند تھا کیونکہ روبی نے واضح ردعمل نہیں دیا تھا۔ ناشتے کے دوران میں صمد اللہ نے اسے بتایا کہ وہ ایک دن ٹھہر کر اگلے دن واپس جائیں گے۔ اتفاق سے آج چھٹی تھی اور روبی کو کالج جانا تھا، اس کا ایک دن کا حرج ہو جاتا۔ دن میں انہیں موقع نہیں ملا مگر رات سونے سے پہلے روبی اسے چائے دینے آئی تو عمران نے اسے روک لیا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا؟“

”کیسا جواب؟“ وہ انجان بنی۔

”یہی کہ میرا قصور ہے یا نہیں ہے۔“

روبی دبے انداز میں مسکرائی۔ ”اگر آپ کا قصور ہوتا تب بھی میں کچھ نہ کہتی اور اس معاملے میں تو آپ نے ثابت قدم رہ کر مجھے مغرور کر دیا ہے۔“

عمران نے سکون کی طویل سانس لی۔ ”شکر اللہ کا، بس اب میں شدت سے منتظر ہوں کہ میرے پیپرز ختم ہوں اور میں واپس حویلی آؤں۔“

روبی شرما گئی۔ ”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

روبی کے جانے کے بعد اس نے پھر دل سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے اس خوفناک آزمائش سے بچا لیا۔

☆☆☆

ڈرائیونگ سیٹ پر شاہ نواز تھا اور اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر سیما عرف رخسانہ عرف سیما بیٹھی تھی۔ اس کا حلیہ ایک بار پھر بدل گیا تھا۔ اس وقت وہ پورے میک اپ اور ساڑی میں تھی۔ وہ حلیہ اور رنگ و روپ بدلنے کی ماہر تھی۔ اگر اس وقت عمران اسے دیکھ لیتا تو اسے بہ حیثیت سیما شناخت کرنے میں ذرا مشکل پیش آتی۔ شاہ نواز کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے رخسانہ سے کہا۔ ”تم نے جان بوجھ کر اس لڑکے کا انتخاب کیا۔“

”اگر میں نے ایسا کیا تو تمہیں اس سے کیا؟“

شاہ نواز نے غرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”مت بھولو کہ میں تمہارے لیے کیا ہوں؟“

”میں جانتی ہوں کہ تم میرے لیے کیا ہو؟“

”میاں شوکت کے بعد اس کی جگہ میں لوں گا اور یہ سب تم سمیت میرا ہو گا۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے؟“

”تب تم نے اس لڑکے کے معاملے میں مجھے کیوں بے خبر رکھا؟“

”اس لڑکے کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم میرے پاس کیسے پہنچے اور میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

شاہ نواز کے چہرے کا رنگ کسی قدر بدلا تھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”جب تم ڈرائیور کی نوکری کے لیے آئے تو میں نے تمہیں ایک لمحے میں پہچان لیا تھا۔ اس وقت میں چاہتی تو آج تمہاری ہڈیاں بھی کسی نامعلوم قبر میں خاک ہو چکی ہوتیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”نہیں۔“ شاہ نواز کا لہجہ بدل گیا۔ ”یہ ماضی کی بات ہے اور تم ماضی کا باب بند کر چکی ہو۔“

”ماضی کا باب کبھی بند نہیں ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک صورت میں بند ہوتا ہے۔“

شاہ نواز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”موت پر؟“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

”ہاں۔“ رخسانہ نے سر ہلایا۔

”بہت جلد دو افراد اسی طرح ماضی کا حصہ بن جائیں گے۔“

"دوسرا فرد یقیناً عمران ہوگا۔" رخسانہ نے سکون سے پوچھا۔

"ہاں وہ ہمارے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے۔"

"مجھے شناخت کر کے؟"

"ہاں یہ دنیا زیادہ بڑی نہیں ہے۔ ماضی کے دو شناسا کسی وقت اور کہیں بھی مل سکتے ہیں۔"

"جیسے ہم ملے۔" رخسانہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہم ملے نہیں بلکہ میں خود آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب تم بیگم شوکت سلطان بن چکی ہو۔"

رخسانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم نے کبھی بتایا نہیں۔"

"اب بتا دیا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"تمہیں میرے ردِعمل کا خوف نہیں تھا؟"

"میرا تجربہ ہے عورت ایک بار کسی کے آگے دل ہار جائے تو کبھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی ہے۔" وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ "میں اس یقین کے ساتھ آیا تھا کہ تم ایک بار پھر میرے آگے ہار جاؤ گی اور ایسا ہی ہوا۔"

رخسانہ کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہوئی مگر یہ سرخی سن گلاسس کے پیچھے چھپی تھی اس لیے شاہ نواز دیکھ نہیں سکا۔ شاہ نواز وہی اسکول کا مالی اختر تھا۔ حالات اور حادثات نے اسے بدل دیا تھا۔ اب وہ باقاعدہ جرائم پیشہ اور سخت جان بن گیا تھا۔ میاں شوکت سے چھٹکارے کی تجویز اسی کی تھی۔ رخسانہ متفق نہیں تھی مگر اس کے دباؤ پر مان گئی۔ شاہ نواز نے اسے یہ خوف بھی دلایا تھا کہ میاں شوکت اس کا کتنا ہی دیوانہ سہی لیکن اگر اسے ان کے تعلقات کا پتا چل گیا تو وہ انہیں خونخوار کتوں کے آگے ڈلوا دے گا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ رخسانہ نے پوچھا۔ "شوکت سے کیسے چھٹکارا حاصل کرو گے؟"

"بہت آسان ہے، تمہاری واپسی کے بعد اس کا تم سے جھگڑا ہوگا اور وہ خودکشی کر لے گا۔" شاہ نواز نے کہا اور اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سنہری مائل دھات سے بنا ہوا ریوالور نکال کر دکھایا۔ "یہ شوکت کا ہے۔ مرنے کے بعد اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جائیں گے اور پولیس اسے خودکشی قرار دے گی۔"

"یہ مجھے دے دو۔" رخسانہ نے اس سے ریوالور لے لیا۔ شاہ نواز نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ریوالور رخسانہ نے پرس میں رکھ لیا۔ "عمران سے کیسے نمٹو گے؟"

"شوکت کے فوراً بعد میں اس کا کام تمام کرنے روانہ ہو جاؤں گا۔ حویلی کے معاملات تم دیکھنا۔ عمران کا خاتمہ کر کے میں فوری واپس آؤں گا تاکہ تمہارے ساتھ جشن منا سکوں۔"

اپنا پلان بیان کرتے ہوئے اختر عرف شاہ نواز بہت خوش اور مگن تھا۔ رخسانہ نے سادہ سے انداز میں پوچھا۔

"کیا عمران کا فوری خاتمہ ضروری ہے۔"

"ہاں میں کسی ایسے شخص کا وجود برداشت نہیں کر سکتا جو تمہارے بدن تک رسائی حاصل کر چکا ہو۔"

"ان میں تو تم بھی شامل ہو۔"

"سوائے میرے۔" اس نے رخسانہ کی طرف دیکھا اور کار روکنے لگا۔ "اب تم پیچھے چلی جاؤ۔ حویلی زیادہ دور نہیں رہی ہے۔"

"ہاں حویلی زیادہ دور نہیں ہے۔" رخسانہ نے کہا اور اتر کر پچھلی نشست پر آ گئی۔ جیسے ہی کار آگے بڑھی، اس نے ریوالور پرس سے نکال کر شاہ نواز کے سر پر رکھ دیا۔

"گاڑی روک لو۔"

"کیوں؟" اس نے سکون سے پوچھا۔

"میں کہہ رہی ہوں۔" وہ اس کے سر پر نال کا دباؤ بڑھا کر بولی۔

شاہ نواز ہنسا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں بھرا ہوا ریوالور دے دوں گا۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے، میں ہر بار تم سے دھوکا کھاتی رہی ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے شوکت کا ریوالور حاصل کیا ہے۔ اس کی ایک گولی میرے پاس تھی اور وہ گولی میں نے چیمبر میں ڈال دی ہے۔ چھ میں سے ایک خانے میں گولی ہے اور ممکن ہے وہ ٹریگر کے سامنے موجود خانہ ہو۔ اب گاڑی روک لو۔"

شاہ نواز کا چہرہ ست گیا.... اس نے گاڑی روک لی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ڈبل کراس کر رہی ہو؟"

"کیوں، کیا یہ حق صرف تمہیں ہے؟" رخسانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "نیچے اترو۔"

شاہ نواز جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ شاید اسے خیال آیا کہ وہ چانس لے سکتا ہے مگر جب اس نے رخسانہ کی طرف والا دروازہ کھولا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول نظر آیا۔ اس نے مطلع کیا۔ "یہ پوری طرح لوڈ ہے، پیچھے ہٹ جاؤ۔"

شاہ نواز پیچھے ہٹ گیا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

رخسانہ باہر نکل آئی۔ ''جب تم مجھے فروخت کر کے چلے گئے تھے تب میں نے سوچا تھا کہ اب میں مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلوں گی۔ میں نے کھیلا بھی، اپنے شوہر کو بھی کھلونا بنا لیا، اس سے جھوٹ کہا کہ اس نے مجھے نشے میں طلاق دے دی ہے۔''

شاہ نواز کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''مگر کیوں؟'' پھر وہ چونکا۔ ''اب سمجھا تمہارا دل اس لڑکے پر آ گیا ہوگا اور تم اس بہانے اس کے پاس پہنچ گئیں۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''ہاں تم نے ٹھیک کہا مگر اب میں تھک گئی ہوں اس لیے آج آخری گیم ہوگا۔ یہ پکڑو۔'' اس نے ریوالور شاہ نواز کی طرف اچھال دیا اور اس نے کیچ کرتے ہی رخسانہ کی طرف تان لیا۔

''پستول پھینک دو۔''

''تمہیں دو چانس دیتی ہوں، تم دو بار ٹریگر دباؤ گے اور اگر ریوالور سے گولی نہیں نکلی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' شاہ نواز نے لرزتی آواز میں کہا۔

رخسانہ نے پستول سیدھا کر لیا۔ ''تمہارے پاس تین سیکنڈ ہیں ایک، دو...''

شاہ نواز نے عجلت میں اس پر دو بار فائر کیے اور دونوں بار ریوالور سے کلک کی آواز آئی۔ اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا اور اس نے پھر فائر کرنے کی کوشش کی مگر رخسانہ کے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کے ماتھے پر بجھ گیا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا نشانہ بھی لاجواب تھا۔ رخسانہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر زیرِ لب بولی۔ ''اب تم میرا ماضی بن گئے ہو۔''

وہ پلٹ کر کار تک آئی۔ پرس سے موبائل نکالا اور میاں شوکت کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے خوشی سے کہا۔ ''رخسانہ کہاں ہو تم؟''

''حویلی کے پاس ہوں۔ میں واپس آ رہی ہوں لیکن ایک چھوٹا سا حادثہ ہو گیا۔ ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی اور شاہ نواز نے مزاحمت کی تو انہوں نے اسے شوٹ کر دیا اور ڈاکو فرار ہو گئے۔''

''اوہ تم ٹھیک ہو نا تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں، ہاں شاہ نواز مر گیا ہے۔''

مگر میاں شوکت نے شاہ نواز کی موت کا کوئی اثر نہیں لیا اور پوچھا۔ ''تم کہاں ہو، میں ابھی آ رہا ہوں۔ پولیس کو بھی کال کرتا ہوں۔''

رخسانہ نے اپنی لوکیشن بتائی اور موبائل رکھ کر اس نے شاہ نواز کی تلاشی لی، اس کی ایک جیب سے ریوالور کی گولیاں نکل آئیں۔ اس نے گولیاں ریوالور میں ڈال کر اسے اس کی لاش کے نزدیک ہی ڈال دیا۔ اس نے شاہ نواز کی لاش سے کہا۔ ''میں نے غلط ثابت کر دیا کہ عورت جس سے ایک بار ہار جائے، اس سے ہمیشہ شکست کھاتی ہے۔ میں نے تمہیں اس بازی میں شکست دے دی ہے۔''

کچھ دیر بعد حویلی کی دو گاڑیاں آ کر وہاں رکیں اور ایک سے میاں شوکت اتر کر اس کے پاس آیا۔ رخسانہ اس کے سینے سے لگی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں واپس آ گئی ہوں ہمیشہ کے لیے۔''

میاں شوکت نے ایک نظر شاہ نواز کی لاش کو دیکھا اور اسے لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے فکر نہیں تھی، اس کے آدمی معاملہ سنبھال لیتے۔ دوسری گاڑی میں وہی آئے تھے۔ اس نے راستے میں رخسانہ سے پوچھا۔ ''سب ٹھیک سے ہوا، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ سرشار لہجے میں بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میں گناہ سے بچ گئی۔''

''اور میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔'' میاں شوکت نے اسے محبت سے دیکھا، وہ بالکل نہیں سمجھا تھا کہ رخسانہ کیوں خوش تھی۔ ''تم نہیں جانتیں تم سے دور یہ گھڑیاں میں نے کیسے مر مر کر گزاریں۔ ایک ایک لمحہ تمہارا انتظار کیا۔''

رخسانہ نے اس کے شانے پر سر رکھ لیا۔ ''اگر میں واپس نہ آتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔''

''شکر ہے مالک کا۔'' میاں شوکت نے شاید زندگی میں پہلی بار خلوصِ دل سے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔ ''میں نے منت مانی تھی کہ اگر تم واپس آ گئیں تو میں اس کے بعد کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ میں تمہارے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب کبھی نہیں پیوں گا۔''

''شکر ہے اللہ کا۔'' رخسانہ نے بھی اس بار دل سے کہا اور پھر دل میں عمران کا شکریہ ادا کیا جس نے زندگی گزارنے کا ایک نیا ڈھنگ اسے سکھا دیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کا شوہر اور اس کے بچے ہی اس کی زندگی ہوں گے۔